شہید

ذوالفقار علی بھٹو کی داستانِ حیات

اور پاکستان پیپلز پارٹی

اسلم گورداسپوری

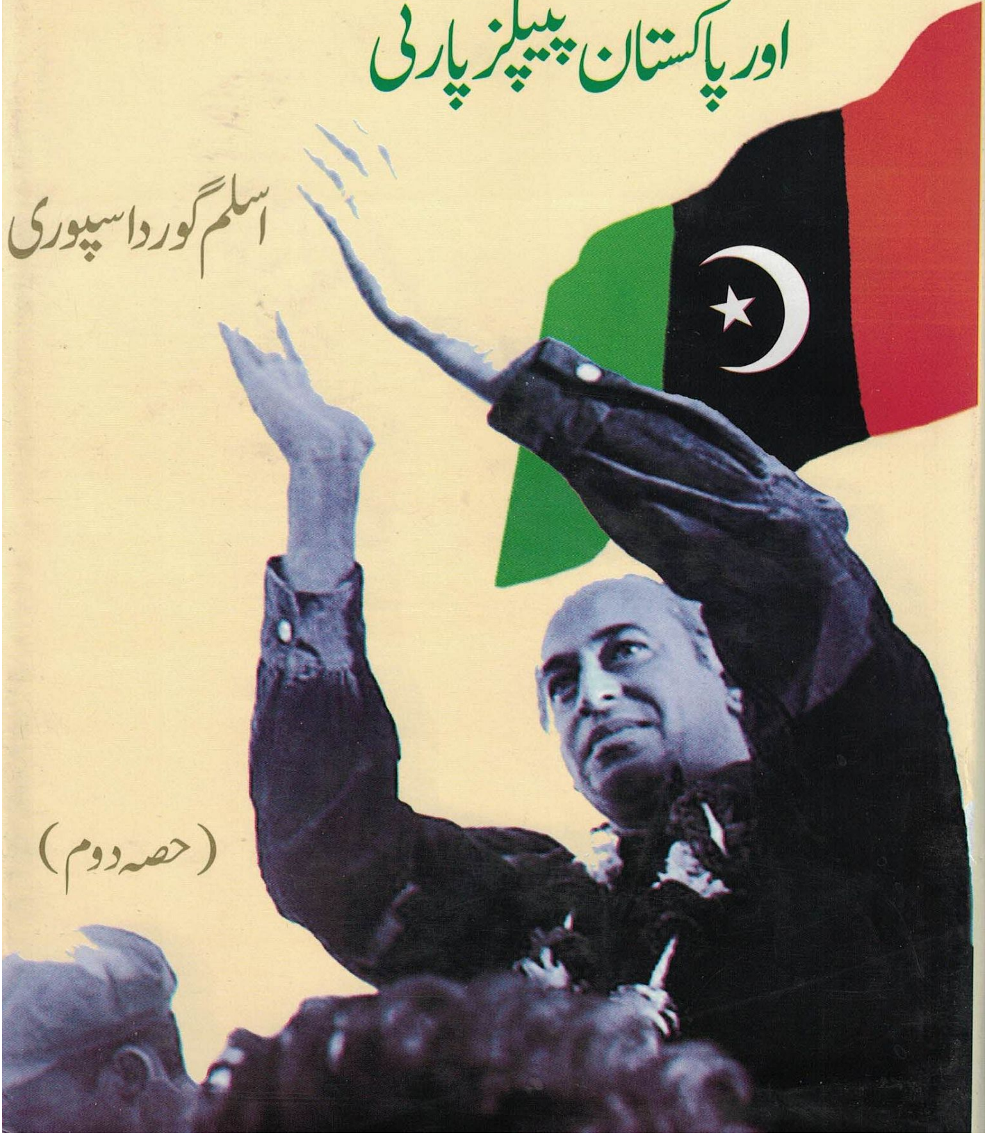

(حصہ دوم)

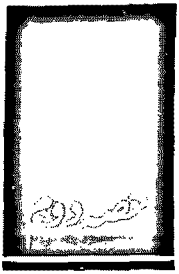

شہید ذوالفقار علی بھٹو کی داستانِ حیات

اور

پاکستان پیپلز پارٹی

اسلم گورداسپوری

فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ لاہور

E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

Ph:042-7249218, 7237430

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	:	شہید ذوالفقار علی بھٹو کی داستانِ حیات اور پاکستان پیپلز پارٹی (حصہ دوم)
مصنف	:	اسلم گورداسپوری
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس 18-مزنگ روڈ، لاہور فون:7249218-7237430
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	عباس
اشاعت	:	2010ء
قیمت	:	-/500روپے

ہیڈ آفس : 18-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

برانچ لاہور	سب آفس حیدر آباد
124-ٹیمپل روڈ لاہور	52,53 رابعہ اسکوائر حیدر چوک گاڑی کھاتہ حیدر آباد
فون:042-7321040	فون:022-2780608

انتساب

اپنے بیٹے علی اسلم

کے نام

جس نے لندن کاسموپولٹین یونیورسٹی سے

ایم۔اے مارکیٹنگ کی ڈگری لے کر

میری خوشی میں اضافہ کیا ہے۔

اس کے علاوہ اُن لوگوں کے نام جنہوں نے انسانیت کی عظمت

کے لئے جنگ کی جن کے دلوں کے مرکز احساسات کی

بھڑکتی ہوئی آگ کی بھٹیاں تھے!

——— اسلم گورداسپوری

www.bhutto.org

فہرست

حرفِ آغاز 19
قصہ پاکستان کے ایٹم بم کا 22
پاکستان کے ایٹم بم بنانے کی اصل وجہ 23
ایٹم بم بنانا جنگ کو روکنا ہوتا ہے 23
پوری قوم سے ایک سوال 24
چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کو ڈپٹی پرائم منسٹر پاکستان بنادیا گیا 25
سلامتی کونسل میں چیئرمین بھٹو کی سٹریجی 26
مشرقی پاکستان کے بارے میں اندرا گاندھی اور صدر نکسن کا مکالمہ 28
چیئرمین بھٹو کے پاس ایک ہی راستہ تھا 30
پولینڈ کی قرارداد کا معاملہ 33
فوجی شکست کے بعد خفیہ ایجنسیوں کا پراپیگنڈہ 35
جماعت اسلامی نے شراب کی دوکانیں توڑنا شروع کر دیں 36
جماعت اسلامی نے جنرل یحییٰ خان کی مدد کردی 37
افسوس کہ ایک جرنیل بھی غیرت سے خودکشی نہ کرسکا 37
ملک غلام مصطفیٰ کھر کا فوجی جرنیلوں کے ساتھ رابطہ اور چیئرمین بھٹو کے
اقتدار میں آنے کی کہانی 39
فوج کے اندر بغاوت کے آثار 41
چیئرمین بھٹو نے پاکستان توڑنے والوں کی جان بخشی کرادی 42
افسوس کہ چیئرمین بھٹو ان قاتلوں کا مسیحا بن گئے 43
چیئرمین بھٹو کی پاکستان آمد اور پاکستان پیپلز پارٹی کا اقتدار 45

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو نے صدرِ پاکستان کا حلف اٹھایا	47
کالعدم نیپ سے پابندی اٹھادی گئی	47
مسلح افواج کے وڈیرے	47
اقتدار حاصل کرنے کے بعد وزیراعظم کا پہلا کام شیخ مجیب الرحمٰن کو آزاد کرنا تھا	
جو ایک صائب فیصلہ تھا	48
یہ جم خانے کے ہٹلر اور لارنس باغ کے نازی	53
پاکستان کا عبوری آئین بنوانا	56
شملہ معاہدہ اور بھٹو کی فتح	56
کیا کسی شکست خوردہ کا بھی کوئی موقف ہوتا ہے	59
وزیراعظم بھٹو کی وضاحت	65
چیئرمین بھٹو کی دوسری سب سے بڑی بھول ملک غلام مصطفےٰ کھر کو اپنا جانشین بنانا تھی	66
چیئرمین بھٹو کے دوسرے جانشین معراج محمد خان	68
ممتاز علی بھٹو	69
ممتاز علی بھٹو کا اقتدار اور سندھی قوم پرستی کی سیاست	73
شکست خوردہ فوجی جرنیلوں کی خفیہ سازش	75
سندھی زبان کا مسئلہ	76
سندھ کا قومی ہتھیار کلہاڑی تھا	77
ایم۔کیو۔ایم کی سیاست کی ابتداء	78
وزیراعظم بھٹو کی ہارڈ لک	80
ممتاز علی خان بھٹو کا معیار دوسرے جانشینوں سے بہت بلند تھا	80
حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کا شائع نہ کرنا	80
وزیراعظم بھٹو کی 1973ء کے آئین کو بنانے کی جنگ	82
پاکستان میں پولیس کی ہڑتال	86
وزیراعظم بھٹو کیسے عجیب انسان تھے	88
آئین کے خلاف خفیہ قوتوں کی سازش اور حزبِ اختلاف کا کردار	95
میاں محمود علی قصوری کا استعفیٰ	96

www.bhutto.org

میرے موقف کی تائید میں ایک دوسرا پہلو ملاحظہ کریں 99
جنرل یحییٰ خان کے مشیر روداد خان کے بھائی عبدالخالق خان کا پیپلز پارٹی سے استعفیٰ 100
ملک غلام مصطفیٰ کھر کا بھٹو صاحب سے عجیب وغریب مطالبہ 101
اس مطالبے کے بارے میں بھٹو صاحب کا اظہارِ خیال 104
جنرل گل حسن اور ائیر مارشل رحیم خان کو نوکری سے نکال دیا گیا 105
صوبہ سرحد میں پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار کی کہانی 107
خان عبدالولی خان کی بھٹو دشمنی کا آغاز 108
پاکستان پیپلز پارٹی کا اقتدار اور ہم کارکنوں کا مقدر 111
کھر ازم اور تاری ازم کا آغاز 113
کارکنوں کا سیاسی کردار تبدیل ہو گیا 114
دفتر 4-اے مزنگ بھی اجڑ گیا 115
پارٹی کے اقتدار نے مجھے تنہا کر دیا 116
میں قائدِ عوام ہوں تم شاعرِ عوام ہو 116
وزیر اعظم بھٹو کا دوسری مرتبہ مجھے گورنر ہاؤس بلانا 117
ہم نظریاتی سیاسی کارکنوں کا فیصلہ 118
شیخ صاحب کی وزارتِ صحت 121
وزارتِ صحت میں شیخ محمد رشید کا انقلابی اقدام 123
جنگِ جزک نیم 123
ملک معراج خالد وزیر اعلیٰ پنجاب کا پہلا اور آخری استقبالیہ 124
پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کا غلغلہ 127
وزیر اعظم بھٹو پر جاگیرداری نہ ختم کرنے کا الزام 128
پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کے لئے انقلاب برپا کرنا آسان تھا 129
عقل کے ساتھ غور کرنے کی بات ہے 130
بھٹو ہم پر اپنا شاعر چھوڑ دیتا ہے 131
دل کی بات خدا جانتا ہے 131
وزیر اعظم بھٹو کو دو طرح کے انقلابیوں کا سامنا تھا 132

www.bhutto.org

وزیراعظم بھٹو ایک قومی مصلح تھے	133
وزیراعظم بھٹو کا سٹیٹ لینڈ تقسیم کرنے کا منصوبہ	137
وزیراعظم بھٹو کی نیشنلائزیشن	138
دوسری غلطی پاکستان پیپلز پارٹی حکومت کی	139
پیپلز پارٹی کے ورکروں کا کردار	140
نیشنلائزیشن کی ناکامی کا تیسرا اہم عنصر	141
ایک لیبر لیڈر کی خوفناک ذہنیت ملاحظہ ہو	141
کراچی کی ٹریڈ یونین کا انداز	142
پاکستان پیپلز پارٹی کی نیشنلائزیشن کو انارکی میں تبدیل کر دیا گیا	144
نیشنلائزیشن کے خلاف امریکا کا ردِعمل	145
نیشنلائزیشن کے خلاف پارٹی کے اندر سے سازش کی گئی	146
پیپلز پارٹی کے متعلق غلط تاثر قائم کر دیا گیا	147
وزیراعظم بھٹو کی نیشنلائزیشن کے سلسلے میں ولادی میر لینن کی نیشنلائزیشن کا ایک اقتباس	148
خواجہ رفیق کی شہادت اور میرا احتجاج	149
ائیر مارشل اصغر خان کی فوجی سیاست	151
ہوائی خان	153
مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا	154
وزیراعظم بھٹو کے ساتھ اچھے حالات میں گورنر ہاؤس میں ایک اور ملاقات	155
شیخ صفدر علی مرحوم کی جگہ ضمنی انتخاب	157
میری لکھی ہی کوثر نیازی کے ہاتھ تھی	159
کوثر نیازی اپنے عہد کا راسپوٹین تھا	161
منیر نیازی کی دلچسپ بات	163
اقتدار میں کسی کا مختارِ کل .نا غلط ہوتا ہے	165
ملک غلام مصطفےٰ کھر کی بغاوت اور حنیف رامے کی آمد	166
قذافی سٹیڈیم کا جلسہ اور تاری فورس کی طاقت کا مظاہرہ	172
اٹ ـ ٹو ـ بروٹ	174

www.bhutto.org

لاہور میں پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس	176
ملک غلام مصطفیٰ کھر کا استعفیٰ	179
محمد حنیف رامے کا اقتدار	180
وزیراعظم بھٹو کا طریقہء اقتدار	184
رامے صاحب کے اقتدار کے دو اہم واقعے	185
احمدیوں کو اقلیت قرار دینا	186
راجہ منور احمد کے ساتھ گفتگو	189
راجہ منور احمد کی بات نے مجھے حیران کر دیا	189
کھر اور رامے صاحب کا مسئلہ	190
میری ذاتی تحقیق کے مطابق	191
حنیف رامے کے دور میں دوسرا اہم واقعہ	192
حنیف رامے کا بھٹو صاحب سے انوکھا مطالبہ	196
مسٹر جے۔اے۔رحیم کا پارٹی سے نکالے جانے کا واقعہ	196
امریکا اور اسٹیبلشمنٹ کی کامیاب سیاست	200
تاج پورہ کا جلسہ	204
وزیراعظم بھٹو نوکرشاہی کے حصار میں جکڑ لئے گئے	207
کہو اسلم تم کب سرخ جھنڈا لے کر میرے خلاف نکلو گے	208
خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو کے سیبوں کا تحفہ	210
بیگم نصرت بھٹو صاحبہ کی میرے نام تحریر کی گئی تعریفی نظم	212
مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں نے بھٹو صاحب کا دل دُکھایا تھا	213
وزیراعظم بھٹو کا مجھے اپنے ساتھ سری لنکا لے کر جانا	218
آغا شاہی کو میں نے کچھ تجاویز دیں	220
ریڈیو سیلون	221
پاکستانی شہری کی رہائی	222
وزیراعظم بھٹو کا بندرانائیکے کے اعزاز میں بنکویٹ	223
اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو	223

www.bhutto.org

سری لنکا کی چاند رات	224
آغا شاہی سے ایک سوال	228
سیاسی حکمرانوں کے لئے ایک مشورہ	229
وزیر اعظم بھٹو کو اسٹیبلشمنٹ نے تنہا کر دیا تھا	231
پاکستان پیپلز پارٹی پر نوابوں کی حکمرانی	233
کھر صاحب کو دوبارہ گورنر بنایا گیا	236
ڈاکٹر مبشر حسن کا استعفیٰ	236
واشنگٹن سے لے کر اسلام آباد تک سازش کا جال پھیلایا گیا	238
قومی متحدہ محاذ اور عوامی جمہوریت ـــــ ڈاکٹر مبشر حسن کا خط	242
مرحوم شیر محمد بھٹی کا استعفیٰ	250
یہ تحریک نہیں تھی ایک سازش تھی	252
تیل نکالنے کا اختلاف	253
امریکہ کا سوویت یونین کے خلاف آخری معرکہ	254
ذوالفقار علی بھٹو پہاڑ کی طرح امریکہ کی راہ میں حائل ہو گئے تھے	256
پاکستانی قوم کے عروج کا زمانہ	257
امریکہ کا وزیر اعظم بھٹو کی سوچ کے ساتھ اختلاف تھا	259
وزیر اعظم بھٹو ایک سپر مین تھا	259
امریکہ کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر کی دھمکی	260
ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ ایک علمی اختلاف	264
پہلی بات	264
دوسری بات	264
تیسری بات	265
چوتھی بات	265
زمین آسمان کا فرق	265
رہی ہیرو پرستی کی بات	265
کالم نویس نذیر ناجی	266

www.bhutto.org

پاکستانی قوم کا زوال	267
پی۔این۔اے کی کہانی	268
نظام مصطفیٰ	270
وزیراعظم بھٹو کی مودودی سے ملاقات	271
5-جولائی 1977ء	272
وزیراعظم بھٹو کا جنرل ضیاء الحق کے ساتھ آمنا سامنا	273
اکتوبر 1977ء کے انتخابات کا اعلان	275
جہانگیر بدر کا جلوس اور لاہور میں پہلی کوڑوں کی سزا	277
بھٹو صاحب کی لاہور آمد	279
مجھے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دیا گیا	282
کوثر نیازی کا گمراہ کن مشورہ	284
لوگ میرے ساتھ تصویر بھی اتروانا نہیں چاہتے	287
مجھے اپنی قسمت پر ہنسی آ رہی تھی	287
بابا فاضل رشیدی	288
وزیراعظم بھٹو کو قتل کے مقدمے میں گرفتار کرلیا گیا	291
جسٹس کے۔ایم۔صمدانی	291
بھٹو صاحب کا مقدمہ اور لاہور ہائی کورٹ	293
پاکستان پیپلز پارٹی اور دوسرے درجے کی قیادت کا کردار	295
مولوی کوثر نیازی کو چیئرمین بنانے کا مطالبہ	299
بیگم نصرت بھٹو اور وزیراعظم بھٹو غیر لالچی سیاست دان تھے	300
نواب صادق قریشی کے گھر بیگم نصرت بھٹو پر ڈاکہ ڈال دیا گیا	302
1977ء کے انتخابات کے خاتمے کا اعلان	304
بریگیڈ میجر نے مجھے طلب کیا	304
میاں منیر، پیر ناظم حسین شاہ اور قیوم نظامی کے کوڑے	305
بیگم بھٹو کی پہلی تنظیم سازی ایس۔ایم۔مسعود صدر پنجاب، چوہدری محمد افضل سندھو سیکرٹری جنرل پنجاب بنا دیے گئے	307

www.bhutto.org

محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ پہلی ملاقات 308
مولوی کوثر نیازی کی غداری 309
مولوی کوثر نیازی کی غداری کی ابتداء 311
لاہور میں کرکٹ میچ اور بیگم نصرت بھٹو محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت کا عظیم مظاہرہ 314
پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کا ہنگامی اجلاس 317
اس اجلاس کا ایک اہم واقعہ 318
مجھ پر مقدمہ تھا کہ میں نے کوثر نیازی کو دھمکیاں دی ہیں 320
ملٹری کورٹ اور میرا مقدمہ 321
ملک معراج خالد کا جیل سے گورنر کو خط 324
حکومتی آرڈر تھا بھٹو صاحب کو سزا سنائی جانے والی ہے 325
ملک سعید حسن کے ساتھ دلچسپ گفتگو 326
جیل میں مجھ پر خونی بواسیر کا حملہ 328
مریض خوش خوراک شیخ رفیق احمد صاحب 328
میرا اپریشن 329
19 مارچ 1978ء کو بھٹو صاحب کو سزا سنادی گئی 330
فوجی حکمرانوں کی دہشت گردی کی انتہا 331
صحافیوں کو الٹا لٹکا دوں 332
نثار عثمانی کا جواب 332
خالد چوہدری پر بم کیس بنادیا گیا 332
کوڑوں کی سزا کوڑے مارنے والوں کے لئے تازیانے ہیں 334
بزرگ صحافی منہاج برنا پر شراب کا مقدمہ 334
خاور نعیم ہاشمی کو کوڑے لگائے گئے 335
ملٹری کورٹ سے کوڑے کھانے والوں کے نام 336
بیگم صاحبہ اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی جدوجہد 336
بھٹو ازم 337

www.bhutto.org

ملتان میں بیگم نادرا خاکوانی کے گھر جلسہء عام اور راشد نا گی اور عبد الوحید قریشی
کی خودسوزی 340
دنیا کی تاریخ کا عجیب احتجاج 341
سینٹر کمیٹی میں ہماری انقلابی تجویز 342
13 اکتوبر 1978ء کو مجھے پیپلز پارٹی پنجاب کا صدر بنا دیا گیا اور رانا شوکت محمود کا
نام نامنظور کر دیا گیا 345
ریٹائرڈ جسٹس ملک سعید حسن کو سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا 347
بیگم صاحبہ کی صدارت میں سینٹر کمیٹی کا اجلاس 348
سیاسی پارٹی کا دفتر ہونا لازمی ہے 348
پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل مبشر حسن سے ایک سوال 349
اصغر چوہدری اور غیاث الدین جاں باز کی شرارت 349
پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کا پہلا تنظیمی اجلاس 352
پیٹریاٹ ڈیموکریٹک لائیرز الائنس کا قیام 354
میری 60 سالہ بڑی بہن سرور بیگم اور میری بھانجی فردوس کی گرفتاری 355
راجہ انور اینڈ کمپنی کی سیاست 361
رائے حفیظ اللہ کا سیکرٹری جنرل بن جانا 363
میری مشکلات میں اور اضافہ ہو گیا 363
سیاسی کارکنوں کے لئے ایک مشورہ 364
بیگم بھٹو سے آخری ملاقات اور راولپنڈی کے اردگرد رہنے کا منصوبہ 366
جہلم میں راجہ انور اینڈ کمپنی کی ہمارے خلاف بغاوت 367
ٹیکسلا شہر کا اجلاس اور میری مہم جوئی 369
عالمِ نفسا نفسی کا آغاز 371
پیٹریاٹ ڈیموکریٹک لائیرز ایسوسی ایشن کا کارنامہ 372
مجھ پر بم کیس بنا دیا گیا 375
بم کیس کا سب سے بڑا نقصان 376
مفرور کو سانپ کی طرح گم ہونا چاہئے 376

بم کیس کے مجرم ایس۔ ایس۔ پی زمان کے گھر چلے گئے 378
قدرت کی گواہی 379
اسلم گورداسپوری افغانستان چلا گیا 380
میں جتوئی ہاؤس پہنچ گیا 380
سید حامد رضا گیلانی کا افسوس 382
پھانسی کوٹھڑی میں عظیم بھٹو کی خرد افروزی 384
ضیاء الحق کی سیاسی سرگرمیاں ختم کرنے کے بارے میں 396
انسانی حقوق 397
افراط زر 398
سیاست دانوں کو بدنام کرنا 399
مسئلہ کشمیر 399
سہولت کی خارجہ پالیسی 400
ایک باریک بات 402
قتل کی ایک مثال 403
نگوڈنگھ ڈائم 403
میری منطق یہ ہے 404
اندوہ ناک شکایت 404
برادرانہ اخوت آقا اور ملازم کے تعلق سے پیدا نہیں ہوتی 407
دوہرا معیار 407
اس کے برعکس 407
وہ تو اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر بات کر رہا تھا 407
مجھے تاریخ کا علم ہے 408
میں نپولین بوناپارٹ کا مداح ہوں 408
فرانس انقلاب کی ماں ہے 408
انتقام کی تاریخ 409
پہلی مثال 409

www.bhutto.org

دوسری مثال	409
تیسری مثال	409
ایک بہادرانہ بات	410
تاریخ عالم کا شعور	410
میں تباہی کو آتا دیکھ رہا ہوں	411
دانش ور کون ہوتا ہے؟	412
بے نظیر کو قیادت سونپ رہے ہیں	412
تمہارے ہتھیار کیا ہیں؟	413
پیچھے دیکھنے کی تاریخ کی انوکھی مثال	413
تانگہ کی مثال	413
ہمت کا زوال	414
موت کی کوٹھڑی	414
دنیا بہت خوبصورت ہے	415
شاعر شیلے کا حسن کا نظریہ	415
زندگی محبت کا ملہ ہے	416
شہید بھٹو کا رومانس	416
احساسات کا تحفہ	416
فوجی ڈکٹیٹر کی شیخی	417
مذہب اللہ اور انسان	417
مجھے سامراجیت سے سخت نفرت ہے	418
اکبر بگٹی اور خیر بخش مری کو میرا اسلام پہنچے	418
لاڑکانہ کے طوطے کی کہانی	419
ران پر کاغذ کو رکھ کر لکھنا	419
وصیت نما پیغا	420
وصیت کی انتہائی قابلِ غور بات	420
میر سائیں	421

www.bhutto.org

نئی نسل کی قیادت مسئلہ 422
نئی نسل کی قیادت کا مسئلہ نئی نسل کا اپنا مرکزی مسئلہ ہوا کرتا ہے 422
داؤ پر بہت کچھ لگا ہوا ہے 422
پیغمبرانہ پیغام 423
حزب اختلاف کے لیڈروں کے بیانات 423
وزیر اعظم بھٹو عدالت میں آئے تو حاضرین احتراماً کھڑے ہو گئے 425
سقراط کی بات 428
20 دسمبر اور 22 دسمبر 1978ء روزنامہ مساوات لاہور کی اہم سرخیاں 428
وزیر اعظم بھٹو کو سپریم کورٹ میں پیش کیا جانا 429
درواں دی ماری جندڑی علیل اے 429
بھٹو صاحب کا سپریم کورٹ کا مکمل بیان (16 تا 22 دسمبر 1978ء) 429
حزبِ اختلاف کے چند بڑے لیڈروں کے بیانات خود سوزی کے خلاف 442
پیپلز پارٹی کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس اور رحم کی درخواست اور میاں یٰسین وٹو کا
سیکرٹری جنرل بن جانا 443
میاں یٰسین وٹو کی ضیاء الحق سے ملاقات کی درخواست 443
حفیظ پیرزادہ کی اپیل 444
وزیر اعظم بھٹو کی سوتیلی بہن نے جان بخشی کی اپیل کر دی 444
بھٹو فرش پر سوتے ہیں 445
بھٹو یا ان کے کسی عزیز کی طرف سے کوئی اپیل داخل نہیں کی گئی، رحم کی اپیل دائر
کرنے کا وقت ختم ہو گیا۔ نوائے وقت 445
جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کے لئے رحم کی تمام اپلیں مسترد کر دیں روزنامہ نوائے وقت 445
شرمناک بات 446
خدا کی آواز 446
قیامت خیز دن 446
بھٹو کی اقامت گاہوں سے خفیہ دستاویزات برآمد کر لی گئیں 447
قدرت کا انتقام 447

قاتلوں کا ترجمان اخبار نوائے وقت 447

3 اپریل 1979ء روزنامہ نوائے وقت کی سرخیاں 448

میں اپنے خدا کے پاس خوبصورت ہو کر جانا چاہتا ہوں 448

وصیت 449

جیل حکام نے کھانے کا پوچھا 449

کوسیجن کو صدر کا پیغام پہنچا دیا گیا 449

4 اپریل 1979ء روزنامہ نوائے وقت کی سرخیاں 450

تاس نے بھٹو کی پھانسی کی خبر پر کوئی تبصرہ نہیں کیا 450

آخر کار انصاف کی جیت ہوئی اور مجرم کو سزا ملی۔ ملائشیا کا سابق وزیر اعظم تنکو عبدالرحمٰن 450

بھٹو کا جسم 35 منٹ تک تختہء دار پر لٹکتا رہا 451

پھانسی کی اجرت دس روپے 451

جیل والوں سے معذرت خواہ ہوں۔ نوائے وقت 452

بابِ شہادت 454

انسانیت سوز شرمناک انتقام 454

ایک کرنل کا جیل میں جانا 454

تم نے مجھے زندگی میں تو سکون نہیں دیا اب چین سے مرنے تو دو 455

پھانسی دینے کا قانونی وقت 456

اخبار نوائے وقت کے مطابق پھانسی کا منظر 457

پھانسی کی طرف جانے سے انکار 457

بھٹو نے اپنی گردن کو اور بلند کر دیا 458

شہید ذوالفقار علی بھٹو کا سفرِ آخرت 458

قبر کشائی کی داستان 459

نبی بخش بھٹو کی حویلی 459

میت کی آمد 460

ہیلی کاپٹر نبی بخش بھٹو کی حویلی کے سامنے اُترا 460

سردار پیر بخش بھٹو کا بیان 460

www.bhutto.org

4اپریل کے نوائے وقت میں وزارتِ داخلہ کا بیان	461
شہید وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی نمازِ جنازہ	461
ماں اور بیٹی نے رورو کر بُرا حال کرلیا	462
خاندانِ شہداء	462
قیادت کی قیمت	463
باب تحسین	464
پاکستان پیپلز پارٹی کے پروانوں شہیدوں اور جیالوں کو خراجِ عقیدت اور خراجِ تحسین	465
کشتگانِ عشق	466
خودسوزی کرنے والے پروانوں کے نام	466
آمریت کی قتل گاہ میں پھانسیاں پانے والے شہیدوں کو خراجِ عقیدت اوران کے نام	466
کوڑے کھانے والے بہادر کارکنوں کو خراجِ تحسین اوران کے نام	466
پاکستان پیپلز پارٹی کے کوڑے کھانے والے جیالوں کے نام	467
شاہی قلعہ لاہور جانے والے لیڈروں اور کارکنوں کے نام	467
شاہی قلعے جانے والی بہادر خواتین کارکنوں کے نام	468
ملٹری کورٹ سے ایک سال قید بامشقت کی سزا پانے والی بہادر خواتین کے نام	468
بحالیء جمہوریت کی تحریک کی روحِ رواں خواتین اوران کے نام	468
جیلوں میں جانے والے لیڈروں اور کارکنوں کے نام	469
پارٹی کارکنوں کی مالی اور اخلاقی مدد کرنے والے کارکنوں کے نام	470
کارکنوں کی قانونی مدد کرنے والے وکلاء کے نام	471

www.bhutto.org

786

حرفِ آغاز

میری اس کتاب کے حصہ دوم میں شہید ذوالفقار علی بھٹو کی داستانِ حیات اور ان کے اقتدار کے زمانے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔اور یہ کہانی پاکستان پیپلز پارٹی کی حقیقی تاریخ کا درجہ رکھتی ہے۔ پاکستان دنیا کا وہ واحد بدقسمت ملک ہے جس میں انتقالِ اقتدار کبھی بھی پُرامن طریقے کے ساتھ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔پاکستان میں اقتدار پر فوجی اسٹیبلشمنٹ کا قبضہ ہے۔جو بھی فوجی چیف کمانڈر کسی سول حکومت کا تختہ الٹ کر ملک پر مارشل لاء نافذ کر کے ملک کا بے تاج بادشاہ بن جاتا ہے۔وہ ایک طویل عرصے تک ملک پر قابض رہ کر حکومت کرتا رہتا ہے۔اور جب اس چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اقتدار کی سڑاند قوم کے لئے اور معاشرے کے لئے ناسور بن جاتی ہے تو وقتی طور پر اسٹیبلشمنٹ ایک عارضی قسم کے ارینج منٹ کے تحت حکومت کسی سیاست دان کے گلے میں ڈال دیتی ہے۔مگر 1970ء کا فوجی اقتدار تو اس قدر بھیانک اقتدار تھا جو فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان سے لے کر جنرل یحییٰ خان تک چلتا رہا تھا۔اس اقتدار کا انتقالِ اقتدار ملک کے دو ٹکڑے ہونے پر دیکھنے میں آیا تھا۔یہ انتقالِ اقتدار 93 ہزار پاکستانی فوج کے جوانوں اور جرنیلوں کے ڈھاکہ میں ہندوستان کی فوج کے کمانڈر انچیف کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی شرمناک فوجی شکست کے بعد وزیرِاعظم ذوالفقار علی بھٹو کے گلے میں ڈال دیا گیا تھا اور عین اس وقت ڈال دیا گیا تھا جب باقی ماندہ پاکستان کو بچانا اور اس کو قائم رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔

دنیا بھر کے قدیم اور جدید فلاسفروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ایک حکمران سیاست دان یا قیادت میں چار چیزوں کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔(1) ایک حکمران کا دانش مند ہونا ضروری ہے۔ (2) ایک حکمران کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عہد کے بین الاقوامی قوانین اور اصولوں سے

www.bhutto.org

واقف ہو۔ (3) ایک حکمران کو اپنی قوم کا مزاج شناس ہونا اور عالمی سیاست پر عبور رکھنا ضروری ہے۔ (4) ایک حکمران کا عالم فاضل ہونا مدبر ہونا اور فلسفی ہونا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ سقراط اور افلاطون اور ارسطو کا تو حتمی فیصلہ یہ تھا کہ ہر ملک اور ہر قوم پر فلسفیوں کی حکمرانی ہونی چاہیئے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ شہید وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو عالمی فلسفیوں کے حکمرانوں کے لئے مقرر کئے گئے اصول اور اقوال کا مکمل مجسمہ تھے۔ انہوں نے جب اقتدار سنبھالا تو ان کے سامنے پانچ بڑے قومی اور بین الاقوامی مسئلے پہاڑ بن کر کھڑے تھے۔ پہلا مسئلہ تو شیخ مجیب الرحمٰن کا تھا جو مغربی پاکستان کی جیل میں قید تھا۔ دوسرا بڑا مسئلہ مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بن جانا تھا اور اس کو تسلیم کرنا تھا۔ تیسرا بڑا مسئلہ پاکستان کے 93 ہزار جنگی قیدیوں کا تھا۔ چوتھا مسئلہ پاکستان کی 5 ہزار مربعہ زمین کو ہندوستان کی فوج کے قبضے سے واگزار کرانا تھا۔ پانچواں مسئلہ ایک شکست خوردہ ٹوٹے ہوئے ملک کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا اور دنیا میں اس کی ساکھ پھر سے بحال کرانا تھا۔

لہٰذا یہ پانچ مسئلے پاکستان کے اس وقت بنیادی مسئلے تھے۔ جو تمام کے تمام انتہائی پیچیدہ اور الجھے ہوئے تھے۔ اور بڑی گھمبیر شکل اختیار کئے ہوئے تھے۔ مگر پاکستان کی تاریخ شاہد ہے کہ شہید وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ان تمام پہاڑ جیسے مسئلوں کو ایک ایک کر کے نہایت سلیقہ مندی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پورے قومی وقار کے ساتھ طے کیا اور پاکستان کو مہذب دنیا کی صف میں کھڑا کر دیا۔

ان کے اقتدار کا پہلا ایجنڈا ہی یہ پانچ ٹیڑھے مسئلے تھے۔ ان کا یہ ایجنڈا ان کے وژن اور ان کی دوراندیشی کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا اور ان کی حکمرانی کے فن کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی سیاست اور ان کے اقتدار کے لئے مشکلات ہی مشکلات تھیں۔ ان کے لئے پاکستان پیپلز پارٹی کے اندر بھی کچھ مشکلات تھیں اور باہر کی مشکلات کا تو کچھ انت ہی نہیں تھا۔ پارٹی کے اندر کی مشکلات یوں تھیں کہ ایک تو پاکستان پیپلز پارٹی ایک نئی پارٹی تھی۔ جس کی مبلغ عمر 1970ء میں صرف تین سال تھی اور پارٹی کے اندر ان کے ساتھ کوئی تجربہ کار ساتھی لیڈر ہی نہیں تھا۔ اس لئے کہ کوئی بڑا تجربہ کار لیڈر پیپلز پارٹی میں شامل ہی نہیں ہوا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے باقی تمام لیڈر نوآموز اور غیر معروف تھے۔ ان میں سے کوئی تو انجینئر تھا اور کوئی وکیل تھا، کوئی سٹوڈنٹ لیڈر تھا، کوئی ڈاکٹر تھا، کوئی مصور تھا، کوئی جاگیردار تھا۔ ان میں اکثریت نوآموزِ سیاست اور نوجوان لوگوں کی تھی اور ان تمام کے علاوہ باقی پاکستان کے غریب محنت کش

www.bhutto.org

عوام تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا صرف ابتدائی تنظیمی ڈھانچہ موجود تھا۔ جس کو تنظیمی اعتبار سے ایک منظم سیاسی جماعت کا تنظیمی ڈھانچہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان کی پہلی اینٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی تھی۔ جو خالصتاً اس عہد کی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف ایک ہی سیاسی جماعت تھی۔ اس لئے کہ پاکستان میں اس وقت موجود تمام سیاسی لیڈر اور سیاسی جماعتیں اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کھلا یا مخفی الحاق کئے ہوئے تھیں۔ اور وہ تمام لیڈر اور تمام سیاسی جماعتیں اور مذہبی تنظیمیں اسٹیبلشمنٹ کی ہی طرح پاکستان پیپلز پارٹی کی مخالفت میں پیش پیش تھیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس تمام اندرونی انتشار اور بیرونی خلفشار کے باوجود شہید وزیراعظم بھٹو نے ملک میں زرعی اصلاحات کر کے بے زمین کسانوں میں زمین تقسیم کی۔ پاکستان کی تمام بڑی صنعتوں اور بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لیا۔ بچوں کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کیا۔ نئی تعلیم کی پالیسی بنائی۔ نئی لیبر پالیسی بنائی۔ ملک میں بھاری کارخانے لگائے گئے۔

وزیراعظم بھٹو کا سب سے بڑا کارنامہ پاکستان کے ڈاؤن ٹراڈن پسے ہوئے غریب عوام میں سیاسی سماجی معاشی اور جمہوری حقوق کا شعور پیدا کرنا تھا۔ ان کے ذہنوں کی پسماندہ تاریکی میں جدوجہد کا اُجالا پیدا کرنا تھا۔ جو علامہ اقبال کے بقول مولوں کو شہبازوں سے لڑانا تھا۔

میری اس کتاب شہید بھٹو کی داستانِ حیات اور پاکستان پیپلز پارٹی کا حصہ دوم شہید ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار سے شروع ہو کر ان کے تختہ دار تک کی مکمل کہانی ہے۔ جس کہانی کو میں نے انتہائی خلوص اور دیانت داری کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ امید ہے قارئین اس کتاب کو پسند کریں گے۔

ان سب سے اہم اور سب سے بڑا کام پاکستان کا آئین بنانا تھا۔ انہوں نے پاکستان کا 1973ء کا آئین بنا کر پاکستانی قوم کو دنیا کی تمام مہذب اقوام کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

وزیراعظم بھٹو ایک قدرتی اور طبعی طور پر کرشماتی انسان تھے۔ مشکل اور ناممکن قسم کے کارنامے سرانجام دینا ان کا ایک مشغلہ تھا۔ معجزے اور کرزمے کرنا ان کا شغل تھا۔ انتہائی نڈر انتہائی انتھک انسان تھے۔ ان کی ذات میں قیادت کے بے پناہ وصف تھے۔ وہ غریبوں کے ساتھ غریب تھے، امیروں کے ساتھ امیر تھے، ہاریوں کے ساتھ ہاری تھے، وڈیروں کے ساتھ وڈیرے تھے، مزدوروں کے ساتھ مزدور تھے، طالب علموں کے ساتھ طالب علم تھے، عالموں کے ساتھ عالم تھے، دانش وروں کے ساتھ دانش ور تھے، سیاست دانوں کے ساتھ سیاست دان تھے، صوفیوں کے ساتھ صوفی تھے، درویشوں کے ساتھ درویش تھے، مولائیوں کے ساتھ مولائی تھے، قلندروں کے ساتھ قلندر تھے، اور

اپنی قوم کے لئے انتہائی محبت کرنے والے اور شفیق انسان تھے۔ ظالموں کے ساتھ ظالم تھے اور مظلوموں کے ساتھ مظلوم تھے۔ وہ طبیعی اعتبار سے حسنیؑ حسینیؑ اور منصوری نیچر کے انسان تھے۔

وہ پاکستان کو اپنی ہی طرح کا ایک عظیم پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کو ایک ایٹمی قوت بنا کر دنیا میں تمام ایٹمی قوت رکھنے والی اقوام کا ہم پلہ بنا دیا تھا۔ جس کی پاداش میں ان کو تختہ دار پر کھینچ دیا گیا تھا۔ آخر میں ذرا ایٹم بم کا قصہ ملاحظہ فرمائیں۔

قصہ پاکستان کے ایٹم بم کا

پاکستان ایک غریب پسماندہ ملک تھا۔ جس میں نہ تو تعلیم کا کوئی جدید نظام تھا اور نہ ہی لوگوں کی صحت کا خاطر خواہ بندوبست تھا۔ پاکستان روزِ اول سے اقتصادی بحران کا شکار ملک ہے۔ جس میں لوگ غربت کی آخری لکیر پر کھڑے ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پاکستان مجموعی آمدنی کا 80 فی صد سرمایہ افواجِ پاکستان کی دفاعی ضرورتوں پر خرچ کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان کی اس طرح کی صورت حال میں پاکستان کے عوام کی غربت کو ختم کرنا تو ایک طرف کم کرنے کا بھی سوچا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا اس نوع کے قومی تناظر میں پاکستان کے ایٹم بم بنانے کا تصور نہ صرف پاکستان کی معیشت کے لئے تباہ کن تھا ایک طرح کی معاشی خودکشی کے مترادف تھا۔

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو جیسا زیرک انسان ان تمام شواہد و حقائق سے نابلد نہیں تھا۔ وہ شخص اپنے قومی معاملات میں انتہا کا حساس انسان تھا۔ وہ پاکستان کے معاشی حالات کی روشنی میں ایٹم بم بنانے کی عیاشی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ انہوں نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے لئے جو پروگرام ان کی شہادت کے بعد صرف ایٹم بم تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے تمام سرمایہ سلامی ملک سعودی عرب کے مردِ دانا شاہ فیصل سے اور اسلامی دنیا کے عظیم مجاہد حکمران جمہوریہ لیبیا کے حکمران صدر معمر قذافی سے اور عرب امارات کے حکمران النہیان سے حاصل کیا تھا۔ لہٰذا پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا بوجھ قطعی طور پر پاکستان کی معیشت پر نہیں ڈالا گیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کی ذات پر ان مشرق وسطیٰ کے حکمرانوں کا کمال اعتماد تھا۔ جنہوں نے ان کی دل کھول کر مدد کی تھی۔ جس کے لئے ان ممالک کو امریکہ کی دشمنی اور ناراضی کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ شاید شاہ فیصل کی شہادت کا موجب پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی مدد کرنا ہی تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ نے صدر معمر قذافی کا ایک عرصہ تک ناطقہ بند کئے رکھا تھا یہ تو تھی پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر خرچ کی جانے والی دولت کی

کہانی جس کو میں نے اپنی دانست کے مطابق بیان کر دیا ہے۔

پاکستان کے ایٹم بم بنانے کی اصل وجہ

جہاں تک پاکستان کے ایٹمی پروگرام میں عالمِ اسلام کے اجتماعی تحفظ کا معاملہ تھا اس کو کتاب میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہاں پر ایٹم بم بنانے کی اصل وجہ کو بیان کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کے ایٹم بم بنانے کی اصل وجہ ہندوستان کا ایٹمی پروگرام اور ہندوستان کا ایٹم بم تھا۔

وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو جیسے غیرت مند محبِ وطن اور قوم پرست انسان کے لئے ڈھاکہ میں ہندوستان کی فوج کے ہاتھوں افواجِ پاکستان کی شکست نا قابلِ برداشت تھی۔ وہ اس طرح کی ہندوستان کی کھلی جارحیت کی توہین اور ذلت ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ 1971ء کی ہندوستان پاکستان جنگ کی وجہ سے پاکستان کی شکست کے نتیجے سے ہندوستان کے حوصلے آسمانوں کو پہنچے ہوئے تھے۔ وہ پاکستان کے تشخص کو ایک طرح سے مسخ کر چکا تھا۔ اب گویا باقی ماندہ پاکستان اس کے لئے کوئی معنی اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ وہ جنوبی ایشیاء کا اب خود کو بے تاج بادشاہ خیال کرنے لگ گیا تھا۔ وہ اس علاقے میں خود کو سپر طاقت سمجھنے لگ گیا تھا۔ ہندوستان کے اس طرح کے زعم اور رویے اور گھمنڈ کو پاکستان کی صرف افواج کے بل بوتے پر ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستان صرف ایک فاتح ہی نہیں تھا وہ اپنا ایٹمی پروگرام بھی شروع کئے ہوئے تھا، اور ایٹم بم بنانے کے قریب قریب پہنچ چکا تھا۔ ہندوستان کے تنہا اس خطے میں ایٹمی قوت بن جانے کی شکل میں ہندوستان صرف پاکستان کے لئے ہی نہیں پورے اس خطے کے لئے جارحیت اور دہشت کا عفریت بن جاتا۔ آج پاکستان کے پاس ایٹم بم کی موجودگی کے باوجود یکم جنوری 2010ء کو ہندوستان کے کمانڈر انچیف نے جس طرح کی جنگ کی دھمکی دی ہے۔ کوئی سوچے اگر پاکستان ایٹمی قوت نہ ہوتا تو اس جنگی دھمکی پر پاکستان کی کیا حالت ہوتی۔

ایٹم بم بنانا جنگ کو روکنا ہوتا ہے

وزیرِ اعظم بھٹو کے لئے پاکستان کے لئے ایٹم بم بنانا نہ صرف پاکستان کو بچانے کی ضرورت تھی بلکہ اس خطے کی سلامتی کی ضرورت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان اس خطے کا بہت بڑا ملک ہے اور پاکستان سے تو بہت ہی بڑا ملک ہے۔ لہٰذا ہندوستان پاکستان کے ساتھ برابری کے سلوک

کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ایک بڑے ملک کی نفسیات پاکستان کے لئے اور اس خطے کے دوسرے چھوٹے ممالک کے لئے ایک مستقل خطرہ اور عذاب بن سکتی تھی۔ لہٰذا ایٹم بم کے حصول کی منطق ہی ہندوستان کی اس ایٹمی قوت کی نفسیات کا علاج ہو سکتی تھی۔ اتنا گہرائی سے سوچنا اتنی دوراندیشی سے اس خطے کے مستقبل کے حالات کے بارے میں سوچنا اور اس کا تدارک کرنا یہ صرف بھٹوازم یا بھٹو ڈاکٹرائین کا ہی کمال تھا۔ ایٹم بم کی قوت حاصل کرنے کے بعد کسی ملک کے بڑے چھوٹے کا سوال ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔ ایٹم بم امریکہ یا ہندوستان کے پاس ہو یا صرف ایک گاؤں کی آبادی کے ملک کے پاس ہو، وہ دونوں ایک برابر ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ایٹم بم کی تباہی کی قوت ملکوں کی آبادیوں اور ان کے وسیع تر رقبوں کی بنا پر نہیں ہوتی۔ ایٹم بم کی قوت ایٹم پر ہی ہوتی ہے۔ وہ خواہ کسی ایک انسان کے پاس ہو یا کسی ایک ارب کی آبادی کے ملک کے حکمرانوں کے پاس ہو۔ وہ اپنی تباہ کاری اور غارت کاری میں ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ لہٰذا لوگوں کا یہ خیال قطعی اور انتہائی غلط ہے کہ ایٹم بم جنگ کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ایٹم بم جنگ کو روکنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ جب ایک ملک ایٹم بم بنا لیتا ہے تو اس کا پوری دنیا پر اس کی طرف سے اعلان ہو جاتا ہے کہ خبردار ہمارے ساتھ کسی قسم کی عسکری جارحیت کا نہ سوچا جائے ہمارے پاس ایٹم بم ہے۔ اس طریقے سے بڑے سے بڑا ملک بھی کسی ایٹمی طاقت کے چھوٹے سے چھوٹے ملک پر بھی کبھی جارحیت کرنے کی حماقت نہیں کرتا۔

لہٰذا وزیراعظم بھٹو کے ایٹم بم بنانے کا یہ اعلان نہ صرف ہندوستان کے لئے تھا بلکہ امریکہ جیسی سپر طاقت کے لئے بھی تھا۔ جو جاپان پر ماضی میں ایٹم بم گرانے کا عملی طور پر مظاہرہ بھی کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ایٹم بم کی مخالفت امریکہ نے کی تھی اور آج تک کرتا چلا آ رہا ہے۔

پوری قوم سے ایک سوال

آج میں پوری قوم سے یہ سوال کرتا ہوں کہ جس شخص نے ہم کو دنیا کی تمام سپر طاقتوں کے برابر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ ہم نے اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ بقول شاعر اسلم گورداسپوری ؎

مار ڈالا ہے اُسے ذوقِ خود آگہی نے
چین سے رہتے ہیں وہ لوگ جو بیدار نہیں

چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کو ڈپٹی پرائم منسٹر پاکستان بنادیا گیا

کجھ اُنج دی راہواں اوکھیاں سن
کجھ گل وچ غماں دا طوق وی سی
کجھ شہر دے لوک وی ظالم سن
کجھ سانوں مرن دا شوق وی سی

نورالامین کو وزیراعظم پاکستان بنانے کے بعد چیئرمین بھٹو کو ڈپٹی پرائم منسٹر پاکستان بن جانے کا کہا گیا۔ صدر جنرل یحییٰ خان نے بھٹو صاحب کو صدر ہاؤس بلا کر ملک کی صورت حال کا نقشہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان نے اپنی فوجیں مشرقی پاکستان کے اندر داخل کر دی ہیں۔ اس وقت آپ کا امریکہ جانا سلامتی کونسل میں جا کر پاکستان کا تحفظ اور ترجمانی کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔ میری فوجی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو اس وقت پاکستان کی نمائندگی کرنے کا مکمل اختیار دیا جائے۔ جس کے لئے آپ کو پاکستان کا ڈپٹی پرائم منسٹر بنا دیا گیا ہے۔ امید ہے اس وقت وقت کی نزاکت کے پیش نظر ملک اور قوم کے وسیع تر مفادات کے لئے آپ ہماری پیش کش کو فوری قبول فرما کر سلامتی کونسل میں شرکت کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔

اس وقت پاکستان کی جو صورت حال تھی اس صورت حال میں پاکستان کا کوئی محب الوطن انسان بھی فوجی حکومت کی اس تجویز کو پاکستان کی خاطر رد نہیں کر سکتا تھا۔ جہاں تک چیئرمین بھٹو کی ذات کا تعلق تھا وہ پاکستان کے معاملے میں غیر معمولی طور پر پاکستان پرست تھے۔ مجھے بعض

www.bhutto.org

اوقات ایسا لگا کرتا تھا جس طرح ان کی رگوں میں خون کی جگہ پاکستان کا جذبہ دوڑ رہا ہے۔ خدا گواہ وہ اس مسئلے پر بے حد حساس تھے، جذباتی تھے، انتہا پسند تھے، پاکستان کے نام پر ان سے کچھ بھی کروایا جا سکتا تھا۔ فوجی حکمران اس وقت تک مشرقی پاکستان کو اپنے ہاتھوں سے گنوا چکے تھے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی بغاوت پاکستانی فوجی حکومت کے تمام نظام کو درہم برہم کر چکی تھی وہاں پر اس وقت حکومت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی۔ خانہ جنگی اپنے عروج پر تھی۔ ہندوستان کی فوج ڈھاکہ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مشرقی پاکستان کے شہروں میں متعین پاکستانی فوج ہندوستان کی فوج کو ڈھاکہ کی طرف مارچ کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی مگر جنرل اے۔ کے نیازی کے حکم کے مطابق مقابلہ کرنے سے گریز کرتی تھی۔ چیئرمین بھٹو اور یحییٰ خان کی ملاقات کے ٹھیک آٹھ دن بعد ڈھاکہ پر ہندوستان کا قبضہ ہونے والا تھا۔ ٹھیک آٹھ دن بعد جنرل اے۔ کے نیازی نے ہندوستانی کمانڈر انچیف اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس عالم میں اس بدنصیب گھڑی میں چیئرمین بھٹو فوجی حکمرانوں کی پیش کش کو قبول کر کے امریکہ روانہ ہو گئے۔ وہ اس طرح کی صورت حالات میں ملک وقوم کی ذمہ داری سے پہلوتہی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ پاکستان کی فوجی ایجنسیاں ملک وقوم کے معاملے میں چیئرمین بھٹو کی کمزوری سے واقف تھیں۔ ان کو علم تھا کہ یہ دیوانہ ملک وقوم کے مسئلے میں ہرگز کوئی جمع تفریق نہیں کرے گا۔ لہٰذا چیئرمین بھٹو کی وطن پرستی کی دیوانگی سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کی سالمیت کے جس جہاز کو فوجی جرنیلوں نے اپنی بداعمالیوں اور اپنے غیر آئینی اقتدار کے بوجھ سے ڈبو دیا تھا۔ جب اس کشتی کا کوئی کپتان نہیں رہا تھا۔ اس ڈوبتی ہوئی کشتی پر چیئرمین بھٹو کو سوار کر دیا گیا۔ ان کو اس جہاز کا کپتان بنا دیا گیا۔ بنگلہ دیش کی آگ سے کھیلنے اور ہندوستان کی فوج کے شعلوں پر چلنے کا کام چیئرمین بھٹو کے سپرد کر دیا گیا۔

سلامتی کونسل میں چیئرمین بھٹو کی سٹریٹیجی

پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے جس طرح کا بھیانک کردار مشرقی پاکستان میں ادا کیا تھا۔ اس کردار سے پوری دنیا واقف تھی۔ پوری دنیا دیکھ رہی تھی کہ پاکستان کے فوجی حکمران ایک منتخب سیاسی جماعت کو اقتدار دینے سے منحرف ہو چکے ہیں۔ انتخابات کو ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ایک سال کے لمبے چوڑے عرصے میں حکومت کی طرف سے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا

جس سے ثابت ہو سکتا کہ حکومت منتخب نمائندوں کو اقتدار دینے میں مخلص ہے یا تیار ہے۔ ایک سال کا عرصہ بہت بڑا عرصہ تھا جس میں ہر اعتبار سے انتقالِ اقتدار کا مسئلہ طے ہو سکتا تھا۔ مگر فوجی حکمرانوں کا ایمان ہی یہ تھا کہ سیاست دانوں کو کسی قیمت پر اقتدار نہیں دیا جائے گا۔ ان کو زیادہ سے زیادہ نوکری دی جا سکتی ہے۔ یہ بات سارا زمانہ جان چکا تھا۔ اب دنیا کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا تھا۔ پوری دنیا کی ہمدردیاں بنگالیوں کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ بنگالی سچے ثابت ہو چکے تھے۔ حق پر ثابت ہو چکے تھے۔ پاکستان کے فوجی حکمران عالمی رائے عامہ کے مجرم ہو چکے تھے۔ قاتل اور غاصب بن چکے تھے۔ بنگالیوں کی نسل تبدیل کرنے کے فوجی اعلان کے بدترین جرم کے مرتکب ہو چکے تھے۔ بنگالی عورتوں کی عصمت دری کرنے کے ملزم ٹھہرا دیئے گئے تھے۔ اس عالم میں سلامتی کونسل میں فوجی حکمرانوں کی ترجمانی کس طریقے سے ہو سکتی تھی۔ اس عالم میں پاکستان کو ایک رکھنے کی نمائندگی کس طرح کی جا سکتی تھی۔ محوِ حیرت ہوں کہ قاتلوں کی وکالت کس طرح ہو سکتی تھی۔ مشرقی پاکستان کے عوام فوجی حکمرانوں کے جبر سے مغربی پاکستان سے متنفر ہو چکے تھے۔ ان کی مظلومیت نے ہندوستان کی سازش کے پروان چڑھنے میں کھاد کا کام کیا تھا۔ اس وقت ہندوستان کو چھوڑ اگر اسرائیل بھی ان کی مدد کو آ جاتا تو وہ اس کی پناہ کو بھی قبول کر لیتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان نے تمام بین الاقوامی قوانین کو توڑ کر قوموں کی خودمختاری کے اصولوں اور ضابطوں کو پامال کر کے مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں تھیں مگر مشرقی پاکستان کے عوام کو بغاوت پر مجبور کرنے کا جرم کس کا تھا۔ اس کی تمام تر ذمہ داری پاکستان کے فوجی حکمرانوں پر آتی تھی۔ مزہ تو جب تھا کہ یہ فوجی حکمران ہندوستان کی فوج کا مقابلہ کرتے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی مسلح فوج بغیر کسی مقابلے کے شکست تسلیم کر لے۔ مشرقی پاکستان میں جنگوں کی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ تھا کہ بغیر جنگ کیے فوج کے جرنیلوں نے ہتھیار ڈالنے کا فوج کے جوانوں اور افسروں کو حکم دے دیا اور اپنی شکست فاش کو تسلیم کر لیا تھا۔ بلکہ دشمن کی فوج کے قیدی ہو گئے تھے۔ اب جبکہ مشرقی پاکستان پر ہندوستان کی فوج قبضہ کر چکی تھی۔ پاکستان کی فوج کو الٹا جارح قرار دے دیا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے عوام ہندوستان کو اپنا نجات دہندہ قرار دے چکے تھے۔ اس عالم میں چیئرمین بھٹو اقوامِ عالم کے سامنے پاکستان کا کیا موقف پیش کر سکتے تھے۔ ان کے پاس اپنی مظلومیت کا کیا ثبوت تھا۔

فوجی حکمران اقتدار کی سازش میں اس قدر غرق ہو چکے تھے ان کو ہتھیار ڈالنے سے پہلے دنیا

www.bhutto.org

کے حالات کی کچھ خبر نہیں تھی۔ ان کو اس بات کا احساس اور ادراک تک نہیں تھا کہ دنیا میں پاکستان کی تقدیر کے کیا فیصلے ہو رہے ہیں۔ ان کو اتنی بھی خبر نہ تھی کہ ہندوستان کی وزیراعظم اندرا گاندھی امریکہ کس لئے گئی ہے۔ میڈم اندرا گاندھی امریکہ پر واضح کرنے گئی تھی کہ مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجی حکمران فوج کشی کر چکے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں بنگال کے عوام اور منتخب اراکینِ اسمبلی ہندوستان بھاگ بھاگ آ رہے ہیں اور آ چکے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے عوامی بنیادی حقوق کے چارٹر کے مطابق بنگال کے لوگوں کو ظلم اور جبر سے بچانا ہندوستان اپنا فرض خیال کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان ہمارا پڑوسی خطہ ہے۔ ہندوستان انسانی ہمدردی کے قانون کے مطابق مظلوموں کی حمایت کرنے پر مجبور ہے۔ ہم سے اتنی بڑی بے ضمیری نہیں ہو سکتی کہ انسانی زندگی کا خون ہوتے دیکھ کر بھی خاموش رہیں۔

مشرقی پاکستان کے بارے میں اندرا گاندھی اور صدر نکسن کا مکالمہ

امریکہ کا صدر نکسن اور امریکی وزیر خارجہ کسنجر پاکستان کے مقابلے میں اندرا گاندھی کو قطعی طور پر ترجیح دینے کو تیار نہیں تھے، اندرا گاندھی امریکہ کے دنیا میں سب سے بڑے دشمن سوویت روس کی اتحادی تھی۔ امریکہ اندرا گاندھی کے مقابلے میں ہر طریقے سے پاکستان کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ مشرقی پاکستان کو ہندوستان کی جھولی میں گرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ امریکہ کی خواہش تھی کہ مشرقی پاکستان کو ایک علیحدہ اقتصادی اکائی بنا دیا جائے۔ امریکہ کی یہ خواہش شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ پوائنٹ کے قریب تر تھی۔ مگر اس طرح کا سیاسی انتظام تو پُر امن ماحول میں ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ جس کو پاکستان اقتدار پسند فوجی ٹولہ ضائع کر چکا تھا۔ اب جب مشرقی پاکستان آگ اور خون کا جوالا مکھی بن چکا تھا۔ دونوں فریق اپنی انتہاؤں کا شکار ہو چکے تھے۔ اب ایسا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا امریکہ دل میں پاکستان کی حمایت اور امداد کا شدید جذبہ رکھتے ہوئے بھی پاکستان کی کچھ امداد نہیں کر سکتا تھا۔

یہ بات تاریخی اعتبار سے ایک حقیقت ہے کہ صدر نکسن اور کسنجر نے اندرا گاندھی کے سامنے پاکستان کی وکالت کی تھی۔ اندرا گاندھی کو ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ مشرقی پاکستان پر فوج کشی کرنے سے باز رہے۔ اندرا گاندھی ایک جمہوری ملک کی وزیراعظم تھی وہ ہندوستان کو امریکہ کے مقابلے کا بڑا ملک تصور کرتی تھی اور خود کو نکسن کے مقابلے کا ایک جمہوری قائد تصور کرتی

www.bhutto.org

تھی۔اس نے نکسن کے ساتھ برابر کی سطح پر رہ کر بات کی۔وہ امریکہ کے صدر کی شخصیت سے ذرا بھی مرعوب نہ ہو پائی۔اس نے الٹا نکسن کو اور کسنجر کو Embarrs کیا۔مشکل میں ڈال دیا۔اس نے کہا کہ تم لوگ دنیا میں انسانی حقوق کے سب سے بڑے علمبردار بنتے ہو۔خود کو جمہوریت کے چیمپئن کہتے ہو۔یہ تمہاری جمہوریت ہے کہ بے گناہ لوگوں کا قتل عام کیا جارہا ہے اور تم خاموش ہو۔

نکسن اور کسنجر نے پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی وکالت کرتے ہوئے اندرا گاندھی سے کہا کہ پاکستان کے فوجی حکمران کا مطالبہ ہے کہ ان کو ابھی تھوڑے سے وقت کی ضرورت ہے ان کو کچھ مزید مہلت چاہئے وہ اپنے معاملات کو طے پالیں گے۔وہ ایک ایسا آئین بنانے کی کوشش کررہے ہیں جو دونوں جانب کے لوگوں کو قابلِ قبول ہو۔ان کو موقعہ دیا جانا چاہئے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوجائیں۔

نکسن نے جس طرح کہ اپنی کتاب میں تحریر کیا۔نکسن کہتا ہے کہ میں نے اندرا گاندھی کو کہا کہ پاکستان اور ہندوستان کی فوجوں کی آپس میں جنگ سے امنِ عالم کو خطرہ درپیش ہوسکتا ہے۔یہ جنگ بہت بڑی تباہی کا سامان بن سکتی ہے۔اس جنگ سے اس خطے میں کئی قسم کے مسائل پیدا ہوجانے کا خطرہ ہے۔اس طرح نکسن لکھتا ہے کہ اس نے ہر طریقے سے اندرا گاندھی کو ڈرانے اور دھمکانے کی کوشش کی تھی۔مگر اندرا گاندھی پاکستان کے خلاف اس قدر شدید انتقامی جذبہ رکھتی تھی اس پر صدر نکسن کی دھمکی آمیز باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔الٹا اس نے انتہائی بیباکی سے جواب دیا کہ آپ کے نزدیک یہ امن ہوگا۔جب پاکستان کی فوج تمام بنگالیوں کو قتل کردے گی۔

کیا آپ جیسی بڑی قوتیں جنگ سے اس لئے گریز کا کہیں گی کہ اس سے امن کو خطرہ ہو جائے گا۔یا دو ملکوں کے درمیان تصادم سے دنیا کا امن خراب ہوجائے گا۔کیا دنیا کا امن اس وقت خراب نہیں ہورہا جس وقت کہ مشرقی پاکستان میں لاکھوں انسانوں کا خون کردیا گیا ہے لاکھوں انسانوں کو بے گھر کردیا گیا ہے۔ان نہتے لوگوں کے خلاف ایک فوجی حکومت نے اعلانِ جنگ کر رکھا ہے۔ایک مسلح فوج لوگوں کے خون سے ہولی کھیل رہی ہے۔اندرا گاندھی کا یہ تلخ ترین جواب امریکہ پر صاف ظاہر کرتا تھا کہ ہندوستان ہر صورت اور ہر قیمت پر مشرقی پاکستان پر فوج کشی کرے گا۔ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ جیسا طاقت ور ملک اندرا گاندھی کے سامنے بھیگی بلی بن گیا تھا اور وہ پاکستان کی کچھ امداد نہیں کرسکا تھا۔امریکہ ہی کی طرح جمہوریہ سوشلسٹ چین جو پاکستان

کا ایک ہی دوست ملک تھا وہ بھی اس وقت پاکستان کی امداد کرنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا۔ پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے مشرقی پاکستان کا معاملہ ہی اس قدر بگاڑ دیا تھا کہ امریکہ جیسی سپر طاقت بھی پاکستان کے ساتھ کھلی ہمدردی رکھتے ہوئے اور ہندوستان کے ساتھ کھلی مخالفت رکھتے ہوئے بھی پاکستان کی کچھ مدد نہیں کر سکی تھی۔

پاکستان کے فوجی حکمران ٹولے کے اقتدار کی انارکی کے باعث اندرون ملک اور بیرون ملک اس کے اقتدار کا دیوالیہ پٹ چکا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس طرح کی صورت حال میں چیئرمین بھٹو پاکستان کی ترجمانی کرنے کا علم اٹھا کر سلامتی کونسل میں پہنچ گئے تھے۔

چیئرمین بھٹو کے پاس ایک ہی راستہ تھا

چیئرمین بھٹو کے پاس ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کو روکنے کا ایک ہی راستہ تھا وہ راستہ تھا امریکہ کی کوشش سے مشرقی پاکستان پر ہندوستان کو فوج کشی کرنے سے باز رکھنے کا راستہ۔ مگر مشرقی پاکستان کی صورت حال اس قدر گمبھیر ہو چکی تھی کہ امریکہ فوجی طور پر اس میں ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا۔ چیئرمین بھٹو نے اپنے ٹھوس دلائل سے امریکہ کے صدر نکسن اور ہنری کسنجر پر ثابت کیا کہ اس خطے میں پاکستان واحد وہ ملک ہے جو امریکہ کا اتحادی ہے۔ جو سوویت روس کے مقابلے میں امریکہ کے مفادات کا نگہبان ہے اور پہرہ دار ہے۔ چیئرمین بھٹو کا یہ موقف امریکہ کے لئے بڑا جذباتی نوعیت کا تھا۔ انہوں نے کہا اگر پاکستان کو نقصان پہنچ گیا تو یہ نقصان امریکہ کے عالمی مفادات کا نقصان ہوگا۔ چیئرمین بھٹو کے ان دلائل سے امریکہ پاکستان کی مدد کرنے پر صرف اس حد تک آمادہ ہو گیا کہ وہ اپنا ساتواں بحری بیڑہ خلیج بنگال میں روانہ کر دے گا۔ اس نے محض دکھاوے کے طور پر اپنا سوین فلیٹ خلیج بنگال کی طرف روانہ کرنے کا اعلان کر دیا۔

بحری بیڑہ خلیج بنگال میں بیکار کھڑا رہا جس کا جنگ میں پاکستان کو عملی طور پر کچھ بھی فائدہ نہ ہو سکا۔ امریکہ کی اس قسم کی محض اخلاقی امداد حاصل کرنے کے بعد چیئرمین بھٹو نے سلامتی کونسل میں پاکستان کی ترجمانی کا آغاز کر دیا۔ سلامتی کونسل کا یہ اجلاس حکومت پاکستان کی درخواست پر ہنگامی طور پر بلایا گیا تھا۔ چیئرمین بھٹو کے پاس حکومتِ پاکستان کی ترجمانی کے لئے کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زیرک انسان نے جو اپنی ذات میں خارجہ پالیسی کے علم میں اپنا کوئی ثانی

نہیں رکھتا تھا۔ انہوں نے ایک ایسا موقف اختیار کیا جو اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے قانون کی اصل روح کے مطابق تھا۔ وہ قانون یا وہ نظریہ کسی بھی ملک کا کسی دوسرے ملک کے معاملات میں مداخلت نہ کرنے کا نظریہ تھا۔ ہندوستان کا سلامتی کونسل میں انسانی بنیادی حقوق کی پاسداری کی شکل میں پیش کیا گیا موقف اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس معاملے میں اس کے دلائل میں بڑا وزن تھا۔ مگر چیئرمین بھٹو کے اٹھائے گئے نکتے کے مطابق کوئی ملک کسی دوسرے ملک کے معاملات میں کسی طرح بھی مسلح مداخلت کرنے کا حامل نہیں ہوسکتا۔ ان کا یہ موقف سورن سنگھ کے موقف سے زیادہ باوزن تھا اور اقوامِ متحدہ کے آئین کے مطابق تھا۔ ہندوستان کا موقف تھا کہ پاکستان کی فوج نے وہاں قتل عام جاری کر رکھا ہے۔ ہندوستان کے وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کی تقریر کا مرکزی موقف ہی یہی تھا جو تقریر اس نے چیئرمین بھٹو سے پہلے سلامتی کونسل میں کی تھی کہ پاکستانی فوج بنگالیوں کا قتل عام کر رہی ہے۔ چیئرمین بھٹو کا پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ میں خارجہ پالیسی کے مسئلے پر ہمیشہ سورن سنگھ کے ساتھ ہی مقابلہ رہا تھا۔ جس مقابلے میں سورن سنگھ کبھی بھی چیئرمین بھٹو پر سفارت کاری میں سبقت حاصل نہیں کر سکا تھا۔

ہر چند اس موقعہ پر وقت اور حالات کی روشنی میں سورن سنگھ کا پلہ بہت بھاری تھا۔ اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ چیئرمین بھٹو نے اپنی تقریر میں ایک ایسا حقیقت افروز انداز اختیار کیا جو لوگوں کے دل و دماغ پر اثر کرنے والا انداز تھا۔

انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز ہی اس اعتراف سے کیا۔

کہا ہاں ہم سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ انسان غلطیوں سے مبرا نہیں ہوتے۔ انسانوں کے ہر عہد میں غلطیاں کی جاتی رہی ہیں۔ رومن امپائر نے غلطیاں کی تھیں۔ برطانوی امپائر سے بھی غلطیاں ہوئی تھیں۔ دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم سے غلطیاں ہوئی ہیں۔

لیکن کبھی کسی ملک کی غلطی سے کسی ملک کو صفحۂ ہستی سے مٹایا نہیں گیا۔ ہم بھی اپنی غلطیوں کا ازالہ نہایت مہذب انداز سے کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ افہام و تفہیم کے ساتھ معاملہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہندوستان اپنی طاقت سے پاکستان کو برباد کر دے گا تو ہم پاکستان کی خاک سے ایک نیا پاکستان تعمیر کریں گے۔

آج بدنصیبی سے ہم پاکستانی آپس میں دست و گریبان ہو گئے ہیں اور ہندوستان ہم کو

ہڑپ کر جانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ بنگلہ دیش ہندوستان کی حکومت کی توسیع پسندی کے ذہن کی پیداوار ہے۔ وگرنہ اس کی دوسری کوئی حقیقت نہیں ہے۔ انہوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ آج سوویت یونین کھلے بندوں ہندوستان کے ساتھ مل کر پاکستان کو دو ٹکڑے کرنا چاہتی ہے۔

سلامتی کونسل کے اجلاس میں دوسرے دن ہندوستان کے وزیر خارجہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ بنگلہ دیش کا مسئلہ صرف اس صورت میں سلامتی کونسل میں طے پا سکتا ہے کہ بنگلہ دیش کا ایک نمائندہ یہاں سلامتی کونسل میں بلایا جائے اور اس کو اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔

سورن سنگھ کے اس مطالبے پر چیئرمین بھٹو نے جواب دیا کہ کیا سلامتی کونسل اس بات کی اجازت دینا چاہتی ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک کا کوئی ناراض گروہ یا علاقائی گروہ یا کسی صوبے کے چند لوگ سلامتی کونسل میں بطور نمائندے سلامتی کونسل میں شرکت کے لئے بلائے جائیں۔ اس طریقے سے تو دنیا کے کسی بھی ملک کی خودمختاری قائم نہیں رہے گی۔

سورن سنگھ کے مطالبے کی طرح ہم بھی ہندوستان کے کسی صوبے کے کسی ناراض گروہ یا لیڈر کو سلامتی کونسل میں شرکت کرنے کی درخواست کر سکتے ہیں۔ ہم بھی کشمیر کے مسئلے پر سلامتی کونسل میں کشمیریوں کی نمائندگی کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

چیئرمین بھٹو نے کہا کہ میکسیکو امریکہ پر قبضہ کر سکتا ہے۔ ڈنمارک جرمنی پر قبضہ کر سکتا ہے۔ فن لینڈ روس پر قبضہ کر سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان پاکستان پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ ہم اپنی آزادی کے لئے آخری آدمی تک لڑیں گے۔ میں درخواست کرتا ہوں۔ جنگ بندی کو ہندوستان قبول کرے۔ مشرقی پاکستان سے اپنی فوجیں باہر نکالے۔ ہم پاکستان کی فوجوں کو وہاں سے واپس مغربی پاکستان لے جانے کے لئے تیار ہیں اور ہم بنگالیوں کے ساتھ جو ہمارے بھائی ہیں پُرامن طریقے سے انتقالِ اقتدار کا مرحلہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس کا موقعہ دیا جائے۔ جو غلطی ہماری جانب سے ہو چکی ہے اب مزید اس غلطی کو دہرایا نہیں جائے گا۔

انہوں نے سلامتی کونسل کے چیئرمین سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ مسٹر سورن سنگھ کو عزت مآب وزیر خارجہ کہتے ہیں۔ کس طرح ایک قاتل عزت مآب ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ ہمارے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔ جس کا دل انتقام کی آگ سے بھرا پڑا ہے۔ میں یہاں پرانی تاریخ کی کلاسیکل مثال پیش کروں گا۔ قدیم روما کے کیٹو (Cato) نے بھی یہی کہا تھا کہ کارتھیج کو ہر

صورت میں تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔

آج ہندوستان بھی (Cato) کی ہی طرح پاکستان کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ نہ تو کارتھیج کی قوم شکست کھا کر دنیا کے نقشے سے مٹ سکی نہ پاکستانی قوم کسی ناکامی سے فنا ہو گی۔ ہم اپنی خاک سے نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ ایسی سلامتی کونسل جو اقوامِ عالم کو تحفظ فراہم نہ کر سکے۔ جو ہندوستان کی افواج کو سلامتی کونسل کے چارٹر کی خلاف ورزی کرنے پر ملزم نہ ٹھہرا سکے۔ جو ایک جارح کا ہاتھ نہ روک سکے۔ جو ہندوستان کو اپنے قوانین کا پابند نہ بنا سکے۔ میں ایسی سلامتی کونسل سے احتجاجاً واک آوٹ کرتا ہوں۔

پولینڈ کی قرارداد کا معاملہ

پولینڈ کی قرارداد کا معاملہ بھی بالکل فوجی حکمرانوں کی پراپیگنڈہ کرنے والی ایجنسیوں کا ویسا ہی معاملہ تھا جو ان ایجنسیوں نے چیئرمین بھٹو کے خلاف ٹانگیں توڑنے، اُدھر تم اِدھر ہم کے عنوانات سے مشہور کیا تھا یا خدا کا شکر ہے پاکستان بچ گیا کی تشہیر کر کے پاکستان ٹوٹنے کی تمام تر ذمہ داری فوجی جرنیلوں کے سر سے اتار کر چیئرمین بھٹو کی ذات پر ڈالنے کی سازش کی تھی۔ پولینڈ کی قرارداد وہی قرارداد تھی جو گورنر ڈھاکہ نے 10۔ ستمبر 1971ء کو پاکستان کے فوجی ہیڈ کوارٹر اسلام آباد کے مشورے کے مطابق تمام جرنیلوں کی متفقہ رائے سے اقوامِ متحدہ کی مرکزی کونسل کو ارسال کی تھی۔ جس میں کہا گیا تھا:

1۔ فوجی جنگ بندی کا انتظام کیا جائے۔

2۔ افواجِ پاکستان کو باعزت طور پر مغربی پاکستان واپس جانے کا موقعہ دیا جائے۔

3۔ پُرامن انتقالِ اقتدار کا بندوبست کیا جائے۔

یہی تین بڑی شرائط پولینڈ کی قرارداد میں شامل تھیں۔ جس کو چیئرمین بھٹو اپنی تقریر میں سلامتی کونسل میں پیش کر چکے تھے۔ پولینڈ کی قرارداد کی اس صورت میں کیا حقیقت رہ گئی تھی جب 15۔ ستمبر 1971ء کو جنرل نیازی نے جنرل مانک شاہ کو غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ جس میں افواجِ پاکستان کے اس وقت کے سربراہ جنرل حمید کا ہتھیار ڈالنے کے حکم کو تسلیم کرنے کا حکم شامل تھا۔

پولینڈ کی قرارداد کے بارے میں واضح رہے کہ قرارداد سلامتی کونسل کو پولینڈ نے پیش کی تھی جو سلامتی کونسل کے ایجنڈے پر آ چکی تھی۔ اس قرارداد کا براہِ راست بھٹو صاحب کی ذات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر اس قرارداد سے پہلے جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کی بات سلامتی کونسل میں پہنچ چکی تھی۔ افواجِ پاکستان کے جرنیلوں کا غیر مشروط ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ تو پولینڈ کی قرارداد اور گورنر مشرقی پاکستان کی قرارداد سے کہیں زیادہ شرمناک تھا۔ چیئرمین بھٹو سلامتی کونسل میں جب اپنی تقریر کے ذریعے اقوامِ عالم میں مدد حاصل کرنے کا منت ماجرہ کر رہے تھے۔ عین اس وقت جب ان کو اس بات کا علم ہوگیا کہ فوجی جرنیلوں نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ تسلیم کر لیا ہے تو انہوں نے اپنی تقریر کا مسودہ پھاڑ کر میز پر پھینک دیا اور وہ سلامتی کونسل سے احتجاج کرنے کے انداز میں واک کر کے باہر آ گئے۔ کوئی سوچے کہ اس کے علاوہ وہ کیا کر سکتے تھے۔

ان حقائق کی روشنی میں جب پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے جرنیلوں نے ہندوستان کی فوج اور مکتی باہنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو سلامتی کونسل میں بنگلہ دیش کے عوام کا اور ہندوستان کا موقف ایک طریقے سے درست ثابت ہو گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے استبداد سے نجات چاہتے تھے جو نجات انہوں نے اپنی بے شمار جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کر لی۔ گویا مشرقی پاکستان کے لوگوں کی یہ جدوجہد، جدوجہد آزادی تھی بغاوت نہیں تھی۔ اس صورت میں چیئرمین بھٹو کیا کر سکتے تھے۔ افسوس کہ اس شخص کے ساتھ کبھی انصاف کیا ہی نہیں گیا نہ تو ان کے ساتھ اقتدار میں آنے سے پہلے انصاف کیا گیا نہ ہی اقتدار میں آنے کے بعد ان کے ساتھ انصاف کیا گیا۔ نہ تو زندگی میں ان کے ساتھ انصاف اور نہ ہی موت کے بعد ان کے ساتھ انصاف کیا گیا۔

15- ستمبر کو مانک شاہ اور ٹائیگر نیازی کے درمیان ہتھیار ڈالنے کا معاہدہ تحریر پا گیا اور 16- ستمبر کو اس ٹائیگر نیازی نے بکری بن کر جنرل اروڑا کے قدموں میں اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور سقوطِ ڈھاکہ ہو گیا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں تبدیل ہو گیا۔ بقول شاعر اسلم گورداسپوری،

اپنے لہو سے ہاتھ بھرے ہم نے کیا کیا
یوں بے دلی کی موت مرے ہم نے کیا کیا

شکست خوردہ لوگ بڑے خطرناک بن جایا کرتے ہیں۔ تاریخِ عالم کو پڑھنے سے ہم کو

بے شمار ایسے واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں جن میں شکست خوردہ جرنیل جنگ میں اپنی شکست کی خفت کو مٹانے کے لئے اپنے ہی لوگوں کو تہہ تیغ کر ڈالتے ہیں۔ وہ اپنی شکست کو کسی دوسرے کی گردن میں ڈالتے دکھائی دیتے ہیں۔ قدیم روما کے جرنیلوں کے ایسے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ 1971ء کی شکست کے بعد بھی جنرل یحییٰ خان نے اور اس کے ساتھی جرنیلوں نے رومن جرنیلوں کی طرح کا ہی کردار ادا کیا تھا۔

وہ ایک طرف تو اپنے شکست خوردہ اور شکست زدہ اقتدار کا طوق چیئرمین بھٹو کی گردن میں ڈال کر اپنی جان بچانے کی سازش کر رہے تھے دوسری طرف ان کی خفیہ ایجنسیاں پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے کی تمام ذمہ داری بھٹو پر ڈال رہی تھیں۔ یہ دونوں کام پاکستان میں بہ یک وقت دیکھنے میں آ رہے تھے۔

فوجی شکست کے بعد خفیہ ایجنسیوں کا پراپیگنڈہ

پاکستان کی سب سے بڑی طاقت ور خفیہ ایجنسی آئی۔ایس۔آئی کا قیام پاکستان کے وجود میں آنے کے فوراً بعد عمل میں آ گیا تھا۔ یوں تو پاکستان کی بے شمار انٹیلی جنس کی ایجنسیاں اور تنظیمیں ہیں۔ مگر آئی۔ایس۔آئی کا کام اس کے آغازِ پیدائش سے ہی پاکستان میں حکومتیں بنانا اور حکومتیں توڑنا تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ تک 25 سال پاکستان کی یہ انتہائی زور آور اور زبردست طاقت کی حامل ایجنسی پاکستان میں کئی حکومتیں توڑ چکی تھی اور بنا چکی تھی۔ مشرقی پاکستان اسی خفیہ ایجنسی کا بہت مرکزی اکھاڑا تھا۔ مشرقی پاکستان میں اصل اقتدار آئی۔ایس۔آئی کے پاس ہی تھا۔ پاکستان میں تمام نشر و اشاعت کے ادارے ان خفیہ ایجنسیوں کے ہی اشارے پر کام کرتے تھے۔ ان ایجنسیوں کو اپنے 25 سالہ کرتوتوں کا علم تھا جو کہ ملک میں اور بالخصوص مشرقی پاکستان میں کرتی چلی آ رہی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں فوجی اپریشن سے بھی پہلے یہ ایجنسیاں شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ گفت و شنید میں مصروف ہو چکی تھی۔ اندر کھاتے ان کا کردار کچھ اور تھا باہر ان کا کردار دوسرا ہوتا تھا۔ ان ایجنسیوں نے شیخ مجیب الرحمٰن پر دباؤ ڈالنے کے لئے چیئرمین بھٹو کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔ یہ ''اُدھر تم اِدھر ہم'' والی بات ان ایجنسیوں کی اسی پالیسی کا حصہ تھی۔ یہ تمام ایجنسیاں فوج کے اشاروں پر چلتی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں جب جرنیلوں نے بھارتی فوج کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تو اپنی اس شرمناک شکست کو چھپانے

www.bhutto.org

کے لیۓ ان ایجنسیوں نے چیئر مین بھٹو کے خلاف کھلا پراپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ پاکستان بھٹو نے دو ٹکڑے کیا ہے۔ اس سلسلے میں آئی۔ جی راؤ رشید مرحوم نے اپنی کتاب ''جو میں نے دیکھا'' کے صفحہ نمبر 73 پر بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر کیا تھا کہ بھٹو کسی طریقے سے بھی سقوطِ ڈھاکہ میں ملوث نہیں تھے۔ واضح رہے کہ راؤ رشید اس وقت پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنس تھے۔ جو الزامات وزیر اعظم بھٹو پر لگائے گئے تھے وہ فوج کی خفیہ ایجنسیوں کی اس پالیسی کا حصہ تھے جس کے بارے میں خود جنرل یحییٰ خان کے بھائی آغا محمد علی اور این۔ اے رضوی جو ان دنوں ڈائریکٹر جنرل آئی۔ بی رہے تھے حمود الرحمٰن کمیشن کے سامنے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کا مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اس کی تمام ذمہ داری فوجی جرنیلوں کی تھی۔ حمود الرحمٰن کمیشن میں آئی۔ ایس۔ آئی کے چیف کا بیان تھا کہ شکست کی کوئی وجہ تو بنانی پڑتی ہے یا ہوتی ہے۔ کسی ایک کو تو ذمہ دار ٹھہرانا ہوتا ہے۔ ڈھاکہ کی شکست کو اگر افواجِ پاکستان کی شکست تسلیم کر لیا جاتا تو افواجِ پاکستان کا وقار مٹی میں مل جاتا تھا۔ ہم کو افواجِ پاکستان کے ادارے کو بچانا تھا۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کی فوج کو یہ گھمنڈ ہو کہ افواجِ پاکستان نے اس کی فوجی طاقت کے سامنے ہتھیار ڈالے ہیں۔ ہم نے اس شکست کا یہ راستہ نکالا تھا کہ ہم کو پاکستان کے دو سیاست دانوں کی وجہ سے شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ گویا ہماری یہ شکست فوجی شکست نہیں تھی سیاسی شکست تھی جو شیخ مجیب الرحمٰن اور بھٹو کی وجہ سے ہوئی تھی۔ افسوس کہ حمود الرحمٰن کمیشن میں انٹیلی جنس بیورو کے افسروں اور آئی۔ ایس۔ آئی کے چیف کے اعتراف کے باوجود وزیر اعظم بھٹو نے فوج کی استدعا پر حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کو ملک میں شائع نہیں کیا تھا، اور ساری بدنامی اپنے گلے میں ڈال لی تھی۔ یہ خودکشی کی حد تک محب وطنی تھی۔

جماعت اسلامی نے شراب کی دوکانیں توڑنا شروع کر دیں

راؤ رشید مرحوم جو اس وقت خود ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنس تھے اور پشاور میں متعین تھے ان کا گھر جنرل یحییٰ خان کے گھر کے قریب تھا۔ اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 71 پر تحریر کرتے ہیں کہ ڈی۔ جی۔ انٹیلی جنس آغا محمد علی جو جنرل یحییٰ خان کے بھائی تھے ان کے دفتر سے ڈپٹی ڈائریکٹر کا مجھے فون آیا اور مجھ سے پوچھا کہ پشاور میں لوگوں کے جلوس والی کیا بات ہے۔ میں نے کہا کہ جلوس نکلے گا۔ لوگ یحییٰ خان کے بنگلے کو جلانا چاہتے ہیں۔ لوگ بڑے غصے میں ہیں اگر ان کو روکا گیا تو بڑا خون خرابہ ہوگا۔ گولی

چلائی گئی تو لوگ مریں گے۔ بعد میں یہ آگ سارے ملک میں پھیل جائے گی۔

جماعت اسلامی نے جنرل یحییٰ خان کی مدد کر دی

وہ اپنی اطلاعات کے مطابق تحریر کرتے ہیں کہ ایک سیاسی پارٹی کا ذکر کرتا ہوں جلوس نکلا تو اس میں بہت غم و غصہ تھا۔ مگر پولیس کو یحییٰ خان کے مکان کو بچانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ جماعت اسلامی نے خفیہ ایجنسیوں کے اشاروں پر جلوس کا رخ شراب کی دوکانوں کی طرف موڑ دیا۔ جماعت اسلامی والوں نے کہا یحییٰ خان کا قصور نہیں۔ شراب کا قصور ہے چنانچہ لوگوں نے شراب کی ساری دکانیں ایک ایک کر کے توڑ دیں۔ لوگ شراب پیتے بھی تھے اور بوتلیں توڑتے بھی تھے یہاں تک کہ کتے بھی مدہوش ہو گئے۔

افسوس کہ ایک جرنیل بھی غیرت سے خودکشی نہ کر سکا

دنیا کی تاریخ میں جنگوں میں افواج کو شکستوں کا ہمیشہ سامنا رہا ہے مگر وہ شکستیں کسی فوج کے مکمل طور پر تہہ تیغ ہونے کے بعد واقع ہوتی ملتی ہیں۔ فوجیں یا لشکری میدانِ جنگ میں اس وقت ہتھیار ڈالتے ہیں جب ان کی کمان کرنے والے دشمن کی فوج کے ہاتھوں مارے جا چکے ہوتے ہیں۔ جب کسی فوج کے پاس نہ تو چیف آف کمان باقی رہتا ہے اور نہ ہی اس کے پاس گولہ بارود باقی رہتا ہے۔ اس عالم میں کسی بھی فوج کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ مگر ہماری فوج کی چیف آف کمان مغربی پاکستان سے لے کر مشرقی پاکستان تک قائم تھی۔ تمام جرنیل زندہ تھے۔ تمام جنگی ساز و سامان موجود تھا اور ہمارے جرنیلوں نے ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا۔ ہمارا ہتھیار ڈالنے والا جرنیل اے۔ کے۔ نیازی اس قدر بے غیرت اور بے حیا انسان تھا۔ جنرل اروڑا کے سامنے اپنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اس کو انتہائی مسخرے کے انداز میں پوچھتا ہے۔

ہیلو! جنرل (How I Fought) میں نے کیسا مقابلہ کیا ہے۔ گویا وہ اپنی ذلت کی پسپائی کی بھی داد مانگ رہا تھا۔ جنرل اروڑ نے اس ننگِ قوم نیازی کے ہاتھ سے بڑی فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا پستول لے کر اس کے کندھوں کے لگے ہوئے پاک فوج کے چاند تاروں کو ردی کے کاغذوں کی طرح نوچ کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔

تاریخِ عالم میں مرقوم ہے کہ جب جرمنی کے آمر ہٹلر کو شکست ہوئی تو ہٹلر سمیت بے شمار

جرنیلوں نے شرم سے خودکشی کرلی تھی۔ افسوس کہ ہماری فوج میں ایک بھی ایسا غیرت مند جرنیل نہیں تھا جو اپنی اس شرمناک شکست پر ہتھیار ڈالنے کے بجائے خودکشی کرلیتا۔ خود کو گولی مار لیتا۔

فوجی جنرل اے۔ کے۔ نیازی ڈھاکہ میں ہندوستانی جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کرتے ہوئے

www.bhutto.org

ملک غلام مصطفیٰ کھر کا فوجی جرنیلوں کے ساتھ رابطہ اور چیئرمین بھٹو کے اقتدار میں آنے کی کہانی

میں نے پیچھے بھی ایک جگہ تحریر کیا تھا کہ چیئرمین بھٹو کی طرف سے ملک غلام مصطفیٰ کھر کا ہی فوج کے ساتھ رابطہ رہتا تھا۔ میرے ماموں میجر محمد افضل خان مجھے اکثر کہا کرتے تھے کہ بھٹو صاحب کا کھر صاحب پر اس قدر اعتماد کس لئے ہے۔ میں ان کو کہا کرتا تھا کھر صاحب بھٹو صاحب کے وفادار دوست، ساتھی اور پیروکار ہیں۔ چیئرمین بھٹو کو جب اقوامِ متحدہ میں پاکستان کا ڈپٹی وزیراعظم بنا کر بھیجا گیا تھا ان کے ملک سے باہر جانے کے بعد فوج کے ساتھ تمام تر رابطہ کھر صاحب کا ہی تھا۔ فوجی جرنیلوں کا کھر صاحب کے ساتھ بہت اعتماد بحال ہو چکا تھا۔ جرنیلوں کے ساتھ ایک طرح کی ان کی دوستی کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جنرل یحییٰ خان اور اس کے تمام ساتھی فوجی جرنیل پاکستان کے دو ٹکڑے کرنے کے مجرم بن گئے تھے۔ مغربی پاکستان کے عوام کے دل و دماغ پر شکست کی سیاہ رات چھا چکی تھی۔ پاکستان کی 93 ہزار افواج کے افسروں اور جوانوں کے ہندوستان کے جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے واقعے سے پوری قوم کی گردن شرم کے مارے جھک گئی تھی۔ پاکستان کے ٹوٹنے کا صدمہ اور فوج کی شکست کی ہزیمت سے پوری قوم بوکھلا اٹھی تھی۔ فوجی حکمرانوں کا سیاہ کردار کھل کر قوم کے سامنے آ چکا تھا۔ لوگ فوج سے نفرت کرنے لگ گئے تھے۔ لوگوں کے ذہنوں میں اس قدر غصہ تھا کہ وہ فوجی حکمرانوں کے گھر جلا دینا چاہتے تھے۔ جنرل یحییٰ خان اور اس کے تمام ساتھی جنرلوں سے اپنی شکست کا انتقام لینا چاہتے تھے۔

لوگوں کے غیظ و غضب کا حکومتی ایجنسیوں کو اندازہ ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے مغربی پاکستان کے تمام شہروں سے فوج کو باہر نکال لیا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کا سانحہ کچھ کم سانحہ نہیں تھا۔ یہ صرف مغربی اور مشرقی دو علاقوں کے علیحدہ ہونے کی بات نہیں تھی۔ یہ علیحدگی ہماری ریاست پاکستان کے نظریاتی سوادِ اعظم کی موت تھی۔ یہ اس نظریے کی موت تھی جس نظریے کے بل پر پاکستان کے وجود میں آنے کی فلاسفی قائم کی گئی تھی۔ جس کو دو قومی نظریہ کہا

www.bhutto.org

گیا تھا یا کہا جاتا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں تھیں جن کا ایک ساتھ رہنا مذہبی اور سماجی اعتبار سے ناممکن تھا۔

مگر اب جب ایک پاکستان اور ایک قوم ہوتے ہوئے پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ مشرقی پاکستان کے مسلمان مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے علیحدہ ہو گئے تو دو قومی نظریے کا دیوالیہ پٹ گیا۔ وقت اور حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ انسانوں کے سیاسی اور معاشی حالات ہی ہوتے ہیں جو انسانوں کو اکٹھا رکھتے ہیں۔ اگر انسانوں کو ان کے سیاسی اور معاشی حقوق سے محروم کر دیا جائے تو مذہب ان کو اکٹھا نہیں رکھ سکتا۔ قوموں کو انصاف اور عدل اکٹھا رکھتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندو اپنی اکثریت کے بل پر مسلمانوں کا استحصال کرتے تھے جس کی وجہ سے ہندوستان تقسیم ہو گیا تھا اور پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اب مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے اقتدار کے مستقل استحصال نے پاکستان تقسیم کر دیا اور بنگلہ دیش وجود میں آ گیا تھا۔

یہ مسئلہ انسانی زندگی کی سوشیالوجی کا عمرانی مسئلہ ہے جس کو فوجی حکمران اور مغربی پاکستان کے جاگیردار اور ان کے حواری مذہبی پنڈت سمجھنے سے قاصر تھے۔ ایک بھائی اگر دوسرے بھائی کے ساتھ معاشی انصاف نہیں کرتا تو بھائی بھائی سے علیحدہ ہو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی صرف اور صرف پاکستان میں فوجی راج کا نتیجہ تھی۔ ایک مسلسل سیاسی ناانصافی کا نتیجہ تھی۔ اس کے سوا کچھ نہ تھی۔

ہندوستان کی افواج کے مشرقی پاکستان میں داخل ہونے کی وجہ وہ بنیادی ناانصافی اور مسلسل محکومی کا خلا تھی جو فوجی حکمرانوں کے اور مشرقی پاکستان کے لوگوں کے درمیان پیدا ہو چکا تھا۔ جس خلا کو ہندوستان کی فوجوں نے مشرقی پاکستان میں داخل ہو کر پورا کر دیا تھا، اور یہی خلا آجکل موجودہ پاکستان میں بھی کئی ایک حوالوں سے ملک کے اندر دیکھنے میں آ رہا ہے۔

پاکستان کے فوجی حکمران اپنی شکست کو اور ملک توڑنے کے جرم کو کسی دوسرے پر ڈال کر اپنی جان بچانا چاہتے تھے۔ مغربی پاکستان بدستور ان کے قبضہ اختیار میں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ پاکستان کی بہادر فوج کے جوان ملک کی آن اور عزت پر قربان نہیں ہونا چاہتے تھے۔ مگر ان کے

www.bhutto.org

ساتھ بدنصیبی یہ ہوئی کہ وہ اپنی بزدل قیادت کی سازش کا شکار بنا دیئے گئے تھے۔ مغربی پاکستان میں فوج کے جوانوں کا غیرت سے خون کھول رہا تھا۔ وہ اس شکست کے ذمہ دار فوجی جرنیلوں کا خون کر دینا چاہتے تھے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد پاکستانی افواج کے چیف آف سٹاف جنرل حمید خان جوانوں کے اس غم و غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے نیشنل ڈیفنس کالج راولپنڈی میں ان سے خطاب کرنے گئے۔ وہ ان پر ثابت یہ کرنا چاہتے تھے کہ پاکستان کو سیاست دانوں نے دو ٹکڑے کر دیا ہے۔ ان فوجی جوانوں میں سے ایک نے سوال کیا کہ کیا فوج کو ہتھیار ڈالنے کا حکم بھی سیاست دانوں نے دیا تھا۔

فوج کے اندر بغاوت کے آثار

جنرل حمید خان جوانوں کے اس سوال پر لاجواب ہو گئے۔ فوجی جوانوں نے ان کے سامنے جنرل یحییٰ خان کو شرابی اور زانی کہا۔ باقی جرنیلوں کو جو اس کے ساتھی تھے ان کو گالیاں دیں اور یحییٰ خان اور اس کے ساتھی جرنیلوں کو پھانسی دینے کا مطالبہ کیا۔ جنرل حمید خان بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑا کر وہاں سے واپس صدر ہاؤس آیا اور اس صورت حال کے بارے میں اپنے ساتھی جرنیلوں کو آگاہ کیا۔ اس نے اپنے ساتھی مجرم جرنیلوں کو کہا کہ فوج کے اندر بغاوت پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ ہم لوگ فوجی جوانوں اور پاکستان کے عوام کے غیظ و غضب سے ایک صورت میں بچ سکتے ہیں کہ اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کو دے دیا جائے۔ تاکہ لوگوں کی توجہ ہم سے ہٹ کر دوسری جانب تبدیل کر دی جائے۔

لہٰذا اس طریقے سے پاکستان دو ٹکڑے کرنے کا فوجی حکمران ٹولا فوج کے اندر اور باہر دونوں طرح خطرے میں گھر چکا تھا۔ فوج کے اندر فوجی جوان ان کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے اور باہر پاکستان کے عوام ان لوگوں سے پاکستان توڑنے کا حساب مانگ رہے تھے۔ یہ تاریخی غلطی تھی جو پاکستان کی قوم سے ہوئی تھی کہ وہ ملک توڑنے کے ذمہ دار مجرموں کو سزا نہیں دے سکے تھے۔ اگر اس وقت ان تمام مجرموں کو ان کے جرم کی سزا دے دی جاتی تو پاکستان ہمیشہ کے لئے فوج کے غیر آئینی راج پاٹھ سے آزاد ہو جاتا۔

چیئرمین بھٹو نے پاکستان توڑنے والوں کی جان بخشی کرادی

افسوس کہ چیئرمین بھٹو نے پاکستان کو دوٹکڑے کرنے والوں کی قوم سے جان بخشی کرا دی۔ یہ بہت بڑا گناہ تھا جو چیئرمین بھٹو سے سرزد ہوا تھا۔ میں نے اپنی بات کا آغاز ملک غلام مصطفیٰ کھر کے فوج کے ساتھ رابطے سے کیا تھا۔ فوجی حکمرانوں کے پاس چیئرمین بھٹو کو اپنے لئے ڈھال بنانے کا بے حد مضبوط ذریعہ مصطفیٰ کھر تھے وہ ہر طرح سے فوجی جرنیلوں کے حلقہء اثر میں تھے۔ فوجی جرنیلوں نے اپنی جان چھڑانے کے لئے چیئرمین بھٹو کو باقی ماندہ ٹوٹے پھوٹے پاکستان کا اقتدار دینے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے اس فیصلے سے ملک مصطفیٰ کھر کو آگاہ کیا۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر اس وقت ایک نوجوان آدمی تھے۔ وہ نہ تو کوئی دانش ور تھے کہ ملک و قوم کو درپیش حالات کی نوعیت کو سمجھ سکتے اور نہ ہی وہ اتنے بڑے سیاست دان تھے کہ سیاست کے اس وقت کے نشیب و فراز کا ادراک کر سکتے۔ وہ حکومت برائے حکومت اور اقتدار برائے اقتدار کی حد تک ہی سوچ سمجھ سکتے تھے۔ ان کے لئے یہی ایک بہت بڑا انقلاب تھا کہ فوجی حکمران اقتدار بھٹو کو دینے کے لئے تیار ہیں۔ وہ اس ایک بات کو ہی اپنی سب سے بڑی فتح تصور کرتے ہوں گے۔

لہٰذا ملک غلام مصطفیٰ کھر نے چیئرمین بھٹو کو اپنی فتح کی خبر سنا کر ان کو فوراً واپس پاکستان آنے کا کہا۔ ان کو کہا کہ معاملہ ہر طرح سے صاف ہو چکا ہے۔ بس آپ کی آمد کی دیر ہے۔ پاکستان کا اقتدار آپ کی راہ دیکھ رہا ہے۔ فوجی جرنیل چیئرمین بھٹو کی کرشمہ ساز شخصیت سے واقف تھے وہ جانتے تھے کہ اس وقت باقی ماندہ پاکستان کو اور خود ان کی ذات کو اور کوئی دوسرا انسان بچا نہیں سکتا۔ چیئرمین بھٹو کو فوجی ٹولا خوشی سے اقتدار نہیں سونپ رہا تھا۔ اس انتقالِ اقتدار میں ان کی کسی جمہوریت پسندی اور آئین نوازی کا کچھ دخل نہیں تھا۔ اقتدار کے جوئے کو کسی دوسرے کے گلے میں ڈالنا اس پھانسی کے پھندے کو کسی دوسرے کی گردن میں ڈالنا ان کی مجبوری بن گیا تھا۔ یہ شکست خوردہ فوجی جنتا بربادی اور تباہی کے جس مقام پر پہنچ چکا تھا اس کے آگے ان کے اقتدار کے قائم رہنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ فوجی جنتا ایک سیاست دان کو اس وقت اقتدار دینے پر مجبور ہوا جب ملک کے دوٹکڑے ہو گئے تھے اور یہاں پر اس بات کو بھی

www.bhutto.org

یاد رکھا جائے کہ یہ اقتدار بھی اس نے صرف وقت ٹپانے کے لئے دیا تھا۔ وقتی طور پر دیا تھا۔ پاکستان کے عوام کی نفرت کی آگ سے ان کے پاؤں جلنے لگے تھے کہ اس ٹولے نے پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنے پاؤں کے نیچے لے لیا تھا۔ اس وقت یہ فوجی ٹولا نہ صرف اپنی قوم کا مجرم تھا بلکہ یہ بین الاقوامی برادری کی نفرت کا بھی شکار تھا پوری دنیا ان کو مجرم قرار دے چکی تھی پوری دنیا اس فوجی ٹولے کو جنگی مجرم قرار دے کر بین الاقوامی قانون کے مطابق سزا دینا چاہتی تھی۔ پاکستان کا یہ فوجی ٹولا مشرقی پاکستان کے لوگوں کا بھی مجرم تھا اور بین الاقوامی قانون کا بھی مجرم تھا۔ یہ ٹولا اپنے جرائم کی روشنی میں کسی صورت بچ نہیں سکتا تھا۔ افسوس کہ چیئرمین بھٹو ان قاتلوں کا مسیحا بن گئے۔

افسوس کہ چیئرمین بھٹو ان قاتلوں کا مسیحا بن گئے

چیئرمین بھٹو وطن پرست ہی بہت زیادہ تھے۔ ان کو پاکستان کے ٹوٹنے کا صدمہ ہی بہت زیادہ ہوا تھا۔ ان کو سقوطِ ڈھاکہ پر بہت زیادہ شاق گذرا تھا۔ ان کو اپنے اس پاکستان کے فوجی جنتا کی عاقبت نااندیشی کے اس کردار پر تو بہت رنج تھا مگر مشرقی پاکستان میں ہندوستان کی فوجی مداخلت کو وہ اپنی غیرت کے خلاف تصور کرتے تھے۔ ہندوستان کی علاقے کی غنڈہ گردی اور چوہدراہٹ کی کارروائی کے وہ بہت خلاف تھے۔ وہ ہندوستان کی اس حرکت کو کسی قیمت پر معاف نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستان کی برتری کو قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مشرقی پاکستان پر ہندوستان کا قبضہ اس کی فوجوں کا تسلط ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ چیئرمین بھٹو اپنی فوج کے جرنیلوں کی غلطیوں اور ان کے مظالم کو درگذر کرنے کو تیار تھے مگر وہ ہندوستان کے سامنے اپنا سر جھکانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہندوستان کے اس بین الاقوامی جرم کو کسی قیمت پر معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ یہ ردِعمل ان کا فطری ردِعمل تھا۔ اس میں کسی سیاست وغیرہ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ یہ ردِعمل اس شہید کی ضمیر کی آواز تھا۔ اس دھرتی کے سپوت کا جذبہ تھا۔ ایک طوفان تھا اس کی قوم سے محبت کا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے چھوٹے دشمن پاکستان کے فوجی جنتا سے لڑنے کی بجائے ملک کے بڑے دشمن ہندوستان کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آپ ذرا اس وقت کا اندرا گاندھی کا بیان تو ملاحظہ کریں۔

www.bhutto.org

سقوط ڈھاکہ ہمارا ایک ہزار سال کی اذیت کا انتقام ہے۔ بہت جلد ہماری قوم کچھ اور بھی خوش خبریاں سنے گی۔

یہ وہ صورت حال تھی جس صورت حال میں چیئر مین بھٹو باقی ماندہ پاکستان کو بچانے کے لئے اقتدار لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ان کے خیال میں تھا کہ اگر وہ قوم کے مطالبے کے مطابق یا قوم کے جوشِ انتقام کے مطابق یحیٰی خان اور اس کے ساتھی ٹولے کو سزا دینے کے لئے اگر ان کے تعاقب میں چل نکلے تو لوگوں کے انتقام کی شورش سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان مغربی پاکستان میں بھی اپنی فوجیں داخل کرنے کا بہانہ بنا سکتا تھا۔ اس وقت پاکستان کی فوج اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ وہ ہندوستان کی کسی بھی یلغار کا سامنا کر سکتی۔ یہی وہ خوف تھا جس کی وجہ سے چیئر مین بھٹو مغربی پاکستان میں فوری طور پر لاء اینڈ آرڈر کو بحال کرنا چاہتے تھے۔

میرے ناقص خیال میں یہی وہ وجوہات ہو سکتی تھیں جن کی بنا پر چیئر مین بھٹو نے اقتدار قبول کرنے پر فوج کے ساتھ اتفاق کیا ہوگا۔ مگر بعد کے واقعات کے مطابق یہ ثابت ہو گیا تھا کہ فوجی ٹولے نے ان کو پاکستان کا اقتدار غیر مشروط اقتدار نہیں دیا تھا، یہ مشروط اقتدار تھا۔ چیئر مین بھٹو کو دیئے گئے اقتدار میں جن شرائط کو اولیت حاصل تھی وہ شرائط یہی تھیں۔

1- فوج کے کسی افسر جوان یا جرنیل پر جنگ میں شکست کھانے پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔

2- فوج پر پاکستان توڑنے کا الزام نہیں لگایا جائے گا۔

3- تمام جنگی قیدیوں کو ہندوستان کی قید سے باعزت واپس لایا جائے گا۔

4- کسی فوجی پر جنگی قانون کے مطابق ہندوستان کو یا بنگلہ دیش کی حکومت کو مقدمہ کرنے کی شرط کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

5- پاکستان میں کسی فوجی افسر کے کورٹ مارشل کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

6- تمام فوجی جرنیلوں کے جان و مال کا تحفظ کیا جائے گا۔

7- یحیٰی خان پر بھی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ اس کو سزا دینے سے فوج کی بدنامی ہوگی۔

آخری شرط یہ تھی کہ کسی طریقے سے بھی فوج کے خلاف ایسا پروپیگنڈہ نہیں کیا جائے گا جس سے فوج بدنام ہو یا فوج کے امیج اور وقار کو ٹھیس پہنچ سکے۔ فوج کے وقار کو بحال کیا جائے گا اور فوج

www.bhutto.org

کے خلاف اخباروں میں یا تقریروں میں یا اسمبلی میں یا ریڈیو ٹیلیویژن پر ایسی کوئی بات نہیں کی جائے گی جو فوج کی عزت اور اس کے وقار کے خلاف ہوگی۔ آخری نکتہ اس سمجھوتے کا یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو کسی قیمت پر اب قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان کے ساتھ ایسا کوئی سمجھوتا نہیں کیا جائے گا جس کے تحت وہ دوبارہ پاکستان کا حصہ کہلا سکیں یا بن سکیں۔

ہر چند فوج کے چیئرمین بھٹو کے ساتھ اس معاہدے کی کوئی تحریری شکل میرے پاس موجود نہیں ہے۔ مگر چیئرمین بھٹو کے اقتدار حاصل کرنے کے بعد جو باتیں اقتدار کے ساتھ ہی دیکھنے میں آئی تھیں، وہ ان تمام شرائط کا احاطہ کرتی تھیں۔

چیئرمین بھٹو کی پاکستان آمد اور پاکستان پیپلز پارٹی کا اقتدار

چیئرمین بھٹو کو ہوائی فوج کے ایئر مارشل جنرل رحیم خان کی طرف سے اسپیشل طیارہ بھیجا گیا۔ جس میں چیئرمین بھٹو کو اسلام آباد لایا گیا۔ اسلام آباد میں ملک غلام مصطفیٰ کھر فوجی جنتا کے ساتھ تمام معاملات ان کی مرضی کے مطابق طے پا چکے تھے۔ جن کا پیچھے ذکر کر دیا گیا ہے۔ چیئرمین بھٹو جب اسلام آباد ائیر پورٹ پر پہنچے تو ائیر پورٹ پر ملک غلام مصطفیٰ کھر موجود تھے۔ جو چیئرمین بھٹو کو اپنے ساتھ راولپنڈی صدر ہاؤس لے کر گئے۔ چیئرمین بھٹو کا بیرون ملک چونکہ کھر صاحب کے ساتھ مسلسل رابطہ تھا لہٰذا فوج اور بھٹو صاحب کے درمیان بات چیت پہلے سے ہی طے ہو چکی تھی۔ اس طرح چیئرمین بھٹو صدر ہاؤس پہنچ گئے وہاں پر جنرل یحییٰ خان جنرل عبدالحمید اور جنرل پیرزادہ بڑی شدت کے ساتھ چیئرمین بھٹو کا انتظار کر رہے تھے۔ انتقالِ اقتدار کی کہانی کے بارے میں بھٹو صاحب نے اپنی کتاب میں تحریر کیا تھا کہ اس وقت جنرل یحییٰ خان کے ذہن کی شکست خوردگی کا یہ عالم تھا کہ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا اس کے ہاتھ کو اس قدر رعشہ تھا کہ اس سے اپنے مستعفی ہونے کے کاغذات پر دستخط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اس طرح بدحواس تھا کہ بغیر سوڈا ڈالے (Neat) نیٹ شراب پیے جا رہا تھا۔ چیئرمین تحریر کرتے ہیں کہ خود جنرل حمید خان اور جنرل پیرزادہ کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر ایک ہی بات کہے جا رہے تھے کہ اب آپ ہی سنبھالیں بھٹو صاحب، ہم نے تو اپنے (ہینڈز اَپ کر دیئے ہیں) ہاتھ کھڑے کر دیئے ہیں۔ اس طرح 20 دسمبر 1971ء کو چیئرمین بھٹو کو صدر پاکستان بنا دیا گیا۔

www.bhutto.org

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف اٹھا رہے ہیں

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو نے صدرِ پاکستان کا حلف اٹھایا

چیئرمین بھٹو نے صدرِ پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا حلف اٹھانے کے بعد قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بھارت کو مشرقی پاکستان پر فوجی حل ٹھونسنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ضرورت سے زیادہ ایک سیکنڈ بھی مارشل لاء برقرار نہیں رکھیں گے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ملک میں جمہوری نظام رائج دیکھنا چاہتے ہیں۔ جس میں عوام کو یہ کہنے کا حق ہو کہ جہنم میں جاؤ ہم تمہاری پالیسیوں کو پسند نہیں کرتے۔

کالعدم نیپ سے پابندی اٹھادی گئی

چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی ذوالفقار علی بھٹو نے 20 دسمبر 1971ء کو صدرِ پاکستان کا حلف اٹھانے کے بعد سب سے پہلے نیشنل عوامی پارٹی سے پابندی اٹھانے کا اعلان کر دیا۔ نیشنل عوامی پارٹی کو جنرل یحییٰ خان نے پاکستان کے خلاف غداری کرنے کا الزام لگا کر اس کو قانونی طور پر کالعدم قرار دے دیا تھا۔ اور اس کے تمام سرکردہ لیڈروں کو گرفتار کر لیا تھا۔ صدر بھٹو نے ان تمام گرفتار لیڈروں کو رہا کرنے کا اعلان کر کے ملک میں خیر سگالی کی سیاست کا آغاز کیا جو ایک اچھا اور قابلِ تعریف اقدام اور آغاز تھا۔

نیشنل عوامی پارٹی ولی خان گروپ کے مرکزی رہنما میجر جنرل (ر) ایم۔ جی جیلانی نے صدر بھٹو کی طرف سے نیپ پر پابندی اٹھانے کے اقدام کا خیر مقدم کیا اور انہوں نے کہا کہ یہ صدر کی تقریر کے بعد پاکستان کی سیاسی لغت سے غداری اور کافر کے الفاظ ختم ہو جائیں گے۔ (21 دسمبر روزنامہ کوہستان لاہور)

مسلح افواج کے وڈیرے

صدرِ پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جنرل یحییٰ خان کے ساتھ افواجِ پاکستان کے سات دوسرے جرنیلوں کو فوج سے برخاست کرتے ہوئے کہا۔ یہ کوئی معمولی اقدام نہیں ہے بلکہ بڑے تگڑے جرنیلوں کے خلاف کارروائی کی گئی ہے۔ انہوں نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ یہ مسلح

افواج کے وڈیروں کے خلاف کارروائی کی گئی ہے۔

اقتدار حاصل کرنے کے بعد وزیراعظم کا پہلا کام شیخ مجیب الرحمٰن کو آزاد کرنا تھا جو ایک صائب فیصلہ تھا

وزیراعظم بھٹو کے لئے پاکستان کے اقتدار حاصل کرنے کے بعد پاکستان کے تمام قومی مسائل سے نبٹنا کسی انداز میں بھی آسان کام نہیں تھا۔قومی حالات اس قدر بے ترتیب تھے کہ ان کو ترتیب میں لانا ناممکن تھا۔ پاکستان کے قومی اور بین الاقوامی حالات اس طرح الجھے ہوئے تھے ان کو سلجھانا ممکن نہیں رہا تھا۔ خاص طور پر مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بن جانے کے بعد باقی ماندہ پاکستان کی حیثیت اور وقعت پوری دنیا میں زیرو ہوگئی تھی۔ اس باقی ماندہ پاکستان کے تشخص کو منوانے کے لئے سب سے ضروری بات تھی کہ بنگلہ دیش کے مسلمان بھائیوں کے دلوں سے مغربی پاکستان کے لئے نفرت کو ختم کیا جائے۔فوجی اپریشن کی ہلاکت خیزی سے ان کو جو صدمہ پہنچا تھا اس کا ازالہ کیا جائے۔ اس ہلاکت خیزی کو پورے مغربی پاکستان کی جھولی میں نہ ڈالا جائے۔ بلکہ ان پر ثابت کیا جائے کہ یہ تمام غلط کاری چند خودسر فوجی جرنلوں کی تھی جو پاکستان کے سیاست دانوں کو اقتدار نہیں دینا چاہتے تھے۔ وہ فوجی جبر کے ذریعے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے عوام کو اپنا غلام رکھنا چاہتے تھے۔ جن کی وجہ سے ہندوستان کو مشرقی پاکستان میں سازش کرنے کا موقعہ ہاتھ آ گیا اور ہندوستان کی فوجی مداخلت نے ہم لوگوں کے دو ٹکڑے کر دیئے ہم کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا۔ مگر وزیراعظم بھٹو کو مشرقی پاکستان کے عوام کو اپنی باتوں کا یقین دلانے کے لئے کوئی کھلی صداقت اور کھلی حقیقت پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ مغربی پاکستان کی جانب سے کوئی ایسی قربانی پیش کرنے کی ضرورت تھی جو قربانی مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے دل جیت سکتی۔ ان کی مغربی پاکستان کے بارے میں نفرت کو ختم کرتی اور ان کو دوبارہ ایک پاکستان کے بارے میں سوچنے کے قابل بنا سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وزیراعظم بھٹو نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے تعلقات کی الجھی ہوئی ڈور کا اپنی کمال ذہانت کے ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن کو آزاد کرنے کے فیصلے سے کس قدر صحیح سرا پکڑا تھا۔ یہ فیصلہ ایک ناممکن فیصلہ تھا۔ یہ کوئی آسان فیصلہ نہیں تھا۔ میری دانست کے مطابق یہ ایک خدائی فیصلہ تھا۔ جو تاریخ میں خدا کی ذات عظیم انسانوں

www.bhutto.org

سے کرایا کرتی ہے۔ یا خود عظیم انسان اس طرح کا فیصلہ کیا کرتے ہیں۔ اس وقت اگر مشرقی پاکستان کے لوگ انتقام کی آگ میں شعلہ فشاں تھے تو اس وقت مغربی پاکستان کے عوام بھی اپنی شکست کے احساس سے آگ بگولا ہو چکے تھے۔ ان کا جذبہء انتقام اپنے عروج پر تھا۔ ایسے موقعوں پر عقل و ہوش کے فیصلے کرنا ناممکن ہو جایا کرتا ہے اور جو انسان ایسے موقعوں پر صحیح اور درست فیصلے کیا کرتے ہیں ان کو ہی کرشمہ ساز انسان کہا جاتا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن جو اپنی آزادی کے تھوڑے ہی وقت کے بعد بنگلہ دیش میں اپنے ہی بنگلہ بندووں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا تھا۔ خدانخواستہ وہ اگر مغربی پاکستان میں ہلاک کر دیا جاتا تو اس کی ہلاکت کا داغ مغربی پاکستان کے چہرے سے قیامت تک دھویا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ وزیر اعظم بھٹو کی سوچ کا معجزہ تھا جس نے ہم کو اس ذلت اور رسوائی سے بچا لیا تھا۔ وگرنہ ہماری اسٹیبلشمنٹ کے بہت اہم ترین لوگوں کا وزیر اعظم کو مشورہ تھا کہ مجیب الرحمٰن کو گولی مار کر ان کے جذبہء انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیا جائے۔ وہ کسی قیمت پر مجیب الرحمٰن کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو یحییٰ خان نے اور اس کے ساتھی جرنلوں نے مغربی پاکستان میں یرغمال کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ ان کی چال یہ تھی کہ مجیب الرحمٰن کی رہائی کے سلسلے میں بنگالیوں کے ساتھ اور شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ باقاعدہ سودا بازی کی جائے گی اور بنگالیوں سے اور مجیب الرحمٰن سے اپنی من چاہی شرطیں منوائی جائیں گی۔ مگر اس اسٹیبلشمنٹ کا یہ منصوبہ بھی اسی طرح ناکام ہوا جس طرح مشرقی پاکستان میں ان کے باقی تمام منصوبے ناکام ہو گئے تھے۔ اب تو معاملہ بالکل الٹ ہو چکا تھا۔ ہمارے 93 ہزار فوجی یرغمال ہو چکے تھے۔ ان کا صرف ایک مجیب الرحمٰن یرغمال تھا۔ وزیر اعظم بھٹو کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بہت جذباتی انسان ہیں۔ وہ جذباتی انسان بھی تھے مگر جذباتی انسان ہونے سے بڑھ کر حقیقت پسند انسان تھے اور ایک سچا اور حقیقت پسند انسان ہی جذباتی ہوا کرتا ہے۔ انہوں نے مجیب الرحمٰن کے مسئلے پر بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیا۔ انہوں نے اپنے اقتدار حاصل کرنے کے صرف سات دن بعد اپنے خصوصی حکم سے شیخ مجیب الرحمٰن کو جیل سے بذریعہ ہوائی جہاز اسلام آباد منگوا کر ایک مہمان خانے کی طرز کی عمارت میں ٹھہرایا اور ان کو وہ تمام سہولتیں بہم پہنچائیں جو ان کے مقام و مرتبے کے مطابق تھیں۔ اس سے پہلے مجیب الرحمٰن کو نہ تو جیل میں اخبار دیا جاتا تھا اور نہ ہی اس کو ریڈیو وغیرہ کی سہولت حاصل تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو کچھ علم نہیں تھا کہ ان کو جیل سے اسلام

اس وقت وہاں پر قابض ہے عوامی لیگ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ اس کو وہاں سے باہر نہیں نکال سکتی۔ اس کو صرف میں ہی وہاں سے باہر نکال سکوں گا۔ میں ہندوستان کو وہاں کبھی نہیں رہنے دوں گا۔ آپ مجھ پر یقین کریں۔

صدر بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ شیخ صاحب میں آپ پر یقین رکھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اقتدار میں آنے کے صرف سات روز بعد جو پہلا حکومتی حکم دیا ہے وہ آپ کی رہائی کا حکم ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے بھٹو صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ میں بہت خوش ہوں۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے دوبارہ حیرت سے پوچھا۔ کیا فوج کا اقتدار ختم ہو چکا ہے۔ آپ فوج سے نپٹ چکے ہیں۔ صدر بھٹو نے کہا کہ شیخ صاحب فوج کے اقتدار کی بات اب ختم ہو چکی ہے۔ اب فوج پاکستان میں دوبارہ کبھی اقتدار میں آنے کی غلطی نہیں کرے گی۔ (بھٹو صاحب کس قدر سادہ تھے)

میں صرف مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی دوبارہ یونٹی یعنی اتحاد چاہتا ہوں۔ وہ اتحاد خواہ کسی قیمت پر بھی ہو مجھے منظور ہوگا۔ والپرٹ لکھتا ہے کہ صدر بھٹو کی سادگی ملاحظہ ہو کہ وہ ابھی تک ایک پاکستان کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ پاکستان کی فوج کے اس بنگالی قیدی کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے جواب دیا کہ بھٹو صاحب مجھے کچھ علم نہیں ہے کہ وہاں کیا حالات ہیں۔ جس قسم کا خون خرابہ ہو چکا ہے اس کے بعد میں یہاں کچھ بھی کہنے کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ میں اس وقت آپ سے ایک ہی وعدہ کر سکتا ہوں کہ میں زندہ سلامت ڈھاکہ پہنچ جاؤں۔ ڈھاکہ میں جلسہء عام سے خطاب کروں۔ لوگوں سے اور اپنے دوستوں سے مل کر وہاں کے حالات معلوم کروں۔ تب ہی میں آپ سے کچھ بات کر سکوں گا۔ میرا یہاں پر کوئی بھی وعدہ کر لینے کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ میرا وعدہ رہا کہ آپ کو وہاں کی صحیح صورتِ حال سے ضرور آگاہ کروں گا۔ جو ممکن ہوا وہ کروں گا۔ اس طرح تقریباً گیارہ دن تک صدر بھٹو شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ اپنی بات چیت طے کرتے رہے۔

صدر بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کو کہا کہ آپ نے اکٹھے رہنے کے لئے شرائط کے طور پر کہا تھا کہ کرنسی اور خارجہ پالیسی اور دفاع مرکز کے پاس رہے۔ باقی تمام چیزیں صوبہ مشرقی پاکستان کو دے دی جائیں۔ میں اس کے لئے تیار ہوں۔

www.bhutto.org

آباد کیوں لایا گیا ہے اور ان کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔

شیخ مجیب الرحمٰن کی اس وقت کی صورتِ حال کا معروف انگریز تاریخ دان سٹینلے والپرٹ نے اپنی کتاب ''زلفی بھٹو آف پاکستان'' کے صفحہ 173 پر کچھ اس طرح نقشہ کھینچا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا کہ مجھے جب جیل سے بذریعہ ہیلی کاپٹر راولپنڈی لایا گیا تو میں نے اپنے دل میں خیال کیا تھا کہ شاید اب میرے خاتمے کا وقت آ پہنچا ہے۔ والپرٹ لکھتا ہے کہ ایک لمبی قید تنہائی کاٹنے سے مجیب الرحمٰن کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ وہ اپنے اردگرد تنے ہوئے فوجی جوانوں کو دیکھ کر حیران پریشان ہو رہا تھا۔ وہ ابھی اس طرح کے خیالات میں گم تھا کہ اچانک ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت صدرِ پاکستان بن چکے تھے شیخ مجیب الرحمٰن کے سامنے آ گئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن صدر بھٹو کو اپنے سامنے پا کر ایک طرح کا دم بخود ہو گیا۔ ہکا بکا رہ گیا۔ صدر بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کو اپنے گلے سے لگا کر کہا۔ آپ بالکل ٹھیک ہیں شیخ صاحب آپ محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ شیخ کی پریشانی دور کرنے کے لئے اس کو بتایا کہ پاکستان میں حکومت تبدیل ہو چکی ہے۔ تب جا کر شیخ مجیب الرحمٰن نے سکھ کا سانس لے کر کہا۔ خدا کا شکر ہے۔ مسٹر بھٹو میں بہت خوش ہوں۔ یقین کیجئے آپ کو دیکھ کر میں اپنی خوشی بیان نہیں کر سکتا کہ میں کس قدر خوش ہوں۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے صدر بھٹو سے پہلا سوال کیا کہ بنگال کی کیا صورتِ حالات ہے۔ صدر بھٹو نے بتایا کہ بنگال پر ہندوستان کی فوج کا قبضہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان نے سوویت یونین کے جنگی جہازوں کی مدد سے ڈھاکہ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ مجیب الرحمٰن نے کہا کہ اس کا مطلب ہے انہوں نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔ صدر بھٹو نے کہا کہ ہاں انہوں نے ہم کو تباہ کر دیا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ اس وقت مجھے ڈھاکہ بھیج دیں۔ اس وقت میرا ڈھاکے میں ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس کے علاوہ میں آپ سے ایک اور وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی فوج مجھے گرفتار کر کے جیل ڈال دے تو آپ میری رہائی کے سلسلے میں میری مدد کریں گے۔ صدر بھٹو نے کہا کہ حوصلہ رکھیں میرا وعدہ رہا کہ ہندوستان کی جارحیت کے خلاف میں ہر طریقے سے آپ کی مدد کروں گا، آپ کے ساتھ رہوں گا۔ والپرٹ لکھتا ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو شاید یہ شک تھا کہ اس کی باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں۔ وہ بار بار ایک ہی بات کئے جا رہا تھا۔ مجھے ہندوستان کے ساتھ وہاں جا کر معاملات طے کرنے پڑیں گے۔ وہ

شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا کہ یہ بات میرے اور آپ کے درمیان رہے۔ اب ہم اگر اکٹھے ہوئے بھی تو ایک کنفیڈریشن کی ہی شکل میں اکٹھے رہ سکیں گے۔ لیکن اس وقت بہتر یہی ہے کہ آپ یہ تمام باتیں مجھ پر یقین کرتے ہوئے مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں جو ممکن ہوا وہ کروں گا۔ یہ میرا آپ کے ساتھ شریفانہ وعدہ ہے۔ اس وقت میں آپ کے ساتھ کوئی وعدہ کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے رازدارانہ انداز میں کہا کہ میں وہاں جلسہء عام میں لوگوں کو بتاؤں گا۔ جو کہ سچ بھی ہے کہ جنرل یحییٰ خان نے اور اس کے کچھ ساتھیوں نے بھٹو کو اقتدار دیتے وقت ان سے ایک ہی مطالبہ کیا تھا کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو پھانسی پر لٹکا دیں۔ مگر صدر بھٹو نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور مجھے آزاد کر دیا۔ میرے اس انکشاف سے بنگال میں لوگوں کے دلوں میں آپ کے لئے محبت کے جذبات پیدا ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔

صدر بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار کی کھلی پیش کش کی۔ میں قرآن کو حاضر ناظر کر کے آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر صدر پاکستان بننا چاہتے ہیں صدر پاکستان بن جائیں، اگر آپ وزیراعظم بننا چاہتے ہیں تو وزیراعظم بن جائیں، میں دونوں طرح آپ کے راستے سے ہٹنے کے لئے تیار ہوں۔ میں ہر قیمت پر چاہتا ہوں کہ پاکستان کو اکٹھا رکھا جائے۔

اس کے جواب میں مجیب الرحمٰن کا ایک ہی جواب تھا کہ ان باتوں کا فیصلہ ڈھاکہ پہنچ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن جب ڈھاکہ پہنچا تو وہاں صورتِ حال ان دونوں سیاست دانوں کی خواہشوں اور تدبیروں سے قطعی مختلف تھی۔ اب بنگال کی مغربی پاکستان سے علیحدگی بنگالیوں کی صوابدید نہیں رہ گئی تھی۔ اب تو یہ ایک بین الاقوامی سازش کا مسئلہ بن چکی تھی۔ بنگالیوں کی رائے کی اس میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس معاملے میں سب سے اہم قوتیں ہندوستان اور سوویت یونین تھیں۔ جو مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کا بہت پہلے سے فیصلہ کر چکی تھیں۔ ان کو صرف مغربی پاکستان کے جنرل یحییٰ خان کے فوجی ٹولے کے فوجی اپریشن کی ضرورت تھی۔ جس ضرورت کو اس نااہل فوجی ٹولے نے ان کی توقع سے بڑھ کو پورا کر دیا تھا۔

وزیراعظم بھٹو کا ہندوستان کے ساتھ شملہ معاہدہ کرنے کی کامیابی کا تمام تر سہرا بھٹو صاحب کے شیخ مجیب الرحمٰن کو آزاد کرنے کے سر جاتا تھا۔ شملہ معاہدہ اس وقت کی پاکستان اور ہندوستان اور بنگلہ دیش کی صورت حالات کے پیشِ نظر ایک معجزے سے کم معاہدہ نہیں تھا۔ ایک ناممکن

معاہدہ تھا۔شملہ معاہدے کے وقت اگر شیخ مجیب الرحمٰن اس معاہدے کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا تو یہ معاہدہ کسی قیمت پر طے نہیں پا سکتا تھا۔اگر اس وقت شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کی گرفتار شدہ فوج پر جنگی قانون کے مطابق مقدمات چلانے کا دعویٰ کر دیتا اور پاکستان سے جنگی تاوان حاصل کرنے کا مطالبہ کر دیتا تو شملہ معاہدہ کبھی طے نہیں پا سکتا تھا۔ یہ وزیراعظم کا مجیب الرحمٰن پر احسان ہی تھا جس کی وجہ سے مجیب الرحمٰن شملہ معاہدے کے درمیان حائل نہیں ہوا تھا اور پاکستان کے وزیراعظم ایک شکست خوردہ قوم کا وزیراعظم ہوتے ہوئے بھی ایک فتح مند ہندوستان پر شملہ کی میز پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔وہ ہندوستان سے 93 ہزار فوجی بھی واپس لے آئے تھے اور ہندوستان کے قبضے سے پاکستان کا 5 ہزار مربع میل کا علاقہ بھی واگزار کرا لائے تھے۔

بے شک شملہ معاہدہ ہندوستان اور پاکستان کی دوستی کے درمیان ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔آج ہم جو کچھ بھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کی شکل میں دیکھ رہے ہیں اس کی بنیاد شملہ معاہدے میں ہی رکھی گئی تھی۔ وزیراعظم بھٹو کے شملہ معاہدے کے کارنامے کو ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں سنہری حروف سے تحریر کیا جاتا رہے گا۔

یہ جم خانے کے ہٹلر اور لارنس باغ کے نازی

چیئرمین بھٹو کو چیف آف آرمی سٹاف اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنائے جانے کے پیچھے ایک تو سیدھی سی مجبوری انتقالِ اقتدار کے پروسیجر کی تھی جس پر پہلے بات ہو چکی ہے مگر اس سے بھی بڑھ کر جو مصلحت اور منصوبہ سازی اس میں پنہاں تھی وہ جرنیلوں کا تحفظ حاصل کرنے کی تھی۔اس لئے کہ ایک چیف آف آرمی سٹاف اپنی ہی فوج کے جرنیلوں اور افسروں کے خلاف کبھی کوئی تعدیبی کارروائی نہیں کیا کرتا۔وہ ہر قیمت پر جرنیلوں اور افسروں کو بلکہ پوری فوج کا تحفظ کیا کرتا ہے اور یہی وہ مصلحت اور قانون اور روایت تھی جس کا صدرِ پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے میرے ساتھ ذکر کیا تھا۔نظم کا معاملہ کچھ یوں تھا۔

اس وقت پوری قوم کے دل جلے ہوئے تھے۔ میں نے قوم کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے ایک نظم کہی تھی جس کا عنوان تھا۔''یہ جم خانے کے ہٹلر اور لارنس باغ کے نازی''۔

اس نظم کو میں مساوات اخبار اور ہفت روزہ نصرت میں شائع کرنا چاہتا تھا۔ یہ دونوں اخبار

www.bhutto.org

ہماری جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کے اخبار تھے۔ یہ نظم اب مجھے یاد نہیں رہ گئی۔ ذہن سے اتر چکی ہے۔ مگر اس کے کچھ مصرعے مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ ملاحظہ کریں:

جہاں کی ہر شکستہ فوج سے یہ لے گئے بازی
یہ جم خانے کے ہٹلر اور لارنس باغ کے نازی
یہ وہ شاہیں نہیں جن کا بسیرا ہے چٹانوں میں
قیام ان کا ہے اب تو کوٹھیوں اور کارخانوں میں
یہ اپنی قوم کو تسخیر کرنے کے تو ماہر ہیں
مگر اغیار کے آگے یہ جو کچھ بھی تھے ظاہر ہیں
انہوں نے غیر کے آگے ہمارے سر جھکائے ہیں
یہ بزدل ہیں شکستِ فاش کھا کر گھر کو آئے ہیں
کوئی زخمی ہوا ان میں نہ کوئی جان پر کھیلا
عدو کی فوج کے آگے یہ ٹائیگر بن گئے لیلا

کچھ اس طرح کی کافی لمبی نظم تھی۔ جس نظم میں یحیٰ خان کے فوجی ٹولے کے تمام کردار کی نقاب کشائی کی گئی تھی۔ یہ نظم اس وقت تحریر کی گئی تھی جب پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار کی ابتدا تھی۔ اخبار کے ایڈیٹر نے یہ نظم حنیف رامے کو اشاعت کی اجازت کے لئے بھیج دی۔ رامے صاحب نے مجھے بلوا بھیجا۔ میں ان کے پاس گیا اس وقت وہ گورنر پنجاب کے ایڈوائزر بن چکے تھے۔ یعنی منسٹر بن چکے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ جہاں تک نظم میں بیان کئے گئے جذبات کا تعلق ہے خود میرے جذبات ان سے بھی زیادہ شدید ہیں۔ مگر ہم اب اقتدار میں ہیں اب ہم اس نظم کو شائع نہیں کر سکتے۔ ہمارے اقتدار میں یہ شرط شامل ہے کہ ہم فوج پر کوئی الزام نہیں لگائیں گے۔ فوج کے خلاف کوئی بات نہیں کریں گے۔ فوج کا ٹرائل کرنے کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ فوج پر کوئی مقدمہ وغیرہ چلانے کی بات نہیں کریں گے۔ ہماری شرائط میں یہ بات شامل ہے کہ ہم فوج کے وقار کو بحال کرائیں گے اور فوج کے خلاف تحریری طور پر یا تقریروں میں کسی قسم کی انتقامانہ بات نہ لکھیں گے نہ کہیں گے۔ تمہاری نظم ہمارے فوج کے ساتھ کئے گئے معاہدے کے سراسر خلاف ہے۔ لہٰذا برادرم اس نظم کو شائع کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اگر آپ اس نظم کو شائع ہی کرانا

چاہتے ہیں تو اس نظم کو بھٹو صاحب کو پیش کر کے اس کی اجازت حاصل کرلو۔

میں نے اس نظم کو بابا سوشلزم جناب شیخ محمد رشید کے ہاتھ چیئرمین بھٹو کو بھیج دیا کہ حنیف رامے صاحب اس نظم کو شائع کرنے سے انکاری ہیں۔ جبکہ یہ نظم پوری قوم کے احساسات کی ترجمان ہے۔ چیئرمین بھٹو اس وقت صدرِ پاکستان تھے اور فرضی طور پر چیف آف آرمی کمانڈ بھی تھے۔

وہ جب صدر پاکستان بننے کے بعد پہلی مرتبہ لاہور تشریف لائے تو انہوں نے پارٹی کے تمام خاص خاص ورکروں، عہدہ داروں کو ملاقات کے لئے گورنر ہاؤس میں بلایا۔ ان بلائے جانے والے میں سب سے پہلی ملاقات میری تھی۔ میں نے محبت سے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ بہت متفکر ہیں۔ انہوں نے میرے بیٹھتے ہی کہا تمہاری نظم مل گئی تھی۔ تم چیف آف آرمی کمانڈ سے مطالبہ کر رہے ہو کہ اپنی فوج کے خلاف تحریر کی گئی نظم کو شائع کرنے کی اجازت دو۔ اپنی فوج پر مقدمہ چلاؤ، اس کے افسروں کو جرنیلوں کو پھانسی دو۔ تم خود ہی فیصلہ کرو کیا یہ بات ایک کمانڈر انچیف اپنی فوج کے خلاف کر سکتا ہے۔ ہم پہلے ہی بہت بدنصیبیوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہمارا ملک دو ٹکڑے ہو گیا ہے اس باقی ماندہ کو بچانا ہے۔ پوری دنیا میں ہمارا تمسخر اڑ رہا ہے۔ ہندوستان ہمارا مذاق اڑا رہا ہے۔ 93 ہزار فوجی ہندوستان کی قید میں ہیں۔ اس صورت میں ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ ملک کو بچانا چاہئے یا اس کو اور تباہی کا سامان بنانا چاہئے۔ ہم کو فوج کا تحفظ کرنا ہے۔ فوج کی عقل ٹھکانے آ چکی ہے۔ اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ جرنیل کانوں کو ہاتھ لگا رہے ہیں۔ وہ میرے پاؤں پکڑ کر ملک کو بچانے کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ وہ ہم میں سے ہی ہیں۔ ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔ غلطی کی صرف سزا دینا ہی ٹھیک عمل نہیں ہوتا۔ غلطی کی معافی دینا سب سے بڑا درست عمل ہوتا ہے۔ یہ باتیں وہ بڑے بھاری دل کے ساتھ کہہ رہے تھے۔ مجھے ان کی باتوں سے معاملے کی معروضی صورت حال کا احساس ہو گیا۔ میں نے فوراً کہا کہ سر آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آئندہ آپ میرے اشعار میں اس قسم کی بات ہرگز نہیں پائیں گے۔

افسوس کہ چیئرمین بھٹو اپنی نیک نیت طبیعت کے مطابق فوجی جرنیلوں پر کس قدر اعتبار کر رہے تھے کہ وہ دوبارہ پاکستان کی سیاست میں فوج کے کردار کا تصور ہی نہیں کر رہے تھے۔ ان کے

www.bhutto.org

نزدیک ملک کے دوٹکڑے ہونے کا واقعہ بہت بڑا واقعہ تھا اور تھا بھی۔ ان کا ایمان ہو چکا تھا کہ فوج اب کبھی پاکستان کی سیاست میں مداخلت نہیں کرے گی۔ جو غلط ثابت ہوا۔ مجھے اپنی اس نظم کو 1977ء میں دوبارہ تحریر کر کے لوگوں میں تقسیم کرنا پڑا تھا۔

پاکستان کا عبوری آئین بنوانا

وزیراعظم بھٹو کو ایک فوجی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے بطور ایک سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اقتدار منتقل کیا گیا تھا۔ جس کی شاید پہلے دنیا میں نظیر نہیں ملتی تھی۔ اس فوجی اقتدار کو جمہوری اقتدار میں تبدیل کرنا کوئی آسان مسئلہ نہیں تھا۔ مگر شہید بھٹو ہر کام میں معجزہ دیکھایا کرتے تھے۔ یہ مسئلہ بھی انہوں نے معجزاتی طور پر حل کر کے پوری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے 20 دسمبر 1971ء کو اقتدار حاصل کیا تھا اور انہوں نے صرف پانچ ماہ کے مختصر ترین وقت میں پاکستان کا ایک عبوری آئین بنوا کر 28 جون 1972ء کو فوجی عہدے کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر کے پاکستان کے وزیراعظم کا آئینی اور جمہوری عہدہ اختیار کر لیا تھا۔ ان کا یہ اقدام ان کی جمہوریت پسندی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ اس معاملے میں ان کو عجلت اور جلدی اس لئے بھی تھی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کے جنگی قیدیوں کو چھڑانے اور پاکستان کے علاقے واپس لینے کے لئے مذاکرات کرنے ہندوستان جانا چاہتے تھے۔

ہندوستان ایک صدر پاکستان اور چیف آف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے نہیں جانا چاہتے تھے۔ وہ شملہ میں ایک منتخب وزیراعظم پاکستان کی حیثیت سے جانا چاہتے تھے۔ تاکہ ہندوستان کی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے ساتھ برابری کی سطح سے بات کر سکیں۔ ان کا یہ فیصلہ ایک مدبر اور ماہر سیاست دان کی حکمت عملی کا عظیم فیصلہ تھا جو شملہ معاہدے کی تکمیل کے دوران ان کے لئے اور پاکستان کے لئے بے حد فائدے مند ثابت ہوا تھا۔

شملہ معاہدہ اور بھٹو کی فتح

انسانی تاریخ میں کچھ ایسے واقعات، معاملات اور مسائل ہوتے ہیں جن کا حل ہونا یا طے پانا صرف مشکل ہی نہیں ناممکن تصور کیا جاتا ہے۔ اگر اس نوع کے قضیے یا تنازع کو کوئی انسان طے

پانے میں کامیاب ہو جائے تو اس کو معجزہ کہا جاتا ہے، کرشمہ کہا جاتا ہے۔ ہندی زبان میں اس کو چمتکار کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اس طرح کے کامیاب انسان کو کرشماتی انسان یا معجزاتی انسان کہا جاتا ہے یا اس کو طلسماتی انسان کہا جاتا ہے۔ وزیر اعظم بھٹو بلا شبہ اور بلا مبالغہ ہمارے قومی معاملات میں ایک معجزاتی انسان تھے۔ ان کی شخصیت کا کرشمہ سر چڑھ کر بولتا تھا۔ جس کا اعتراف ان کے بدترین دشمن بھی کیا کرتے ہیں۔ شملہ معاہدہ تاریخی اعتبار سے ایک ایسا ہی معاہدہ تھا جس کا طے پانا ایک کرشمہ ہی تھا۔ اس معاہدے میں پاکستان اور ہندوستان دو فریق تھے۔ پاکستان کی حالت یہ تھی کہ پاکستان ایک شکست خوردہ ملک تھا اور ایک شکست زدہ فریق تھا۔ جس کی افواج نے ڈھاکہ میں ہندوستان کے جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور پاکستان کے 93 ہزار فوجیوں کو گرفتار کر کے ہندوستان کی جیلوں میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس 93 ہزار میں کچھ تو جرنیل تھے اور باقی تمام فوجی افسران اور فوجی جوان تھے۔ ان کے علاوہ پاکستان کا 5 ہزار مربعہ میل کا علاقہ ہندوستان کے قبضے میں جا چکا تھا۔ یہ شکست فوجی اعتبار سے ایک شکست فاش تھی۔ ایک مکمل شکست تھی۔ اس قسم کی شکست کے بعد شکست خوردہ فریق کا کسی بھی معاملے میں کوئی استحقاق باقی نہیں رہا کرتا۔

اس کے علاوہ بنگلہ دیش کے لوگ جو اس جنگ کا اصل فریق تھے وہ بھی ہندوستان کے ساتھ تھے۔ وہ ہندوستان کو اپنا نجات دہندہ قرار دیتے تھے۔ وہ پاکستان کی فوج سے اپنا خون بہا مانگ رہے تھے۔ ان کا افواجِ پاکستان پر مقدمہ تھا کہ ان کی نسل کشی کی گئی ہے۔ ان کی عورتوں کی عصمت ریزی کی گئی ہے۔ ان کا قتلِ عام کیا گیا ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اس فوج پر مقدمہ چلایا جائے اور ان کو عالمی قانون کے مطابق سزائیں سنائی جائیں۔ پاکستان کو ایک مجرم ملک قرار دیا جائے۔ اس پر جنگی تاوان لاگو کیا جائے۔ عوامی لیگ کے تمام انتہا پسند رہنما جن کے بھارت کے ساتھ بہت خفیہ تعلقات اور راز و نیاز تھے۔ وہ پوری دنیا سے مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ جس کی وجہ سے عالمی رائے عامہ بھی بنگلہ دیش اور ہندوستان کے حق میں تھا۔ پوری دنیا پاکستان کو ایک جارح ملک تصور کر رہی تھی۔ پاکستان دنیا میں سیاسی اعتبار سے بھی مجرم ثابت ہو چکا تھا اور فوجی اعتبار سے بھی مجرم ثابت ہو گیا تھا۔ اس کے مجرم ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ پاکستان کا مقدمہ سیاسی اعتبار سے اخلاقی اعتبار سے یا فوجی اعتبار سے غرض کے ہر اعتبار سے انتہائی کمزور مقدمہ تھا۔ وقت اور حالات کی ستم ظریفی نے اور ہمارے

اقتدار پرست جرنیلوں کی حماقتوں نے ہندوستان کو پاکستان کے مقدمے کے فیصلے کے لئے عدالتِ عظمیٰ کا شرف عطا کر دیا تھا اور وزیراعظم ہندوستان شری متی اندرا گاندھی اس عدالت عظمیٰ کی چیف جج بن گئی تھی اور اس عدالت میں مدعی بنگلہ دیش تھا۔ گویا عدالت بھی ہندوستان کی تھی، جج بھی ہندوستان کے تھے، مدعی اور گواہ بھی ان کے اپنے تھے اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حیثیت صرف اور صرف ایک مجرم کی حیثیت تھی۔ جن کے پاس اپنی صفائی کے لئے سوائے شرمساری کے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس تمام صورتِ حالات میں وزیراعظم بھٹو کو اپنے دو فیصلوں کی اخلاقی حمایت اور قوت حاصل تھی جو انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو آزاد کر کے اور بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے حاصل کی تھی۔ وزیراعظم بھٹو کے یہ دو فیصلے معاہدہ شملہ کے وقت پاکستان کے لئے فتح مبین بن کر سامنے آئے تھے۔ وزیراعظم بھٹو نے جب یہ دو فیصلے کئے تھے اس وقت پاکستان میں ان دو فیصلوں کے خلاف بڑا ردِعمل سامنے آیا تھا۔ خاص طور پر پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کی خفیہ ایجنسیوں نے اپنی خفیہ قوتوں سے بڑے مظاہرے کرائے تھے جن میں جماعت اسلامی، اصغر خان اور پاکستان کی باقی تمام حزبِ اختلاف کی جماعتیں پیش پیش تھیں۔ ان کا ایک ہی نعرہ تھا کہ "بنگلہ دیش نامنظور"۔ خدا جانے وزیراعظم بھٹو کس سوچ کے انسان تھے جو ان معاملات میں بیرونی اور اندرونی شدید قسم کے دباؤ کو برداشت کر رہے تھے۔ پاکستان کا کوئی لیڈر بھی پاکستان کی اصل حیثیت اور اس کی صورت حال کا ادراک نہیں کر رہا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے ان دو فیصلوں کی مخالفت کر رہے تھے۔

انہی دنوں خان عبدالولی خان سے ایک اخبار نویس نے سوال کیا تھا کہ خان صاحب آپ اگر بھٹو کی جگہ اس وقت ہوتے تو آپ کیا کرتے۔ انہوں نے اپنے پختونی لہجے میں کہا کہ میں بھٹو کی مخالفت کرتا۔ اخبار نویس نے کہا کہ آپ میرا سوال نہیں سمجھے۔ ولی خان نے کہا کہ تم میرا جواب نہیں سمجھے۔ گویا ان کی سیاست صرف بھٹو دشمنی تھی اس میں عقل و خرد والی کوئی بات نہیں تھی۔ سوال گندم تھا جواب چنا تھا۔ حزبِ اختلاف کے اس انتہائی بوگس غیر سیاسی رویے کے باوجود وزیراعظم بھٹو نے شملہ جاتے وقت پاکستان کے تمام حزبِ اختلاف کے لیڈروں سے مشورہ حاصل کیا۔ پاکستان کے دانش وروں سے مشورہ کیا۔ ان سب کی تائید حاصل کی۔ اس طریقے سے اس خالی ہاتھ انسان نے شملہ معاہدے کا سامنا کرنے کے لئے خود کو اخلاقی اعتبار سے مستحکم کیا اور وہ اپنے

ساتھ ایک مختصر سا وفد لے کر ہندوستان کے مشہور پہاڑی مقام شملہ پہنچ گئے۔ شملہ میں مقدمہ کی شروعات ہو گئی۔ ہندوستان کا ہر طرح سے پلہ بھاری تھا۔ وہ ہر معاملے میں چڑھ کر بات کرتے تھے۔ مگر وزیراعظم بھٹو کی نرم مزاجی ان کے غرور کو ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ شملہ کی میز ایک میدان کی طرح تھی۔ جس پر بھٹو اپنی دانش و حکمت سے ہندوستان پر اپنی برتری ثابت کرنے میں ہر اعتبار سے کامیاب رہے تھے۔

کیا کسی شکست خوردہ کا بھی کوئی موقف ہوتا ہے

شملہ کی ٹیبل پر اندرا گاندھی کے وفد میں شامل کسی ڈپلومیٹ نے بھٹو صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا کسی شکست خوردہ کا بھی کوئی موقف ہوتا ہے۔ وزیراعظم بھٹو نے برجستہ انداز میں کمال جواب دیا۔

کہا کہ ہاں جنٹلمین موقف تو صرف ہوتا ہی شکست خوردہ کا ہے۔ فاتح کا تو کوئی موقف ہی نہیں ہوا کرتا۔ آپ خود کو اگر فاتح خیال کر رہے ہو تو بتاؤ آپ کا کیا موقف ہے۔ کیا جارحیت آپ کا موقف ہے۔ جنگ کرنا آپ کا موقف ہے۔ کسی ملک میں مسلح مداخلت کرنا آپ کا موقف ہے۔ کسی کی سرزمین پر قبضہ کرنا آپ کا موقف ہے۔ 93 ہزار لوگوں کو قید رکھنا آپ کا موقف ہے۔ طاقت سے اپنے فیصلے دوسروں پر مسلط کرنا آپ کا موقف ہے۔ کل اگر ہندوستان کے ساتھ یہ حادثہ پیش آ جائے یہ صورت حال پیش آ جائے تو کیا تب بھی آپ کا یہی موقف ہو گا کہ شکست خوردہ کا کوئی موقف نہیں ہوتا۔ بھٹو صاحب کے اس جواب سے اندرا گاندھی نے اپنے وفد کے اس شخص کو خاموش کرا دیا اور کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ایک شکست خوردہ فریق اپنی شرائط منوا نہیں سکتا۔ ہم ماحول کو اچھا رکھنا چاہتے ہیں۔ اس سوال کو چھوڑ دیتے ہیں۔ آگے بات کرتے ہیں۔ وزیراعظم بھٹو کو شیخ مجیب الرحمٰن پر اپنے کیے گئے احسان کا مکمل اعتماد تھا۔ انہوں نے اندرا گاندھی کو کہا کہ آپ تو اس میں فریق ہی نہیں ہیں۔ آپ تو جارح ہیں، حملہ آور ہیں۔ آپ نے اپنی افواج کو اس وقت مشرقی پاکستان میں داخل کیا تھا جب مشرقی پاکستان پاکستان کا حصہ تھا۔ آپ کسی بھی بین الاقوامی قانون کے مطابق ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ اس میں اگر کسی کو ہمارے مقابلے میں فریق قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ شیخ مجیب الرحمٰن ہے۔ اگر ان کی

جانب سے یہ کہا جائے کہ پاکستان سے جنگی تاوان حاصل کیا جائے یا جنگی مقدمات قائم کئے جائیں تو تب تو اس کی ایک حقیقت اور حیثیت بن سکتی ہے کہ پاکستان پر کوئی مقدمہ وغیرہ چلایا جائے۔ آپ کس طرح ایسا کرنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں۔ پاکستان اگر بنگلہ دیش کے لئے جارح تھا تو ہندوستان پاکستان کے لئے جارح تھا۔ ہماری اور آپ کی پوزیشن بالکل ایک سی ہے۔ یہ مقدمہ اگر بین الاقوامی عدالت میں جائے گا تو اس میں ہم دونوں ہی اپنی اپنی نوعیت کے مجرم ٹھہرائے جائیں گے۔

ہندوستان کے وفد اور اندرا گاندھی کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وزیراعظم بھٹو نے مزید کہا کہ ہندوستان درمیان میں نہ آئے۔ یہ ہم بھائیوں بھائیوں کا معاملہ ہے۔ ہم اس معاملے کو خود حل کرلیں گے۔ ہندوستان تو ثالث تب بن سکتا ہے جب ہم دونوں فریق اس کو ثالث تسلیم کریں گے۔ اگر ہندوستان بنگلہ دیش میں خود کو ایک فریق بنائے گا تو اس کی ثالثی کی حیثیت متنازع ہو جائے گی۔

وزیراعظم بھٹو نے یہ باتیں شملہ کے آخری سیشن میں کی تھیں۔ جب شملہ معاہدہ کی کامیابی کی بات چیت ناکام ہو چکی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ دونوں فریق کے درمیان کوئی بااصول معاہدہ طے پانا ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہندوستان کے زعماء ہمارے 93 ہزار قیدیوں کی آڑ میں صورت حال کو ایکسپلائٹ کرنے کی کوشش میں تھے۔ مگر وزیراعظم بھٹو کی مندرجہ بالا باتوں سے ان کی تمام خوش فہمی کافور ہو گئی تھی۔ بھٹو صاحب کی باتوں سے بنگلہ دیش کے آئینے میں بھارت کے حکمرانوں کو اپنی شکل ایک مجرم کی شکل دکھائی دینے لگ گئی۔ وزیراعظم بھٹو نے ہندوستان کی حکومت کو جو ایجنڈا پیش کیا تھا وہ بے حد مثبت اور آسان ایجنڈا تھا اور بہت مختصر تھا۔ اس کے بس دو ہی اہم ترین نکات تھے۔

پہلا مطالبہ تھا کہ پاکستان کے 5 ہزار مربع میل کے علاقے کو فوری طور پر واگزار کیا جائے۔ اس کو پاکستان کی تحویل میں دیا جائے۔ وہاں سے فوجوں کو بھی فوراً ہٹا لیا جائے۔ دوسرا مطالبہ تھا کہ پاکستان کے 93 ہزار جنگی قیدیوں کو باعزت طور پر پاکستان کے حوالے کیا جائے۔ وزیراعظم بھٹو کے ان دو مطالبات کا ہندوستان کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔ وہ کسی قانون کے مطابق ان دو مطالبات کو رد نہیں کر سکتے تھے۔ بھٹو صاحب کے مطالبات کے برعکس ہندوستان کا ایجنڈا بڑی

بے تکی قسم کی شرائط پر مبنی تھا۔ جس میں ہندوستان بنگلہ دیش کی طرح خود کو ایک فریق قرار دے رہا تھا جو سراسر غلط نظریہ تھا جس کا احساس ہندوستان کی وزیر اعظم کو بھٹو کے ساتھ مذاکرات کے بعد ہوا تھا۔ ہندوستان اپنے ایجنڈے کی رو سے ہی ایک حملہ آور اور ایک جارح ثابت ہو رہا تھا اور پاکستان کی سرزمین میں مسلح مداخلت کا مجرم ثابت ہو رہا تھا۔ جب وزیر اعظم بھٹو نے ہندوستان کو ان کے ایجنڈے کے حوالے سے ان کو عالمی اور بین الاقوامی قوانین کا مجرم ثابت کر دیا۔ ہندوستان کو اقوام متحدہ کے چارٹر کا مجرم ثابت کر دیا تو ہندوستان کے حکمرانوں کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔

اندرا گاندھی کو اس کے مددگاروں نے مزید مشاورت کے لئے شملہ کانفرنس کے آخری سیشن کی کارروائی کو وقتی طور پر روک دینے کا مشورہ دیا۔ کارروائی کو روک دیا گیا۔ اس طریقے سے یہ تمام کارروائی ایک طرح کے ڈیڈلاک کی شکل میں روک دی گئی۔

اعلان کیا گیا کہ اگر مزید ضرورت ہوئی تو دوبارہ مذاکرات شروع کئے جائیں گے۔ یہ اعلان ایک طرح کا مذاکرات کے بے نتیجہ قسم کے اختتام کا اعلان تھا۔ جو پاکستان کے لئے بڑا افسوس ناک اعلان تھا۔

اس اعلان کے ساتھ جب دونوں جانب کے لوگ ابھی اٹھنے ہی والے تھے تب وزیر اعظم بھٹو نے مسز اندرا گاندھی کو مشورہ دیا کہ میری خواہش ہے کہ مذاکرات ختم کرنے سے پہلے کچھ باتیں میں آپ کے روبرو بیٹھ کر آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس ملاقات میں دونوں جانب سے کوئی تیسرا شخص شریک نہ کیا جائے۔ وزیر اعظم بھٹو کی اس تجویز پر ہندوستان کے زعماء نے کچھ وقت سوچ بچار کے بعد منظور کر لیا اور وزیر اعظم بھٹو کو اس کی اطلاع کر دی گئی۔ یہ بات تاریخ میں رقم ہو چکی ہے کہ باہمی بات چیت کی اطلاع سے پہلے وزیر اعظم بھٹو اور ان کے وفد کے لوگ واپسی کے لئے اپنا سامان باندھنا شروع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے حکمران اس بات پر بڑے متحیر تھے۔ وزیر اعظم پاکستان اپنے ایجنڈے میں ہندوستان سے جنگ نہ کرنے کی کوئی بات ہی نہیں کر رہا۔ وہ صرف اتنی بات ہی کہے جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کو اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہئے۔ ایک دوسرے کی خودمختاری میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ ہندو بھٹو صاحب کی اس پُرامن رہنے کی خواہش تک محدود عبارت سے خوف زدہ ہو گئے۔ ان کو وہم تھا کہ بھٹو جنگ کرنے کا راستہ کھلا رکھ رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ بھٹو کے دل میں ہندوستان کے لئے نفرت اور

انتقام موجود ہے۔ ویسے بھی بھٹو صاحب نے بھارتی حکمرانوں کو مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کا جرم وار بنا کر ان کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ وہ گلٹی کانشیئس بنا دیئے گئے تھے۔ یہ وزیراعظم بھٹو کی سفارت کاری کا کمال تھا۔ وگرنہ بھارتی حکمران تو پاکستان کو مجرم بنائے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے مذاکرات کسی جرنیل کے ساتھ ہوں گے۔ مگر وقت کی تبدیلی کے بعد ان کو ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ مذاکرات کرنا پڑ گئے۔ جس سے مذاکرات کی نوعیت ہی بدل گئی تھی۔ پاکستان کا جمہوری تشخص بحال ہونے سے پاکستان ہندوستان کے برابر آ چکا تھا۔ وزیراعظم بھٹو اور مسز اندرا گاندھی برابری کی سطح پر بات کر رہے تھے۔ اب ہندوستان کو جمہوریت کا وہ تفاخر حاصل نہیں تھا۔ جو اس کو کبھی پہلے پاکستان پر حاصل تھا۔ ہندوستان کے زعماء نے اپنی وزیراعظم کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی ون ٹو ون ملاقات میں وزیراعظم بھٹو پر جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کا کہیں۔ ہندوستان کے حکمران وزیراعظم بھٹو کو دل سے ہندوستان کا دشمن خیال کرتے تھے۔ وہ بھٹو صاحب کی ایک ہزار سال تک جنگ کرنے کی بات کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کو خوف تھا یہ شخص اقتدار میں آ چکا ہے۔ یہ چین کو ساتھ ملا کر ہندوستان سے جنگ کا انتقام لے گا۔ لہٰذا ہندوستان نو وار پیکٹ کی بات کر کے ایک تو بھٹو صاحب کے عزائم سے پردہ اٹھانا چاہتے تھے۔ دوسری ان کی چال یہ تھی کہ اگر بھٹو صاحب جنگ نہ کرنے کے معاہدے کو قبول نہیں کریں گے تو وہ دنیا کو یہ کہنے میں حق بجانب ہو جائیں گے کہ پاکستان ایک جنگ جو ملک ہے جو امن و آشتی کا خواہاں ہی نہیں ہے۔ ہندو حکمران اس مسئلے پر اس قدر بوکھلائے ہوئے تھے کہ وہ اس بات کا خیال ہی اپنے من میں نہیں لا رہے تھے کہ پاکستان تو اب اس قابل ہی نہیں تھا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ جنگ کر سکے۔ پاکستان کی مسلح افواج مکمل طور پر مفلوج ہو چکی تھی اس میں لڑنے کی سکت ہی نہیں تھی۔ نہ تو پاکستان کے پاس جدید ہتھیار تھے، نہ ہوائی جہاز تھے، پاکستان دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔ قوم کا مورال زوال پذیر ہو چکا تھا۔ ملک کی اقتصادیات برباد ہو گئی تھی۔ پاکستان کے ایک مردہ جسم میں دوبارہ جان پیدا کی جا رہی تھی اس میں زندگی کی روح پیدا کی جا رہی تھی۔ وزیراعظم بھٹو تو خود کسی بھی اعتبار سے جنگ کو افورڈ کرنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ مزید جنگ کرنے کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا ہندوستان کے حکمرانوں کی نو وار پیکٹ کرنے کے معاہدے کی بات تو اصل میں بھٹو صاحب کے دل کی بات تھی۔ اس طریقے سے وزیراعظم بھٹو نے ان کے اس مطالبے کو تسلیم کر کے

ہندوستان کے حکمرانوں کے ہاتھ کے تمام پتے بے کار بنا دیئے۔اب نہ تو وہ جنگی قیدیوں کو اپنی قید میں رکھ سکتے تھے اور نہ ہی پاکستان کے علاقے اپنے قبضے میں رکھ سکتے تھے۔

وزیراعظم اندرا گاندھی کے ساتھ جب وزیراعظم بھٹو کی ون۔ٹو۔ون بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا تو وزیراعظم اندرا گاندھی کا اپنے زعماء کے مشورے کے مطابق تمام تر زور دونوں ممالک کے پرامن رہنے پر تھا۔اس کے علاوہ وہ ان دو باتوں پر اڑی ہوئی تھی۔جن میں پہلی بات جنگی تاوان کی تھی اور دوسری بات جنگی قیدیوں پر مقدمات چلانے کی تھی۔وزیراعظم بھٹو کے بقول پہلے تو بھٹو صاحب کافی لمحوں تک خاموش رہے اور وہ اندرا گاندھی کی باتیں سنتے رہے۔اندرا گاندھی مسلسل بولتی رہی۔کچھ وقت کے بعد اس کو خود ہی محسوس ہوا کہ وزیراعظم بھٹو تو کوئی بات کر ہی نہیں رہے۔وزیراعظم بھٹو ایک لمبی سوچ میں گم تھے۔وہ جیسے اندرا گاندھی کی باتوں کو سن ہی نہیں رہے تھے۔مسز اندرا گاندھی نے اس طرح کی بھٹو صاحب کی خاموشی سے گھبرا کر ان کو کہا کہ مسٹر پرائم منسٹر آپ کیا سوچ رہے ہیں۔میں آپ کے منہ سے اپنی باتوں کا جواب سننا چاہتی ہوں۔

وزیراعظم بھٹو نے مسز اندرا گاندھی کو کہا کہ میں سوچ رہا ہوں۔یہ موقعہ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔آج پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دونوں جانب کے وزیراعظم ایک ساتھ بیٹھے ہیں۔ آج ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ ہم دونوں کے ہاتھ میں ہے۔خواہ اس خطے کی تاریخ کو برباد کردیں یا آباد کردیں۔آج کس قدر بھاری بوجھ ہم دونوں کے سروں پر آن پڑا ہے۔اس میں ایسا نہیں کہ ہم دونوں کی غلطی سے کسی ایک کو نقصان پہنچے گا اور کسی ایک کو فائدہ پہنچ جائے گا۔ہم دونوں میں سے کسی ایک کی غلطی دونوں ملکوں کے لئے تباہی کا باعث بن جائے گی۔آج ایک انداز میں اس خطے کی تاریخ کا نیا آغاز ہوگا۔وہ کس طرح کا آغاز ہوگا یہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔میرے علاقے اور میرے قیدی آپ کے ہاتھ میں ہیں۔میرے ہاتھ تو خالی ہیں۔میرے ہاتھوں میں کچھ بھی نہیں ہے جس کا آپ مطالبہ کریں اور مجھ سے تسلیم کروائیں۔آج امن و آشتی کا لیور آپ کے ہاتھ میں ہے۔آج دونوں ملکوں کی دوستی کی کلید آپ کے ہاتھ میں ہے۔میں آپ کے پاس امن کے لئے آیا ہوں، دوستی کے لئے آیا ہوں، اس خطے کی آبادی کے لئے آیا ہوں، اس خطے کی نئی تاریخ رقم کرنے آیا ہوں، تاریخ کا دھارا بدلنے آیا ہوں۔میں اس خطے میں پُرامن اور باوقار زندگی کے قیام کے لئے عملی ثبوت مہیا کر چکا ہوں۔میرا پہلا ثبوت شیخ مجیب الرحمٰن کو آزاد کرنا

تھا۔جس کا مطلب ایک طرح سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا تھا۔میرا امن کا سب سے بڑا ثبوت آپ کے پاس صلح جوئی کے لئے آپ کے پاس آنا ہے اور میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔اب بال آپ کے کورٹ میں ہے۔اندرا جی اس خطے کے امن کا ثبوت اب آپ کو دینا ہے۔میں اس معاملے میں شملہ پہنچ کر سرخرو ہو چکا ہوں۔اپنا کام مکمل کر چکا ہوں۔وزیراعظم بھٹو نے اندرا گاندھی کے فرار حاصل کرنے کے تمام راستے ہی مقفل کر دیئے تھے۔اس کے پاس کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ وہ اِدھر اُدھر کی کوئی بات کر سکتی۔اب ایجنڈے والی بات ہی ختم ہو گئی تھی۔ایجنڈا وجنڈہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔اب بات تاریخ کے حوالے سے کی جارہی تھی۔جدلیات کے اصولوں پر مبنی تھی جس میں کوئی ابہام نہیں رہ سکتا تھا۔اندرا گاندھی یا صلح کو تسلیم کر سکتی تھی یا جنگ کا اعلان کر سکتی تھی۔وزیراعظم بھٹو نے اس کے لئے دوسرا کوئی راستہ چھوڑا ہی نہیں تھا۔یہ معاہدہ ایک طرح سے بالکل صلح حدیبیہ کی طرح کا تھا۔جس میں اہلِ مکہ جو شرط بھی لگاتے تھے رسول پاکؐ اس کو تسلیم کر لیتے تھے۔جس کی وجہ سے مکہ والوں کے پاس سوائے صلح نامہ تحریر کرنے کے اور کوئی راستہ باقی ہی نہیں رہا تھا۔

وزیراعظم بھٹو نے مسز اندرا گاندھی کو آخری بات کرتے ہوئے کہا۔وہ کام جو ہمارے بزرگ نہ کر سکے وہ کام آج آپ کو اور مجھے سرانجام دینا ہے۔وزیراعظم بھٹو کی ان تاریخی حوالوں کی خردمندی کی باتیں سن کر اندرا گاندھی پہلے تو کچھ دیر سوچ میں ڈوبی رہی پھر وہ بھٹو صاحب سے چند منٹ کی اجازت لے کر اپنے دفتر سے باہر اپنے مشیروں اور فوجی کمانڈروں کے پاس گئی۔غالباً اس نے ان کو یہی کہا ہو گا کہ پاکستان کے جنگی قیدی چھوڑ کر اور علاقے واپس کر کے اس قضیئے سے اپنی جان خلاصی کرا لینی چاہئے جس کو منظور کر لیا گیا اور اندرا گاندھی نے واپس اپنے دفتر میں آ کر وزیراعظم بھٹو کو شملہ معاہدے کی کامیابی کی مبارک پیش کر دی۔ شملہ معاہدہ ایک سیاست دان کی سیاسی بصیرت اور سفارت کاری کا شہکار ہے۔وزیراعظم بھٹو کو آج شہادت پائے 27 سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔پاکستان میں ان کے سفاک قاتل اور ان کے بدترین مخالف بھی ان کے کیے گئے شملہ معاہدے پر انگشت نمائی کرنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ہندوستان کے ساتھ آج دوستی کی جتنی پینگیں بڑھائی جارہی ہیں اس کی بنیاد شملہ معاہدہ ہی قرار دی جارہی ہے۔

www.bhutto.org

نوٹ: یہاں پر ایک دلچسپ بات تحریر کرنا بے حد ضروری ہے۔ پاکستان کا موجودہ فوجی حکمران پرویز مشرف ہندوستان کے ساتھ دوستی کے معاہدے کے لئے آگرہ گیا تو اس کی حالت اور اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں ہندوستان کے تجزیہ نگاروں نے کہا تھا کہ وہ شخص ایک گھبرایا ہوا شخص تھا۔ اس کی باڈی ٹاک میں اعتماد نام کی کوئی شے نہیں جھلکتی تھی۔ وہ نو بیاہے گئے دولہے کی طرح اپنے سر پر ہاتھ پھیرتا جاتا تھا، شرمایا ہوا تھا، ڈرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خود کو کسی پنجرے میں محبوس تصور کر رہا تھا۔ (یہ بات ایک فوجی جرنیل اور ایک سیاست دان میں فرق ثابت کرنے کے لئے تحریر کی گئی ہے)

وزیراعظم بھٹو کی وضاحت

پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے کے سب سے بڑے مجرم یحییٰ خان اور اس کے ساتھی جرنیلوں کا کورٹ مارشل نہ کرنے کی وجہ ان کو معاف کرنے کی وجہ بھٹو صاحب نے یہ بیان کی تھی کہ پاکستان کی فوج کے 93 ہزار افسر اور جوان ہندوستان کی قید میں تھے۔ عوامی لیگ اور ہندوستان کے فوجی افسران پاکستان کے فوجی افسروں کو ٹرائل کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ ان کو جنگی قانون کے مطابق سزا دینا چاہتے تھے اور جنگی تاوان کا مطالبہ کرتے تھے۔ جبکہ وزیراعظم بھٹو کہتے ہیں کہ میں ان کو چھڑانا چاہتا تھا۔ اگر میں بھی یہاں پاکستان میں ان لوگوں پر جنگی جرائم کے الزام میں مقدمے چلاتا اور ان کو سزائیں دیتا تو بنگلہ دیش اور ہندوستان کے موقف کی تائید ہو جاتی تھی اور ان 93 ہزار کو بچانا ناممکن ہو جاتا تھا۔ ان میں اگر تمام مجرم ہوتے تو صبر کیا جاسکتا تھا۔ مگر ان میں چند جرنیلوں کو نکال کر باقی تمام لوگ بے گناہ تھے۔ میں بے گناہوں کو سزائیں پاتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ان کا قصور تو یہ تھا کہ انہوں نے اپنے افسروں کا حکم مانا تھا اور ان بے گناہوں کی تعداد بہت بڑی تھی۔ اس کے علاوہ اقوامِ عالم میں ان لوگوں کی باعزت واپسی کا اور پاکستان کے علاقوں کی واپسی کا بڑا مطالبہ کمزور ہو جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے میں نے ان لوگوں کا کورٹ مارشل نہیں کیا تھا۔ ملک توڑنے والے جرنیلوں کو معاف کرنا چیئرمین بھٹو کی ایک بہت بڑی بھول تھی۔ ان کو ان جرنیلوں پر غداری کا مقدمہ قائم کرنا چاہئے تھا۔

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو کی دوسری سب سے بڑی بھول ملک غلام مصطفیٰ کھر کو اپنا جانشین بنانا تھی

دوسری بھول کا مسئلہ پہلی بھول سے بھی بڑھ کر سنجیدہ اور اہم ہے۔ یہ مسئلہ تھا ایک قسم کی ان کی سیاسی اور حکومتی جانشینی کا مسئلہ۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ دنیا میں نبی بھی وہی کامیاب ہوئے جن کے حواری اچھے تھے جن کے ساتھی اچھے تھے جن کے ساتھی وفادار تھے، وفا شعار تھے۔ جس نبی کے حواری اچھے نہیں تھے ان کا انجام بھی اچھا نہیں ہوا تھا۔ مثال کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری تمام کے تمام وعدہ معاف گواہ بن گئے تھے۔ نتیجہ جس کا ان کی پھانسی کی شکل میں دیکھنے میں آیا تھا۔ ہمارے نبیؐ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی اچھے تھے وفادار تھے اور وفا شعار تھے۔ ان پر اپنی جان قربان کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ہمارے نبیؐ دنیا کے کامیاب ترین نبیؐ تھے۔

انسانی معاشروں کی سیاسی قیادت میں بھی اس مثال کی پیروی کرنا ہر قیادت کے لئے اشد ضروری ہے۔ ایک سیاسی قیادت کے لئے انتہائی لازم ہے کہ اس کی ساتھی سیاسی قیادت یعنی درجہ دو کی قیادت اس کے نظریات وخیال کی مظہر ہو۔ قیادت کے اصولوں کی کاربند ہو۔ مخلص ہو، بے لوث ہو، دیانت دار ہو، اور فرض شناس ہو، وفا شعار ہو اور قیادت پر قربان ہونے کا جذبہ رکھتی ہو۔

جہاں تک چیئرمین بھٹو کی ذات کا تعلق تھا ان کی ذات بلاشبہ بہت بڑی تھی۔ مگر ان کے بعد کی درجہ دو کی قیادت جن کو وہ پسند کرتے تھے وہ ان کی طرح فعال اور متحرک نہیں تھی۔ جہاں تک پیپلز پارٹی کا تعلق تھا تو پیپلز پارٹی ابھی اپنی تشکیل کے مراحل میں تھی کہ 1970ء کے انتخابات میں شریک ہو گئی۔ انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ پارٹی ہر شہر اور ہر گاؤں میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے کامیاب ممبران کی پیپلز پارٹی بن گئی۔ پارٹی کا تنظیمی ڈھانچہ پیچھے چلا گیا اور ممبرانِ اسمبلی کے گروہ آگے آ گئے تھے۔ سیاسی جماعتوں میں انتخابات میں اکثر ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ مگر ایک سیاسی جماعت کو ایک منظم سیاسی جماعت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ جماعت کے تنظیمی عہدوں کو اولیت دی جائے۔ پارٹی پر تنظیمی عہدوں کا تشخص قائم کیا جائے۔ چیئرمین بھٹو کا اور پاکستان پیپلز پارٹی کا اقتدار ایک حادثاتی اقتدار تھا ایک اتفاقیہ اقتدار تھا۔

اس وقت فوج کے پاس پیپلز پارٹی کو اقتدار دینے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی موجود نہیں

تھا۔ پیپلز پارٹی کو اقتدار دینا سیاسی اعتبار سے بھی درست تھا اور آئینی اعتبار سے بھی درست تھا۔ اس کے علاوہ پیپلز پارٹی کو اقتدار دینے کی جو ناگزیر وجہ تھی وہ چیئرمین بھٹو کی قیادت اور ان کی ذات تھی۔ اس وقت پاکستان کے جو سیاسی حالات بن گئے تھے ان حالات کا سامنا کوئی کرشمہ ساز انسان ہی کر سکتا تھا۔ وہ ایک بین الاقوامی سطح کی شخصیت ہی کر سکتی تھی جو چیئرمین بھٹو کے علاوہ اور کوئی ایسی شخصیت نہیں تھی جس کو پاکستان کا اقتدار دیا جاتا۔

آئینی طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کو اقتدار دینا اس لئے ضروری اور قانونی تھا کہ پیپلز پارٹی کو مغربی پاکستان کی اسمبلی میں اکثریت حاصل تھی دوسری سب سے بڑی اہم وجہ پیپلز پارٹی کو اقتدار دینے کی یہ تھی کہ پیپلز پارٹی نے قومی انتخاب نظریہ پاکستان کے مطابق جیتا تھا۔ پیپلز پارٹی وفاق پاکستان پر ایمان رکھتی تھی۔ پیپلز پارٹی کی فتح پاکستان کے آئین کے مطابق ایک قومی فتح تھی۔ جبکہ شیخ مجیب الرحمٰن کی انتخابی فتح چھ پوائنٹ کی بدولت تھی جس میں وفاق پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا عوامی لیگ کے مشرقی پاکستان کو پاکستان سے علیحدہ کر دینے کے بعد پاکستان میں صرف اور صرف پاکستان پیپلز پارٹی ہی وہ قومی پارٹی تھی جس نے پاکستان کے نام پر انتخاب جیتا تھا۔ لہٰذا پاکستان پیپلز پارٹی کو اقتدار دینا جہاں فوجی ٹولے کی مجبوری بن گیا تھا۔ وہاں پیپلز پارٹی کو اقتدار دینا آئینی طور پر بھی درست اور قانون کے مطابق تھا۔ مگر اس قسم کے حادثاتی نوعیت کے اقتدار کے حاصل ہو جانے کے بعد چیئرمین بھٹو کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ صوبوں کی حکمرانی کے لئے بڑے دانا اور دور اندیش لوگوں کا انتخاب کرتے۔ ایسے لوگوں کا انتخاب کرتے جو تجربہ کار ہوتے عوام دوست ہوتے۔ آئین پرست ہوتے۔ پارٹی کے منشور پر ایمان رکھتے ہوتے۔ جو پارٹی اور عوام کو سب سے افضل خیال کرتے۔

اس کے علاوہ پاکستان پیپلز پارٹی کے تشخص کو دوام بخشنے کے لئے ضروری تھا کہ پارٹی کے عہدہ داروں کو ان کے حفظِ مراتب کے مطابق حکومت میں عہدے دیئے جاتے۔ اس اصول کے تحت ضروری تھا کہ پنجاب میں پیپلز پارٹی کی حکومت کا سربراہ پنجاب پیپلز پارٹی کا صدر بنایا جاتا اور سندھ میں سندھ کی صوبائی حکومت کا سربراہ سندھ کی پیپلز پارٹی کے صدر کو بنایا جاتا۔ چیئرمین بھٹو کے پاس اتفاق سے ان دونوں بڑے صوبوں میں دونوں صوبوں کے پیپلز پارٹی کے صدر بے حد عوامی انسان تھے بے حد مخلص انسان تھے۔ بڑے بزرگ سیاسی رہنما تھے۔ اچھی شہرت اور

اچھی شخصیت کے حامل انسان تھے۔ اعلیٰ قسم کے سیاسی کارکن تھے اور چیئرمین بھٹو کی قیادت اور ان کے سیاسی اصولوں کے صحیح پیروکار تھے اور سچے ترجمان تھے۔ وہ عوامی انسان رسول بخش تالپور اور شیخ محمد رشید تھے۔ یہ دونوں حضرات اپنے اپنے صوبے میں مناسب ترین انسان تھے۔

مگر یہ ایک تاریخی امر ہے کہ ہر بڑی تاریخی شخصیت میں اس کی تمام عظمتوں کے باوجود کوئی نہ کوئی خلا ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو میں مردم شناسی کا خلا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ میرا کوئی دوست میری اس بات سے اتفاق نہ رکھتا ہو۔ مگر میں اپنے مکمل ایمان کی روشنی میں اپنے تجربے کی بنا پر یہ بات تحریر کررہا ہوں۔ میں نے چیئرمین کی ذات میں کچھ اس قسم کا خلا ہی محسوس کیا تھا۔ میری بات کی صداقت کی حتمی شہادت کے لئے جنرل ضیاء الحق کے انتخاب کی مثال ہی بہت کافی ہے۔ شیخ محمد رشید کو اور رسول بخش تالپور کو حکومتی عہدوں پر لانے سے پاکستان پیپلز پارٹی کی سیاست اور اس کے منشور کے تمام عوامی تقاضے پورے ہو سکتے تھے۔ اس لئے کہ ان دونوں حضرات کے لئے یہ حکومتی عہدے ان کی کامیابی کی آخری معراج ہو سکتے تھے۔ یہ عہدے ان کی خواہشوں سے بڑے عہدے تھے۔ یہ دونوں حضرات چیئرمین بھٹو کی ہمسری کرنا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کے لئے یہ عہدے ہی بہت کافی تھے۔ ان دونوں حضرات سے نہ تو کسی اقتدار کی سازش کا خطرہ ہوسکتا تھا۔ اور نہ ہی کسی غداری کا خطرہ تھا۔ نہ تو ان کے ایمان کو کوئی فوجی جرنیل خرید سکتا تھا اور نہ ہی کبھی وہ چیئرمین بھٹو کی جگہ حاصل کرنے کی غلط فہمی کا شکار بنائے جاسکتے تھے یا بن سکتے تھے۔ مگر چیئرمین بھٹو نے پنجاب میں حکمرانی کے لئے اپنا انتخاب نظر ملک غلام مصطفیٰ کھر کو بنایا اور سندھ میں میر رسول بخش کی جگہ ممتاز علی بھٹو کو حکمرانی کے لئے اپنا انتخاب نظر بنایا۔

چیئرمین بھٹو کے دوسرے جانشین معراج محمد خان

چیئرمین بھٹو کے دوسرے جانشین معراج محمد خان تھے۔ اس دوسرے جانشین کے مسئلے میں بھی قسمت چیئرمین بھٹو کے حق میں نہیں تھی۔ پہلا جانشین انتہا درجے کا ابن الوقت اور اقتدار پرست تھا۔ وہ اپنے اقتدار کے لئے سب کچھ قربان کرسکتا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کی دوستی اور انتہائی قربت کی وجہ سے پہاڑ کی چوٹی پر اُگا ہوا تنکا تھا جو خود کو پہاڑ سے بلند اور اونچا تصور کرنے لگ گیا تھا۔ جس کو آپ اسی کتاب میں آگے چل کر ''کھر بغاوت'' کے عنوان سے ملاحظہ کریں گے۔ کھر

کی نسبت دوسرا ان کا جانشین معراج محمد خان ایک بہتر پرولتاریہ لیڈر تھا مگر اس کے ساتھ لاحقہ یہ تھا کہ وہ اپنے گرو کی سیاست ہی نہیں کرتا تھا۔ اس کی سیاست کے تار پود کہیں اور تھے وہ اپنی ہر بات انقلاب کے نام پر کرنے کا داعی تھا۔ وہ اپنے گرو کے ساتھ بھی اپنے اختلاف کو انقلاب کا نام دیا کرتا تھا۔ گویا اس دوسرے جانشین کی سیاست ہی چیئرمین بھٹو کی نہیں تھی۔ لہٰذا جس جانشین کی سیاست اپنے لیڈر کے برعکس ہو اس کی جانشینی پر چیئرمین بھٹو کیا تکیہ کر سکتا تھا۔ اس دوسرے جانشین کا واٹرلو بھی مصطفےٰ کھر ہی کی طرح کا تھا۔ مگر اس کی شکل صورت مختلف تھی۔

ممتاز علی بھٹو

جہاں تک ممتاز علی بھٹو کا معاملہ تھا وہ بھٹو صاحب کا خاندانی معاملہ تھا۔ بھٹو صاحب اپنے خاندان کے بارے میں بے حد حساس ہوا کرتے تھے۔ سندھ کے ماضی کے اقتدار میں سندھ کے کچھ حکمران خاندانوں کے ساتھ بھٹو خاندان کی اقتدار کے مسئلے پر کچھ چپقلش چلی آ رہی تھی۔ خاص طور پر پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سندھ میں جتنے خاندان بھی برسر اقتدار آئے تھے ان اکثر حکمران خاندانوں کا تعلق لاڑکانے سے ہی تھا۔ جن میں قاضی عیسیٰ کا خاندان تھا اور ایوب کھوڑو کا خاندان بہت مشہور تھا۔ چیئرمین بھٹو کے والد محترم بھی چونکہ پاکستان کے بانیوں میں سے ایک تھے بلکہ سندھ کو پاکستان کا حصہ بنانا ان کی جدوجہد کا شاندار کارنامہ تھا۔ چیئرمین بھٹو کے والد سر شاہ نواز بھٹو کی وفات کے بعد بھٹو صاحب کا خاندان کچھ عرصہ تک سندھ کی حکمرانی کی سیاست سے باہر ہو گیا تھا۔ بھٹو خاندان کی سیاست کا دوبارہ آغاز چیئرمین بھٹو کی ذات سے ہی ہوا تھا اور ان کے پاکستان کے وزیر خارجہ بن جانے کے بعد تو لاڑکانہ صرف اور صرف چیئرمین بھٹو کے نام کے ساتھ ہی منسوب ہو کر رہ گیا تھا۔

لہٰذا سندھ کے اقتدار کے بارے میں ان کا بہت حساس نقطۂ نظر تھا۔ سندھ ان کی کمزوری تھا۔ لاڑکانہ ان کا ایک طرح کا مکہ اور مدینہ تھا۔ وہ اپنے اس شہر کے لئے بے حد جذباتی تھے۔ ان کا سندھ اور بالخصوص لاڑکانے کے ساتھ بہت رومانس تھا۔ آخری بات کہے دیتا ہوں کہ وہ سندھ اور لاڑکانہ کے عاشق تھے۔ میں نے کسی پنجابی سیاست دان یا حکمران کو اپنی جنم بھومی کے معاملے میں اس قدر شدید حساس نہیں پایا جتنے کہ چیئرمین بھٹو حساس تھے۔ میں لاڑکانے میں ان کو بے حد

www.bhutto.org

مختلف انسان پاتا تھا۔

ممتاز علی بھٹو ان کے چچازاد بھائی تھے ان کو وہ اپنا ٹلنٹیڈ کزن کہا کرتے تھے۔ ممتاز علی بھٹو کے ساتھ میری بھی بڑی جذباتی محبت تھی ہم سب جدوجہد کے ساتھی تھے اقتدار سے پہلے وہ بہت ہی شفیق اور ہمدرد انسان ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں ان کے اندر وڈیرا شاہی کم ہی دیکھنے میں آیا کرتی تھی۔ وہ ایک پڑھے لکھے انسان دیکھائی دیا کرتے تھے۔ انگریزی لٹریچر کا بہت مطالعہ کیا کرتے تھے۔ تاریخ وادب پر میری ان سے اکثر بات چیت ہوا کرتی تھی۔ وہ ملک غلام مصطفیٰ کھر کے مقابلے میں میری بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت میں جو بگاڑ پڑا تھا یا جو خرابی واقع ہوئی تھی وہ سندھ کا اقتدار حاصل کرنے کے بعد واقع ہوئی تھی۔ چیئر مین بھٹو کا ان کو سندھ کا گورنر یا وزیر اعلیٰ بنانا ان کی قومی سیاست کی مصلحت کے خلاف تھا۔ ممتاز علی بھٹو میں اور ان کی ذات میں کوئی فرق ہی نہیں تھا یہ دونوں انسان ایک ہی انسان کے دو پیکر محسوس ہوا کرتے تھے۔ اقتدار سے پہلے میں نے یا کسی بھی دوسرے انسان نے ان دونوں بھائیوں میں کبھی کسی معاملے پر نہ تو کوئی تفریق دیکھی تھی اور نہ ہی کبھی کوئی اختلاف دیکھا تھا۔ چیئر مین بھٹو کا زیادہ تر انتخابات میں پنجاب میں وقت صرف ہوتا تھا۔ سندھ میں ان کی جگہ ممتاز علی بھٹو ہی انتخابی دورے جاری رکھتے تھے۔ 1970ء کے انتخابات کے دوران مجھے خاص طور پر ممتاز علی بھٹو نے سندھ کے پورے انتخابی دورے میں اپنے ساتھ رکھا تھا۔ ان انتخابی دوروں میں یا تو میر علی احمد تالپور تقریریں کرتے تھے یا میر رسول بخش تالپور تقریریں کرتے تھے یا ممتاز علی بھٹو تقریر کیا کرتے تھے یا میں ان جلسوں میں نظم پڑھا کرتا تھا اور تقریر کیا کرتا تھا۔

مگر اب جب چیئر مین بھٹو کو پاکستان کا اقتدار مل چکا تھا تو ان کے لئے ضروری تھا کہ خاص طور پر سندھ میں وہ میر رسول بخش تالپور کو یا غلام مصطفیٰ جتوئی کو وزیر اعلیٰ بناتے اور ممتاز علی بھٹو کو یا تو گورنر بنا دیتے یا اپنے ساتھ مرکزی حکومت میں کسی کلیدی عہدے پر مقرر کر دیتے۔ ان کو اپنے ساتھ اور اپنے قریب رکھتے تاکہ ممتاز علی بھٹو ان کے ساتھ حکومتی معاملات میں ایک مددگار کی حیثیت میں ہر وقت ان کے ساتھ رہتے۔ سندھ میں صوبے کی حکمرانی میں حکومتی معاملات میں ایک وزیر اعلیٰ کے کئی لوگوں کے ساتھ اقتدار کے مسئلے پر اختلافات ہو سکتے تھے۔ کوئی وزیر اعلیٰ اقتدار کے معاملے میں تمام گروہوں کو کبھی خوش نہیں رکھ سکتا۔ ہر علاقے کی سیاست میں گروپ

بندی ہوتی ہے دھڑے بندی ہوتی ہے۔ ہر علاقے میں کچھ ایسے سیاسی خاندان ہوتے ہیں جن کے آپس میں نہ ختم ہونے والے سیاسی اختلافات ہوتے ہیں اور کئی ایک خاندانوں کے سیاسی اختلافات ذاتی اختلافات شکل اختیار کر جایا کرتے ہیں۔ جس سے بعض اوقات حکمرانوں کے لئے بہت خطرناک صورت حال پیدا ہو جایا کرتی ہے جس طرح کی کہ ممتاز علی بھٹو کی حکمرانی کے دوران چیئرمین بھٹو کے لئے سندھ میں پیدا ہو گئی تھی۔ چیئرمین بھٹو اب پورے ملک کے حاکم تھے بہ حیثیت ایک حکمران کے ایک وزیر اعظم کو ہر صوبے کے یا ہر علاقے کے تمام دھڑوں کو ساتھ رکھنے کی ضرورت تھی۔ مگر افسوس کہ وہ پاکستان کے چاروں صوبوں میں اپنے خاص دوستوں اور اپنے انتخاب نگاہ کو ہی حکومت دینے کے عمل پر کاربند ہو گئے۔ اس معاملے میں انہوں نے کسی سیاسی مصلحت کا ہرگز کوئی خیال نہ رکھا تھا۔ صوبوں کی حکومتوں کی تقسیم اور تشکیل کے معاملے میں ان کے طریقے بادشاہوں سے ملتے جلتے تھے۔ بادشاہ چونکہ مطلق العنان ہوتا ہے اس کو کسی گروہ یا دھڑے کی پسند اور ناپسند کی کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ مگر ایک جمہوری قائد اور منتخب وزیر اعظم ہر علاقے کے تمام سیاسی طبقوں شخصیتوں سیاسی جماعتوں دھڑوں اور گروہوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے مجبور ہوا کرتا ہے۔ وہ اپنی پسند اور ناپسند میں آزاد نہیں ہوا کرتا۔

پاکستان میں جب کہ وزیر اعظم بھٹو کی شکل میں بھٹو خاندان کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ اس صورت میں سندھ کی صوبائی حکومت قائم کرنے میں کسی طرح بھی بھٹو خاندان کو ملوث نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بھٹو خاندان کو سندھ صوبے کی سیاست میں آزاد رہنا چاہئے تھا۔ اس کو ایک ریفری کا کام سرانجام دینا چاہئے تھا۔ سندھ کا وزیر اعلیٰ کوئی بھی بنایا جاتا اس کو ہر صورت بھٹو خاندان کے تابع ہی رہنا تھا۔ اس کو وزیر اعظم کے حکم کے مطابق کام کرنا تھا۔ اس صورت میں کسی بھی وزیر اعظم کو کسی دھڑے کے اختلاف کی بنا پر تبدیل کرنا آسان ہو جاتا اور صوبے کی سیاست پر وزیر اعظم کی گرفت بھی بہت مضبوط ہو سکتی تھی۔

مگر ممتاز علی بھٹو کو وزیر اعلیٰ سندھ بنا دینے کے بعد چیئرمین بھٹو کی وہ تمام آزادی ختم ہو گئی جو آزادی ان کو کسی دوسرے وزیر اعلیٰ کے ہوتے حاصل ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ ممتاز علی بھٹو کا چیئرمین بھٹو کے ساتھ خاندانی معاملہ تھا سیاسی معاملہ نہیں تھا، سیاسی تعلق یا سیاسی رشتہ نہیں تھا۔ پاکستان کی سیاست کے مطابق ہر وزیر اعلیٰ اپنی حکومت کی مضبوطی کے لئے اپنے صوبے میں یا اپنی حکومت میں

اپنا ایک دھڑہ خود بناتا ہے اور اپنے دھڑے کے لوگوں کو ہر طرح سے نوازتا ہے۔ اس طرح کی دھڑے بازی کی سیاست جاگیردارانہ سیاست کا خاصا ہوتی ہے اور جب وزیراعلیٰ خود جاگیردار ہو تو دھڑہ پروری کا کام اور بھی قوت اختیار کر جاتا ہے۔ سندھ میں چند ایک گھرانوں کو چھوڑ کر باقی تمام جاگیردار پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل تھے۔ پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد ان جاگیرداروں میں اقتدار کی تقسیم میں اختلافات ہو جانے ایک فطری بات تھی۔ لہٰذا ممتاز علی بھٹو کے وزیراعلیٰ بن جانے کے بعد وہی ہوا جو جاگیرداروں کی سیاست میں ہوا کرتا ہے۔

مگر ممتاز علی بھٹو کے اقتدار کی وجہ سے ان جاگیرداروں کے اختلافات صرف ممتاز علی بھٹو کی پریشانی کا باعث نہیں بنتے تھے ان کے اختلافات وزیراعظم بھٹو کی پریشانی بن جاتے تھے۔ وہ ممتاز علی بھٹو کے ہر حکم کو وزیراعظم بھٹو کا حکم تصور کرتے تھے۔ ممتاز علی بھٹو کی ان کے ساتھ کی گئی کسی زیادتی کو وہ وزیراعظم بھٹو کے ساتھ منسوب کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے خلاف ممتاز علی بھٹو جو کچھ بھی کر رہا ہے بھٹو صاحب کے حکم پر کر رہا ہے۔ ممتاز علی بھٹو کی حکمرانی کی شکل میں چیئرمین بھٹو کے لئے سندھ میں یہ صورت بے حد خطرناک بن جاتی تھی۔ خاص طور پر عبدالحمید جتوئی اور غلام مصطفیٰ جتوئی اور ممتاز علی بھٹو کے اختلافات میں بالکل یہی ہوا تھا جو میں نے اوپر تحریر کیا تھا۔ قومی اسمبلی کے کیفے ٹیریا میں غلام مصطفیٰ جتوئی بہت رنجیدہ بیٹھے تھے۔ ان دنوں ممتاز علی بھٹو کے جتوئی خاندان کے ساتھ اختلافات اپنی عروج پر تھے۔ ان کے ساتھ اور بھی ایم۔ این۔ اے حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ جتوئی صاحب کے ساتھ میری بھی صاحب سلام تھی۔ میں بھی ان کی مجلس میں بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ اپنے خاندان کے ساتھ سندھ میں ہونے والی زیادتیوں کی باتیں کر رہے تھے اور وہ بار بار کہے چلے جا رہے تھے کہ اب ہمارا بھٹو صاحب کے ساتھ مزید آگے چلنا مشکل ہو گیا ہے۔ اب ہم بھٹو صاحب کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ میں نے جتوئی صاحب کو کہا کہ آپ کے ساتھ جو بھی ظلم یا زیادتی ہو رہی ہے وہ ممتاز علی بھٹو کی طرف سے ہو رہی ہے۔ آپ ان تنازعات میں بھٹو صاحب کو کیوں ملوث کر رہے ہیں۔ بھٹو صاحب تو آپ کے دوست ہیں۔ آپ ان کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ ہمیشہ ان کے قریب رہے ہیں۔ مگر جتوئی صاحب کا جواب میرے لئے حیران کن تھا۔ جتوئی صاحب نے کہا۔ شاعر صاحب ممتاز علی بھٹو، بھٹو صاحب کے حکم کے خلاف چھینک نہیں مار سکتا۔ ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، ممتاز علی بھٹو جو کچھ بھی کر رہا ہے بھٹو صاحب کے حکم کے مطابق کر رہا

ہے۔سائیں اصل حاکم بھٹو صاحب ہیں ممتاز علی بھٹو تو نام کے حاکم ہیں۔

آج میں سوچتا ہوں کہ اگر ایک پارٹی کا بانی انسان چیئرمین بھٹو کا ذاتی دوست اگر چیئرمین بھٹو کے بارے میں اس قدر بدگمان ہو سکتا تھا تو چیئرمین بھٹو کے سیاسی مخالفین بھٹو صاحب کے بارے میں کتنے بدگمان ہوتے ہوں گے۔یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کے ناراض کیئے ہوئے تمام لوگ چیئرمین بھٹو کی جان کے دشمن بن جایا کرتے تھے۔وہ ان لوگوں کی ہر زیادتی کو بھٹو صاحب کے نام منسوب کر دیتے تھے۔

وزیراعظم بھٹو کے تمام دشمنوں نے نہ تو کبھی مصطفیٰ کھر کو اپنا دشمن قرار دیا تھا اور نہ ہی ممتاز علی بھٹو کو اپنا دشمن قرار دیا تھا۔وہ ہمیشہ وزیراعظم بھٹو کو اپنا دشمن قرار دیا کرتے تھے اور اس سے ہی انتقام لینے کی بات کیا کرتے تھے۔

ممتاز علی بھٹو کے معاملے میں صورت حال زیادہ نازک تھی۔اس کی وجہ ممتاز علی بھٹو کا بھٹو صاحب کے بھائی ہونا تھی۔کزن ہونا تھی۔وزیراعظم بھٹو نے غلام مصطفیٰ جتوئی کے ساتھ اس کو وزیراعلیٰ سندھ بنانے کا وعدہ بھی کر رکھا تھا۔جس وعدے کو انہوں نے بعد میں پورا بھی کر دیا تھا۔ مگر اس وقت سندھ صوبے کی سیاست میں وزیراعظم بھٹو کا بہت زیادہ نقصان ہو چکا تھا۔

ممتاز علی بھٹو کا اقتدار اور سندھی قوم پرستی کی سیاست

ممتاز علی بھٹو جب تک اقتدار میں نہیں تھے اس وقت تک ان کے خیال ونظریات کا کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ہو سکتا ہے کہ ان کے قریب کے دوستوں کو ان کے سیاسی خیالات سے آگاہی ہو۔مگر عام لوگوں کو خود مجھے بھی ان کے سیاسی خیالات سے کچھ واقفیت نہیں تھی۔مگر ان کے اقتدار حاصل کرنے کے فوراً بعد ان کے اندر کا وڈیرہ ممتاز علی بھٹو باہر آ گیا تھا۔ان کی طرزِ سیاست اور طرزِ حکومت سے معلوم ہوا تھا کہ ان کے آئیڈیل بلوچستان کے قوم پرست سردار تھے اور سندھ میں جی۔ایم سید تھا۔ان کا اقتدار عام فہم کا جمہوری اقتدار نہیں تھا یا جمہوری سیاست کا اقتدار نہیں تھا۔ان کے اقتدار کی نوعیت خیر بخش مری اور اکبر بگٹی کے طرزِ اقتدار سے ملتی جلتی تھی۔جس میں مروجہ جمہوری آزادی کی نام کی کسی شے کا کچھ عمل دخل نہیں تھا۔جس طریقے کے ساتھ بلوچ سردار بلوچستان کے اقتدار کو صرف اور صرف بلوچوں کا اقتدار تصور کرتے ہیں اسی طرح ممتاز علی بھٹو بھی سندھ کے

www.bhutto.org

اقتدار کو صرف اور صرف سندھیوں کا اقتدار تصور کرتے تھے۔ وہ اپنے اقتدار میں اردو سپیکنگ لوگوں کا یا مہاجروں کا کوئی حصہ تصور نہیں کرتے تھے۔

سندھ میں مہاجروں کی علیحدہ سیاست کے آغاز کی تحریک میں شدت ممتاز علی بھٹو کی حکمرانی میں ہی دیکھنے میں آئی تھی۔ ان کے اقتدار سے پہلے سندھی اور مہاجر کی تقسیم اتنی انتہائی تقسیم نہیں ہوتی تھی۔ اس تقسیم میں ایک قسم کا ٹھہراؤ اور اعتدال موجود تھا۔ سندھ کی سیاست میں مہاجر اور سندھی کی پولورائزیشن ممتاز علی بھٹو کے اقتدار میں ہی نمایاں ہوئی تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو جب اقتدار حاصل ہوا تو سندھ کے معروف قوم پرست جی۔ ایم سید کے تقریباً تمام اہم اراکینِ اسمبلی پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ جن کی سندھ میں وجہ شہرت قوم پرستی کی سیاست تھی ان میں سے کئی ایک کو صوبائی وزارتوں سے نوازا گیا تھا۔ سندھ میں قوم پرستوں کو پارٹی میں شامل کرنے اور حکومتی عہدے دینے میں چیئرمین بھٹو کی کوشش تھی کہ سندھ کے قوم پرستوں کو قومی دھارے میں شامل کر لیا جائے تاکہ سندھ کی سیاست میں انتہا پرستی کی سیاست کا خاتمہ ہو جائے۔ وزیراعظم بھٹو کی یہ کوشش ایک قابلِ تعریف کوشش تھی مگر ممتاز علی بھٹو کے مزاج پر قوم پرستی کا رنگ کچھ زیادہ ہی گہرا ہو گیا۔ قوم پرست ان پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہو گئے۔ ان کے اندازِ اقتدار سے محسوس یہ ہوتا تھا کہ وہ سندھ میں جی۔ ایم سید سے قوم پرستی کی سیاست اور قیادت چھین لینا چاہتے تھے اور وقتی طور پر وہ سندھ کی سیاست میں اپنی حکمتِ عملی میں کامیاب بھی دکھائی دیتے تھے۔ مگر ان کی اس کامیابی کے نتائج اچھے ثابت نہیں ہوئے تھے۔ قوم پرستی کی سیاست میں ایک بنیادی خرابی ہوتی ہے کہ اس سیاست میں توازن برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر تو معاملہ صرف جی۔ ایم سید کی طرح کی قوم پرستی کا ہو جس قوم پرستی میں حکومتی مصلحت اور اقتدار کی تقسیم کی مجبوریاں نہیں تھیں۔ یعنی صرف قوم پرستی کی پیری فقیری تک ہی بات تھی۔ اپنی سیاست کی دوکان چمکانے تک ہی بات محدود تھی۔ تو ایسی شکل میں قوم پرستی کی سیاست کی جا سکتی تھی۔ جس طرح کی جی۔ ایم سید کرتا تھا جس کی قوم پرستی اس کے حلقہء اثر اور حلقہء سیاست تک محدود تھی۔

اس میں حکومتی حکم احکام کی کوئی بات نہیں تھی۔ جی۔ ایم سید کی قوم پرستی اس کا ذاتی مسئلہ تھا یا اس کے کچھ ہم خیالوں کا ذاتی مشغلہ تھی اس کا پورے سندھ کے صوبے کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر یہی قوم پرستی کی سیاست جب ممتاز علی بھٹو کی حکومت کی شکل میں دیکھنے آنے لگی تو یہ

www.bhutto.org

صوبہ سندھ کی مجموعی سیاست کے لئے ایک خطرناک طوفان بن کر سامنے آ گئی۔ جس کا آغاز جس کی ابتدا سندھی زبان کو سندھ کی سرکاری زبان بنانے یا قرار دینے کے لئے سندھ کی صوبائی اسمبلی سے کی گئی۔ جس کی قطعی طور پر کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ایک انتہائی غیر سیاسی اور احمقانہ قسم کی سیاست بازی تھی۔ یہ خوامخواہ کا فساد برپا کرنے کی حماقت تھی۔ جس فساد کو ممتاز علی بھٹو کی حکومت خود برپا کر رہی تھی اور صوبے میں غیر سندھیوں یعنی اردو بولنے والوں کو انتشار پیدا کرنے کی خود دعوت دے رہی تھی۔

سندھ اسمبلی میں پاکستان پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل تھی۔ ایک طرح سے تمام سندھی پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل تھے۔ سندھ میں مہاجر ہی صرف پیپلز پارٹی سے باہر تھے۔ مگر تمام مہاجر پیپلز پارٹی سے باہر نہیں تھے۔ ان مہاجرین میں ایک اچھی خاصی تعداد پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل تھی۔ پیپلز پارٹی کے لئے سندھ میں انتہائی ضروری تھا کہ وہ مہاجر قوم کو اپنی آزاد سیاست کے بل پر اپنے ساتھ شریک کرنے کی کوشش کرتی۔ مہاجروں کو اپنا ہمنوا بناتی ان کو اپنے اقتدار اور اپنے اختیار میں شریک کرتی۔ یہ امر سندھ پیپلز پارٹی کے لئے اہم تھا اور ضروری تھا۔ سندھ کی حکومت کی مصلحت کا تقاضا ہی یہی ہونا چاہئے تھا کہ وہ ایسی کوئی صورت حال پیدا نہ کرتی جس صورت حال سے مہاجر پریشان ہوتے۔ ممتاز علی بھٹو کی حکومت کو مہاجروں کو ناراض نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سندھی مہاجروں کی سیاست میں تفریق پیدا نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اس میں خود ان کی حکومت اور پیپلز پارٹی کو ہی فائدہ حاصل ہونا تھا۔ ممتاز علی بھٹو کو اس بات کا احساس رکھنا چاہئے تھا کہ افواجِ پاکستان کے جرنلوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کو خوشی سے اقتدار نہیں دیا تھا۔ پیپلز پارٹی کو اقتدار پاکستان کے دو ٹکڑے ہونے کی نموشی اور شرمندگی کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ اقتدار کے تمام خفیہ راستوں پر فوجی جرنلوں کا قبضہ تھا۔ تمام خفیہ ایجنسیاں فوج کے ہی قبضہء اختیار میں تھیں۔ فوجی جرنل اپنی شکست فاش کے باوجود اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔

شکست خوردہ فوجی جرنیلوں کی خفیہ سازش

شکست خوردہ فوجی جرنیلوں کی سازش تھی کہ لوگوں پر جلد از جلد ثابت کر دیا جائے کہ سیاسی جماعت یا پیپلز پارٹی پاکستان پر حکومت کرنے کی اہل ہی نہیں ہے۔ سیاسی جماعت کے اقتدار کو وہ

اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ان کی سازش تھی کہ پیپلز پارٹی اور وزیراعظم بھٹو فوجی جرنیلوں کی کٹھ پتلیاں بن کر کام کریں۔ان کی خواہش کے مطابق حکومت کریں۔فوجی جرنیل بھٹو کو ایک کمزور ترین وزیراعظم بنا کر حکومت پر فائض رکھنا چاہتے تھے۔ایک مضبوط وزیراعظم ان کو کسی قیمت پر منظور نہیں تھا۔یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی خفیہ فوجی ایجنسیوں کے ذریعے ملک میں بدامنی پیدا کرنا چاہتے تھے۔وزیراعظم بھٹو کی حکومت کو پاؤں جمانے نہیں دینا چاہتے تھے۔وہ فوجی جرنیل وزیراعظم بھٹو کو اپنے ہر قدم پر اپنا مرہونِ منت کرنا چاہتے تھے۔اپنا محتاج رکھنا چاہتے تھے۔وہ ابتدا میں ہی وزیراعظم بھٹو کو دل برداشتہ بنا دینا چاہتے تھے۔خوفزدہ کردینا چاہتے تھے۔

پاکستان میں وزیراعظم بھٹو کی حکومت کو ابتدا ہی میں ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جن مشکلات کا ان سے پہلے کبھی کسی حکومت کو سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔پنجاب میں فوج کی خفیہ تنظیموں نے پولیس کی ہڑتال کروادی تھی اور سندھ میں ممتاز علی بھٹو کی غلط سیاست سے فائدہ اٹھا کر مہاجروں کو پیپلز پارٹی کی حکومت کے سامنے لاکر کھڑا کردیا تھا۔

سندھ میں بنگلہ دیش کی طرح کی صورت حال پیدا کردی تھی۔سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیپلز پارٹی کے لیڈر اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ فوجی جرنیلوں کی حکومت کے خلاف سازش اور مداخلت کو دیکھ کر بھی محتاط کیوں نہ ہوتے تھے۔ان کو تو پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہئے تھا۔مگر افسوس کہ سندھ میں ہم نے دیکھا کہ ممتاز علی بھٹو کی حکومت نے کسی مصلحت اور دور اندیشی کا مظاہرہ نہ کیا اور اپنی حکومتی خرابی سے پیپلز پارٹی کے تمام دشمنوں کو موقعہ فراہم کیا کہ وہ مہاجروں کی پشت پناہی کریں۔ فوجی جرنیلوں کو موقعہ دیا کہ وہ مہاجروں کو پیپلز پارٹی کے خلاف بغاوت کرنے کا اشارہ کریں۔

سندھ حکومت نے فوجی جرنیلوں کو مہاجروں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا موقعہ فراہم کردیا۔جو سندھ حکومت کی بہت بڑی غلطی تھی۔

سندھی زبان کا مسئلہ

سندھ میں سندھی زبان کا کسی قسم کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔سندھی پاکستان کے تمام صوبوں میں واحد ایک ایسی مقامی زبان ہے جو صدیوں سے سندھ میں باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے۔تمام سندھی ہمیشہ آپس میں سندھی زبان میں بات کرتے ہیں۔سندھی میں خط وکتابت کرتے ہیں۔یہاں

تک کہ دفتروں میں بھی سندھی بولی اور لکھی جاتی ہے۔ خاص طور پر محکمہ مال کا تمام ریکارڈ صدیوں سے سندھی میں رائج چلا آتا ہے۔ سندھ کی زمینوں کا تمام ریکارڈ سندھی میں ہے۔ تمام پٹوار کھاتے سندھی میں تحریر ہیں۔ تمام زرعی نظام کا ریکارڈ سندھی زبان میں موجود تھا اور موجود چلا آرہا ہے۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں سندھی زبان کے مسئلے کو سندھ کی صوبائی اسمبلی میں پیش کیا جانا ایک بہت بڑی حکومتی غلطی تھی۔ ایک بہت بڑی خفیہ سازش تھی جس کا سندھ کی حکومت کو خود ممتاز علی بھٹو کو قوم پرستی کے نام کے نشے میں مبتلا کر کے شکار بنایا گیا تھا۔

لہٰذا سندھی زبان کو سندھ کی سرکاری زبان بنانے کا بل جب اسمبلی میں پیش کیا گیا تو اس بل کے خلاف کراچی اور حیدر آباد اور سکھر اور سندھ کے تمام دوسرے شہروں میں جہاں اردو بولنے والے رہتے تھے وہاں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ ممتاز بھٹو کو چاہیئے یہ تھا کہ وہ اس طوفان کو ختم کرنے کے لئے اس بل کو فوری طور پر واپس لینے کا حکم کرتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ سندھی مہاجر کی زبان پر بھڑکی ہوئی آگ پر اپنی حکومت کے گھمنڈ کا اور بھی تیل چھڑک دیا۔ وہ سندھ کے ایک قومی ہتھیار کلہاڑی کو اُٹھا کر سندھیوں کے جلوس کی قیادت کرنے کو چل نکلے۔

سندھ کا قومی ہتھیار کلہاڑی تھا

آپ ذرا ممتاز علی بھٹو کی قوم پرستی کا شوقِ سیاست ملاحظہ کریں کہ وہ ایک قدیم دقیانوس قسم کے کلہاڑی کے ہتھیار کو سندھ کی تہذیب کا نشان ظاہر کر رہے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کلہاڑی سندھ کا قدیم ترین اوزار اور ہتھیار ہے۔ جو سندھ کے ہر دیہاتی کے کندھے پر ہوتا تھا یا ہوا کرتا تھا۔ مگر ایک ترقی پسند انقلابی سیاسی جماعت کے پڑھے لکھے وزیر اعلیٰ ہونے کے ناطے ممتاز علی بھٹو کو اس طرح کی قدامت پرستی کا خود مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ان کا یہ اقدام وزیر اعظم بھٹو کی قومی سیاست کے لئے تباہ کن اقدام تھا اور خود ان کی اپنی صوبائی سیاست کے لئے بھی بربادی کا سامان تھا۔

وزیر اعلیٰ سندھ ممتاز علی بھٹو نے کلہاڑی لہرا کر سندھی زبان کے حق میں نکالے گئے جلوس کی قیادت کرنے کا افتتاح کیا اور کئی گھنٹوں تک وہ جلوس کی قیادت میں جلوس کے آگے چلتے رہے۔ افسوس کہ ان سے کسی نے بھی سوال نہ کیا کہ وزیر اعلیٰ سندھ صاحب آپ یہ کلہاڑی بردار جلوس کس

www.bhutto.org

کے خلاف نکال رہے ہیں۔ جلوس تو ہمیشہ کسی حکومت کے خلاف ہی نکالے جایا کرتے ہیں۔ یہ کیسا شوقِ قوم پرستی تھا کہ پیپلز پارٹی کا وزیراعلیٰ اپنی حکومت کے خلاف خود ہی احتجاجی جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔ دوسری صورت میں یہ جلوس مہاجروں کے خلاف بھی ایک مسلح مظاہرہ تھا۔

سندھ کے وزیراعلیٰ کے اس غیر دانش مندانہ مظاہرے کے نتیجے میں کراچی، حیدرآباد اور سکھر کے شہروں میں جہاں مہاجروں کی اکثریت آباد تھی۔ ان شہروں میں سندھ کی صوبائی حکومت کے قانون کی عملداری کا نظام ناپید ہوگیا۔ مہاجروں کے مشتعل جلوس نکلنا شروع ہوگئے۔ ان کا غم وغصہ آسمان کو چھونے لگ گیا۔ پاکستان کی سیاست کی تاریخ میں اس سے پہلے اس طرح کی صورت حال کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ یہ صورت حال بالکل مشرقی پاکستان میں بنگالی زبان والی بن گئی تھی۔ جو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک پہلی دراڑ بنی تھی۔

نوٹ: سندھی قوم پرست جی۔ ایم سید کا پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ تعلق تھا۔ پاکستان کے فوجی حکمران جی۔ ایم سید کے گلے میں ان کے گاؤں جا کر ہار ڈالتے رہے ہیں۔ ممتاز علی بھٹو کو خفیہ ایجنسیوں نے سندھ کے قوم پرستوں کی مدد سے استعمال کیا تھا اور ان کو مہاجر دشمنی کا سمبل بنا دیا تھا۔

ایم۔ کیو۔ ایم کی سیاست کی ابتداء

میرے خیال میں سندھ میں ایم۔ کیو۔ ایم کی سیاست کی ابتداء اور ایم۔ کیو۔ ایم کے قیام کی پہلی اینٹ ممتاز علی بھٹو کے اقتدار نے ہی رکھی تھی۔ سندھی اور مہاجر کی پولورائزیشن ان کی حکمرانی میں ہی ہوئی تھی۔ ان دونوں قومیتوں کی تقسیم کا کام خود ممتاز علی بھٹو نے ہی سرانجام دیا تھا۔ بعد میں یہ پودا فوجی حکمرانوں کی سیاست میں پل پوس کر ایک بہت بڑا درخت بن گیا جس کی جڑیں دور دور تک پھیل گئی تھیں۔

1977ء میں وزیراعظم بھٹو کی حکومت گرانے میں فوج کے بعد ایم۔ کیو۔ ایم کا بہت بڑا کردار تھا اور ایم۔ کیو۔ ایم کی وزیراعظم بھٹو کے ساتھ دشمنی کا آغاز ان کے ٹلنٹیڈ کزن ممتاز علی بھٹو کی حکومت سے ہی ہوا تھا۔ ممتاز علی بھٹو نے ایک طرف تو تمام مہاجروں کو اردو بولنے والوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ دوسری جانب وہ اپنی سندھی سیاست میں کامیاب نہ ہو سکے۔ خود سندھیوں میں

انہوں نے اپنی حکمرانی سے اپنے سیاسی حریف پیدا کر لئے۔ پہلے تو انہوں نے تالپور خاندان کو پیپلز پارٹی سے نکال باہر کیا۔ اس کے بعد ان کو سندھ پیپلز پارٹی میں اپنا سب سے مضبوط سیاسی حریف غلام مصطفیٰ جتوئی کا خاندان اور ان کا سیاسی دھڑا نظر آتا تھا۔

ممتاز علی بھٹو کا سندھ صوبے کی حکمرانی کے دور میں صرف ایک ہی دھڑے کی طرف جھکاؤ ہو گیا تھا۔ وہ دھڑا سندھی قوم پرستوں کا تھا۔ آہستہ آہستہ سندھ پیپلز پارٹی کے اراکینِ اسمبلی ممتاز علی بھٹو کی پسند اور ناپسند کا شکار ہو کر وزیراعظم بھٹو کے پاس وزیراعلیٰ کی شکایات کرنے لگ گئے۔ اسی طریقے کے ساتھ اس تمام ناراض لوگوں کا غلام مصطفیٰ جتوئی کے ساتھ رابطہ ہونا شروع ہو گیا۔ وزیراعظم بھٹو ان دنوں پاکستان کے آئین کی تدوین اور تشکیل میں بے حد پریشان تھے۔ ان کو پاکستان کے آئین کے لئے قومی اسمبلی میں ہر طبقے اور ہر سیاسی جماعت کے اراکینِ اسمبلی کی حمایت کی ضرورت تھی۔ ممتاز علی بھٹو کا مذکورہ رویہ وزیراعظم پاکستان کی قومی سیاست کی ضرورتوں کے انتہائی خلاف تھا۔ ان کی حکمتِ عملی کے برعکس تھا۔ ان کے لئے قومی اسمبلی میں مشکلات پیدا کرنے کا باعث بن چکا تھا۔ اوپر سے ممتاز علی بھٹو نے غلام مصطفیٰ جتوئی کے بڑے بھائی عبدالحمید جتوئی کے خلاف مقدمہ بنا کر اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ شاید ان کی خانہ تلاشی پولیس سے کرائی گئی کچھ اس طرح کا معاملہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ عبدالحمید جتوئی کے خلاف کی گئی اس کارروائی پر غلام مصطفیٰ جتوئی مشتعل ہو گیا اور وہ مرکزی وزارت سے استعفیٰ دے کر راولپنڈی سے بذریعہ ٹرین اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ وزیراعظم بھٹو کے لئے سندھ کی سیاست میں بڑی دشواریاں اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ سندھ کی صورت حالات کو درست کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ ممتاز علی بھٹو کو سندھ کی وزارتِ اعلیٰ کے عہدے سے سبکدوش کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ وزیراعظم بھٹو نے ممتاز علی بھٹو کو سندھ کی وزارتِ اعلیٰ سے ہٹا کر مرکز میں بڑی اہم وزارت پر فائض کر دیا مگر ممتاز علی بھٹو نے وزیراعظم بھٹو کے اس فیصلے کو پسند نہیں کیا تھا۔ انہوں نے سندھ کی وزارتِ اعلیٰ کے عہدے سے اپنے ہٹائے جانے کو اپنی توہین کا مسئلہ بنا لیا۔ ان کا رویہ ایک طرح سے باغیانہ دیکھائی دیتا تھا۔

سندھ کی وزارتِ اعلیٰ کے عہدے سے ہٹائے جانے کے بعد ممتاز علی بھٹو اور وزیراعظم بھٹو کے پہلے سے برادرانہ تعلقات میں کچھ دراڑسی آ گئی تھی۔ وزیراعظم بھٹو کا ممتاز علی بھٹو کو وزیراعلیٰ

www.bhutto.org

سندھ بنانے کا تجربہ ان کے خاندانی مراسم کے لئے اچھا ثابت نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کی سیاسی قسم کی ناراضگی کچھ خاندانی ناراضگی بن گئی تھی۔ اس میں ایک طرح کے شریکے کی جھلک پیدا ہوگئی تھی۔ جس کا اظہار ممتاز علی بھٹو کی جانب سے زیادہ دیکھنے میں آیا تھا۔

وزیراعظم بھٹو کی ہارڈ لک

وزیراعظم بھٹو کی بدنصیبی یہ دیکھنے میں آئی تھی کہ ان کا ایک بھی لیفٹینینٹ ان کے ساتھ اپنی مثالی وفاداری نبھانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ جس کسی کو بھی انہوں نے اپنا جانشین بنایا۔ اس نے ان سے نہ صرف بغاوت کی بلکہ غداری کی حد تک ان کے خلاف کردار ادا کیا۔ مگر ممتاز علی بھٹو کا معاملہ ان باغیوں سے مختلف تھا۔

ممتاز علی خان بھٹو کا معیار دوسرے جانشینوں سے بہت بلند تھا

ممتاز علی بھٹو کا معاملہ دوسروں کی طرح غداری کا یا بغاوت کا ہرگز دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ ان کا معاملہ ناراضگی کی حد تک ہی تھا۔ جو ایک خاندانی ٹسل کی شکل تھا۔ اس معاملے میں ممتاز علی بھٹو کا معیار دوسرے لوگوں سے بہت بلند تھا اور مختلف تھا۔ انہوں نے اپنی ناراضگی کے جنون میں دوسرے لوگوں کی طرح بھٹو صاحب کے ذاتی اور سیاسی دشمنوں کے ساتھ ہرگز ہرگز سمجھوتا نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی سیاسی بغاوت کا مظاہرہ کیا تھا۔ سیاسی اختلافات ہو جانے کے باوجود ان میں ادب آداب کا سلسلہ قائم تھا۔ ایک طرح کا خاندانی رکھ رکھاؤ پوری طرح موجود تھا۔ میرے مشاہدے کے مطابق چیئرمین بھٹو کے جانشینوں میں ممتاز علی خان بھٹو سب سے بہتر انسان تھے۔ ان کے صرف اقتدار کی سیاست سے بھٹو صاحب کو نقصان پہنچا تھا۔

حمودالرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کا شائع نہ کرنا

چیئرمین بھٹو کے ایک مخلص پیروکار ہونے کے ناطے سے میں احتراماً لفظ غلطی کی بجائے بھول تحریر کر رہا ہوں۔ میرے چیئرمین کی تیسری بھول یہ تھی کہ انہوں نے پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے والوں کا قانونی احتساب نہیں کیا تھا۔ بھٹو صاحب نے حمودالرحمٰن کمیشن قائم کر کے اس

بات کا فیصلہ تو کرا دیا تھا کہ پاکستان یحییٰ خان اور اس کے ساتھی جرنلوں کی حماقت اور حکومتی غنڈہ گردی اور بنگالی عوام کی خوں ریزی نے دولخت کیا تھا۔ مگر کمیشن کے عدالتی فیصلے کو لوگوں پر ظاہر نہ کیا گیا۔ حمودالرحمٰن کمیشن کے فیصلے کی اشاعت سے بھی ان کو وہی خوف لاحق تھا جس کا اظہار انہوں نے میری نظم کو شائع نہ کرنے کی شکل میں ظاہر کیا تھا کہ فوج کا مورال تباہ ہو جائے گا۔ فوج کی بدنامی ہوگی۔ مجھے چیئرمین بھٹو کی اس بات سے سوفی صد اتفاق ہے کہ سزا کی بجائے معاف کرنا ایک اچھا عمل ہے۔ مگر یہ عمل اس قیمت پر نہیں ہونا چاہئے کہ چور تو قطب بن جائیں اور قطب جو ہیں وہ چور بنا دیئے جائیں۔

چیئرمین بھٹو نے حمودالرحمٰن کمیشن کی عدالتی تحقیقات کو شائع نہ کرنے کے بارے میں اپنی کتاب اگر مجھے قتل کر دیا گیا میں تحریر کیا تھا کہ پاکستان کی فوجی کونسل نے مشترکہ طور پر مجھ سے درخواست کی تھی کہ کمیشن کے فیصلے کو نشر نہ کیا جائے۔ اس کی اشاعت سے فوج کا رہا سہا بھرم بھی ختم ہو جائے گا۔ فوج کے اندر بغاوت ہو جائے گی۔ فوج کا بچا کھچا ڈھانچہ بھی برباد ہو جائے گا۔

تاریخِ عالم میں اس قسم کی بخششوں اور نوازشوں کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلا کرتا۔ مثال کے طور پر ابوسفیانؓ کو تو رسول اللہؐ نے معاف کر دیا تھا مگر ابوسفیانؓ کے پوتے نے حسین علیہ السلام کو زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ افسوس کہ اتنے بڑے قیامت خیز قومی سانحہ کے مجرموں کو چیئرمین بھٹو نے معاف کر دیا۔ مگر تاریخ کے بے رحم اصول کے مطابق ان قومی مجرموں نے چیئرمین بھٹو کی جان بخشی نہ کی ان کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ کاش کہ بھٹو صاحب پاکستان کی سالمیت کے قاتلوں کو معاف نہ کرتے۔ ان کا صاف اور شفاف احتساب کرتے تو ہماری قومی سیاسی تاریخ کا دھارا ہی تبدیل ہو جاتا۔ مگر ہم اتنے خوش قسمت نہیں ہو سکتے تھے۔

معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب تاریخ اور سیاست میں تاریخ اور شکست کے باب میں تحریر کرتے ہیں۔ قوموں کی تاریخ میں صرف فتوحات ہی اہم نہیں ہوتیں بلکہ شکستیں بھی ان کی زندگی میں اہم تبدیلیاں لے کر آتی ہیں۔ اس لئے شکست کا تجزیہ، اس کے اسباب و وجوہات اور نتائج کا مطالعہ قوموں کی تاریخ میں انتہائی ضروری ہے کیونکہ جب تک اس کا تجزیہ نہیں کیا جائے گا اور اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا جائے گا۔ اس وقت تک سبق بھی نہیں سیکھا جائے گا کیونکہ شکست کسی فریق کی بنیادی کمزوریوں کی وجہ سے ہوتی ہے اگر ان کے ذریعے ان بنیادی

کمزوریوں کی نشان دہی کی جائے تو قوم ان کمزوریوں کو دور کر کے معاشرے کے بنیادی ڈھانچے کو بھول سکتی ہے۔ اور یہ تبدیلی قوم کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک سکتی ہے۔ تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ہیں کہ شکست کے بعد قوموں میں سیاسی معاشی اور سماجی شعور پیدا ہوا۔ یورپی تاریخ میں اس کی مثال جرمنی کی ہے کہ جب نپولین نے آسانی کے ساتھ جرمن ریاستوں کو شکست دے دی اور جرمن فرانسیسیوں کے مفتوح ہو گئے تو ان شکستوں نے جرمن قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کے بعد ہی ان میں قوم پرستی کا گہرا جذبہ ابھرا۔ جس کے زیر اثر انہوں نے نہ صرف جرمن ریاستوں کو متحد کر کے ایک جرمنی کی بنیاد ڈالی بلکہ تاریخی و ثقافتی طور پر قومی اساس کو بیدار کر کے اپنی قومیت کی جڑوں کو مضبوط کیا تھا۔ اس عمل میں سیاستدانوں، شاعروں، ادیبوں اور مورّخوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ انہوں نے جرمن ثقافت اور جرمن قوم کی نئے سرے سے تشکیل کی تھی۔ اسی قوم پرستی کے زیر اثر جرمنوں نے فرانس کو شکست دے کر اپنی قومی بالادستی کو دوبارہ قائم کیا تھا۔

مگر تاریخ میں جب شکست خوردہ قوم اور عناصر اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اپنی شکست کے اسباب کو ظاہر نہیں ہونے دیتے اور اپنی شکست پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں تو ایسی قوم اور ایسے عناصر کو بعد میں شکست سے بھی بڑھ کر بدترین حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ ان عناصر نے شکست سے سبق حاصل کرنے کا راستہ نہیں اپنایا ہوتا اور وہ اپنی شکست کو اپنی اَنا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر مبارک علی کی بات کی روشنی میں یہ انتہائی ضروری تھا کہ ڈھاکا میں افواجِ پاکستان کی شرمناک شکست کے اسباب کو تسلیم کیا جاتا تاکہ پاکستان کی تشکیل نو ع میں آسانی رہتی۔

وزیراعظم بھٹو کی 1973ء کے آئین کو بنانے کی جنگ

وزیراعظم بھٹو کو پاکستان کا اقتدار حاصل کرنے کے بعد جو سب سے پہلا مشکل ترین اور اہم ترین مرحلہ درپیش تھا وہ پاکستان کا آئین بنانے کا مرحلہ تھا۔ جس کے بغیر نہ تو مملکتِ پاکستان کو کوئی آئینی حیثیت حاصل تھی اور نہ خود ان کی حکومت کی کوئی آئینی حیثیت ہو سکتی تھی۔ ہمارا قومی تشخص اور قومی ڈھانچہ قیامِ پاکستان سے لیکر 1973ء تک ایک طرح کا بے آئین ہی چلا آ رہا تھا۔ یعنی پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد 25 سال تک پاکستان کا کوئی مستقل آئین ہی بن نہیں پایا تھا۔ درمیان میں ایک مرتبہ 1956ء کا آئین بنایا گیا تھا جس کو فیلڈ مارشل جنرل ایوب

خان نے 1958ء میں صرف دو سال بعد ہی اپنے فوجی بوٹوں کے نیچے روندڈالا تھا۔اس کے بعد خود فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان نے اپنا فوجی آئین 1962ء کا آئین بنایا تھا جس کو 1969ء میں اس نے خود ہی توڑ دیا تھا۔آئین کے معاملے اور مسئلے میں پاکستان بڑا بدقسمت واقع ہوا تھا۔ اگر قیامِ پاکستان کے آغاز کے سالوں میں پاکستان کا ایک متفقہ آئین بن جاتا یا 1956ء کے آئین کو ہی قائم رکھا جاتا تو پاکستان کبھی بھی دو ٹکڑے نہ ہوتا۔پاکستان فوجی حکمرانوں کی غیر آئینی حکمرانی کی وجہ سے دولخت ہوا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان کوئی قانونی اور آئینی عمرانی معاہدہ ہی موجود نہیں تھا۔جنرل یحییٰ خان کا ہی بنایا گیا لیگل فریم ورک آرڈر تھا۔جو ایک مارشل لا آرڈی نینس ہی تھا جس کی کوئی دستوری حیثیت نہیں تھی۔پاکستان کا آئین نہ ہونے کی ہی وجہ تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں اپنے چھ پوائنٹ کے ایجنڈے پر انتخاب لڑا تھا اور بھاری کامیابی حاصل کی تھی۔جس کامیابی کو اس وقت کی فوجی جنتا نے قبول نہیں کیا تھا۔جس کے نتیجے میں پاکستان ٹوٹ گیا تھا۔

وزیراعظم بھٹو کے اقتدار حاصل کرنے کے وقت بھی معاملہ پہلے ہی کی طرح کا تھا، باقی ماندہ پاکستان کا کوئی آئین نہیں تھا۔مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کا آپس میں دستوری شکل میں کوئی عمرانی معاہدہ موجود نہیں تھا۔باقی ماندہ پاکستان کو نئے سرے سے ایک نئے پاکستان کی شکل دینے کی صورت حال پیدا ہو چکی تھی اور آئین کے بغیر باقی ماندہ پاکستان کو ایک مملکت کی شکل نہیں دی جاسکتی تھی۔یہ صورت حال بالکل وہی صورت حال تھی جو مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش بننے سے پہلے کی صورت حال تھی۔یہ صورت حال انتہائی خطرناک صورت حال تھی۔باقی ماندہ پاکستان کے صوبوں میں بغاوت پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا۔پاکستان کا کوئی بھی دوسرا صوبہ بنگلہ دیش کی طرح کا علیحدگی کا اعلان کرسکتا تھا۔اس وقت پاکستان کی فوج اس قابل نہیں رہی تھی کہ صوبے کی مسلح بغاوت کا سامنا کرسکتی۔خاص طور پر صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان کے قوم پرست سیاست دانوں کے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ بنگلہ دیش کے علیحدہ ہو جانے کے بعد اب ان کے علیحدہ ہو جانے کا بھی راستہ کھل چکا ہے۔یہ تو وزیراعظم بھٹو کی چھا جانے والی شخصیت کا کمال تھا۔ان کی سیاست کی برق رفتاری تھی کہ انہوں نے نئے پاکستان کا دنیا میں ایسا شہرا برپا کردیا کہ ان کی وطن پرستی کے نمونے میں مزید کسی طرح کی بھی کوئی علیحدگی کا خیال کسی ذہن میں بھی پنپ نہ سکا۔یا ان

کی قیادت نے پنپنے نہ دیا۔

پاکستان کے آئین کی تکمیل میں بھی پہلے کی سی صورت حال موجود تھی۔ وہ صورت حال یہ تھی کہ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ ملٹری بیوروکریسی اور سول بیوروکریسی پاکستان کے آئین بنانے کے خلاف تھی۔ قیامِ پاکستان سے لے کر 1973ء تک ان قوتوں نے پاکستان کا کوئی متفقہ آئین بننے ہی نہیں دیا تھا۔ پاکستان کے متفقہ قومی دستور بن جانے سے پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا اقتدار ختم ہو جانا تھا۔ اس لئے کہ دنیا کے کسی جمہوری آئین میں فوج کا اور بیوروکریسی کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ فوج اور بیوروکریسی کو آئین کے تابع فرمان رہ کر اپنا کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ جو کردار ملک وقوم کے تحفظ کا کردار ہوتا ہے۔ ملازمت کا کردار ہوتا ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ پر فائض رہنے کا کردار نہیں ہوتا۔ مگر پاکستان میں اسٹیبلشمنٹ کا وجود اس قدر پھیل چکا تھا وہ کسی آئین کے دائرۂ اختیار میں رہ کر کام کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ ہاتھی اپنی ذات پر کوئی قانونی پابندی برداشت کرنا نہیں چاہتا تھا اور اس طرح کی ہاتھی نما آزادی یا جنگل کی آزادی ان کو یا اس کو پاکستان کو بے آئین رکھنے میں ہی حاصل ہو سکتی تھی۔

مگر 1973ء میں وزیراعظم بھٹو کو پاکستان کا آئین بنانے کا اس وجہ سے موقعہ مل گیا کہ اس وقت پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا ہاتھی زخمی ہو چکا تھا۔ پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے کا مجرم ہو چکا تھا۔ اپنی شکست کے زخم چاٹ رہا تھا۔ وہ اپنے تمام غیظ و غضب کے باوجود اس قابل نہیں تھا کہ وزیراعظم بھٹو جیسے جری اور حوصلہ مند انسان کو آئین بنانے سے روک سکتا۔ مگر اس بات کی تاریخ گواہ ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود اسٹیبلشمنٹ پاکستان کے آئین بنانے کے حق میں نہیں تھی۔ اس کی سرتوڑ کوشش تھی کہ آئین کو بننے نہ دیا جائے اور اگر آئین بنایا بھی جائے تو اتنا ڈھیلا ڈھالا آئین بنایا جائے کہ اسٹیبلشمنٹ جب چاہے اس کو پھاڑ کر ایک طرف پھینک سکے۔ دوسری طرف پاکستان کے دو صوبوں کے قوم پرست سیاست دانوں کی بھی خواہش تھی کہ پاکستان کا کوئی متفقہ آئین نہ بن پائے تا کہ ان کی علیحدگی کا راستہ کھلا رہ سکے۔ اس طریقے سے یہ دو بڑی طاقت ور قوتیں وزیراعظم بھٹو کے آئین بنانے کے راستے میں حائل تھیں۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا کردار تو خفیہ کردار تھا۔ مگر قوم پرستوں کا کردار کھلا کردار تھا جو چھپائے چھپ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی وہ اس کو چھپانا چاہتے تھے۔ قوم پرست سیاست دانوں کا پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف بہت

مضبوط موقف تھا جو بہت حد تک درست بھی تھا اور بالکل بنگلہ دیش کے لوگوں اور ان کے سیاست دانوں سے ملتا جلتا تھا۔ جس طرح مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں کو شکایت تھی کہ طاقت کا تمام توازن مغربی پاکستان کی طرف جھکا ہوا ہے۔ اقتدار کا کلی مرکز فوج ہے اسی طریقے سے بلوچ رہنماؤں اور پختون سیاست دانوں کا الزام تھا کہ ان کے صوبوں میں تمام کلیدی عہدوں پر پنجابی افسروں کو تعینات کیا جاتا ہے۔ صوبے کا اقتدار اعلیٰ فوج کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ جن کی وجہ سے ان صوبوں کے لوگوں کو یوں لگتا ہے جس طرح وہ پنجاب کے فوجی جرنلوں کی کالونی ہیں، نو آبادی ہیں۔ آج 2006ء میں بھی پاکستان کے فوجی جرنلوں پر الزام ہے کہ یہ صوبوں کو خودمختاری اور جمہوری آئینی حقوق نہیں دینا چاہتے۔ اس لئے کہ آج بھی بلوچستان میں فوجی اپریشن جاری ہے۔ اصل میں یہ تمام صورت حال پاکستان میں ایک صحیح آئینی حکومتوں کے وجود میں نہ آنے کی وجہ تسمیہ تھی اور صوبوں کو آئینی خودمختاری نہ دینے کی وجہ سے ہم کو یہ دن دیکھنے پڑ رہے تھے۔ مگر 1971ء میں چونکہ پہلی بار پاکستان میں انتخابات کے ذریعے پاکستان پیپلز پارٹی کو اقتدار ملا تھا۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ مکمل قواعد وضوابط کے مطابق ایک آئین بنانے کا مرحلہ اور موقعہ نصیب ہوا تھا۔ جس کے لئے پاکستان کے چاروں صوبوں کے منتخب نمائندوں کا اتحاد اور اتفاق ضروری تھا۔ اس قومی اتفاقِ رائے کے لئے وزیراعظم بھٹو نے خلوصِ نیت کے ساتھ چاروں صوبوں کے منتخب سیاست دانوں کو پاکستان کا آئین بنانے کے لئے قومی اسمبلی میں آنے اور اجلاس میں شرکت کرنے کی دعوت دی۔ جس دعوت کو چاروں صوبوں کے منتخب نمائندوں نے اپنے کچھ تحفظات کے ساتھ اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونا قبول کرلیا اور پاکستان کے چاروں صوبوں کے نمایاں قائدین کو آئینی کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا۔ جس کی وجہ سے ان کے مرکز کے بارے میں ماضی کے خدشات کا ازالہ ہوگیا اور طے پا گیا کہ پارلیمنٹ میں جمہوری ضابطے کے مطابق آئین کا مکمل مسودہ پیش کیا جائے گا۔

اس پر کھلی بحث ہوگی اور پورے ہاؤس کی تائید کے بعد آئین کو منظور کیا جائے گا۔ اس وقت کے فوجی جرنیلوں کو جن میں جنرل گل حسن، جنرل عبدالحمید خان اور جنرل پیرزادہ شامل تھے۔ ان کو یقین تھا کہ قوم پرست سیاست دان آئین کے معاملے میں وزیراعظم بھٹو کا ساتھ نہیں دیں گے۔ مگر جب قوم پرست رہنماؤں نے اپنے جمہوری مزاج کے مطابق پاکستان کے آئین

بنانے میں وزیراعظم پاکستان کے شانہ بشانہ کھڑے ہوکر پاکستان کا آئین بنانے کا آغاز کردیا تو ان جرنیلوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ سیاست دان آپس میں دست وگریبان ہو جائیں گے۔ اسمبلی میں دھنگا فساد ہوگا اور ان کو دوبارہ ملک پر قبضہ کرنے کا بہانہ مل جائے گا۔ مگر جب پاکستان کے سیاست دانوں کے کمال فہم وفراست سے آئین بنانے کا سلسلہ پُرامن طریقے سے جاری ہوگیا۔ تو ان جرنیلوں نے اپنی خفیہ ایجنسیوں کے ذریعے وزیراعظم بھٹو کی حکومت کو ذاج کرنا شروع کردیا۔ انہوں نے پولیس کو خفیہ ایجنٹوں کے ذریعے بغاوت پر آمادہ کردیا۔ اس طریقے سے آئی۔ ایس۔ آئی نے وزیراعظم بھٹو کو ناکام بنانے کا آغاز کردیا تھا۔

پاکستان میں پولیس کی ہڑتال

پاکستان میں پولیس کی ہڑتال بالکل اسی طرح تھی جس طرح ملک بھر کے تمام چور ہڑتال کر دیں اور مطالبہ کردیں کہ آپ لوگ اپنے گھروں کے دروازے کھول دیں تاکہ ان کو نقب زنی کی کھلی اجازت ہو اور ان کو چوری کرنے میں آسانی ہو۔

جنوبی ایشیا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ پاکستان میں پولیس ہڑتال کر رہی تھی۔ پولیس کا مطالبہ تھا کہ پولیس کو یونین بنانے کی اجازت دی جانی چاہئے، یعنی ٹریڈ یونین کی اجازت دی جائے۔ اور اس میں ایک اور بات بہت حیران کن تھی۔ وہ حیران کن بات یہ تھی کہ پولیس کی اس ہڑتال کا آغاز صوبہ سرحد سے ہوا تھا جہاں پر خان عبدالولی خان اور مفتی محمود کی مشترکہ حکومت قائم تھی۔ افسوس کہ صوبہ سرحد کے خان عبدالولی خان اور مفتی محمود فوجی جرنیلوں کی سازش کا شکار بن گئے۔ جس کی وجہ سے ایک سازش کے ذریعے صوبہ سرحد میں جعلی پولیس کی ہڑتال کرائی گئی۔ پولیس کا مطالبہ تھا کہ پولیس میں ٹریڈ یونین بنانے کی اجازت دی جائے۔ جو فوری طور پر دے دی گئی اور وہاں پر ہڑتال ختم ہوگئی۔ اس طرح خفیہ ایجنسیوں نے ایک ''پریذیڈنٹ'' (President) بنا کر ایک حوالہ بنا کر پولیس کی ہڑتال اپنے اصل مقام پر یعنی پنجاب میں کرائی تھی۔ جو صدر پاکستان بھٹو کی طاقت کا اصل مرکز تھا۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے صدر بھٹو کے خلاف پیر پگاڑا اور اصغر خان کی قیادت میں تمام حزبِ اختلاف کے سیاست دانوں کو بھٹو حکومت کو ختم کرنے پر اکٹھا کردیا تھا اور ان کو حکم دیا تھا کہ بھٹو کی حکومت ختم کرنے کے بعد اس متحدہ حزبِ اختلاف پر مشتمل ایک قومی

حکومت بنا دی جائے گی جس کا وزیر اعظم اصغر خان ہو گا۔ اس وقت حزب اختلاف کے یہ تمام سیاست دان بے شمار وجوہات کی بنا پر جن میں سرفہرست ان کی انتخاب میں شکست تھی صدر بھٹو کی جان کے دشمن بن گئے تھے۔ ان تمام سیاست دانوں کا بھٹو دشمنی ایمان بن گیا تھا یا بنا دیا گیا تھا۔ پاکستان میں سیاست دانوں کا یہ کردار تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ سیاست کے اس کردار سے صرف بھٹو کو ہی نقصان نہیں پہنچا خود ان سیاست دانوں کو بھی بہت نقصان پہنچا بلکہ ان میں سے اصغر خان کی طرح کے تمام سیاست دان خفیہ ایجنسیوں کی ہی نذر ہو کر رہ گئے تھے۔ بات پنجاب پولیس کی ہڑتال سے چلی تھی۔ افسوس کے ساتھ تحریر کرنا پڑ رہا ہے کہ یہ تمام سیاست دان خفیہ طور پر پولیس ہڑتال میں شامل ہو کر پولیس کا حوصلہ بڑھانے لگ گئے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے ساتھ کچھ ناخوشگوار واقعات بھی پیش آ گئے تھے۔ جن کا آگے ذکر کیا جائے گا۔

پاکستان میں پولیس کی ہڑتال کا تاریخ کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ جس کی پہلے کوئی مثال موجود نہیں تھی اور پولیس کے جو مطالبات تھے۔ ان مطالبات کا کسی قانون اور آئین کے ساتھ قطعی کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ایک کھلی بغاوت تھی۔ پولیس اور فوج ہر ملک کے دو ایسے قانونی ادارے ہوتے ہیں جن کے اپنے قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ فوج کے قانون کے مطابق فوج کو ہر حالت میں ملک کا تحفظ کرنا ہے۔ اگر کوئی دشمن طاقت ملک پر جارحیت کرنے کی کوشش کرے تو اس کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے، ملک وقوم پر کٹ مرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح پولیس بھی فوج کی طرح ایک ایسا مسلح ادارہ ہے جس کا کام ملک میں قانون کی حکمرانی قائم کرنا ہوتا ہے، امن وامان کو قائم کرنا ہوتا ہے، شہریوں کے جان و مال کا تحفظ کرنا ہوتا ہے، لوگوں کی ہر معاملے میں مدد کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا فوج ہی کی طرح پولیس میں کسی قسم کی سوداکاری کی انجمنیں نہیں بنائی جا سکتیں۔ کسی قسم کی ٹریڈ یونین نہیں بنائی جا سکتی۔ اس لئے کہ ان دونوں اداروں کے ملازمین کی تمام تر نگہداشت ریاست کے سر ہوتی ہے۔ جو ان کو ریاست ہر حال میں مہیا کرتی ہے۔ جس کا قانون متعین ہے۔ جس کے لئے ان کو کسی انجمن کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان دونوں اداروں میں بھرتی ہونے والے لوگوں کا کام حکم کی تعمیل ہوتا ہے۔ ڈو اینڈ ڈائی ہوتا ہے۔ (Do and Die)، ہاؤ اینڈ وائی نہیں ہوتا (Who and Why)، کیسے اور کیوں کا سوال کرنے کا نہیں ہوتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ان دو اداروں کا ماحول اس قسم کے مطالبوں کا بن جائے گا تو ان کی

www.bhutto.org

وہ روح مرجائے گی جس کے لئے ان کو ریاست نے اپنے تحفظ کے لئے مقرر کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی دشمن ملک پر حملہ آور ہو جائے اور فوج اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے سوداکاری میں الجھ جائے کہ یہ مطالبات پورے ہوں گے تو مقابلہ کیا جائے گا۔ کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے دنیا کے تمام ممالک میں تحفظ کے ان اداروں کا وقار اور معیار بہت بلند ہوتا ہے اور اس طرح کی باتوں سے پاک اور صاف ہوتے ہیں۔ شفاف ہوتے ہیں۔ ان کو اس طرح کی آلائشوں میں ملوث نہیں کیا جاتا۔ ان آلائشوں سے ان دونوں اداروں کو دور رکھا جاتا ہے۔ ان اداروں کو اس طرح کی باتوں کی ہوا تک نہیں لگنے دی جاتی۔ جس طرح پہلے فوج کی مثال دی گئی ہے۔ اسی طرح پولیس کو اگر کسی مقام پر امن وامان بحال کرنے کا معاملہ ہو تو پولیس کا کام حکم پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ سوداکاری میں لگ جائے گی تو ان کے جانے تک تو پورا شہر جل جائے گا یا ہلاک کر دیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں قانون نافذ کرنے والوں اداروں میں کسی یونین بازی اور یونین سازی کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ پاکستان میں ہی پہلا موقعہ تھا کہ جس میں پولیس اور وہ بھی ''پنجاب کی پولیس'' یونین بنانے کا مطالبہ کر رہی تھی۔

چہ دلاور است دزدے
کہ بہ کف چراغ دارد

کتنا بہادر چور ہے کہ ہاتھ میں چراغ لے کر چوری کرتا ہے یعنی چوری کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔

وزیراعظم بھٹو کیسے عجیب انسان تھے

مجھے وزیراعظم بھٹو پر حیرانی نہیں غصہ آتا ہے۔ وہ کس قدر عجیب انسان تھے۔ کیا خبط تھا ان کو حکمرانی کرنے کا۔ کیا شوق تھا ان کو قیادت کرنے کا۔ کسی قیمت پر وہ اس قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ کسی قیمت پر وہ فوج کو بنانا اور سنوارنا چاہتے تھے۔ ان کو ہندوستان کی قید سے آزاد کرا کر باعزت واپس لانا چاہتے تھے۔

بہر صورت اپنا اپنا وظیفہ اور اپنا اپنا شوق اور اپنی اپنی فطرت ہے۔ وزیراعظم بھٹو کا شوق ان کی فطرت لوگوں کو زندگی دینا تھی۔ قوم کو بنانا سنوارنا تھا۔ ان کے برعکس ان کی مقابل قوتوں کی

فطرت زندگی کو بگاڑنا اور برباد کرنا تھی۔

آپ ذرا صورت حال ملاحظہ کریں کہ پاکستان دو ٹکڑے ہو چکا ہے۔ وزیر اعظم بھٹو اس ٹوٹے ہوئے پاکستان کی کرچیاں اکٹھی کر رہا ہے۔ وہ اس کے ٹکڑے جوڑ کر اس کو دوبارہ ایک ملک کی شکل دینا چاہتا ہے اور وہ قوتیں جن کے کردار و کرتوت کی وجہ سے ملک ٹوٹ گیا۔ دو ٹکڑے ہو گیا۔ جن قوتوں کو غداری کی سزا دی جانے چاہئے تھی۔ جن کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہئے تھا۔ وزیر اعظم بھٹو ان قوتوں کو تحفظ دے کر ملک کا آئین بنانا چاہتا ہے۔ وہ قوتیں کس قدر بے رحم تھیں، کس قدر ظالم تھیں، ہٹ دھرم تھیں۔ وہ وزیر اعظم بھٹو کو اس باقی ماندہ پاکستان کی تعمیر نہیں کرنا دینا چاہتی تھیں۔ وہ اس کو سکون سے کام نہیں کرنے دینا چاہتی تھیں۔ ان خفیہ قوتوں کو ٹوٹے ہوئے پاکستان کا کچھ خیال نہیں تھا۔ ان کو صرف اور صرف اپنی وحشت خیزی کا خیال تھا۔ وہ اس حالت میں بھی اپنی سپر میسی چاہتی تھیں۔ ان کو اتنا بھی خیال نہیں تھا کہ وہ جس پولیس کو ہڑتال کرنے کی سازش میں ملوث کر رہی ہے۔ اس پولیس کی عوام کی نظر میں حیثیت کیا تھی۔ پولیس تو عوام کی نفرت کی علامت تھی۔ انتہائی غیر مقبول قوت تھی۔ مطالبات ہمیشہ مظلوم کیا کرتے ہیں۔ غنڈے اور بدمعاش مطالبے نہیں کیا کرتے۔ جن کی بدمعاشی اور غنڈہ گردی کو شریف شہری سختی سے کچل دیا کرتے ہیں۔ ان کے مطالبوں کی اور ان کی ہڑتالوں کی کوئی وقعت نہیں ہوا کرتی۔ پولیس کی اس ہڑتال میں بھی تمام پولیس شامل نہیں تھی۔ ان میں بھی گنتی کے کچھ ایسے لوگ تھے جن کا خفیہ اداروں اور ایجنسیوں سے تعلق تھا، وہ پیش پیش تھے اور پولیس کو ہڑتال پر اُکسا رہے تھے۔

لہٰذا پولیس کی ہڑتال وزیر اعظم بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کا پہلا امتحان تھا۔ پنجاب میں ملک غلام مصطفیٰ کھر اس وقت مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور گورنر پنجاب تھے۔ ان کی اس وقت اپنی ہمت اور جواں مردی کا امتحان تھا۔ مرکز سے خورشید حسن میر لاہور تشریف لائے اور انہوں نے پنجاب پیپلز پارٹی کے دفتر میں آ کر کارکنوں کا اجلاس بلایا۔ وہاں پر یہ طریقہ طے پایا گیا کہ حکومت پنجاب یعنی گورنر کھر حکومتی طریقے سے بیوروکریسی کے ذریعے پولیس ہڑتال پر قابو پائیں۔ مگر شہروں اور دیہاتوں میں پاکستان پیپلز پارٹی عوام کی مدد کے ساتھ پولیس کی ہڑتال کی اس سازش کو ناکام بنائے۔ مزنگ پارٹی کے دفتر میں ایک انقلابی کمیٹی بنائی گئی۔

اس کمیٹی میں میری تجویز کے مطابق یہ طے پالیا گیا کہ ہر شہر میں پاکستان پیپلز پارٹی کے

www.bhutto.org

کارکن تانگوں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر اعلانات کرنے شروع کر دیں۔ ان اعلانات میں عوام کو خبردار کریں کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے پیپلز پارٹی کے ورکروں کا ساتھ دیں۔ باقاعدہ اعلان کریں کہ پیپلز پارٹی کے ورکر ہر گلی ہر محلے کے تھانے میں خود بیٹھ کر عوام کا تحفظ کریں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ انگریزوں کی بنائی ہوئی ظلم کرنے والی شیطانی طاقت پولیس خود ہی اپنی موت مر گئی ہے۔ ہم کو پولیس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہمارے عوام اس قدر بلند کردار ہیں کہ ان کے لئے اس طرح کی پولیس رکھنا ان کی توہین ہے۔ پیپلز پارٹی کے کارکن جو عوام کے خادم ہیں، وہی اب عوام کی پولیس ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ بہت جلد عوامی پولیس کی بھرتی کی جائے گی۔ جس میں باکردار نوجوانوں کو بھرتی کیا جائے گا۔ جو اس جدید دور کے تقاضوں کے مطابق عوام کی خدمت کا کردار سرانجام دیا کریں گے۔ اس تمام صورت حال میں لاہور شہر ہی سب سے اہم شہر تھا اور ایک ٹیسٹ کیس کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہڑتال بھی لاہور میں ہی جاری تھی۔ لہٰذا لاہور شہر میں اعلانات کرنے والی ٹیم کا ہیڈ مجھے بنایا گیا۔ میں نے تانگے پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر اپنے کچھ پارٹی ورکر لے کر شہر میں اعلان کرنے کے سلسلے کا آغاز کر دیا۔ میں نے اپنے صادق جذبے کے ساتھ باقاعدہ تقریر کے انداز میں پولیس کے خلاف اعلانات کرنے شروع کر دیئے۔ ہر چوک میں لوگ انتہائی جذبے کے ساتھ پولیس کے خلاف نعرے مارنے لگ گئے۔ یوں لگتا تھا کہ عوام پولیس کو صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیں گے۔ مجھے میرے اعلان کے دوران یہ دیکھنے کو ملا کہ لوگ اس ادارے سے کس قدر نفرت کرتے ہیں۔ پولیس کے خلاف جب میں اعلان کرتا ہوا ریگل چوک میں پہنچا تو وہاں پر لوگوں نے ایک لڑکے کو نقلی پولیس والا بنا کر اس کا منہ کالا کر دیا اور وہ لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوا جلوس کے آگے آگے چلنے لگ گیا۔ ہم نے یہ معاملہ صبح شروع کیا تھا دوپہر تک لوگ تھانوں پر قبضہ کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ اس سلسلے میں ایک بات انتہائی افسوس ناک دیکھنے میں آ گئی۔ میرے اعلانات سے خفیہ ایجنسیوں نے فوری طور پر گورنر ہاؤس میں اطلاع کی کہ جس طرح کے اعلانات پولیس کے خلاف پیپلز پارٹی کے ورکر کر رہے ہیں اس سے شہر میں خون خرابہ ہو جائے گا۔ لوگ تھانوں کو اور پولیس کے لوگوں کو جلا ڈالیں گے۔ آپ یہ اعلانات کا سلسلہ بند کرا دیں۔ پنجاب حکومت نے خورشید حسن میر کو فوراً اعلانات کا سلسلہ بند کرنے کو کہہ دیا۔ خورشید

www.bhutto.org

حسن میر صاحب کا سیکرٹری اور پارٹی کے کچھ ورکر مجھے تلاش کرتے ہوئے لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے جہاں پر میں پولیس کے خلاف اعلانات کر رہا تھا اور انہوں نے ہم لوگوں کو اس سلسلے کو ختم کر کے فوراً اپنے ساتھ خورشید حسن میر کے پاس جانے کا کہا۔

اس طرح ہم لوگ میں یہ سلسلہ ختم کر کے خورشید حسن میر کے پاس پہنچ گئے۔

انہوں نے ہم کو کہا کہ پنجاب حکومت جو اپنے پاس تمام اختیارات رکھتے ہوئے نہیں کر سکتی تھیں وہ تم لوگوں نے عوام کے پاس جا کر چند گھنٹوں میں کر ڈالا ہے۔ پولیس کی ہڑتال کرانے والی قوتیں خوفزدہ ہو گئی ہیں۔ وہ عوام کے غیظ و غضب کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں۔ وہ تمہارے اعلانوں سے بوکھلا گئیں ہیں اور ان کو بند کرنے کا کہہ رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خورشید حسن میر نے ہم کارکنوں کو مشورہ دیا کہ کچھ کارکن منٹو پارک جائیں جہاں یہ پولیس کے ہڑتال کرنے والے مورچہ لگائے بیٹھے ہیں اور یہ خبر لائیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔ میر صاحب کے کہنے پر کبریا خان، ضیاء الدین بٹ، روزی خان اور میں خود منٹو پارک چلے گئے۔ وہاں باوردی پولیس والے تو تقریباً 100 کی نفری سے بھی کم تھے۔ مگر وہاں عام لوگ کافی زیادہ تھے۔ ان عام لوگوں میں پولیس والے بھی ہوں گے۔ مگر ایک بات بڑی عجیب دیکھنے میں آئی کہ حزبِ اختلاف کی جماعتوں کے کارکن اچھی خاصی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ جو پولیس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے اور پیپلز پارٹی کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ تمام پولیس والے ایک میدان میں بندوقیں ہاتھ میں تانے دھرنا دیئے بیٹھے تھے اور ایک پولیس انسپکٹر چوہدری سلطان محمود ان سے بار بار خطاب کئے جا رہا تھا۔ یہ سلطان محمود پنجاب میں ہڑتالی پولیس کا رنگ لیڈر تھا اور ہڑتال کی کمان کر رہا تھا۔ سلطان محمود آج بھی زندہ سلامت ہے۔ ہم پیپلز پارٹی کے کارکن جب اس مجمعے کے قریب چلے گئے تو ایک صحافی نے بلند آواز سے کہنا شروع کر دیا کہ پیپلز پارٹی والے بھی یہاں آ گئے ہیں۔ یہ مجمع تمام کا تمام پیپلز پارٹی کے خلاف تھا۔ تقریباً تمام لوگ پیپلز پارٹی کے خلاف نعرے لگانے لگ گئے۔ اس صورتِ حال میں میں نے ہمت کر کے سلطان محمود انسپکٹر کو مخاطب کر کے کہا جس کو میں پہلے سے جانتا تھا وہ بھی مجھے جانتا تھا۔ میں نے اس کو کہا کہ ہم پارٹی کی طرف سے صلح کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ ہم آپ کو قوم کا حصہ سمجھتے ہیں۔ آپ کے اگر کوئی مطالبے ہیں تو یہ آرام سے طے پائے جا سکتے ہیں۔ اس وقت ملک کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ اس وقت ہم کو آپ کی

www.bhutto.org

مدد کی ضرورت ہے۔ آپ چاہیں تو آپ ہمارے ساتھ گورنر ہاؤس چلیں، آپ کی ہر بات کو سنا جائے گا۔ یہ وقت ہڑتال کرنے کا نہیں ملک کی حفاظت کرنے کا وقت ہے۔

مگر وہ تو ایک بہت بڑی سازش کا آلہءکار بنا ہوا تھا۔ اس نے پیپلز پارٹی کے خلاف تقریر شروع کر دی کہ تم نے ملک توڑا ہے تمہارے ساتھ بات نہیں کریں گے۔ سلطان محمود کی تمام شرانگیزی کے باوجود پولیس کے اس مجمع میں کچھ جان نہیں تھی۔ بڑے بے جان قسم کے نعرے لگ رہے تھے۔ تمام مجمع پر خوف و ہراس کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ پولیس کی یہ ہڑتال باقاعدہ ایک تنظیم بنا کر کرائی گئی تھی۔ جس کا صدر سلطان محمود کو بنایا گیا تھا اور اس کا سیکرٹری جنرل انسپکٹر شیخ محمد علی کو بنایا گیا۔ شیخ محمد علی میری برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا کہ یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو۔ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔ کس کے اشارے پر اپنی زندگی کو داؤ پر لگائے ہوئے ہو۔ شیخ محمد علی بے حد شریف پولیس والا تھا۔ شریف آدمی تھا۔ گھبرا کر کہنے لگا۔ کل میں یہاں نہیں آؤں گا۔ اس طرح ہم لوگ وہاں سے واپس آ گئے اور ہم نے خورشید حسن میر کو تمام صورتِ حال بتائی کہ قطعی کوئی خطرہ نہیں ہے۔ حکومت کی طرف سے معمولی دباؤ ڈالنے پر یہ ہڑتال ختم ہو جائے گی۔ اس ہڑتال میں کچھ دم نہیں ہے۔ ساتھ ہی میں نے کہا کہ اس ہڑتال کا سیکرٹری جنرل کل ہڑتالیوں کے ساتھ نہیں ہوگا۔ ہڑتالیوں کے سرغنہ چوہدری سلطان محمود نے ہماری موجودگی میں بار بار کہا تھا کہ ڈی۔ آئی۔ جی وکیل خان کو یہاں بھیجا جائے تاکہ وہ ہمارے مطالبات پورے کرنے کا ہم سے وعدہ کرے وغیرہ۔ میں نے خورشید حسن میر سے کہا کہ وہ ایک ہی مطالبہ کر رہے ہیں کہ ڈی۔ آئی۔ جی پولیس کو ان کے پاس بھیجا جائے۔ اس کو بھیج دیا جائے یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ میر صاحب گورنر ہاؤس چلے گئے۔ شام کو ہماری دوبارہ ملاقات ہوئی تو میر صاحب سے معلوم ہوا کہ گورنر اس معاملے کو بہت ڈرامائی انداز میں حل کرنا چاہتا ہے۔ وہ کل موچی دروازہ میں جلسہءعام میں پولیس کو الٹی میٹم دے گا کہ اگر اس نے شام تک یا 24 گھنٹوں تک ہڑتال ختم نہ کی تو ان تمام کی نوکریاں ختم کر دی جائیں گی۔ میر صاحب نے کہا کہ ہر چند انتظامیہ کہہ رہی ہے کہ ہڑتال دم توڑ چکی ہے۔ پولیس والے کل تک خود بخود وہاں سے اٹھ کر گھروں کو چلے جائیں گے مگر گورنر نے اس معاملے کو عوامی سطح پر ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس طرح موچی دروازہ میں جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر اس جلسے میں ایک بات جو طے کی گئی وہ یہ تھی کہ اس جلسے میں سوائے ملک غلام مصطفٰے کھر

www.bhutto.org

کے اور کوئی دوسرا خطاب نہیں کرے گا۔ حالانکہ یہ ایک پارٹی کا جلسہ تھا جس میں میر خورشید حسن، شیخ محمد رشید اور حنیف رامے صاحب کو خطاب کرنے کا موقعہ دیا جانا چاہئے تھا۔ مگر ایسا نہ کیا گیا۔ صرف اس جلسے میں مجھے نظم پڑھنے کا کہا گیا اور میری نظم کے بعد گورنر صاحب کا خطاب طے پایا۔ اس جلسے کا تمام بندوبست حنیف رامے نے کیا تھا۔ مگر اسٹیج پر انچارج شیخ جاوید الرحمٰن کو بنایا گیا تھا۔ ہرچند حنیف رامے جلسے میں شروع سے لے کر آخر تک رہے مگر ان کو خطاب کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

جلسہ گاہ میں گورنر غلام مصطفےٰ کھر صاحب تشریف لائے اور انہوں نے اس وقت جو لباس پہن رکھا تھا وہ تقریباً اس طرح کا دکھائی دیتا تھا جس طرح کا فوجی لباس ہوتا ہے۔ وہ نیم فوجی قسم کا لباس تھا۔ اس طرح کے لباس کی مناسبت اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ وہ اس وقت پنجاب کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ آج میں ہنستا ہوں کہ ہمارے ساتھ اسٹیبلشمنٹ کس کس طرح کے مذاق کرتی رہی ہے۔

ہم سادہ ہی اتنے تھے کی یوں ہی پذیرائی
جب جب کہ خزاں آئی سمجھے کہ بہار آئی

گورنر ملک غلام مصطفےٰ کھر نے کوئی لمبی چوڑی تقریر نہ کی تھی۔ انہوں نے پولیس کو الٹی میٹم دیا اور چوبیس گھنٹوں میں ہڑتال ختم کرنے کا حکم دے کر جلسہ ختم کر دیا۔ موچی دروازے کے جلسہ عام میں پولیس کے خلاف عوام کی نفرت کا کھلا مظاہرہ دیکھنے میں آیا تھا۔ پیپلز پارٹی کی خوش قسمتی تھی کہ اسٹیبلشمنٹ نے جس وکٹ پر کھیلنا چاہا تھا وہ وکٹ بے حد خراب وکٹ تھی۔ یعنی پولیس کو اپنا آلہ کار بنایا گیا تھا۔ جس کی ہڑتال سے نقصان کی بجائے الٹا پیپلز پارٹی کو فائدہ پہنچا تھا۔ لوگوں نے اپنی نفرت کی بنا پر پیپلز پارٹی کو فاتح پولیس پارٹی کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ فوجی جرنیل جنہوں نے یحییٰ خان سے انتقالِ اقتدار سے پہلے ملک غلام مصطفےٰ کھر کے ساتھ تمام باتیں طے کیں تھیں۔ پولیس کی ہڑتال کے وقت وہ سب کے سب آنکھیں بدل گئے تھے۔ جنرل گل حسن جس کو وزیراعظم بھٹو نے انتقالِ اقتدار کے چند ہی گھنٹوں بعد افواجِ پاکستان کا چیف آف آرمی کمانڈر بنایا تھا۔ اس نے پولیس ہڑتال میں فوج کی جانب سے حکومت کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ یاد رہے کہ اس معاملے میں گل حسن سے مدد کرنے کا خود صدر پاکستان بھٹو نے کہا تھا۔ جس

کے جواب میں جنرل گل حسن نے کہا تھا کہ اب آپ اپنے اقتدار کا میوزک خود ہی فیس کریں۔ فوج اس مسئلے میں آپ کی کچھ مدد نہیں کرے گی۔ اس طرح ایک آرمی چیف کا صدر پاکستان بھٹو کے حکم نہ ماننے کا یہ اسی طرح کا دوسرا واقعہ تھا جس طرح انگریز جنرل گریسی نے کشمیر کے مسئلے پر قائداعظم کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ پولیس کی ہڑتال کے بارے میں آئی۔ جی راؤ رشید مرحوم اپنی کتاب (جو میں نے دیکھا) کہ صفحہ 91 پر لکھتے ہیں کہ بھٹو صاحب نے چیف کمانڈر گل حسن کو کہا تھا فوج کا ہاتھ بٹائے۔ ایئر مارشل رحیم کو کہا تھا کہ ائیر فورس چکر لگائے۔ مگر دونوں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ شکست کے بعد بھی جرنیلوں کے دماغ سے یہ بات نہیں نکلی تھی کہ وہ سول اتھارٹی کا حکم نہیں مانیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ بھٹو صاحب نے ان دونوں کو فوج سے نکال دیا تھا۔ پاکستان کی تمام سیاسی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ پاکستان میں فوجی جرنیلوں نے سیاست دانوں کا کبھی حکم تسلیم نہیں کیا ہے اور نہ ہی سیاست دانوں کو وہ ملک پر حکومت کرنے کا حقدار تصور کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری وساری ہے۔ وہ سیاست دانوں کو حکومتی ملازمت تو دینے کو تیار ہیں اقتدار دینے کو ہرگز تیار نہیں ہیں۔

میں نے پیچھے انسپکٹر شیخ محمد علی کا ذکر کیا تھا جو ہڑتالی پولیس کا جنرل سیکرٹری تھا وہ چونکہ میرے کہنے پر ہڑتال سے علیحدہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے پولیس کی ہڑتال کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ اس کو میں خود ڈی۔ آئی۔ جی وکیل خان کے پاس لے کر گیا تھا اور اس کو دوبارہ نوکری پر بحال کرا دیا گیا تھا۔ اس کی زبانی مجھے علم ہوا تھا کہ یہ ہڑتال کا اشارہ بہت اوپر سے آیا تھا۔ پولیس کو کہا گیا تھا کہ پولیس شہر کے تمام راستے بند کر دے۔ دفاتر کا گھیراؤ کر لے۔ بنکوں کو لوٹ لیا جائے۔ وزیروں کو یرغمال بنا لیا جائے۔ جس کے نتیجے میں فوج پیپلز پارٹی کا تختہ الٹنے میں حق بجانب ثابت ہو جائے گی اور پیپلز پارٹی کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور صدر بھٹو پر ملک توڑنے کا الزام لگا کر مقدمہ قائم کر دیا جائے گا اور پیپلز پارٹی کے لیڈروں کو جیلوں میں ڈال دیا جائے گا اور ملک پر آج ہی کی طرح کی سیاست دانوں کی حکومت قائم کر دی جائے گی۔ جس کا وزیراعظم اصغر خان کو بنا دیا جائے گا اور اس حکومت میں باقی تمام سیاست دانوں کو حصہ بقدر جثہ دے کر مطمئن کر دیا جائے گا۔ جس طرح پیپلز پارٹی کے پانچ سالہ اقتدار کے بعد وزیراعظم بھٹو کا تختہ الٹ کر جنرل ضیاء الحق نے کچھ سیاست دانوں کو اپنے اقتدار میں شریک کر کے ان کو ان کی جمہوریت دشمنی کا صلہ عطا کر دیا تھا۔

آپ دیکھیں کہ ملک کی خفیہ قوتیں یہ تمام اوپر بیان کیے گئے واقعات کو پروان چڑھانے کی سازش اس وقت کر رہی تھیں جب تازہ تازہ ملک دو ٹکڑے ہوا تھا۔ 93 ہزار فوجی جوان پاکستان کے ہندوستان کی قید میں تھے۔ ملک کا ہر ادارہ شکست و ریخت کا شکار تھا۔ جب ابھی وزیر اعظم بھٹو نے اقتدار کی ابتدا کی تھی۔ اس کے علاوہ ملک کا متفقہ آئین بنانے کی ابھی ابتدا تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وزیر اعظم بھٹو کس قدر طاقت ور اور ہنر مند سیاست دان تھے جنہوں نے اپنے اقتدار کے پہلے دن سے ہی خفیہ قوتوں کی سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور وہ پاکستان کا آئین بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پاکستان کا آئین بنانے کے درمیان خفیہ طاقتوں نے بے شمار سازشیں کی تھیں۔ اس کی یوں تو تفصیل بہت لمبی ہے۔ مگر چند ایک نمایاں سازشوں کا یہاں ذکر کر دینا ضروری ہے۔

آئین کے خلاف خفیہ قوتوں کی سازش اور حزبِ اختلاف کا کردار

پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ نے پولیس کی ہڑتال کے دوران حزبِ اختلاف کے تمام بڑے لیڈروں جن میں خان عبدالولی خان، مفتی محمود، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، نوابزادہ نصر اللہ خان، میاں ممتاز دولتانہ، ملک محمد قاسم، آغا شورش کاشمیری، پیر پگاڑا، ائیر مارشل اصغر خان، اکبر بگٹی اور نواب عطاء اللہ مینگل۔ ان تمام لیڈروں کو اپنے خفیہ طریقے کار کے ذریعے وزیر اعظم بھٹو کی حکومت کو گرانے کے غلط کام میں ملوث کر دیا تھا۔ ایک طرف پولیس ہڑتال پر تھی دوسری جانب حزبِ اختلاف کے یہ تمام لیڈر جلسے اور جلوسوں کے ذریعے پیپلز پارٹی پر حملہ آور ہو گئے تھے۔

ہماری سیاسی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ ہمارے کچھ سیاست دان پاکستان کے قیام کے آغاز میں ہی اپنی نااہلی کی بنا پر اسٹیبلشمنٹ کے محتاج اور بعد میں اس کے ایجنٹ بن گئے تھے۔ اسٹیبلشمنٹ جب بھی چاہتی تھی ان سیاست دانوں سے اپنی مرضی کے مطابق تحریکیں چلواتی تھی، اور اپنے مخصوص مفادات حاصل کر لیتی تھی۔ 1972ء میں پہلی مرتبہ اسٹیبلشمنٹ کو اپنے مذموم عزائم میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ کی اس ناکامی کی وجہ ایک تو وزیر اعظم بھٹو کی آہن شکن ذات اور شخصیت تھی۔ دوسری سب سے بڑی وجہ پاکستان پیپلز پارٹی تھی جس کی جڑیں عوام کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ تیسری اہم وجہ پیپلز پارٹی کا منشور اور اس کے نظریات کا جوہر تھا جو ایک بہت بڑی قوت بن گیا تھا۔ جس منشور یا نظریات کی وجہ سے تحریک چلانے والی تمام ظاہری اور خفیہ

قوتوں کو لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ عوام کی ہی قوت کا نتیجہ تھا کہ ملک مصطفیٰ کھر کی حکومت نے لاہور میں تقریباً حزبِ اختلاف کے تمام بڑے لیڈروں کو تھانوں میں بند کر دیا تھا۔ مگر باہر عوام کے کانوں تک جوں تک نہ رینگی تھی۔ تھانہ سول لائن لاہور میں کچھ لیڈروں کے ساتھ گورنر کھر کے حکم پر بہت غلط برتاؤ کیا گیا تھا جو کسی اعتبار سے اچھا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس قسم کے برتاؤ کی ہرگز ہرگز ضرورت نہیں تھی۔ یہ قائدین عوام میں کوئی مقبولیت نہیں رکھتے تھے۔ اس کے باوجود میں ایک سیاسی کارکن ہونے کی بنا پر سیاست دانوں کے ساتھ کئے گئے اس سلوک کے اس وقت بھی خلاف تھا اور آج بھی خلاف ہوں۔ یہی وہ غیر جمہوری اقدام تھے جن کی وجہ سے پیپلز پارٹی کی حکومت بہت کم وقت میں غیر مقبول ہونا شروع ہو گئی تھی۔

میاں محمود علی قصوری کا استعفیٰ

پنجاب میں پولیس کی ہڑتال اور حزبِ اختلاف کی پولیس کی حمایت میں باہر سڑکوں پر چلائی گئی تحریک کے دم توڑ جانے کے بعد اسٹیبلشمنٹ نے وزیراعظم بھٹو کو مرکزی اسمبلی میں آئین بنانے کے معاملے میں ناکام بنانے کا نیا منصوبہ بنایا۔ اس نئی سازش میں تمام حزبِ اختلاف کے منتخب نمائندوں کو متفقہ طور پر آئین بنانے کے مسئلے میں مشکلات پیدا کرنے کا کام سونپا گیا۔ دوسری سازش پیپلز پارٹی کے اراکینِ اسمبلی کو پارٹی کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے اندر جتنے بھی خفیہ ایجنسیوں کے بھیجے ہوئے لوگ تھے ان لوگوں کو ذاتی اختلافات کی بنا پر پارٹی کو چھوڑنے کا اشارہ کر دیا گیا۔ آپ ذرا قومی اسمبلی میں خفیہ قوتوں کی سازش کا کمال ملاحظہ کریں اور حزبِ اختلاف کے کردار کا اندازہ کریں کہ قومی اسمبلی میں آئین پر حزبِ اختلاف کی جانب سے افتتاحی تقریر کے لئے احمد رضا قصوری کا انتخاب کیا گیا تھا۔

حزبِ اختلاف کا یہ اقدام ان کے ذہنی دیوالیہ پن کی انتہا کا مظہر تھا اور وزیراعظم بھٹو دشمنی کی انتہا تھی۔ وہ اپنی اس اندھی دشمنی میں کسی وقار اور کسی معیار کو ملحوظ نہیں رکھتی تھی۔ یہ آئین کا مذاق اڑانے والی بات تھی۔ حزبِ اختلاف کے لئے آئین جیسے سنجیدہ مسئلے پر اس طرح کی روش اختیار کرنا بے حد شرمناک بات تھی۔ مگر حزبِ اختلاف چونکہ ایک مجبور محض قوت تھی اس کو حکم اوپر سے آتا تھا۔ جس حکم کو قبول کرنے میں اس کو نہ تو کوئی عار محسوس ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی شرم محسوس ہوتی

تھی۔ہم نے دیکھا تھا کہ آئین بنانے کے وقت قومی اسمبلی میں پاکستان کے ان تمام سیاست دانوں کے چہرے بے نقاب ہو گئے تھے جو فوج کی خفیہ ایجنسیوں کے اشارے پر اپنی سیاست کی دوکان چلائے ہوئے تھے۔اس طریقے سے پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار کے وقت ملک میں ایک طرح کی پولارائزیشن ہو گئی تھی۔

وہ پولارائزیشن ان سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں کی تھی جو اسٹیبلشمنٹ کی سیاست کرتے تھے۔اس پولارائزیشن میں بڑی افسوس ناک صورتِ حال سامنے آئی تھی۔وہ صورتِ حال یہ تھی کہ سوائے پاکستان پیپلز پارٹی کے باقی پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں اور سیاست دان فوجی جرنیلوں کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔پاکستان کے سیاست دانوں کا یہ کردار ملک وقوم کے لئے کبھی بھی اچھا کردار نہیں ہوسکتا تھا۔یہ ایک بدشگون کردار تھا۔جس کی سزا آج پوری پاکستانی قوم پا رہی ہے۔

پیپلز پارٹی کو یا وزیراعظم بھٹو کو مرکزی اسمبلی میں ناکام بنانے کے لئے پیپلز پارٹی کی پارلیمانی پارٹی پر سب سے کاری وار میاں محمود علی قصوری کی پارٹی سے بغاوت کروا کر کرایا گیا تھا۔میاں محمود علی قصوری کی بغاوت بڑی معنی خیز تھی اور پاکستان کے تمام اصلی اور حقیقی سیاست دانوں اور سیاسی کارکنوں کے لئے ایک بہت بڑا جھٹکا تھی۔محمود علی قصوری کی بغاوت اسٹیبلشمنٹ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔میاں محمود علی قصوری کوئی عام رکن اسمبلی نہیں تھے وہ وزیراعظم بھٹو کے وزیر قانون تھے۔ان کے وزیر قانون ہونے کی حیثیت سے ان کی بغاوت وزیراعظم بھٹو کی آئین سازی کے لئے کس قدر مہلک اور سنگین بن جاتی ہے اور ان کی حکومت کے لئے کتنی خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔میاں محمود علی قصوری ماضی کی فوجی حکومتوں کے دور میں پوری دنیا میں آئین اور قانون اور انسانی بنیادی حقوق کے سلسلے میں پاکستان کی نمائندگی کے لئے جایا کرتے تھے۔ان کا ان بین الاقوامی فورموں میں جانا پاکستان کی ماضی کی فوجی حکومتوں کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ان کی اس طرح کی نمائندگی صاف ثابت کرتی ہے کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کے زیر اثر سیاسی کام کیا کرتے تھے۔دوسرا ان کا تعلق نیشنل عوامی پارٹی سے تھا اور 1970ء میں ان کی پرانی جماعت نیشنل عوامی پارٹی کی تمام سیاست فوجی جرنلوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کی سیاست بن کر رہ گئی تھی۔حمودالرحمن کمیشن میں خود خان عبدالولی خان نے اعتراف کیا تھا کہ وہ ڈھاکہ جنرل صدر یحییٰ خان کے کہنے پر جاتے تھے۔اس وقت کے ڈپٹی انٹیلی جنس ڈائریکٹر

www.bhutto.org

راؤ رشید جوان دنوں پشاور میں متعین تھے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 73 میں تحریر کرتے ہیں کہ عبدالولی خان اور طفیل محمد یحییٰ خان کے مشیروں کا کام کرتے تھے۔ پاکستان کا آئین بنانے کے وقت وزیراعظم بھٹو کے آئین بنانے کی سب سے بڑی مخالف جماعت پارلیمنٹ میں جماعت اسلامی اور نیشنل عوامی پارٹی تھی اور اس کی اتحادی جماعت مفتی محمود کی جماعت تھی۔ ولی خان کی اسمبلی میں وزیراعظم بھٹو کی مخالفت کے پیچھے اسی خفیہ قوت کا ہاتھ تھا جس کو اسٹیبلشمنٹ کہا جاتا ہے۔ ولی خان کے ساتھ چونکہ میاں محمود علی قصوری کے دیرینہ مراسم تھے جس کی وجہ سے میاں محمود علی قصوری کو وزیراعظم بھٹو کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنا بہت آسان بن گیا تھا۔ ابھی آئین بنانے کی ابتداہی ہوئی تھی کہ لاہور ہائی کورٹ میں میاں محمود علی قصوری کے ایک جونیئر مشتاق راج نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ جب پاکستان کا وزیر قانون ہی نہیں ہوگا تو پاکستان کا آئین کس طرح بن سکے گا۔

واضح رہے کہ نیشنل پارٹی کا یہ کرونک پرانا کارکن یہ باتیں اسی وقت کہہ رہا تھا جس وقت میاں محمود علی قصوری کا وزیراعظم بھٹو کے ساتھ کسی قسم کا کوئی اختلاف موجود نہیں تھا۔ مشتاق راج کی باتوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ پیپلز پارٹی سے میاں محمود علی قصوری کو باہر کھینچنا نیشنل عوامی پارٹی کی سازش تھی۔ یہاں پر یہ بات بھی تحریر کر دینا قابلِ ذکر ہوگی کہ میاں محمود علی قصوری کا استعفیٰ بھی مذکورہ مشتاق راج ہی لاہور گورنر ہاؤس لے کر گیا تھا اور وہ اس استعفیٰ کو اپنی کی گئی پیش گوئی کا کرشمہ قرار دیا کرتا تھا کہ میں نے تو اس استعفیٰ کا اعلان وقت سے پہلے ہی کر دیا تھا مگر لوگ میری بات کا یقین نہیں کرتے تھے۔ مشتاق راج کا میاں محمود علی قصوری کے پیپلز پارٹی چھوڑنے کے انکشاف کا معاملہ عین اسی طرح کا تھا جس طرح ایک گھر سے بھاگ جانے والی لڑکی کا معاملہ تھا جس نے گھر سے بھاگنے سے پہلے ہی اپنی ماں کو اور اپنے گھر والوں کو کہنا شروع کر دیا تھا کہ کل ہمارے گھر میں ایک جی کم ہو جائے گا اور جب وہ لڑکی بھاگ گئی تو اس کی ماں نے کہنا شروع کر دیا کہ لوگو میری لڑکی تو اولیاء تھی وہ تو بار بار کہتی تھی کہ کل ہمارے گھر میں ایک جی نہیں ہوگا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وزیراعظم بھٹو اپنی طبیعت کے لحاظ سے بے حد اَنا پرست، خود پرست اور آتش زیر پا قسم کے انسان تھے۔ ان کی طبیعت اور ان کے مزاج کا حوالہ دے کر ہر شخص اپنی غداری اور اپنی بغاوت کو ''جسٹی فائی'' کر سکتا تھا۔ وجہ جواز بنا سکتا تھا۔ لیکن فلاسفی کی

اصطلاح میں ایک بات مشہور ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ دنیا کا ہر اختلاف باہمی محبت اور گفت وشنید سے ختم کیا جا سکتا ہے ہر جگہ ہر شکایت کا علاج ہو سکتا ہے۔ مگر سازش کے تحت اختیار کی گئی ناراضگی کا کوئی علاج نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کی ناراضگی کا مقصد ہی علیحدگی ہوتا ہے۔ میاں محمود علی قصوری کی ناراضگی کے لئے بھی وزیراعظم بھٹو کے جارحانہ رویے کو ہی جواز بنایا گیا تھا۔

میاں محمود علی قصوری کوئی عام انسان نہیں تھے کہ بھٹو صاحب ان کے ساتھ کسی بھی طرح کا غلط برتاؤ کرتے۔ بھٹو صاحب نے ان کو اپنی ضمنی انتخابی نشست پر ایم۔ این۔ اے بنایا تھا۔ اس کے بعد ان کو وزیر قانون بنایا تھا۔ میاں محمود علی قصوری خود بھی قانون پرستی اور آئین پرستی کی شہرت رکھتے تھے۔ پاکستان کے آئین بنانے کا کام وزیراعظم سے زیادہ ان کے لئے اہم ہونا چاہئے تھا۔ یہ وزیر قانون کی ذمہ داری تھی کہ وہ ملک کا آئین بنانے کے لئے اپنا سب کچھ وقف کر دیتا وہ اپنی چھوٹی چھوٹی رنجشوں کو قربان کر دیتا۔ وہ ایک بڑے کاز کے لئے کسی ناراضگی کو دل میں جگہ نہ دیتا اور اگر وہ آئین کا کام مکمل کر کے وزیراعظم بھٹو سے یہ کہہ کر علیحدگی اختیار کر لیتا کہ اس نے وزیراعظم کے کسی غلط رویے کو صرف آئین بنانے تک برداشت کرنا گوارا کیا تھا۔ اب آئین بن چکا ہے اور میں ان کی پارٹی سے علیحدگی کا اعلان کرتا ہوں تو ان کی عظمت میں تاریخ ساز اضافہ ہوتا۔ اس کے برعکس انہوں نے جس انداز میں وزیراعظم بھٹو کا ساتھ چھوڑا تھا وہ کوئی قابلِ عزت انداز نہیں تھا۔ جو ایک قانون دان سیاست دان کے شایانِ شان نہیں تھا۔ وہ انداز ایک سازش تھی۔ میاں محمود علی قصوری جو اپنی ذات کی پہچان سوشلزم اور کیمونزم بنائے ہوئے تھے۔ بالآخر وہ ائیر مارشل اصغر خان کی پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ جو پارٹی خفیہ ایجنسیوں کی بنائی ہوئی تھی۔

میرے موقف کی تائید میں ایک دوسرا پہلو ملاحظہ کریں

میاں محمود علی قصوری کی ایک سازش کے تحت پیپلز پارٹی سے علیحدگی اختیار کرنے کی تصدیق کے لئے دوسرا پہلوان کے ان پیروکاروں کا اور ان کے ان ورکروں کا تھا جن کو پیپلز پارٹی نے 1970ء میں انتخابات میں پارٹی ٹکٹ دے کر اسمبلیوں میں پہنچایا تھا۔

میاں محمود علی قصوری ان کے قائد تھے۔ ان ممبرانِ پنجاب اسمبلی میں رفیق احمد شیخ، رؤف

طاہر، اسماعیل ضیاء اور کاکوشاہ کے نام بہت نمایاں تھے۔ اگر میاں محمود علی قصوری کسی اصول کی بنا پر وزیر اعظم بھٹو سے علیحدگی اختیار کرتے تو یہ تمام سیاسی کارکن جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یہ تمام پیپلز پارٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دیتے۔ مگر ان لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی ان کی علیحدگی کو حق بجانب خیال نہیں کیا تھا۔ بلکہ ان کے اس غلط اقدام کی مذمت کی تھی۔ اور آخری دم تک پیپلز پارٹی کے ساتھ رہے تھے اور ان میں جو زندہ ہیں وہ آج بھی پیپلز پارٹی کے ساتھ ہیں۔ ان لوگوں نے کھل کر کہا تھا کہ میاں صاحب نے ولی خان کے کہنے پر استعفیٰ دیا ہے۔

جنرل یحییٰ خان کے مشیر روداد خان کے بھائی عبدالخالق خان کا پیپلز پارٹی سے استعفیٰ

میاں محمود علی قصوری کو پیپلز پارٹی سے کھینچ لینے سے پہلے پاکستان پیپلز پارٹی کا ایک اور ایم۔ این۔ اے جس کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا اور جو نیشنل عوامی پارٹی کا سابق رکن تھا اس کو بھی پیپلز پارٹی سے بغاوت کرا کر اسمبلی میں حزبِ اختلاف کی صفوں میں شامل کر لیا گیا تھا۔ یہ شخص یا یہ ایم۔ این۔ اے صوبہ سرحد میں پیپلز پارٹی کا قومی اسمبلی کا اکلوتا ممبر منتخب ہوا تھا۔ اس شخص کے پیپلز پارٹی چھوڑنے کی دو وجہ تھی۔ ایک تو یہ نیپ کا پرانا رکن تھا۔ دوسرا اس ایم۔ این۔ اے کا بھائی روداد خان یحییٰ خان کا مشیر اطلاعات تھا۔ مشرقی پاکستان میں افواج پاکستان کی طاقت اور قوت کا جس طرح کا تصور اس شخص نے اپنی نشر و اشاعت کی قوت سے پیدا کیا تھا اس کے بعد مشرقی پاکستان کے عوام افواجِ پاکستان کو کسی قیمت پر اپنی ہمدرد اور مخالف خیال نہیں کر سکتے تھے۔ متحدہ پاکستان کی سالمیت کا صاحبزادہ جنرل شیر علی خان کے بعد اس شخص روداد خان نے بیڑہ غرق کیا تھا۔ فوجیں ہتھیار ڈال رہی تھیں یہ مشیرِ اطلاعات و نشریات یحییٰ خان کو پاکستان کے نئے آئین کے اعلان کا مشورہ دے رہا تھا۔ صدرِ پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے صدر کا عہدہ اختیار کرنے کے بعد پہلے دو فیصلے جو کئے تھے وہ یہ تھے۔ ایک تو انہوں نے جنرل گل حسن کو افواجِ پاکستان کا کمانڈر انچیف مقرر کیا تھا۔ دوسرا حکم انہوں نے روداد خان کو برطرف کرنے کا کیا تھا۔ روداد خان کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ صوبہ سرحد کے سیاست دانوں کا یحییٰ خان کے ساتھ رابطہ روداد خان کے ذریعے ہی ہوتا تھا۔ روداد خان بھی جنرل حمید اور جنرل گل حسن کے

www.bhutto.org

ساتھ انتقالِ اقتدار کی سازش اور سکیم میں شریک تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ صدر بھٹو کو اقتدار دیئے جانے میں وہ خود بھی شامل تھا لہٰذا اس کو برطرف نہیں کیا جا سکے گا۔ مگر اس کو برطرف کرنا بھٹو صاحب کی مجبوری تھی۔ یہ شخص برطرف ہوتے ہی ولی خان کے ساتھ جا ملا اور اس نے اپنے بھائی سے بغاوت کروا کر اس کو حزبِ اختلاف میں شامل کروا دیا تھا۔ یہ شخص روداد خان اسٹیبلشمنٹ کی خفیہ ایجنسی کا اہم رکن تھا جو برطرف ہو کر بھی خفیہ ایجنسیوں کا سرحد میں اہم ترین کارندہ تھا۔ خان عبدالولی خان کو وزیراعظم بھٹو کے مقابلے میں کھڑا کرنے میں اس شخص کا اہم کردار تھا۔ جس کا پہلا ثبوت اس کے بھائی کا پیپلز پارٹی کو چھوڑ کر ولی خان کے ساتھ اسمبلی میں اتحاد کرنا تھا۔ جس کا نام عبدالخالق خان تھا۔

ملک غلام مصطفیٰ کھر کا بھٹو صاحب سے عجیب و غریب مطالبہ

وزیراعظم بھٹو کو جب پاکستان کا اقتدار منتقل کیا گیا اس وقت پاکستان کا کوئی آئین موجود نہیں تھا۔ واضح رہے کہ اقتدار ہمیشہ کسی قانون اور کسی آئین کے مطابق کسی شخص یا کسی فریق کو منتقل کیا جاتا ہے۔ مگر اس وقت صرف اور صرف مارشل لاء کا ضابطہ ہی دستیاب تھا۔ جس ضابطے کے مطابق صدر یحییٰ خان حکومت کر رہا تھا۔ لہٰذا انتقالِ اقتدار کے وقت وزیراعظم بھٹو کو فوجی قانون کے تحت اقتدار منتقل کیا گیا تھا۔ مارشل لاء کے وہ تمام اختیارات وزیراعظم بھٹو کی ذات کو منتقل کر دیئے گئے تھے جو صدر جنرل یحییٰ خان کو حاصل تھے۔ اس طرح وزیراعظم بھٹو صدرِ پاکستان بھی تھے اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھے۔ دنیا کا یہ پہلا موقعہ اور واقعہ تھا کہ ایک سیاست دان یا سویلین حکمران چیف آف آرمی سٹاف بھی تھا اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی تھا۔ جو ایک جمہوری اور آئینی نظریہ سیاست کے مطابق جائز بات نہیں تھی۔ مگر اس وقت یہ مجبوری تھی اس کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ لہٰذا وزیراعظم بھٹو کو عارضی طور پر یہ غیر عوامی عہدہ قبول کرنا پڑا تھا، مگر یہاں ایک بات کس قدر واضح ہو رہی ہے کہ پاکستان کے شکست خوردہ جرنیلوں کی ذہنی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ جب ان کی جان پر بنی ہوئی تھی تب یہ اپنی جان بچانے کے لئے ہر کام کرنے کو تیار تھے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ یہ جرنیل کسی سویلین وزیراعظم کو سلیوٹ مارنا اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔ بہ حیثیت صدرِ پاکستان وزیراعظم بھٹو جب پاکستان کا آئین بنانے میں

مصروف تھے تو یہ جرنیل ہر قدم پر صدر بھٹو کے راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے۔ یہ جرنیل اپنی اس شرمناک حالت کے باوجود صدر بھٹو کو اپنے شکنجے میں رکھنا چاہتے تھے۔ صدر بھٹو کو اپنا مجبور محض بنانے کے لئے تمام حربے استعمال کر رہے تھے۔ جن میں پولیس کی ہڑتال کا حربہ تھا۔ حزب اختلاف کو متحد کر کے صدر بھٹو کے مقابل لانے کا حربہ تھا۔ اسمبلی کے اندر صدر بھٹو کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا حربہ تھا۔ جو وزیر قانون میاں محمود علی قصوری، احمد رضا قصوری اور عبدالخالق خان ایم۔ این۔ اے کی بغاوت سے کر دیا گیا تھا۔ جس کا پیچھے ذکر کر دیا گیا ہے۔

وزیر اعظم بھٹو اقتدار تو حاصل کر چکے تھے، مگر ان کے اس اقتدار حاصل کرنے کی پاداش میں جو کچھ ان کے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہ بہت خوفناک عمل تھا۔ باخدا وزیر اعظم بھٹو بڑے فولادی قسم کے انسان تھے۔ جو اسٹیبلشمنٹ سے بہت زیادہ طاقت ور ثابت ہوئے تھے۔ ہم نے پاکستان کے آئین بنانے سے بات شروع کی تھی۔ پاکستان کا آئین بناتے وقت صدر بھٹو کی اور حزب اختلاف کی آئین بنانے کے مرحلے پر ایک جنگ جاری تھی جس کو بظاہر پارلیمانی جنگ کہا جا سکتا ہے۔ صدر بھٹو حزبِ اختلاف کی نیت اور سازش کو اچھی طرح بھانپ چکے تھے وہ حزبِ اختلاف کو یہ بات سمجھ نہیں آنے دینا چاہتے تھے کہ وہ پاکستان کا آئین کس قسم کا بنانا چاہتے ہیں۔ آیا وہ صدارتی آئین بنانا چاہتے ہیں یا پارلیمانی نظامِ حکومت کا آئین بنانا چاہتے ہیں جس میں آئینی طور پر وزیر اعظم سب سے زیادہ طاقت کا حامل ہوا کرتا ہے۔ اس وقت چونکہ صدر بھٹو ملک کے صدر تھے اور صدارتی طرزِ اقتدار میں صدر ایک مطلق العنان حکمران ہوتا ہے۔ صدر بھٹو کی کوشش تھی کہ وہ اپنی صدارت کے عہدے کے ذریعے ایسی تمام قانونی اور آئینی مراعات حاصل کر لیں جو آئین بن جانے کے بعد حاصل کرنا مشکل ہو جاتی تھیں، ان کی وہ تمام مراعات کوئی غیر قانونی نہیں تھیں اور نہ ہی ان مراعات کا تعلق ان کے ذاتی مفاد سے وابستہ تھا۔ مگر حزبِ اختلاف چونکہ ان کی صرف سیاسی مخالف نہیں تھی وہ ان کی ذاتی دشمن بن چکی تھی وہ ہر قدم پر ان کا رستہ روک رہی تھی۔ ان کی ایک سازش کے تحت یہ کوشش تھی کہ صدر بھٹو کو کمزور قسم کا حکمران بنا دیا جائے۔ صدر بھٹو ایک جمہوری قائد تھے ان کی اصل منزل اور ان کا اصل مقام تو پاکستان کا وزیر اعظم بننا تھا، مگر ان کو اس بات کا علم تھا کہ اگر انہوں نے اپنی حزبِ اختلاف کو اگر ذرا سا اس بات کا عندیہ دے دیا کہ وہ وزیر اعظم بننا چاہتے ہیں تو یہ ایسا آئین ہرگز نہیں بننے دیں گے جس آئین کی رو سے

وزیراعظم کی طاقت سپریم ثابت ہو جائے۔ لہٰذا صدر بھٹو نے حزبِ اختلاف کی سازش کو ناکام بنانے کے لئے حزبِ اختلاف کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنے اندازِ اقتدار سے ہر طریقے سے یہ ثابت کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ ملک میں صدارتی نظام لانا چاہتے ہیں اور خود پاکستان کا صدر بننا چاہتے ہیں۔ خود پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اس معاملے میں بے حد پریشان تھی کہ صدر بھٹو کا اصل مقصد معلوم کیا جا سکے کہ وہ اصل میں کیا بننا چاہتے ہیں۔ مگر صدر بھٹو ایک کامیاب کھلاڑی کی طرح کسی پر بھی یہ ثابت نہیں کر رہے تھے کہ ان کا اصل گول کیا ہے۔ اس معاملے میں حزبِ اختلاف گومگو کی حالت میں تھی۔ حزبِ اختلاف ایک دن تو صدارتی نظام کے خلاف تقریریں کرتی تھی۔ دوسرے دن وہ وزیراعظم کے اختیارات کو کم کرنے کی بات کر رہی ہوتی تھی۔ بالآخر صدر بھٹو نے حزبِ اختلاف کو مکمل طور پر سابوڈاج کر دیا تھا۔ حزبِ اختلاف کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ صدر بھٹو ملک میں صدارتی آئین بنانا چاہتے ہیں۔ اس طرح آئین بنانے کی ون ٹو ون فائٹ میں یعنی حزبِ اختلاف اور صدر بھٹو کے درمیان جاری جنگ نما کشتی میں اور رسہ کشی میں ملک غلام مصطفیٰ کھر گورنر پنجاب اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر پنجاب نے صدر بھٹو سے ایک عجیب وغریب قسم کا مطالبہ کر دیا۔ وہ مطالبہ یہ تھا کہ بھٹو صاحب اگر آپ پاکستان کا صدر بننا چاہتے ہیں اور پاکستان کا آئین صدارتی بنانا چاہتے ہیں تو وزیراعظم پاکستان کے لئے آپ میرا نام تجویز کرنے کا میرے ساتھ وعدہ کریں۔ کھر صاحب کا یہ مطالبہ صدر بھٹو کے لئے بے حد حیران کن تھا۔ صدر بھٹو اس وقت کھر صاحب پر بے حد اعتماد رکھتے تھے۔ وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ملک غلام مصطفیٰ کھر وزیراعظم بننے کا خواب بھی دیکھ سکتا ہے۔ کھر صاحب کا صوبہ پنجاب کا حکمران بن جانا بھی ایک معجزہ تھا۔ ایک حیران کن بات تھی۔ اس لئے کہ صاحب الرائے لوگ کھر صاحب کو اس نظر سے کبھی بھی نہیں دیکھتے تھے کہ وہ پنجاب کا حاکم بن جائے گا۔ صدرِ پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی ذات پر تنقید کا آغاز ہی کھر صاحب کی حکمرانی سے ہوا تھا کہ بھٹو نے چھوروں کو پنجاب پر مسلط کر دیا ہے۔ اس قسم کے ماحول میں کھر صاحب کا وزیراعظم کے عہدے کا بھٹو صاحب کو کہنا ایک بم شل کی طرح کا مطالبہ تھا۔

آج 2006ء میں اگر ملک غلام مصطفیٰ کھر وزیراعظم پاکستان بننے کی بات کریں تو قابلِ فہم بات ہو سکتی ہے۔ مگر 1972ء میں اس طرح کی بات کرنا بڑی خطرناک بات تھی۔ کھر صاحب کے

www.bhutto.org

اس مطالبے کے جواب میں اگر بھٹو صاحب ان کو یہ کہتے ہیں کہ وہ تو خود وزیراعظم بننے کے لئے اُمیدوار ہیں تو صدر بھٹو کے تمام پتے ننگے ہو جانے کا خطرہ تھا جس سے وہ حزبِ اختلاف کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ صدر بھٹو کے سیاسی پتے فلاش کی گیم بلائنڈ کی طرح تھے۔

فلاش کی گیم میں ایک اچھا کھلاڑی جس طرح اپنے مدمقابل کو اپنے پتوں کے بڑے اور چھوٹے ہونے کا اندازہ نہیں کرنے دیتا۔ اسی طرح صدر بھٹو سیاست کی گیم میں حزبِ اختلاف کو یہ سمجھ میں نہیں آنے دینا چاہتے تھے کہ وہ صدر بننا چاہتے ہیں یا وزیراعظم۔ لہٰذا کھر صاحب کا یہ مطالبہ صدر بھٹو کے لئے اپنے اندر بے شمار شکوک و شبہات لئے ہوئے تھا۔ صدر بھٹو اس وقت حزبِ اختلاف کو مکمل طور پر یہ باور کرائے ہوئے تھے کہ وہ پاکستان کا صدر بننا چاہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے حزبِ اختلاف وزیراعظم کے عہدے کو تمام اختیارات دینے کی تحریک چلائے ہوئے تھی اور ان کی آئینی تحاریک کو ایک ایک کر کے منظور بھی کیا جا رہا تھا اور حزبِ اختلاف صدرِ پاکستان کے عہدے کو محض دکھاوے کا عہدہ بنا دینا چاہتی تھی اور اس طرح ایک مخبر قسم کی حزبِ اختلاف کو صدر بھٹو اپنے جال میں شکار کر چکے تھے۔ حزبِ اختلاف کی حالت بالکل اس طرح کی تھی کہ خود آپ اپنی چال میں صیاد آ گیا تھا۔ کھر صاحب کے اس غیر مناسب قسم کے بلاوجہ کے مطالبے پر صدر بھٹو کا ماتھا تو ضرور ٹھنکا مگر انہوں نے کھر صاحب پر کسی قسم کا کوئی اعتراض ظاہر نہ ہونے دیا۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ وقت آنے پر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کھر صاحب کا اس قسم کا بے محل مطالبہ آج بھی اپنے اندر بے شمار سوال لئے ہوئے ہے۔ میری ذاتی رائے کے مطابق بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ اس وقت افواجِ پاکستان کے جرنیلوں کا تمام تر رابطہ کھر صاحب کے ساتھ تھا۔ انتقالِ اقتدار کا منصوبہ بھی کھر صاحب کے ساتھ ہی طے پایا تھا۔ ایک تو ان کا خیال ہو سکتا تھا کہ اگر بھٹو صاحب صدرِ پاکستان بن جاتے ہیں تو وزیراعظم ان کے اعتماد کا آدمی آ جائے۔ دوسرا کھر صاحب کے اس مطالبے سے اس بات کا بھی پتہ چلایا جا سکے گا کہ صدر بھٹو پاکستان کا آئین کس طرح کا بنانا چاہتے ہیں۔ ان دو باتوں کے علاوہ کھر صاحب کے مطالبے سے اور کچھ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

اس مطالبے کے بارے میں بھٹو صاحب کا اظہارِ خیال

لاہور کے گورنر ہاؤس میں جب گورنر پنجاب نواب صادق قریشی تھا اور ملک غلام مصطفےٰ کھر

www.bhutto.org

وزیراعظم بھٹو کے خلاف بغاوت کا اعلان کر چکا تھا۔ اس وقت خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو کی موجودگی میں بھٹو صاحب کچھ لوگوں کے ساتھ اظہار خیال کر رہے تھے۔ اس میٹنگ میں پارٹی کے چند پرانے بنیادی کارکنوں کو بھی بلایا گیا تھا ان میں میں بھی شامل تھا۔ وہاں کھر صاحب کی بغاوت کے بارے میں لوگ اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ اس میٹنگ میں بھٹو صاحب نے خود اس بات کا انکشاف کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ تو ان کو اپنے بیٹے مرتضیٰ بھٹو سے زیادہ محبت کرتے تھے مگر کھر کا ذہن عجیب وغریب تھا۔ وہ شروع دن سے ہی خفیہ قوتوں کی سازش کا شکار ہو گیا تھا۔ جس سازش کا پہلا انکشاف کھر کا وزیراعظم بننے کا مطالبہ تھا۔ وزیراعظم بھٹو کے الفاظ تھے کہ کھر کے اس مطالبے کے بعد وہ کافی دیر تک اس کے اس مطالبے پر غور کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی وزیراعظم بھٹو نے خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو صاحبہ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں نے اس وقت بیگم صاحبہ کے ساتھ یہ بات کی تھی کہ نصرت سنا تم نے کھر صاحب وزیراعظم پاکستان بننا چاہتے ہیں۔ وزیراعظم بھٹو کی اس بات پر بیگم صاحبہ نے افسوس کے ساتھ بھٹو صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ کا ایک لاڈلا بھی وفادار ثابت نہیں ہوا۔ میرے ذاتی خیال کے مطابق کھر صاحب کے بارے میں بھٹو صاحب کے ذہن میں پہلی بدگمانی کھر صاحب کے اس مطالبہ سے پیدا ہوئی ہوگی۔

اس طرح کی تمام باتوں سے ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک سیاست دان وزیراعظم کے لئے پاکستان کا آئین بنانا کس قدر مشکل بنا دیا گیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو بعد کمال واعزاز پاکستان کا ایک جمہوری متفقہ آئین بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان کا اصل مدعا اور ان کا گول پاکستان کا وزیراعظم بننا تھا۔ وہ حزبِ اختلاف کو اس بات کا جُل دیتے رہے کہ وہ صدرِ پاکستان بننے کے زیادہ خواہش مند ہیں۔ جس کی وجہ سے ولی خان اور ان کے تمام اتحادی وزیراعظم کے اختیارات میں اضافے پر متحد اور متفق ہو گئے اور جب آئین کی تدوین وتکوین کا سلسلہ مکمل ہو گیا تو وزیراعظم بھٹو نے ایک صبح اسمبلی میں ملک سے مارشل لاء کا قانون ختم کر کے وزیراعظم پاکستان بن جانے کا اعلان کر کے تمام حزبِ اختلاف اور اسٹیبلشمنٹ کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کو صرف اسٹیبلشمنٹ اور اس کے خفیہ ایجنٹ اور پاکستان کی حزبِ اختلاف ہی ان کی عوامی حکمرانی کی راہ میں مشکلات پیدا نہیں کر رہی تھی ان کے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے اور تراشے ہوئے بت بھی ان کے اقتدار کے راستے میں خندقیں کھود رہے تھے۔ اس طرح کی

www.bhutto.org

صورتِ حال سے نبرد آزما ہونا ذوالفقار علی بھٹو کا ہی کام تھا۔

جنرل گل حسن اور ائیر مارشل رحیم خان کو نوکری سے نکال دیا گیا

جنرل گل حسن اور ائیر مارشل رحیم خان پاکستان پیپلز پارٹی کی عوامی حکومت کو کسی قیمت پر کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ وہ وزیر اعظم بھٹو کے لئے ہر قدم پر مشکلات پیدا کرتے چلے جا رہے تھے۔ فوج کی تمام خفیہ ایجنسیاں ان کے اشاروں پر کام کرتی تھیں۔ ان کی پہلی سازش تو پولیس ہڑتال کرانے سے منظرِ عام پر آ چکی تھی۔ ان کی دوسری سازش فوج کے اندر بغاوت کرانے کی تھی۔ یہ دونوں شکست خوردہ ذہنیت کے جرنیل کچھ جونیر فوجی افسروں کے کندھے پر بغاوت کی بندوق رکھ کر چلانا چاہتے تھے جس کا بھٹو صاحب کو بروقت علم ہو گیا تھا۔ جنرل گل حسن کا اختلاف تو وزیر اعظم بھٹو کے ساتھ ان کے قوم سے پہلے خطاب سے ہی ہو چکا تھا۔ جس خطاب میں بھٹو صاحب نے جرنیلوں کے بارے میں کہا تھا کہ اب کسی جرنیل کو غیر ضروری مراعات نہیں دی جائیں گی۔ اور نہ ان کی ترقیاں کسی میرٹ کے بغیر عمل میں آئیں گیں۔ فوجی جرنیل قوم کو اور فوج کو اپنی قیادت سے مایوس کر چکے ہیں۔ ان کو ان کی اچھی اور اعلیٰ کارکردگی سے دوبارہ بحال کیا جائے گا۔ مجھے پاک فوج کو نئے سرے سے ترتیب اور تعمیر کرنا ہے۔ وزیر اعظم بھٹو جو خطاب کرتے وقت صدرِ پاکستان تھے۔ کہتے ہیں کہ خطاب کے بعد پہلا فون گل حسن کا آیا اور اس نے کہا کہ بھٹو صاحب آپ نے ہمارے بارے میں کیا کہہ دیا ہے۔ میں نے جواب دیا تھا کہ جنرل اب میں عوام کا نمائندہ ہوں اور یہ عوام کی حکومت ہے۔ اس جواب کے بعد وہ خاموش ہو گیا تھا۔ بھٹو صاحب نے حکومت ملتے ہی جب جمہوریہ چین کا دورہ کیا تو اس دورے میں گل حسن اور رحیم ساتھ تھے۔ ان دونوں کو چین کے رہنماؤں میں بھٹو صاحب کی مقبولیت پر بڑا حسد آیا تھا۔ یہ دورے کے دوران کھچے کھچے سے رہے تھے۔ بھٹو صاحب ان لوگوں کی نیت بھانپ گئے تھے۔ انہوں نے جمہوریہ چین کے دورے سے واپس آتے ہی ان دونوں تیس مار خان جرنیلوں کو صدر ہاؤس بلایا اور ان کے آگے استعفے رکھ کر کہا۔ سوری جنرل کبھی کچھ ایسے ناخوشگوار کام بھی کرنے پڑتے ہیں جن کو کرنے کو دل نہیں چاہتا مگر مجبوراً ان کو کرنا پڑتا ہے۔ ان اپنے تحریر شدہ استعفوں پر دستخط کرو۔ تاکہ میں تمہاری آئے دن کی سازشوں سے نجات پا کر ملک وقوم کی ترقی

کے لئے پوری توجہ کے ساتھ کام سرانجام دے سکوں۔لہٰذا ان دونوں نے اچھے بچوں کی طرح فوراً دستخط کر دیئے تھے۔

پاکستان کی تاریخ میں ایک سویلین وزیراعظم نے پہلی مرتبہ دو جرنیلوں کو نوکری سے نکالا تھا۔مگر پاکستان کی فوج جو ایک حکمران فوج بن چکی ہے۔وہ تاک میں اور گھات میں رہی جیسے ہی اس کو موقعہ ملا اس نے بھٹو صاحب کا تختہ الٹا دیا تھا۔

صوبہ سرحد میں پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار کی کہانی

صوبہ سرحد میں پاکستان پیپلز پارٹی کا صدر حیات محمد خان شیر پاؤ تھا۔شیر پاؤ کی سیاست کی ابتداء ایوب خان کی کنونشن لیگ سے ہوئی تھی۔شیر پاؤ ایک ناتجربہ کار نوجوان سیاست دان تھا۔ اس کی سیاست کا مرکزی نقطہ نیشنل عوامی پارٹی کی مخالفت کرنا تھا۔وہ خان عبدالولی خان کو پاکستان کا دشمن کہا کرتا تھا۔سرحد میں 1970ء میں دو ہی بڑے سیاست دان تھے ایک تو خان عبدالولی خان تھا۔دوسرا خان عبدالقیوم خان تھا۔شیر پاؤ ان دونوں کو ہی ناپسند کرتا تھا۔وہ ان دونوں میں کسی کے ساتھ بھی پیپلز پارٹی کے اتحاد کرنے کے خلاف تھا۔میرے یہ ذاتی علم کی بات ہے جس کا میں نے پیچھے کتاب میں کہیں ذکر بھی کیا تھا کہ شیر پاؤ ان دونوں رہنماؤں سے خوف کھاتا تھا۔وہ بے حد سیلف سنٹرڈ آدمی تھا۔وہ سرحد میں پاکستان پیپلز پارٹی کا بلا شرکت غیرے لیڈر رہنا چاہتا تھا۔اس کی یہ روش اور خواہش قومی سیاست کی مصلحتوں اور اصولوں کے خلاف تھی اور اس کا یہ رویہ انتہائی غیر سیاسی تھا۔اس کے اس رویے سے پہلے خود اُس کو نقصان پہنچا اور وہ زندگی سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا۔اس کے بعد خود وزیراعظم بھٹو کو بھی خان عبدالولی خان کی دشمنی کا شکار ہونا پڑا۔شیر پاؤ بہت محبت بھرا انسان تھا مگر سیاسی معاملات میں وہ بڑا اضدی تھا۔پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام سے ہی پہلے وہ بھٹو صاحب کا ساتھی بن گیا تھا۔اس طریقے سے صوبہ سرحد میں وہ پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک تھا۔بھٹو صاحب شیر پاؤ کو بہت پسند کرتے تھے۔شیر پاؤ کا بھٹو صاحب کے مزاج پر بہت اختیار تھا۔شیر پاؤ اپنے معاملات میں بے حد حساس ہوا کرتا تھا۔بھٹو صاحب بھی شیر پاؤ کی کسی بات کو ٹالا نہیں کرتے تھے۔پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار سے پہلے بھی کچھ لوگوں نے بڑی دیانت داری کے ساتھ پیپلز پارٹی کا نیپ کے ساتھ اتحاد کرانے کی کوشش کی تھی۔مگر

شیر پاؤ ان تمام کوششوں میں آڑے آ جاتا تھا۔ خان عبدالولی خان کے ساتھ وزیراعظم بھٹو کے اختلافات کی سب سے بڑی وجہ شیر پاؤ تھا۔ بھٹو صاحب نے شیر پاؤ کی ہی ضد کے باعث خان عبدالولی خان کے ساتھ سیاسی اتحاد بنانے کے بجائے مولانا بھاشانی کے ساتھ ایک سیاسی سمجھوتا کیا تھا۔ جس کا بھٹو صاحب کی ذات کو اور پیپلز پارٹی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان دونوں میں بے حد کمزور تھی۔ ان دونوں صوبوں میں نیشنل عوامی پارٹی کی قوم پرستی کی سیاست کا بڑا زور تھا جس کو توڑا نہیں جا سکتا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو ہر صورت نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ سیاسی اتحاد قائم کرنا چاہئے تھا۔ اس پارٹی کے ساتھ اتحاد نہ کرنا یہ ہماری بہت بڑی غلطی تھی جس کا سب سے زیادہ ہم کو ہی نقصان ہوا تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ اتحاد کرنے سے زیادہ فائدہ بھٹو صاحب کو ہی حاصل ہونا تھا اس لئے کہ بھٹو صاحب کو قومی قائد ہونے کا شرف حاصل تھا جو ولی خان کو نہیں تھا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ اگر پیپلز پارٹی کے اقتدار کا سمجھوتا ہو جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت پیپلز پارٹی کے اقتدار کا تختہ نہیں الٹا سکتی تھی اور نہ ہی وزیراعظم بھٹو کو پھانسی دی جا سکتی تھی۔ یہ وزیراعظم بھٹو کی خان عبدالولی خان کے ساتھ سیاسی مخالفت کا ہی نتیجہ تھا کہ ضیاء الحق کے لئے ان کو پھانسی دینا آسان ہو گیا تھا۔

خان عبدالولی خان کی بھٹو دشمنی کا آغاز

پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے تک نیشنل عوامی پارٹی اور خان عبدالولی خان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی ذاتی دشمنی کا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ اس وقت تک نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ پیپلز پارٹی کا سیاسی اور نظریاتی قسم کا ہی اختلاف تھا۔ ایسا اختلاف جو عام سیاسی اور جمہوری سیاسی جماعتوں میں ہوا کرتا ہے۔ یوں تو نیشنل عوامی پارٹی اور پاکستان پیپلز پارٹی دونوں ہی بائیں بازو کی نمایاں جماعتیں تھیں۔ مگر پیپلز پارٹی کا سوشلزم نیشنل عوامی پارٹی سے زیادہ مقبول تھا۔ جس کی وجہ وزیراعظم بھٹو کی سحر خیز شخصیت تھی۔ جس کی بنا پر پاکستان کے تمام سیاست دان ان کے سامنے خم کھاتے تھے اور ان کے بارے میں کچھ حسد زدہ سے تھے۔ مگر یہ ایک قدرتی بات تھی جو بڑی شخصیتوں میں اکثر پیدا ہو جایا کرتی ہے، جس کو پرسنلٹی کلالیش کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خان عبدالولی خان کے ساتھ بھٹو صاحب کا اور کوئی اختلاف نہیں تھا۔

وزیراعظم بھٹو نے جب اقتدار حاصل کیا تو اقتدار حاصل کرتے ہی انہوں نے خان عبدالولی خان کے ساتھ سیاسی سمجھوتا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کی اس کوشش اوران کا یہ آغاز سوفی صد صحیح اور درست تھا۔ اس معاملے میں بہت زیادہ پیش رفت ہورہی تھی۔ خان عبدالولی خان کے ساتھ بھٹو صاحب کا سمجھوتا ہونا اس لئے بھی ممکن اور آسان تھا کہ صوبہ سرحد میں خان عبدالقیوم خان کے ساتھ بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی کی ذاتی پرخاش تھی بلکہ دشمنی تھی۔ وہ قیوم خان کی جعلی لیگ کے ہی خونخوار قاتل اور غنڈے تھے جنہوں نے سندھ میں سانگھڑ کے مقام پر بھٹو صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ سانگھڑ کے حملے کے پیش نظر خان عبدالقیوم خان کے ساتھ بھٹو صاحب کا کوئی سیاسی سمجھوتا کرنا کسی طرح بھی ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مگر ہماری بدنصیبی ہماری قسمت سے زیادہ طاقت ور تھی یہاں پر پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کی خفیہ ایجنسیوں کے کمال کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں بھٹو صاحب کا ولی خان کے ساتھ کسی قیمت پر سمجھوتا ہونا قبول نہیں کرسکتی تھیں۔ خان عبدالولی خان کے ساتھ وزیراعظم بھٹو کا سیاسی سمجھوتا خفیہ ایجنسیوں کی سازش کے لئے موت بن سکتا تھا۔ خفیہ ایجنسیاں وزیراعظم بھٹو کو اس قدر سیاسی طور پر طاقت ور نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ بھٹو صاحب کو کمزور قسم کا وزیراعظم دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان کی پہلے دن سے ہی یہ چال اور سازش تھی کہ بھٹو صاحب کو پاکستان کے باقی تمام سیاست دانوں سے لڑا دیا جائے۔

افسوس کہ پاکستان کی خفیہ ایجنسیاں سیاست دانوں کے معاملے میں ہمیشہ ہی لکی (Lucky) ثابت ہوتی رہی ہیں، کامیاب رہی ہیں۔ خان عبدالولی خان کے معاملے میں ہمارا اپنا لیڈر حیات محمد خان شیر پاؤ ہی خفیہ ایجنسیوں کے لئے بے حد کارآمد مہرہ ثابت ہوا۔ حیات محمد خان شیر پاؤ کی ولی خان کے ساتھ سیاسی قد کاٹھ کی جو نفرت اور پرخاش چلی آتی تھی۔ وہ ان ایجنسیوں کے کام آ گئی۔ خفیہ ایجنسیوں کے لوگوں نے شیر پاؤ کی اس نفرت میں اور بھی اضافہ کیا۔ شیر پاؤ کو ولی خان اور بھٹو صاحب کے سمجھوتے سے ڈرانا شروع کر دیا۔ شیر پاؤ خود بھی ذہنی طور پر ولی خان سے خوفزدہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خان عبدالولی خان جیسے سیاسی درخت کے ہوتے اس کے منحنی وجود کی حیثیت ہی ختم ہو جائے گی۔ اس طریقے سے پہلے تو اکیلا شیر پاؤ ہی عبدالولی خان کے ساتھ سمجھوتے کے خلاف تھا اب اس کے ساتھ پاکستان کی طاقت ور ترین خفیہ ایجنسیاں بھی اس سمجھوتے کے خلاف برسرِ عمل ہو گئیں۔

خان عبدالقیوم خان پرانا خفیہ ایجنسیوں کا ایجنٹ تھا۔ خفیہ ایجنسیوں نے وزیر اعظم بھٹو کو اپنے ذرائع سے مشورہ دینا شروع کر دیا کہ خان عبدالقیوم خان کو معاف کرنا بڑی دوراندیشی کی بات ہوگی۔ قیوم خان ایک بے ضرر انسان ہے۔ نہ اس کی کوئی جماعت ہے اور نہ ہی وہ کوئی سیاسی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ پاکستان کو بنانے والوں میں سے ایک ہے۔ محب وطن ہے۔

خان عبدالولی خان قیامِ پاکستان کے خلاف نظریات رکھتا ہے۔ اس کو پاکستان کے عوام یعنی پنجاب کے عوام عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس کو غدارِ پاکستان خیال کرتے ہیں لہٰذا ولی خان کے ساتھ سمجھوتا کرنے سے وزیر اعظم کی سیاسی ساکھ کو بہت نقصان پہنچے گا۔ خود فوج میں بھی جوانوں کو تکلیف پہنچے گی جو ولی خان کو ہندوستان کا ایجنٹ خیال کرتے ہیں۔ اس طرح خان عبدالولی خان کے ساتھ بھٹو صاحب کے سمجھوتے کی راہ میں پہلے تو صرف حیات محمد خان شیر پاؤ ہی حائل تھا اب پوری اسٹیبلشمنٹ بھی اس کے ساتھ اس مسئلے پر کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہوگئی۔ اسٹیبلشمنٹ کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ وزیر اعظم بھٹو حیات محمد خان شیر پاؤ کی بات کو کبھی بھی نہیں ٹالیں گے۔ وہ اس سے اپنی محبت کی بنا پر کوئی ایسا سمجھوتا نہیں کریں گے جو اس کو ناپسند ہوگا۔ اس طریقے سے یک نہ شد دو شد والی بات ہوگئی۔ یہ باتیں سب کو معلوم ہو چکی تھیں کہ ولی خان اور بھٹو صاحب کے سمجھوتے کی باتیں کافی آگے جا چکی تھیں۔ یہاں تک کہ مرکز میں نیشنل عوامی پارٹی کو دو اہم ترین وزارتیں دینے کا بھی فیصلہ ہو چکا تھا۔ مگر اس دوران خان عبدالقیوم خان کا شیر پاؤ کے ساتھ رابطہ ہو گیا یا کرا دیا گیا۔ جس میں خان عبدالقیوم خان نے شیر پاؤ کو صوبہ سرحد کا بے تاج بادشاہ تسلیم کر لیا۔ قیوم خان کا مطالبہ مرکز کی وزارت کا تھا۔ صوبے کی سیاست اور حکومت کے لئے اس نے شیر پاؤ کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا۔ (نوٹ) اس بات کی تفصیل جاننے کے لئے راؤ رشید کی کتاب ''جو میں نے دیکھا'' کے صفحہ نمبر 93 پر ملاحظہ کریں۔

خان عبدالقیوم خان بڑا گھاگ سیاست دان تھا۔ وہ آنے والے وقت میں صوبہ سرحد میں خان عبدالولی خان کی سیاست کی قوت کا ادراک رکھتا تھا۔ اس کو علم تھا کہ ولی خان کی پارٹی کی قوت کے ہوتے صوبہ سرحد میں کسی شخص کے لئے حکومت کرنا آسان نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صرف مرکز میں بیٹھ کر مفت کے اقتدار حاصل کرنے کے مزے لوٹنا چاہتا تھا۔ صوبہ سرحد کی تمام خون خرابیاں وہ شیر پاؤ اور وزیر اعظم بھٹو کے سر ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ خفیہ ایجنسیوں کا آدمی تھا۔ اس کو علم تھا

www.bhutto.org

کہ آگے چل کر خفیہ ایجنسیاں صوبہ سرحد میں کیا کھیل کھیلیں گی۔ لہٰذا خفیہ ایجنسیاں اور خان عبدالقیوم خان اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے۔ حیات محمد خان خوش ہو گیا کہ صوبہ سرحد میں اس کے اقتدار میں اس شکل میں حصہ لینے والا کوئی نہیں ہو گا۔ حیات محمد خان جو اس وقت صوبہ سرحد کا گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھا وہ اپنے اس حادثاتی قسم کے اقتدار میں بدمست ہو چکا تھا۔ وہ وجوان انسان تھا دوراندیشی اس کی جوانی سے بہت دور تھی۔ وہ دور کی سوچنے والا تھا ہی نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ مرکزی حکومت کے ساتھ جب عبدالولی خان کی صوبائی حکومت کے حکومتی تنازعات پیدا ہوں گے تو اس کا تمام تر فائدہ اس کی ذات کو پہنچے گا۔ اس طریقے سے اس کا ایک طاقت ور سیاسی حریف مرکز کی قوت کی نذر ہو جائے گا اور صوبہ سرحد میں وزیر اعظم بھٹو کا حیات محمد خان ہی ایک انتخاب رہ جائے گا۔ کچھ اس طرح کی غیر سیاسی سوچ کا ہی نتیجہ تھا کہ حیات محمد خان، خان عبدالولی خان کے ساتھ بھٹو صاحب کا کسی قسم کا بھی سیاسی سمجھوتا ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اسٹیبلشمنٹ بھی یہی چاہتی تھی۔ وہ وزیر اعظم بھٹو کے سامنے ایک طاقت ور نظریاتی سیاسی قیادت کو حزب اختلاف بنا کر کھڑا کرنا چاہتی تھی۔ جو خان عبدالولی خان، مفتی محمود اور نیپ کے بلوچ سرداروں کے علاوہ اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا خفیہ ایجنسیوں کی سازش اور حیات محمد خان شیر پاؤ کی ضد اور غلط سیاست کی وجہ سے خان عبدالولی خان اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ وزیر اعظم بھٹو کا حکومتی سمجھوتا نہ ہو سکا اور خان عبدالولی خان بھٹو صاحب کے اقتدار کے ابتدائی ایام میں ہی وزیر اعظم بھٹو کے سامنے صوبہ سرحد میں ایک سیاسی اژدہا بن کر کھڑا ہو گیا۔ جس کی دشمنی کا تمام تر نقصان وزیر اعظم بھٹو اور خود شیر پاؤ اور پاکستان پیپلز پارٹی کو ہی پہنچا۔ ولی خان اس دشمنی میں ہر طرح سے فائدے مند رہا۔ ہر طرح سے محفوظ رہا۔ اس لئے کہ اس کی حفاظت کے لئے تو خفیہ ایجنسیاں خود موجود تھیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا اقتدار اور ہم کارکنوں کا مقدر

جہاں تک وزیر اعظم بھٹو کی ذات کا تعلق تھا ان کی ذات عوام کے لئے پارٹی کے لئے اور پارٹی کے کارکنوں کے لئے بے حد مخلص تھی۔ عین اس وقت جب وہ چاروں جانب سے مسائل میں گھرے ہوئے تھے پاکستان کے بنانے کی ابتدائی مراحل میں ہی تھے ابھی وہ صدر پاکستان اور

www.bhutto.org

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنے ہی تھے وہ پہلی مرتبہ لاہور گورنر ہاؤس اپنے ان عہدہ جات کے ساتھ تشریف لائے۔ مجھے یہ علم نہیں کہ انہوں نے اپنی اس پہلی آمد پر لاہور میں کن کن لوگوں کو گورنر ہاؤس میں ملاقات کے لئے بلایا تھا مگر مجھے اتنا یاد ہے کہ ان کی ان ملاقاتوں میں سب سے پہلے میری ملاقات تھی۔ جس کا پیچھے نظم کے حوالے سے ذکر ہو چکا ہے۔ میری ملاقات صدرِ پاکستان کے ساتھ تقریباً 9 بجے صبح ہوئی تھی۔ گورنر ہاؤس میں گورنر کے دفتر خاص میں جب میں دفتر کے کمرے کے اندر داخل ہوا تو بائیں جانب صدرِ پاکستان بھٹو تشریف فرما تھے اور دائیں جانب گورنر کھر بیٹھے تھے۔ میری نشست بھٹو صاحب کے سامنے تھی۔ بھٹو صاحب مجھے بے حد محبت کے ساتھ ملے ان سے ملنے کے بعد کھر صاحب کے ساتھ بھی دور سے سلام دعا ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بھٹو صاحب کو انگریزی میں کہا تھا کہ آپ کو اتنا قریب سے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ بھٹو صاحب نے دوسرے ہی لمحے مجھے کہا کہ مجھے ملک اور قوم کا بہت کام کرنا درپیش ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھے ساتھیوں کو ایڈجسٹ کیا جائے۔ تم کیا چاہتے ہو۔ میں نے سادگی کے ساتھ کہا کہ میں ادب اور تحریر و تقریر کا آدمی ہوں مجھے گورنر پنجاب کا کلچرل ایڈوائزر بنا دیا جائے۔ وزیراعظم بھٹو نے میری اس بات کو پسند کرتے ہوئے گورنر کھر کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ کھر صاحب نے بے حد عجلت کے ساتھ جواب دیا۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ ان کے اس طرح کے فوری جواب میں میرے خلاف ان کی نفرت اور ناپسندیدگی بے حد نمایاں تھی۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ گورنر صاحب نہیں مان رہا۔ میں نے کہا کہ صدرِ پاکستان جس طرح کھر صاحب آپ کے ساتھ سیاست میں اور جدوجہد میں تھے اسی طرح میں بھی ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے آپ کے ساتھ شامل تھا۔ کھر صاحب اگر گورنر بن سکتے ہیں تو میں بھی ایڈوائزر بن سکتا ہوں۔ میرے اس جواب پر گورنر کھر نے کہا کہ شاعر صاحب حکومت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں ہر کسی کا حصہ ہو۔ آپ کو نوکری وغیرہ دی جاسکتی ہے۔ میں نے ادب کے ساتھ کہا کہ اگر مجھے نوکری ہی کرنی تھی صدر صاحب تو میں پہلے نوکری کر لیتا۔ میری جدوجہد کا مقصد نوکری کرنا نہیں تھا۔ صدرِ پاکستان کے پاس اس وقت وقت بہت محدود تھا ان کی لاہور میں اقتدار کے بعد یہ پہلی آمد تھی۔ انہوں نے مجھے محبت سے کہا کہ اس وقت میں سب دوستوں سے ملاقات کر رہا ہوں۔ دوبارہ تم کو پھر بلایا جائے گا۔ اس طرح یہ ملاقات ختم ہوگئی۔ جب میں ان کے ساتھ ہاتھ ملا کر کمرے سے باہر آنے

www.bhutto.org

لگا تو انہوں نے کہا کہ گورنر صاحب کے ساتھ بھی ہاتھ ملا کر جاؤ۔ میں نے کہا کہ معافی چاہتا ہوں بھول گیا تھا۔ میں نے گورنر صاحب سے بھی بڑھ کر ہاتھ ملایا اور ان کے دفتر سے باہر آ گیا۔ میرے لئے اتنا ہی بہت کافی تھا کہ بھٹو صاحب نے صدرِ پاکستان بن کر نہ صرف مجھے یاد رکھا بلکہ سب سے پہلے لاہور میں جس کے ساتھ ملاقات کی وہ میں تھا۔ صدرِ پاکستان کے ساتھ اس پہلی ملاقات سے گورنر کھر صاحب کے ساتھ میری دوری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے ساتھ میری ایک طرح کی ذہنی رنجش پیدا ہو گئی۔ مجھے بے حد افسوس کے ساتھ تحریر کرنا پڑ رہا ہے کہ ملک غلام مصطفٰے کھر جو کہ جدوجہد کا میرا ساتھی تھا وہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایک ساتھی کارکن کے اس قدر خلاف ہو جائے گا۔ جس کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل یہ میری طبقاتی بدنصیبی تھی۔ میرے طبقے کے کارکنوں کا پارٹی کے اقتدار میں کچھ حصہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی ایسا سیاسی کارکن جو حکمرانوں کی مجبوری بن جائے اس کو شریکِ اقتدار کیا جا سکتا تھا جس طرح کہ شیخ محمد رشید کو شریکِ اقتدار کر لیا گیا تھا۔ وگرنہ اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

کھر ازم اور تاری ازم کا آغاز

پارٹی کا اقتدار کیا آیا کہ ہم کارکنوں کا شیرازہ ہی بکھر کر رہ گیا۔ اقتدار کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی وزیروں کی پارٹی میں تبدیل ہو گئی۔ پارٹی کے اندر وہ تمام سانجھ جو اقتدار سے پہلے سب میں ہوتی تھی وہ بڑی سرعت کے ساتھ ختم ہو گئی تمام پارٹی گروہوں میں بٹ گئی۔ پارٹی کے اندر غیر نظریاتی کارکنوں کی بھرمار تھی۔ اسی طرح کے وزیر اور مشیر تھے۔ اس طریقے کے ساتھ وزراء کا کام عوام کی خدمت کرنے کے بجائے اپنے اپنے گروپ کے ورکروں کو خوش کرنا بن گیا۔ ہر وزیر اپنے محکمے کی تمام چیزیں اپنے پسند کے کارکنوں میں تقسیم کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس معاملے میں نظریات کی یا اچھے خیالات کی یا کسی قربانی کی یا پارٹی کی خدمت کا کوئی خیال نہ رکھا جاتا تھا۔ کارکنوں کے وزراء کے نعرے مارنے کو ان کی برآمدہ گیری کرنے کو خوشامد کرنے کو ترجیح حاصل تھی۔ پارٹی کے وہ تمام کارکن اقتدار میں آ گئے جن کا تعلق ڈاکٹر مبشر حسن کے گروپ کے ساتھ تھا۔ خاص طور پر لاہور کا تمام اقتدار ملک غلام مصطفٰے کھر گورنر پنجاب کے وزیر میاں افتخار تاری کو اور اس کے غنڈہ نما سیاسی کارکنوں کو حاصل ہو گیا۔ ہر طرف لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کارکنوں

www.bhutto.org

کی آپس کی مفادات کی جنگ شروع ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں پارٹی کا نظریاتی کام ایک طرح سے ختم ہو کر رہ گیا۔ پارٹی کی تنظیمیں جن کو صرف اور صرف ڈاکٹر مبشر حسن اور ان کے تابع دار وزیروں کی پسند کے مطابق بنایا جاتا تھا۔ ان کا کام وزیروں کو استقبالیہ دینا بن گیا۔ میں نے اقتدار کے پانچ سالوں میں پارٹی کے کارکنوں کا ایک ہی کردار دیکھا تھا۔ ان میں سے کچھ تو ایک وزیر کے ائیر پورٹ پر استقبال کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔ کچھ کارکن کسی وزیر کو ائیر پورٹ پر جہاز پر سوار کرانے کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ہم کارکنوں کا اور کوئی کردار دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ لاہور میں تو میاں افتخار تاری کے نام کی اس طرح دھوم تھی جس طرح کبھی اچھا شو کروالے کے نام کی دھوم ہوتی تھی۔ ہر طرف میاں تاری کے مسلح کارکن دندناتے پھرا کرتے تھے۔ لاہور پارٹی کے دفتر کی حالت تو غنڈوں اور بدمعاشوں کے ڈیرے کی سی تھی جس میں ہر وقت پستول اور چاقو کی زبان میں باتیں کی جاتی تھیں۔ اس طریقے سے پیپلز پارٹی کا اقتدار سوشلزم کی بجائے مبشرازم اور کھر ازم اور تاری ازم میں تبدیل ہو گیا تھا۔ بیوروکریسی ہمارے اس غیر نظریاتی شخصی اقتدار سے خوب فائدہ اٹھاتی تھی۔

کارکنوں کا سیاسی کردار تبدیل ہوگیا

وزیراعظم بھٹو کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد پارٹی کی صفیں درست کرتے اور پارٹی کارکنوں کو پارٹی کے اقتدار میں ایک نظریاتی کردار ادا کرنے کی تربیت دے سکتے۔ ان کو تو ایک ڈوبتے ہوئے جہاز کا کپتان بنا دیا گیا تھا۔ پاکستان کی اندرونی اور بیرونی حالت اس قدر دگرگوں ہو چکی تھی کہ بھٹو صاحب کی تمام توجہ پاکستان کو اپنے پاؤں پر دوبارہ کھڑا کرنے پر مرکوز تھی۔ ان کو دوسری کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ افسوس کہ پارٹی میں دوسری صف کی قیادت دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک تو وہ تھے جو صرف اقتدار کے خواہش مند تھے۔ ان کو جب اقتدار مل گیا تو پارٹی ان کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ صوبوں مقتدر اعلیٰ، صوبائی گورنر اور وزراء اعلیٰ اپنا تمام کام حکومتی ملازموں سے کروانے میں زیادہ عزت محسوس کرتے تھے اور آسانی بھی محسوس کرتے تھے۔ وہ سرکاری ملازموں کو پولیس کو اپنے کارکن تصور کرنے لگ گئے تھے۔ وہ بہت جلد بیوروکریسی کا حصہ بن گئے تھے۔ بلکہ خود بیوروکریٹ بن گئے تھے۔ پارٹی کی تنظیمیں اور کارکن

www.bhutto.org

صرف اورصرف ان کے استقبال کی ضرورت تھے۔ یا عوام کے دکھاوے کے لئے جلسے جلوسوں کی ضرورت کی حد تک رہ گئے تھے۔ بلکہ وقف ہو گئے تھے۔ جہاں اور جس جگہ صوبائی حکمران جاتا یا اس کے وزراء جاتے کارکن وہاں جا کر ان کے نعرے مارتے ان کو زندہ باد کہتے کسی کو شیر کہتے کسی کو دلیر کہتے۔ کارکنوں کو سرکاری گاڑیاں دی جاتی تھیں ان کو کھانے پینے کا سامان سرکاری افسر کر دیتے تھے ہر وزیر کا نعرے مارنے کا اپنا جتھا ہوتا تھا اور یہ وزیر اپنے ان نعرہ زن جتھوں کے ساتھ شہر فتح کرتے پھرا کرتے تھے۔ کارکنوں کی سیاسی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ کارکن افسر شاہی کا قرب پا کر خود بھی افسروں کی طرح کا روپ اپنانے لگ گئے تھے۔ وہ سیاسی ورکر کی بجائے خود کو افسر شاہی کا حصہ خیال کرنے لگ گئے تھے۔

ڈاکٹر مبشر حسن کے جتنے من پسند کارکن تھے ان سب کو بنکوں کا اور فنانس کمپنیوں کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا تھا۔ نہ تو پیپلز پارٹی کا کوئی سیکرٹریٹ تھا اور نہ ہی پارٹی کا حکومت سے باہر لوگوں میں کوئی کردار باقی رکھا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ پارٹی کی گلی محلہ کی تنظیموں کے عہدہ دار سرکاری محکموں کی غلام گردشوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ انہوں نے اپنی سفارشوں کو ہی پارٹی کی سیاست بنا دیا۔ اس میں جائز اور ناجائز کی کچھ تمیز نہیں تھی۔ پارٹی کے عہدہ داروں کی سفارشوں کا یہ سلسلہ ایک کاروبار کی شکل اختیار کر گیا۔ پارٹی کے عہدہ داروں کے دل ودماغ سے پارٹی کے سیاسی نظریات کا جذبہ اور روح ختم ہوگئی۔ کارکنوں کے دفتر ڈیرہ داری میں تبدیل ہو گئے۔ اس طریقے کے ساتھ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی سیاست کا انداز مسلم لیگ کی طرح کا بن گیا۔ پرانے جاگیرداری طرز کی سیاست کے انداز میں بدل گیا اور پارٹی کے کارکنوں کی سیاست کا وہ عوامی انداز ختم ہو گیا جو اقتدار سے پہلے ہوا کرتا تھا۔

دفتر 4-اے مزنگ بھی اجڑ گیا

پاکستان پیپلز پارٹی کا دفتر 4-اے مزنگ جس میں بابا سوشلزم شیخ محمد رشید کی عوامی سیاست سے رونق رہتی تھی۔ وہ رونق شیخ صاحب کے وزیر صحت بن جانے کے بعد تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔ شیخ رشید صاحب واحد وزیر تھے جن کی عوامیت کا سلسلہ ان کی وزارت میں بھی قائم رہا۔ شیخ صاحب کارکنوں کے بغیر خود کو تنہا محسوس کیا کرتے تھے۔ ان سے محبت کرنے والے ان کے جیالے بھی ان کی جدائی برداشت نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا شیخ صاحب کے اسلام آباد چلے جانے کے

بعد ان کے جیالے بھی ان کے ساتھ اسلام آباد میں ہی رہا کرتے تھے۔ لاہور میں ان کا قیام جمعہ ہاؤس میں ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا ان کے جیالے بھی جمعہ ہاؤس میں زیادہ پائے جاتے تھے۔ اب پارٹی کے دفتر میں ان کا آنا جانا کچھ زیادہ نہیں رہ گیا تھا۔

پارٹی کے اقتدار نے مجھے تنہا کر دیا

پارٹی کے اقتدار سے پہلے میرا معاملہ دوسرے کارکنوں اور عہدہ داروں سے بالکل مختلف تھا۔ مجھے ہر جگہ چیئرمین بھٹو کے ساتھ جلسے جلوسوں میں رہنا ہوتا تھا۔ میری تمام تر کیمونیکیشن بھٹو صاحب کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ اقتدار کے بعد جو لوگ اسمبلیوں کے ممبر بن گئے تھے یا جو وزیر بن گئے تھے۔ ان کے ساتھ زیادہ میل ملاپ کا مجھے کبھی موقعہ ہی نہیں ملتا تھا۔ ان میں کچھ کے ساتھ تو میرا نظریاتی قسم کا اختلاف اقتدار سے پہلے ہی چلا آ رہا تھا۔ ان میں ڈاکٹر مبشر حسن اور ملک غلام مصطفےٰ کھر سرِ فہرست تھے۔ ان دونوں با اثر لوگوں کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی مجھ سے دور رہا کرتے تھے۔ صرف ایک شیخ محمد رشید کے ساتھ میری دوستی تھی۔ مگر ان کے ہاں ان کے جیالوں کا جمگھٹا اتنا زیادہ رہتا تھا کہ ان کے ساتھ ملنا بھی کچھ آسان نہیں رہ گیا تھا۔ وزیر اعظم بھٹو امورِ مملکت میں مصروف ہو گئے تھے۔ اب ان کے پہلے سے جلسے جلوس نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی ان کو پہلی سی فرصت تھی کہ ان کے ساتھ ملاقات کا سلسلہ قائم رہ سکتا۔

میرے پاس پارٹی کا کوئی عہدہ ہی نہیں تھا۔ اب تو ہر اس شخص کو سرکاری دربار میں بلایا جاتا تھا جس کے پاس پارٹی کا کوئی عہدہ وغیرہ ہوتا تھا۔ میرا پارٹی کا کوئی عہدہ نہ حاصل کرنے کی وجہ بھی وزیر اعظم بھٹو صاحب تھے۔

میں قائدِ عوام ہوں تم شاعرِ عوام ہو

ایک بار 1970ء میں میرے دل میں خیال آیا کہ میرے پاس پارٹی کا کوئی عہدہ ہونا چاہئے۔ میں ان دنوں وزیر اعظم بھٹو کے ساتھ سندھ کے عوامی دورے پر تھا۔ ایک رات المرتضیٰ میں پارٹی کے عہدہ داروں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ پارٹی کے عہدہ داروں کی بھٹو صاحب کے نزدیک بہت اہمیت تھی۔ وہ ان کو بہت اہمیت دے رہے تھے۔

www.bhutto.org

بھٹو صاحب میر رسول بخش تالپور کو کہہ رہے تھے کہ میں تو چاہتا ہوں کہ میرے تمام دوستوں کے پاس پارٹی کا عہدہ ہونا چاہئے، تاکہ پارٹی کے کام کو زیادہ ذمہ داری سے سرانجام دیا جائے۔ ان کی اس بات پر میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ چیئرمین صاحب مجھے بھی پارٹی کا کوئی عہدہ دیا جائے۔ اس وقت ان کے ساتھ وہاں رفیع منیر، قاسم پٹیل، چاکر علی جونیجو، عبدالرزاق سمرو، ممتاز علی بھٹو اور ان کے بھائی عاشق علی بھٹو وہاں موجود تھے۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ تم میری ذاتی ٹیم میں شامل ہو۔ جس طرح یہ لوگ ہیں جن کے میں نے نام تحریر کئے ہیں ان کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہے۔ میری دوستی ہی ان کا اور تمہارا عہدہ ہے۔ سیاسی عہدوں کے بعد آپس میں کھٹ پٹ شروع ہو جاتی ہے میں نہیں چاہتا کہ میرے دوستوں میں اس طرح کی صورتِ حال پیدا ہو جائے۔ میرے دوستوں کو سب کے ساتھ ملنا ہے۔ لہٰذا تم لوگوں کا سب کے لئے غیر جانب .ار رہنا ضروری ہے تاکہ تمام لوگ آپ لوگوں سے محبت کریں۔

انہوں نے اپنے مخصوص محبت بھرے انداز میں مجھے کہا کہ میں قائد عوام ہوں تم شاعرِ عوام ہو اس کے باوجود تمہیں کسی عہدے کی ضرورت ہے۔ ان کے اتنا کہنے سے مجھے محسوس ہوا کہ میں نے غلط بات کر دی ہے۔ مجھے واقعتاً کسی عہدے وغیرہ کی بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ میں نے کہا کہ آئی ۔ ایم ۔ سوری سر۔ اس طرح بھٹو صاحب کی ان باتوں کے بعد میں نے کسی تنظیمی عہدے کا کبھی اپنے دل میں خیال ہی نہیں پیدا کیا تھا۔ مگر وزیر اعظم بھٹو کی یہ بات اس وقت تک تو ٹھیک تھی جب پارٹی اقتدار میں نہیں تھی۔ اقتدار کے بعد پارٹی کی صورت حال تبدیل ہو گئی تھی اب پارٹی میں پہلا سا سیاسی ماحول نہیں رہ گیا تھا۔ اب نہ تو ان کا وہ دوستی کا حلقہ تھا جن کا انہوں نے ذکر کیا تھا اور نہ ہی پارٹی کے دوستوں میں وہ پہلی سی یگانگت باقی رہی تھی۔ اس صورت میں میرا اتنہا رہ جانا ہی معروضی حقیقت تھی۔ لہٰذا وہ لوگ جو میری طرح انقلاب کے رومانس میں پارٹی کے ساتھ تھے وہ اقتدار کے بعد تنہائی کا شکار بن گئے تھے۔

وزیر اعظم بھٹو کا دوسری مرتبہ مجھے گورنر ہاؤس بلانا

پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد پارٹی کا ایسا کوئی دوسرا گورنر یا وزیر یا مشیر نہیں تھا جس نے مجھے اقتدار میں آنے کے بعد خود بلایا ہو۔ یہ صرف اور صرف ذوالفقار علی بھٹو کی ذات ہی ایک

www.bhutto.org

ایسی ذات تھی کہ وہ اپنی ساری مصروفیت کے باوجود کارکنوں کو یاد رکھتے تھے۔ انہوں نے امان اللہ خان کو اور مجھے گورنر ہاؤس میں طلب کیا۔ ان کی اس ملاقات سے پہلے مساوات کے دفتر میں میاں اسلم جو کھر صاحب کے مشیر خاص تھے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت ملتان کے ہمارے ایک کامریڈ اشفاق ایڈووکیٹ کی بات کی جا رہی تھی جس کو کھر صاحب کی سفارش سے شمالی کوریا میں سفیر لگا دیا گیا تھا۔ میں چونکہ بے حد سوشلسٹ خیالات کا حامل تھا میں نے میاں اسلم کو کہا کہ مجھے چین میں ڈپٹی سفیر بنا کر بھیج دیں۔ میاں اسلم چونکہ مجھ سے محبت کرتا تھا انہوں نے کھر صاحب کو محبت کے انداز میں کہا کہ گورداسپوری کہتا ہے کہ مجھے بھی کسی سوشلسٹ ملک میں سفارت کاری کی ذمہ داری دی جائے۔ گورنر ہاؤس میں سب سے پہلے مجھے طلب کیا گیا۔ بھٹو صاحب نے ہاتھ ملاتے ہی مجھے کہا کہ عقل کی باتیں کیا کرو۔ تم کہتے ہو کہ تمہیں سفیر لگایا جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ کھر صاحب نے میاں اسلم والی بات ان کو کہہ کر ان کا موڈ ہی خراب کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ سفارت والی بات صرف اشفاق کے سفارت کار مقرر ہونے پر میں نے کی تھی۔ میں خود کو سفیر بننے کا اہل خیال نہیں کرتا ہوں۔ ان کا دوسرا سوال تھا کہ تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔ سنا ہے تمہارے پاس رہنے کو گھر بھی نہیں ہے۔ میں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ کہیں کوئی دوبارہ غلط بات نہ ہو جائے۔ میں نے کہا کہ میں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ میں تو ہمیشہ پیپلز پارٹی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ عوام کے بارے میں سوچتا ہوں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ بہت جلد کھر صاحب تمہیں بلائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی میری ملاقات ختم ہو گئی۔ امان اللہ خان کو چونکہ گورنر کھر نے اپنا پریس سیکرٹری بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا، ان کی یہ رائے بھی تھی کہ ہم ورکروں کو صرف نوکری دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا امان اللہ خان کو پریس سیکرٹری بنا دیا گیا۔ اس ملاقات کے بعد نہ ہی مجھے گورنر کھر نے کبھی بلایا اور نہ ہی مجھے کسی حکومتی عہدے کے لئے کہا گیا۔

ہم نظریاتی سیاسی کارکنوں کا فیصلہ

پارٹی کے اقتدار میں اکیلا میں ہی نظر انداز نہیں کر دیا گیا تھا۔ بے شمار ایسے سیاسی نظریاتی کارکن تھے جو اقتدار کی اس گھڑ دوڑ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ پارٹی کی حکومت کو انقلابی اصولوں کے مطابق چلایا جانا چاہئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو سرکاری درباری

پارٹی نہیں بنانا چاہئے۔اس پارٹی کو ممتاز دولتانے کی مسلم لیگ نہیں بنانا چاہئے۔لہٰذا اس فکر وفہم کے سیاسی کارکنوں کا مزنگ دفتر سیاسی پناہ گاہ بن گیا۔ایک اچھی خاصی تعداد میں پارٹی کارکن دفتر میں ہر وقت جمع ہونا شروع ہو گئے۔ پروفیسر استقلال،اصغر چوہدری ایڈووکیٹ، ایس۔ایم۔ مسعود ایڈووکیٹ اور میں نے پارٹی کے دفتر میں ہفتہ وار لیکچر دینا شروع کر دیئے۔ہم اپنی تقریروں میں پارٹی کے منشور کی باتیں کرتے تھے۔پارٹی کی حکومت کے اچھے کاموں پر پارٹی کی تعریف بھی کرتے تھے اور برے کاموں پر حکومت پر تنقید بھی کرتے تھے۔میں نے ایک تجویز پیش کی کہ پارٹی کے نظریاتی قسم کے وزیروں کو اپنے ہفتہ وارانہ اجلاس میں بلایا جائے تاکہ ان تک عوام کی سوچ کو پہنچایا جائے۔یہ تجویز بہت معقول تھی اس کو منظور کر لیا گیا۔وزیروں کو دعوت دینے کا کام پروفیسر استقلال کے ذمہ لگا دیا گیا۔وزیروں کے آنے جانے سے پارٹی کے دفتر میں بڑی رونق لگنا شروع ہو گئی۔ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ ہر وزیر کو آخر میں تقریر کی دعوت دی جاتی تھی۔اس سے پہلے دس پندرہ سیاسی کارکن اپنی تقاریر میں حکومت کے بارے میں عوام کے تاثرات بیان کیا کرتے تھے۔حکومت کی جس بات کو لوگ پسند کیا کرتے تھے اس کا بھی ذکر کیا جاتا تھا جس بات کو ناپسند کرتے تھے اس کا ذکر بھی ہوتا تھا۔

اس طریقے سے پارٹی کا دفتر ایک معلوماتی قسم کا فورم بن گیا تھا۔جس کو باشعور ذہن کے وزیروں اور مشیروں نے بہت پسند کیا تھا۔ہر اجلاس کے آخر میں ایک دو قراردادیں پیش کی جاتی تھیں۔جن میں عوامی مطالبات ہوتے تھے جن کو یادداشت کی شکل میں تحریری طور پر وزراء کو دے دیا جاتا تھا۔میں چونکہ مساوات سے تعلق رکھتا تھا لہٰذا ان تمام اجلاس کی کارروائی کو خود لکھتا تھا اور مساوات میں شائع کرواتا تھا۔ان دنوں پارٹی کے اخبار مساوات کی بے حد اہمیت تھی۔ان دنوں مساوات میں ملک کے جانے پہچانے نظریاتی صحافی شفقت تنویر مرزا،احمد بشیر،بابا ظہیر کاشمیری اور منو بھائی کی شکل میں موجود تھے۔وہ ہم تمام نظریاتی کارکنوں کی تلخیوں کے چشم دید گواہ بھی تھے۔ وہ کھر ازم اور تاری ازم کو ناپسند بھی کرتے تھے۔ان کی خواہش تھی کہ پارٹی کی حکومت صحیح معنوں میں اپنے منشور پر عملدرآمد کرے۔ملک میں جمہوریت کو مضبوط کرے آزادیٔ اظہار کو عام کرے لوگوں کو انصاف مہیا کرے اور ان کی زندگی میں انقلابی تبدیلی برپا کرے۔حکومت پر پارٹی کے اندر اس طرح کے نظریاتی دباؤ ڈالنے کا اور کوئی راستہ موجود نہیں تھا جس کی وجہ سے ہمارے ان

www.bhutto.org

اجلاسوں کو مساوات میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ لوگ ہماری آزاد خیالی کو بہت پسند کیا کرتے تھے۔ ان کی ہمت افزائی کی وجہ سے اور ہماری محنت سے مرکز اور صوبے کے حکومتی حلقوں میں ہمارے اجلاسوں کی دھوم مچ گئی۔ ہر وزیر کی خواہش ہوتی تھی کہ اس کو ان اجلاسوں میں بلایا جائے۔ ہم نے اس سلسلے کا آغاز شیخ رشید سے شروع کیا تھا۔ یہ سلسلہ خورشید حسن میر تک تو بخیر و خوبی چلتا رہا۔ مگر حنیف رامے تک آ کر ہمارا یہ فورم صوبائی حکومت کے عتاب میں آ گیا۔ پنجاب کی صوبائی حکومت کے وزیر افتخار تاری نے مزنگ دفتر میں آنے جانے والے تمام ورکروں کو بلیک لسٹ قرار دے دیا۔ اس کا اعلان تھا کہ جو پارٹی ورکر ٹیمپل روڈ کے لاہور پارٹی کے دفتر میں نہیں آئے گا اس کو پارٹی کا ورکر تسلیم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کا کوئی کام کیا جائے گا۔

معاملہ یہ تھا کہ اندر خانے میں شروع دن سے ہی ملک غلام مصطفیٰ کھر کی اور حنیف رامے صاحب کی پنجاب کی حکمرانی کے مسئلے پر تسلسل چل رہی تھی۔ جو وقتی طور پر تو ختم ہو گئی تھی۔ حنیف رامے صاحب مصطفیٰ کھر کے مقابلے میں خود کو حکومت کرنے کا زیادہ اہل تصور کرتے تھے۔ اب جب ملک کھر صاحب کی حکومت قائم ہو گئی تو بہت ہی کم وقت میں ان کی حکومت بدنام ہونا شروع ہو گئی۔ ان کی حکومت کی بدنامی کا تمام سہرا تاری کی بے لگام قسم کی غنڈہ فورس کے سر تھا۔ کھر صاحب چونکہ جاگیرداری مزاج کے حکمران تھے۔ ان کو تاری ازم بے حد پسند تھا۔ وہ طاقت کے استعمال پر یقین رکھتے تھے۔ وہ عوام پر تو پولیس کی مدد سے قابو پانا چاہتے تھے۔ اسی طرح وہ پارٹی پر تاری فورس کے ذریعے اپنا رعب و دبدبہ اور تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ جس کو چاہتے تھے تاری فورس کے ذریعے پٹوا دیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اس فورس سے پٹوایا تھا جس کا ذکر کچھ آگے جا کر کیا جائے گا۔

اس تاری فورس کا ایک ہی واقعے کا ذکر کرنا کافی ہوگا۔ اس کے بعد اس کا ذکر کرنا ضروری نہیں رہے گا۔ ہوا یوں کہ جب آئین بن گیا تو آئین کی رو سے پنجاب کے صوبے میں وزیر اعلیٰ پنجاب بنانا قانونی طور پر ضروری ہو گیا۔ کھر صاحب کی کوشش یہ تھی جس میں وہ کامیاب بھی ہو گئے کہ کسی ایسے یا اس قسم کے انسان کو وزیر اعلیٰ بنایا جائے جس کی کوئی عوامی ساکھ نہ ہو۔ جو بے معنی قسم کا انسان ہو۔ جس کا نہ کوئی دین ہو اور نہ ایمان ہو۔ وہ شخص ملک صاحب کے ہاتھ کی گھڑی اور چھڑی ہو۔ قصہ مختصر ایسا آدمی ہو جو ملک صاحب کے تابع فرمان ہو۔ لہٰذا ملک صاحب کا یہ

کرۂ انتخاب ملک معراج خالد پر جا گرا۔ وہ حنیف رامے کو کسی قیمت پر پنجاب کا وزیراعلیٰ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ رامے صاحب سے پہلے شیخ محمد رشید کے لئے ہم وزارتِ اعلیٰ کی جنگ لڑ چکے تھے۔ جس کی سزا سب سے زیادہ مجھے بھگتنا پڑی تھی۔ شیخ صاحب کے لئے ہم سیاسی کارکن تو میدان میں ڈٹے رہے تھے مگر شیخ صاحب مرکزی وزارت قبول کر کے بھٹو صاحب کے ساتھ اور کھر صاحب کے ساتھ سمجھوتا کر گئے تھے۔

شیخ صاحب کی وزارتِ صحت

شیخ صاحب نے اپنے اس اقتدار کے سمجھوتے کے فوراً بعد اپنے ان تمام جیالوں کو بلایا جن میں میں بھی تھا۔ یہ بڑا خفیہ قسم کا اجلاس تھا جس میں صرف پانچ دس لوگ ہی بلائے گئے تھے۔ ہم کو بلا کر شیخ صاحب نے اپنے اقتدار کی یعنی پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ کو حاصل کرنے کی جنگ کی تمام کارروائی سنائی۔ اپنی بہادری اور ثابت قدمی کے قصے بیان کئے۔ اس طریقے سے اپنی ذات کی لمبی چوڑی تعریف کرنے کے بعد اور اپنی اس اقتدار کی خواہش کی جنگ کو عین کمیونزم اور سوشلزم کی جنگ ثابت کرنے کے بعد انکشاف کیا کہ دوستو تم کو مبارک ہو تمہارا شیخ رشید کس قدر اہم ہے کہ فوج اس سے ڈرتی ہے۔ فوج نے بھٹو صاحب کو کہا ہے کہ ہم شیخ رشید کو کسی قیمت پر پنجاب کا وزیراعلیٰ تسلیم نہیں کریں گے۔ تم کو مبارک ہو کہ تمہارے لیڈر سے فوج ڈرتی ہے۔ لہٰذا بھٹو صاحب کے کہنے سے میں نے مرکز میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دوستو یہ بہت بڑی بات ہے کہ تمہارے لیڈر سے جرنیل خوف کھاتے ہیں تم کو مبارک ہو۔ شیخ صاحب کی اس مبارک سے مجھے عوامی شاعر حبیب جالب کی ریاض شاہد کو بے وقوفانہ قسم کی مبارک دینے کی بات یاد آ گئی۔ ریاض شاہد نے ایوب خان کی حکومت کے دور میں امن کے نام پر فلم بنائی تھی بعد میں جس کا نام یہ امن رکھا گیا تھا۔ یہ فلم آزادی پرستوں کی جدوجہد کی فلم تھی۔ اس فلم کے گانے حبیب جالب نے لکھے تھے جس کا ایک گانا بہت مشہور ہوا تھا۔ ظلم رہے اور امن بھی ہو۔ کیا ممکن ہے تم ہی کہو۔ یہ فلم ایوب خان کی حکومت نے بین کر دی۔ اس کی نمائش پر پابندی لگا دی کہ اس فلم کی نمائش سے بغاوت پھیلنے کا خطرہ ہے۔ اس فلم پر پابندی سے پہلے حبیب جالب کی کتاب "سرِ مقتل" کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ حبیب جالب کتاب کی پابندی کو اپنے لئے اعزاز خیال کرتا تھا۔ اس نے ریاض

www.bhutto.org

شاہد کی فلم پر پابندی لگنے کو بھی ریاض شاہد کے لئے بہت بڑا اعزاز خیال کیا۔ وہ بھولا شاعر تھا اس کو اس بات کا کچھ احساس نہیں تھا کہ اس کا تمام سرمایہ اس فلم پر پابندی لگنے سے غرق ہو گیا ہے۔ یہاں جالب کی کتاب والا معاملہ نہیں تھا بلکہ ریاض شاہد کے دیوالیہ ہو جانے کا خطرہ تھا۔ مگر حبیب جالب اس پہلو سے بے نیاز تھا۔ اس نے ریاض شاہد کو فون کیا اور اس کو بلند آواز سے انتہائی خوشی کے عالم میں کہا کہ ریاض شاہد صاحب آپ کو مبارک ہو، آپ کی فلم آمریت نے بین کر دی۔ آپ نے میری کتاب کی طرح بہت بڑا اعزاز حاصل کر لیا ہے۔ آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ ایک انقلابی انسان ہیں۔ یہاں ہم تمام لوگ خوشی منا رہے ہیں۔ جالب کی یہ تمام باتیں ہم لوگ جو چائنیز لنچ ہوم میں بیٹھے سن رہے تھے۔ ریاض شاہد کو جالب کی باتوں سے بڑا غصہ آیا۔ اس نے غصے سے کہا۔ تم کیا بک رہے ہو۔ میں برباد ہو گیا ہوں اور تم لوگ خوشی منا رہے ہو۔ کتنے شرم کی بات ہے۔ ریاض صاحب کے اظہار ناراضگی پر حبیب جالب کو بڑی حیرانی ہوئی۔ فون بند کر کے واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ کر کہنے لگے۔ اندر سے سرمایہ دار ہے۔ ریکشنری ہے۔ انقلابی نہیں ہے۔ ہم لوگوں کو جب جالب صاحب کی مبارک دینے کے پس منظر کا علم ہوا تو ہم نے جالب صاحب کو کہا کہ آپ کا دماغ خراب ہے ایک آدمی تباہ ہو گیا ہے اور آپ اس کو مبارک باد دے رہے ہیں۔ تب جا کر جالب صاحب کو اپنی حماقت کا کچھ احساس ہوا۔ مگر وہ اپنی بات پر پھر بھی قائم تھا۔ کہنے لگا۔ ٹھیک ہے نقصان ہو گیا ہے۔ مگر فلم تو بین ہو گئی ہے جو چیز آمریت بین کر دے وہ ''مسر [illegible] ت۔ عظیم ہے۔ بابا سوشلزم بھی مجھے بالکل اس وقت حبیب جالب ہی لگ رہے تھے۔ وہ اس بات خوشی سے پھولے ہی نہیں سماتے تھے کہ جرنیلوں نے ان کی مخالفت کی ہے۔ وہ ان سے ڈرتے ہیں۔ میں نے شیخ صاحب کو کہا کہ شیخ صاحب اس میں آپ کے خوش ہونے کی یا ہمارے خوش ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تو جرنیلوں کے لئے خوشی کی بات ہے کہ وہ آپ کو پنجاب سے باہر کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آپ کو اور ہم کو تو ناکامی ہوئی ہے۔ ہمارے لئے تو یہ رونے کی بات ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے شیخ صاحب کو کہا کہ آپ کو اس بات کا کس طرح یقین ہے کہ جنرل آپ کو وزیر اعلیٰ نہیں بنانا چاہتے۔ ہو سکتا ہے کہ مصطفیٰ کھر جو بے حد چالاک آدمی ہے اس نے یہ بات خود گھڑ لی ہو۔

شیخ صاحب کو میری باتیں انتہائی بری لگ رہی تھیں۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ملک

www.bhutto.org

ٹوٹ چکا ہے حالات خراب ہیں۔ ہم کو پاکستان کو بچانا ہے پاکستان میں سوشلزم لانا ہے۔ اس وقت میں بھٹو صاحب کے لئے مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی فوج کو ناراض کرنا چاہتا ہوں۔ پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ کی جنگ کو وقتی طور پر ملتوی کر دیا ہے۔ حالات ٹھیک ہو جانے کے بعد اس جنگ کا آغاز کر دیا جائے گا۔ میں نے مرکز میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آج سے پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ کے معاملے میں میری مصطفیٰ کھر سے کوئی لڑائی نہیں رہی۔ میں نے کہا کہ شیخ صاحب آپ کے لئے ہم نے مصطفیٰ کھر سے لڑائی لی تھی۔ آپ نے تو صلح کر لی ہے ہمارا کیا بنے گا۔ اس کا جواب شیخ صاحب کے پاس نہیں تھا۔

وزارتِ صحت میں شیخ محمد رشید کا انقلابی اقدام

ہمارے سیاسی لوگوں کی جدوجہد کے بارے میں ایک محاورہ مشہور ہے کہ انقلابی جس مقام پر بھی متعین ہوگا وہ اپنا انقلابی جوہر ضرور دکھائے گا۔ شیخ صاحب کو وزارتِ صحت کا منصب اس لئے دیا گیا تھا کہ اس محکمے میں شیخ صاحب جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے لئے اپنی انقلابی شہرت کے حوالے سے کوئی تنازعہ کھڑا نہیں کر سکیں گے۔ حکومت کے لئے کوئی مشکل پیدا نہیں کریں گے۔ مگر ان کا انقلابی جنوں اس وزارت میں بھی فارغ نہ بیٹھ سکا۔

جنگِ جزک نیم

پاکستان کی مرکزی وزارتِ صحت پاکستان کی ابتدا ہی سے قومی اور بیرونی سرمایہ داروں کی میڈیسن پالیسی کے مطابق چل رہی تھی جس پالیسی میں دوائیوں کے اصل ناموں کی جگہ ان کو برانڈ ناموں سے تیار کیا جاتا تھا۔ ان کے انگریزی نام رکھ کر ان کو مہنگے داموں فروخت کیا جاتا تھا۔ شیخ محمد رشید نے ایک حکومتی قانون نافذ کر کے قانون بنا دیا کہ پاکستان میں تمام دوائیوں کے نام ان کے اصل مقامی نام تحریر کئے جائیں۔ کوئی دوائی اپنے اصل نام کے بغیر فروخت نہیں کی جائے گی۔ یہ ایک بہت بڑا عوامی معرکہ تھا۔ وہ اسبغول جو انگریزی نام سے مثال کے طور پر 50 روپے کی قیمت سے فروخت کیا جا رہا تھا۔ اس کو جب اصلی نام دیا گیا تو اس کی قیمت خود بخود ہی پانچ روپے کے پیکٹ پر آ گئی تھی۔ اسی طرح دوسری تمام دوائیوں میں لوگوں کے ساتھ دھوکا کیا جا رہا

www.bhutto.org

تھا۔شیخ صاحب کا جزک نیم کا کارنامہ صحت کے شعبے سے تعلق رکھنے والے دوائیاں بنانے والے جلاد سرمایہ داروں کے لئے بے حد نقصان کا باعث تھا۔ سرمایہ داروں نے شیخ صاحب کو بڑی رشوتوں کا لالچ دیا۔مگر شیخ رشید کا ایمان انقلابی ایمان تھا۔ انہوں نے پاکستان میں جزک نیم کی پالیسی کا قانون بنا کر اور اس پر عمل کروا کر پاکستان کے غریب عوام کی بے مثال خدمت کا کام سرانجام دیا تھا۔جس کی ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے تعریف کی تھی۔

ملک معراج خالد وزیراعلیٰ پنجاب کا پہلا اور آخری استقبالیہ

ملک معراج خالد کو وزیراعلیٰ پنجاب بنادیا گیا۔ملک معراج خالد کے ساتھ پروفیسر استقلال کی بڑی دوستی تھی۔ پروفیسر صاحب اور میں اور کچھ دوسرے کارکن ملک صاحب کو مبارک باد دینے چلے گئے۔ہم ملک معراج خالد کو کچھ عوامی انسان خیال کیا کرتے تھے۔اس وقت تک ہم کو ان کی اصلی صلاحیتوں کا کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ہم نے ملک صاحب کو تجویز پیش کی کہ آپ کارکنوں کے کھلے اجلاس بلانے کا سلسلہ شروع کریں تا کہ آپ کو عوام کی تکالیف کا علم ہو سکے۔اس طرح کے اجلاسوں سے پارٹی میں بھی حرکت پیدا ہوگی۔کارکنوں میں جوش پیدا ہوگا۔ہم نے ملک صاحب کو ایمان داری کے ساتھ رائے دی تھی۔مگر ملک معراج خالد چونکہ ایک طفیلی قسم کے وزیراعلیٰ بنے تھے انہوں نے ہماری اس رائے کو کچھ زیادہ وقعت نہ دی تھی۔

ہماری اس ملاقات کے کچھ ہی دن بعد ملک معراج خالد کی ملک غلام مصطفیٰ کھر کے ساتھ لاہور کے مسئلے پر کھٹ پٹ شروع ہوگئی۔لاہور کو افتخار تاری اپنی مملکت خیال کرتا تھا۔وہ لاہور کے تمام حکومتی اور غیر حکومتی معاملات کو اپنے تصرف میں رکھنا چاہتا تھا۔اس کی خواہش تھی کہ لاہور میں ہر کام اس کی خواہش کے مطابق ہو۔اس سے پوچھ کر کیا جائے۔

ملک معراج خالد کے ساتھ مشکل یہ پیش آگئی کہ ملک صاحب خود بھی ایک طرح کے لاہوری تھے۔ان کے پاس بھی بیٹھنے والے تمام کارکنوں کا تعلق لاہور کے نواح اور لاہور سے ہی تھا۔لہٰذا ان کی تمام ترجیحات اپنے دوستوں اور اپنے کارکنوں تک محدود تھیں۔ملک معراج خالد ویسے بھی گروپ بندی کی سیاست کے آدمی تھے۔وہ اپنا ایک گروپ قائم رکھا کرتے تھے۔ان کی تمام سیاست ان کے گروپ کے لئے ہوتی تھی۔وہ گروپ بندی کے بڑے پکے تھے۔ان کی

سیاست کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے ورکروں سے دوسرے لیڈروں کو بے عزت کروایا کرتے تھے۔ ان کو گالیاں دلوایا کرتے تھے۔ ان کے ورکر پارٹی کے ورکر نہیں ہوا کرتے تھے وہ صرف اور صرف ملک معراج خالد کے ورکر ہوا کرتے تھے۔ ملک معراج خالد کی طرح ان ورکروں کا بھی کوئی نظریہ نہیں ہوتا تھا۔ وزیر اعلیٰ بننے کے بعد ملک معراج خالد کا اپنے جیسوں کے ساتھ ہی یا اپنی طرز کی سیاست کرنے والوں کے ساتھ واسطہ پڑ گیا تھا۔ ان معاملات میں اپنے سے زیادہ طاقت وروں کے ساتھ واسطہ پڑ گیا۔ اس لئے کہ اس وقت ملک صاحب کے ورکروں کا دھڑا کچھ زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ مگر افتخار تاری کے ورکروں کا دھڑا زیادہ مضبوط تھا اور تعداد میں زیادہ تھا۔

ملک معراج خالد خواہ کچھ بھی تھے مگر وہ افتخار تاری سے زیادہ سیاسی انسان تھے۔ زیادہ سیاسی فکر و فلسفے کے آدمی تھے۔ وہ اپنی تمام دھڑے بندی کو کسی فلسفے پر قائم کیا کرتے تھے۔ تاری کی طرح محض غنڈہ گردی کی سیاست نہیں کرتے تھے۔ مقاصد دونوں کے ہی ایک ہوتے تھے طریقے کار کا فرق تھا۔ ملک معراج خالد نے اپنے کارکنوں کو لاہور میں زیادہ اہمیت دینا شروع کر دی جو ایک قدرتی امر بھی تھا۔ تاری کے کارکن حکومتی معاملات میں اپنے آپ کو بے اختیار محسوس کرنے لگ گئے۔ کئی ایک معاملات میں تاری کے کارکنوں کا ملک معراج خالد کے کارکنوں کے ساتھ اختلاف پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ لاہور کی وزارتِ بلدیات بہت اہم وزارت تھی جس کو ملک معراج خالد نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ شہر میں تمام لوٹ مار اس محکمے میں تاری کے کارکن کرتے تھے۔ ملک صاحب کے آ جانے کے بعد اب ان کو کھلا ہاتھ نہیں ملتا تھا۔ جہاں سے ملک معراج خالد کے ساتھ تاری گروپ کی دشمنی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ افتخار تاری کی تمام شہرت ہی اس کی اس غنڈہ فورس کی وجہ سے تھی۔ اس نے ملک معراج خالد کو لگام ڈالنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ملک معراج خالد اپنی تمام تر موقع پرستی کی سیاست کے باوجود ایک عوامی قسم کے انسان تھے بلکہ عوامیت ان کی شخصیت کا خاصا تھی۔ فورٹریس سٹیڈیم لاہور میں عوامی میلے کے انعقاد کا خیال بھی ملک صاحب کا ہی تخلیق کردہ تھا۔ اس میلے میں پنجاب کی ثقافت کا بھرپور مظاہرہ دیکھنے میں آتا تھا۔ اس میلے کا آغاز بھی ان کی وزارتِ اعلیٰ کے ساتھ ہی ہوا تھا۔ ملک صاحب لاہور کے کارکنوں کے ساتھ خاص طور پر اپنے دھڑے کے کارکنوں کے ساتھ اس پہلے عوامی میلے کی تیاری کی بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے شالیمار باغ لاہور میں لاہور کے کارکنوں کا اجلاس

www.bhutto.org

بلایا۔ چونکہ ان کے وزیر اعلیٰ پنجاب بننے کے بعد ان کا یہ پہلا اجلاس تھا۔ لہٰذا میں اور میاں عبدالستار نجم بھی اس اجلاس میں شرکت کے لئے شالیمار باغ پہنچ گئے۔ اجلاس بڑی سادگی کے ساتھ جاری تھا۔ ملک صاحب نے ابھی پنجابی میں اپنا خطاب شروع ہی کیا تھا کہ میاں تاری کی رجمنٹ کا مسلح مخصوص ٹولہ وہاں پہنچ گیا۔

طارق وحید بٹ اور حمید سرور ایڈووکیٹ اس ٹولے کی قیادت کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے آتے ہی ملک معراج خالد کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ملک معراج خالد کے ساتھ کچھ اس طرح مخاطب ہو رہے تھے۔ اوئے ماجیا تری جرات کیویں ہوئی اے ساڈے توں بغیر میٹنگ کرن دی۔ توں کھر صاحب دا ملازم ایں وغیرہ وغیرہ۔ اپنی اوقات وچ رہ۔ اجلاس کی کارروائی ساکت ہو گئی۔ ملک معراج خالد ان کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر وہ ان کی کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے ملک صاحب کے کچھ نمایاں کارکنوں کو بھی دھمکیاں دیں۔

ملک صاحب کا اجلاس درہم برہم ہو گیا۔ ملک صاحب کے دفتر کا سرکاری عملہ حیران پریشان ہو کر تمام کارروائی دیکھتا رہا۔ انہوں نے ساری زندگی میں کسی وزیر اعلیٰ کی اس طرح سے پہلے کبھی مٹی خراب ہوتے نہ دیکھی تھی۔ وزیر اعلیٰ کے ہوتے تو لوگ دم نہیں مارا کرتے تھے۔ یہاں معاملہ ہی الٹ تھا الٹا وزیر اعلیٰ دم سادھے کھڑا تھا۔ میں چونکہ اس طرح کی پارٹی کے اندر غنڈہ گردی کی مساوات اخبار میں کھل کر مذمت کیا کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ لوگ وہاں سے واپس جانا شروع ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے بلند آواز سے کہا۔ کل اے خبر وی اخبار وچ آ جائے گی۔ جاسوس ایتھے وی پہنچ گیا اے۔ ان کا یہ میری طرف اشارہ تھا۔

جب وہ لوگ چلے گئے تو میں نے اور میاں نجم نے ملک صاحب کو کہا کہ آپ اپنا خطاب شروع کریں وہ بھاگ گئے ہیں۔ مگر ملک صاحب بہت پریشان ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا اجلاس ختم ہوتا ہے۔ آئیں سب دوست چائے پیتے ہیں اور گپ لگاتے ہیں۔ میں نے حسب معمول اس غنڈہ گردی کی مساوات میں مذمت کی خبر شائع کروائی۔ مگر دوسرے دن ملک معراج خالد ان تمام لوگوں کے ساتھ پریس کانفرنس کرنے میں مصروف تھے۔ جنہوں نے ان کو گالیاں دی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ہے جس کا اخبارات میں ذکر کیا گیا ہے۔ میرا اور میاں نجم کا خیال تھا کہ وہ اس قدر بے عزتی کے بعد وزارتِ اعلیٰ سے استعفیٰ دے

دیں گے مگر ہمارا خیال غلط تھا۔

یہ تمام باتیں اس لئے تحریر کی جارہی ہیں تا کہ آپ لوگوں کو علم ہو سکے کہ پاکستان پیپلز پارٹی جس کو قائد عوام اور پاکستان کے عوام اپنے ایک مشترکہ جذبے کے ساتھ وجود میں لائے تھے۔ جس میں انقلاب کی روح کارفرما تھی۔ اس پارٹی کے اندر کس کس قسم کے اور کس کس نیچر کے لوگ شریک تھے جن لوگوں کا مقصد صرف حکومت کرنا تھا۔ مال و دولت بنانا تھا۔ ان کے دل میں عوام کی فلاح و بہبود کا کوئی جذبہ متحرک نہیں تھا۔ وہ حکومت اور سیاست کو غنڈہ گردی تصور کرتے تھے۔ ان کو وزیراعظم بھٹو کی عظمت اور وقار کا کچھ خیال نہیں تھا۔ ایک ایسی پارٹی جو پاکستان کے عوام میں صرف اور صرف اپنے فکر و فلسفے کی بنا پر مقبول تھی جانی پہچانی جاتی تھی۔ اس پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد اس کی کمان ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جن کا پارٹی کے فلسفے کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ شہید بابا کے اقتدار کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی بنی تھی۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کا غلغلہ

جہاں تک پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کا معاملہ تھا۔ پیپلز پارٹی کا منشور باقاعدہ تحریری شکل میں موجود تھا اور بہت واضح تھا اس میں کسی قسم کا کچھ ابہام نہیں تھا۔ یہ منشور اس وقت کا ایک سائنٹیفک منشور تھا، جو پاکستان کی دینی سیاسی سماجی معاشی زندگی کا مکمل احاطہ کرتا تھا اور اس کا آئینہ دار تھا۔ یہ ایک ترقی پسند سوشلسٹ منشور تھا اور بہت قابلِ عمل پروگرام تھا۔ یہ پروگرام قائد عوام کی دانش اور حکمت کا بہترین مظہر تھا۔ وزیراعظم بھٹو کی یہ بدقسمتی تھی کہ ان کو اپنی سیاسی زندگی میں ایک ہنگامی صورت حال کا ہی سامنا رہتا تھا یا رہا تھا۔ اور ان کے اقتدار کی نوعیت ہی بے حد ہنگامی قسم کی تھی۔ مگر وزیراعظم بھٹو کی شخصیت بنی ہی حادثوں کا سامنا کرنے کے لئے تھی۔ ان کی سیاست کو ایمرجنسی ہی درپیش رہتی تھی۔ ان کا اقتدار ان کی حکمرانی معمول کی حکمرانی ہی نہیں تھی۔ ان کا اقتدار کیا تھا ایک افراتفری کا مجموعہ تھا۔ صرف پاکستان ہی نہیں ٹوٹا تھا ہر شے ہی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اس کے باوجود اس شخص کا عوام کے ساتھ کئے گئے وعدوں پر عمل درآمد کرنا ایک معجزہ تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کی بنیادی شقوں میں سرِ فہرست اور سب سے اہم دو نکات تھے۔ پہلے نمبر پر زرعی اصلاحات کا پروگرام تھا اور دوسرے نمبر پر صنعتی یونٹوں کی نیشنلائزیشن تھی۔

وزیراعظم بھٹو نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد جو پہلا کام کیا تھا وہ لینڈ رفارم کمیشن بنانے کا کام تھا۔ جوان کا ایک عظیم الشان کارنامہ تھا۔ اس لینڈ رفارم کمیشن کا چیئرمین بابا سوشلزم شیخ محمد رشید کو بنا کر انہوں نے اس کے نفاذ پر صداقت کی مہر لگا دی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے اپنی زرعی اصلاحات پر عمل درآمد کرانے کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کیا تھا جو جاگیرداری کو ختم کرنا اپنا ایمان خیال کرتا تھا۔ اس مسئلے میں وہ ننگی تلوار تھا۔

نوٹ: وزیراعظم بھٹو نے اس لینڈ رفارم کمیشن کے قانون کی رو سے لاکھوں ایکڑ زرعی رقبہ پاکستان کے جاگیرداروں سے واگذار کرا کر سرکاری تحویل میں لے لیا تھا اور اس رقبے کو پاکستان کے تمام صوبوں کے غریب کسانوں ہاریوں میں مفت تقسیم کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ کئی ایک جگہ یہ زمین تقسیم کر دی گئی تھی اور اکثر جگہوں پر ابھی اس کو تقسیم کیا جانا تھا کہ ان کی حکومت کو ختم کر دیا گیا تھا۔ ان کے اس عوامی اصلاحی قانون کا صرف اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وزیراعظم بھٹو کی حکومت کو فوج کے ذریعے ختم کرنے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے سب سے پہلے بھٹو صاحب کے لینڈ رفارم کمیشن کو ختم کیا تھا اور تمام جاگیرداروں کو ان کی چھینی گئی زمینیں واپس کر دی گئی تھیں۔ ان جاگیرداروں میں سرِ فہرست سیکرٹری جنرل پاکستان پیپلز پارٹی سردار فاروق لغاری تھا جس کی زمین واپس کی گئی تھی۔

وزیراعظم بھٹو پر جاگیرداری نہ ختم کرنے کا الزام

وزیراعظم بھٹو پر ان کے بائیں بازو کے حریف یا مخالف دیانت داری کے ساتھ یا بددیانتی کے ساتھ یہ الزام لگاتے تھے کہ بھٹو نے انقلاب برپا کرنے کا موقعہ گنوا دیا تھا۔ بھٹو انقلاب کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق اس وقت صورتِ حال انقلاب کے لئے مکمل تیار ہو چکی تھی۔ فصل پک چکی تھی صرف کاٹنے کی ضرورت تھی۔ انقلاب کے لئے موسم اور حالات سازگار تھے۔ بھٹو نے انقلاب برپا کرنے کی صورت حال خراب کر دی تھی۔ وہ انقلاب برپا کرنے والی انقلابی قوتوں کی راہ میں حائل ہو گیا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اب پہلا سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے ٹوٹ جانے کے بعد مغربی پاکستان میں وہ کونسی ایسی انقلابی قوت تھی جس کے انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد کی راہ میں بھٹو حائل ہو گئے تھے۔ کیا مغربی پاکستان میں اس وقت کوئی

www.bhutto.org

کسانوں کی انقلابی جماعت یا انقلابی کونسل تھی جس کی مسلح جدوجہد کی راہ میں بھٹو حائل ہو گیا تھا۔ کیا نیشنل عوامی پارٹی مغربی پاکستان میں انقلاب برپا کرنا چاہتی تھی یا مفتی محمود کی ملاں رجمنٹ انقلاب برپا کرنا چاہتی تھی۔ کیا بلوچستان کے سردار بلوچستان سے سرداری نظام ختم کرنا چاہتے تھے۔ کیا پاکستان کے دوصوبوں میں این۔اے۔پی کی مفتی محمود، خان عبدالولی خان، میر غوث بخش بزنجو اور مینگل کی اتحادی حکومتیں قائم نہیں ہوئیں تھیں۔ کیا ان لوگوں نے اپنے صوبوں میں انقلاب برپا کیا تھا۔ کیا ان لوگوں نے اپنے صوبوں میں جاگیرداری ختم کی تھی۔ ان لوگوں کو اختیار حاصل تھا کہ یہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جاگیرداری اور سرداری نظام ختم کر سکتے تھے۔ پھر ان لوگوں نے جاگیرداری اور سرداری نظام کو ختم کیوں نہ کیا۔

سخت افسوس کی بات تھی کہ پاکستان کے تمام کمیونسٹ سوشلسٹ ترقی پسند صرف ذوالفقار علی بھٹو کی ہی مخالفت کرنے کی قسم اٹھائے ہوئے تھے بلکہ ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ وزیراعظم بھٹو تو انقلاب کے میدان سیاست میں نووارد تھے۔ مگر عبدالولی خان اور بزنجو جو کمیونسٹ انقلاب کے گرگ جہاں دیدہ تھے۔ پون صدی سے سرخ سویرے کے نعرے لگاتے چلے آرہے تھے۔ سوویت یونین کی طرز کے انقلاب سے کم تر انقلاب کی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ پاکستان کے کسی کمیونسٹ سوشلسٹ انقلابی رہنما یا دانش ور نے ان کے اقتدار پر تو ان پر الزام عائد نہ کیا کہ انہوں نے انقلاب کا راستہ روکا ہے یا انقلاب کو ان لوگوں نے سبوتاژ کیا ہے۔ ان لوگوں کو تو انقلاب کے مسئلے پر سات خون معاف تھے۔ مگر ذوالفقار علی بھٹو کے معاملے میں ان کے عدل و انصاف کا معیار کچھ اور تھا۔ ان کے معاملے میں ان کا عدل ایک ایسی عداوت کی طرح تھا جس عداوت کا انتقام ان کے مرنے سے بھی پورا نہیں ہوتا تھا۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہوتا

پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کے لئے انقلاب برپا کرنا آسان تھا

پاکستان میں سرخ انقلاب صرف شیخ مجیب الرحمٰن برپا کر سکتا تھا۔ میرے نزدیک کسی بھی ملک میں انقلاب برپا کرنے کی پہچان جاگیرداری کو ختم کرنا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن اس لئے

www.bhutto.org

جاگیرداری کو ختم کرسکتا تھا کہ اس کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور مشرقی پاکستان میں جاگیرداری تھی ہی نہیں۔ لہٰذا اس کا کوئی ساتھی یا اس کی پارٹی کا کوئی طبقہ جاگیرداری ختم کرنے کے خلاف نہیں ہوسکتا تھا اس کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔ مغربی پاکستان میں اس کی جماعت ہی نہیں تھی۔ تمام جاگیردار اس کے خلاف تھے۔ لہٰذا اس کے لئے مغربی پاکستان کی جاگیرداری کو ختم کرنا بے حد آسان تھا۔ میرا کامل یقین ہے کہ مغربی پاکستان کے جاگیرداروں اور ان کی محافظ اسٹیبلشمنٹ کے نیم جاگیردار فوجی جرنیلوں اور بیوروکریٹوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو پاکستان کا اقتدار دینے کے بجائے ملک توڑنا گوارا کرلیا تھا۔ ان لوگوں نے ملک توڑ کر اپنی جاگیریں بچائی تھیں۔

عقل کے ساتھ غور کرنے کی بات ہے

مغربی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور جاگیردار جنہوں نے پاکستان توڑ کر اپنی جاگیریں محفوظ بنالی تھیں۔ وہ مغربی پاکستان میں کسی سیاست دان کو اس بات کی اجازت دے سکتے تھے کہ وہ جاگیرداری ختم کر ڈالے۔ پاکستان کے جاگیردار اور پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ مشرقی پاکستان میں ناکام ہوئی تھی۔ مغربی پاکستان میں اس کا سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا جیسا پاکستان ٹوٹنے سے پہلے تھا۔ مغربی پاکستان میں اقتدار ان کے پاس تھا۔ فوج کی کمان ان کے پاس تھی۔ پولیس کی کمان ان کے پاس تھی۔ بیوروکریسی ان کے ساتھ تھی۔ مذہبی جماعتوں کے لٹھ بردار لشکر ان کے ساتھ تھے۔ خود لیفٹنٹ بھٹو دشمنی میں ان کے ساتھ تھے۔ مغربی پاکستان میں ایک خونی انقلاب کس طرح برپا کیا جاسکتا تھا۔ کیا پاکستان پیپلز پارٹی یا کوئی بھی انقلابی پارٹی اس قابل تھی کہ فوج پر قابو پالیتی۔ یا کیا عوام کی تحریک اس نہج پر تھی کہ وہ فوجی گاڑیوں پر قبضہ کرلیتی۔ عوام تو سقوط ڈھاکہ کے صدمے سے بے ہوش ہوگئے تھے۔ یہ تو سیاسی کارکنوں کا دم خم تھا جنہوں نے اپنے جوش و خروش سے اسٹیبلشمنٹ کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا تھا اور اسٹیبلشمنٹ نے وقتی طور پر وزیراعظم بھٹو کو اقتدار دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ اقتدار یا انتقال اقتدار ایک سازش تھی محض ایک چال تھی۔ یہ ایک عارضی بندوبست تھا۔ جس کو وزیراعظم بھٹو کی فولادی شخصیت نے حقیقت میں تبدیل کردیا تھا۔ لہٰذا اس قسم کے اقتدار میں وزیراعظم بھٹو جاگیرداری کو کس طرح ختم کرسکتے تھے۔ جبکہ پاکستان کا ہر جرنیل اور ہر بیوروکریٹ جاگیردار بن چکا تھا۔

www.bhutto.org

بھٹو ہم پر اپنا شاعر چھوڑ دیتا ہے

جاگیرداری کی بات پر ایک دلچسپ لطیفہ مجھے یاد آیا ہے۔ ملتان کا ایک بڑا جاگیردار حامد رضا گیلانی تھا وہ ملتان کی ثقافت کے مطابق بہت بذلہ سنج انسان تھے وہ لاہور میں عارف افتخار کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا۔ ان دنوں بھٹو صاحب کا ملتان کا دورہ تازہ تازہ ختم ہوا تھا۔ عارف افتخار نے ان سے بھٹو صاحب کے ساتھ ان کی ملاقات کا پوچھا۔ حامد رضا کہنے لگا کہ بھٹو سائیں کو ملنے تو جاتا ہوں مگر جب بھی میں ان کو گھر ہاؤس ملنے جاتا ہوں۔ وہ اپنا ''شاعر مجھ پر چھوڑ دیتے'' ہیں۔ وہ شاعر ہماری زمینیں وغیرہ کسانوں کو تقسیم کر کے ہم کو فارغ کر دیتا ہے۔ معاملہ یوں ہوتا تھا جب بھی یہ جاگیردار بھٹو صاحب کو ملنے آتے تھے۔ بھٹو صاحب ان کو ڈرانے کے لئے مجھے میری منشور نظم پڑھنے کا کہہ دیتے تھے۔ جس نظم کا تمام مضمون جاگیرداری کو ختم کرنا تھا اور زمین کو لوگوں میں تقسیم کرنا تھا۔

دل کی بات خدا جانتا ہے

ذوالفقار علی بھٹو کے دل کی حقیقت خدا جانتا ہوگا کہ وہ جاگیرداری کو ختم کرنا چاہتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ بات تو ایک حقیقت ہے کہ مغربی پاکستان میں خود ان کی سیاسی طاقت کا انحصار ان کے جاگیردار ممبرانِ اسمبلی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ممبرانِ اسمبلی ہرگز ہرگز انقلابی نہیں تھے۔ نہ ہی وہ کمیونسٹ اور سوشلسٹ تھے۔ وہ صرف اور صرف جاگیردار تھے۔ اقتدار کے خواہش مند تھے۔ ان میں سے بے شمار کا اسٹیبلشمنٹ کی خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ پرانا رابطہ تھا۔ میں انتہائی غیر جانب داری کے ساتھ یہ بات تحریر کرنا چاہتا ہوں کہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو جس انداز میں یا جس قوت کی مدد کے ساتھ اقتدار میں آئے تھے۔ اور خود ان کی پارٹی میں جن جاگیردار ممبرانِ اسمبلی کی ان کو اسمبلی میں حمایت حاصل تھی۔ وہ اس سٹف کے ساتھ کوئی بھی بہت بڑا انقلاب برپا نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی جاگیرداری نظام کو ختم کر سکتے تھے۔ وہ ملک کے معروضی حالات کے مطابق جاگیرداروں کو پاکستان میں حکومت کرنے کے لئے ایک مضبوط قوت خیال کرتے تھے۔ وہ فوجی قوت کے سامنے اپنے جاگیردار طبقے کی طاقت کو ایک طرح کا توازن خیال کرتے تھے۔ اس

www.bhutto.org

لئے کہ فوجی جرنیل عوام کی قوت کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔

وزیراعظم بھٹو کو دو طرح کے انقلابیوں کا سامنا تھا

وزیراعظم بھٹو کو اقتدار فوجی جرنیلوں نے وقتی طور پر ایک سازش کے تحت دیا تھا۔ وہ وقتی طور پر پس منظر میں چلے جانا چاہتے تھے۔ ایک قسم کا حادثاتی اور اتفاقی نوعیت کا اقتدار تھا۔ ایک ہنگامی اقتدار تھا۔ اس طرح کے اقتدار کو انقلاب میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس طریقے کے اقتدار سے وزیراعظم بھٹو پر انقلاب نہ برپا کرنے کی الزام تراشی کرنا سراسر مبہم جوئی کے مترادف تھا یا بھٹو دشمنی کا اظہار تھا۔ کچھ لوگ بڑی دیانت داری کے ساتھ انقلاب کو خودکشی کرنے کے عمل میں تبدیل کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وزیراعظم بھٹو کا دو طرح کے انقلاب پسندوں کے ساتھ واسطہ تھا۔ ایک تو وہ انقلاب پسند تھے جو ملک کے معروضی سیاسی حالات سے بالکل بے بہرہ تھے۔ ان کا عقل و ہوش کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تصوراتی لوگ تھے۔ انقلاب ان کے لئے ایک جنون تھا۔ وہ انقلاب کے راستے کی مشکلات اور حالات کی سنگینی کا ادراک ہی نہیں رکھتے تھے۔ انقلاب ان کی محض خواہش تھی اس میں ان کی اپنی ذات کی کسی کوشش، کسی قربانی یا امتحان کا کوئی دخل نہیں تھا، گویا انقلاب ان کا شوق اور شغل تھا۔ وہ شوق اور شغل وہ ذوالفقار علی بھٹو سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ وہ وزیراعظم بھٹو کے اقتدار کی کسی مجبوری کے قائل نہیں تھے۔ دوسرے وہ انقلابی تھے جو بھٹو صاحب کی سیاست کے دشمن تھے وہ بھٹو صاحب کے سیاسی حریف ہونے کے بجائے سیاسی دشمن بن گئے تھے۔ وہ وزیراعظم بھٹو کو ایک قسم کی انتہا پسندی کا شکار بنانا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے وزیراعظم بھٹو اپنے حادثاتی اقتدار میں روس اور چین کی طرح کا انقلاب برپا نہیں کر سکتے مگر وہ اپنے غلط مفادات کے پیش نظر اپنے حسد اور اپنے بغض کے تحت ان کو بدنام کر رہے تھے۔ ان پر انقلاب کو نقصان پہنچانے کا طعنہ دے رہے تھے۔ ان کی بھٹو دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ وہ تمام انقلابی بھٹو دشمنی میں تمام اسلام پسندوں کے اتحادی بن کر بھٹو کی حکومت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس معاملے میں آخری بات یہ ہے کہ جو لوگ ایئر مارشل اصغر خان کو اپنا لیڈر بنائے ہوئے تھے ان لوگوں کے انقلاب اور ان لوگوں کے سوشلزم کے بارے میں کچھ بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

وزیراعظم بھٹو ایک قومی مصلح تھے

دنیا کی سیاسی تاریخ میں دو طرح کے انقلابی رہنما دیکھنے میں آتے ہیں۔ کچھ انقلابی اپنی مسلح جدوجہد سے انقلاب برپا کرنے کے قائل تھے۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حالات نے مسلح جدوجہد ان پر مسلط کر دی تھی۔ جس سے وہ پہلو تہی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ ان کی انقلابی جدوجہد پر ہی ان کی زندگیوں کا انحصار تھا۔ مثال کے طور پر روس کا سرخ انقلاب جس کی قیادت لینن کر رہا تھا یا چین کا سرخ انقلاب جس کی قیادت ماؤزے تنگ کر رہا تھا۔ یہ دنیا کے عظیم ترین انقلاب تھے۔ یہ انسانی معاشروں کے غیر معمولی انقلاب تھے۔ یہ دونوں انقلاب مسلح جدوجہد کے بغیر وقوع پذیر ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ ہمارے انقلابی دانشور ذوالفقار علی بھٹو سے اس طرح کے انقلاب برپا کرنے کا مطالبہ کرتے تھے۔

یہ دانشور اور انقلابی یہ بات سوچنے پر آمادہ ہی نہیں تھے کہ روس اور چین کے انقلاب میں جو انقلابی اور مسلح عوامی فوج یا سرخ فوج کی قوت لینن کو اور ماؤزے تنگ کو حاصل تھی کیا وہ وزیراعظم بھٹو کو حاصل تھی۔ کیا ذوالفقار علی بھٹو کے پاس سرخ فوج تھی۔ کیا وزیراعظم بھٹو کے ساتھ کوئی ٹراٹسکی اور چو این لائی تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ تو معدودے چند کو چھوڑ کے باقی تمام کے تمام چو رنگ کائی شیک اور لن پیاؤ تھے۔ البتہ ان کی اصل قوت ایک اچھی خاصی تعداد میں ترقی پسند سیاسی کارکنوں کی تھی۔ جو ان کے لئے جلسے جلوس تو کر سکتے تھے۔ وہ کسی سرخ انقلاب کے لئے بندوق اٹھا کر مسلح جدوجہد نہیں کر سکتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست کی یہ گراؤنڈ ریالٹی تھی۔ معروضی صداقت تھی جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اپنی بات کا آغاز اس بات سے کیا تھا کہ دنیا میں دو طرح کے انقلابی دیکھنے میں آتے ہیں۔ پہلی طرح کے انقلابی مسلح جدوجہد سے انقلاب برپا کرتے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو دوسری طرز کے انقلابی مدبر اور سیاست دان رہنما تھے۔ جن کو انقلاب کی ترقی یافتہ زبان میں مصلح کہا جاتا ہے۔ اس نوع کے انقلابی اپنے ملک اور اپنے معاشرے میں اپنی معروضی صورت حالات کے مطابق اپنی سیاست کی رہنمائی کا ڈول ڈالتے ہیں۔ اپنی حریف قوتوں کی طاقت کا اندازہ کرتے ہوئے اپنی سیاست کے لئے راستہ پیدا کرتے ہیں۔ کسی بھی فوجی مسلح قوت سے ٹکرانے سے گریز کرتے ہیں۔ یہ زیرک

www.bhutto.org

انسان مہم جوئی کی خودکشی کی سیاست نہیں کیا کرتے۔ اپنی طاقت کے مطابق قدم اٹھاتے ہیں۔ ان رہنماؤں کی اصل قوت عوام ہوا کرتے ہیں۔ عوام ہمیشہ ایک مؤثر سیاسی قوت ہوا کرتے ہیں۔ عوام کبھی بھی مسلح جدوجہد کے خواہاں نہیں ہوا کرتے۔ عوام مسلح جدوجہد کے متحمل نہیں ہوا کرتے۔ البتہ اگر کوئی مسلح جدوجہد کی قوت انقلاب کے لئے اٹھ کھڑی ہو یا کوئی مسلح تنظیم ایک فوج کی شکل میں جابر قوتوں کے سامنے ڈٹ جائے تو عوام ان کی جدوجہد کی حمایت کیا کرتے ہیں اور ان کی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ اپنی حمایت میں اضافہ کیا کرتے ہیں اور بالآخر ان کی جدوجہد میں براہ راست شامل ہو جایا کرتے ہیں۔ مگر عوام کی شمولیت بہت بعد میں دیکھنے میں آیا کرتی ہے۔ پہلے کسی بھی مسلح انقلابی تنظیم کو تنہا ہی عوام کی دشمن قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

وزیراعظم بھٹو کے پاس اس قسم کی کوئی تنظیم نہیں تھی۔ ان کے پاس یا ان کے ساتھ صرف اور صرف سیاسی کارکن تھے اور ہر طرح کے سیاسی کارکن تھے۔ ان میں انقلابی بھی تھے اور غیر انقلابی بھی تھے۔ جہاں تک ان کی پیپلز پارٹی کا تعلق تھا تو یہ پارٹی اپنے ضمیر کے مطابق انقلابی پارٹی تھی مگر اپنے اجتماعی تشخص میں ایک الیکشن کی پارٹی تھی، ایک انتخابی پارٹی تھی، ایک جمہوری انقلابی پارٹی تھی۔ جو انتخابات لڑنے کی حد تک تو تیار تھی مگر کسی انقلابی جنگ لڑنے کے قابل نہیں تھی۔ وزیراعظم بھٹو کی اصل طاقت اور اصل قوت پاکستان کے غریب عوام تھے۔ جن کی تمام قوت اور طاقت ان کے ووٹ تھے اور پاکستان میں عوام نے اپنے اس ووٹ کی قوت اور طاقت کا اظہار جس طرح ذوالفقار علی بھٹو کے حق میں کیا تھا۔ اس طرح پاکستان کی تاریخ میں دوبارہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ وزیراعظم بھٹو بھی عوام کو ہی اپنی اصل قوت خیال کرتے تھے اور وہ اپنی اس قوت کی میٹشن یعنی ان کی محدودات سے واقف تھے۔ وہ اپنی عوامی قوت کی حدود سے آگاہ تھے۔ وہ اپنی اس اصل قوت جس کو عوام کہا جاتا ہے اس کو کسی غلط مہم بازی کی نذر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان کی قوت کے مطابق اپنی سیاسی جنگ کو محدود رکھنا چاہتے تھے۔ وہ سیاست میں ایسی جنگ کا آغاز کرنا چاہتے تھے جس جنگ کو وہ جاری رکھ سکتے تھے۔ وہ ایسی جنگ نہیں لڑنا چاہتے تھے جس جنگ کے وہ قابل نہیں تھے۔ وہ عوام کا امتحان تو ضرور کرتے تھے مگر وہ ان کو کسی مشکل میں نہیں ڈالتے تھے۔ وہ ایک عملیت پسند انسان تھے۔ سیاست میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ ان کے انقلاب کا طریقہ کمال اتاترک سے ملتا جلتا تھا۔ وہ ایک مدبر اور دانشور انسان تھے۔ وہ اپنی اصلاحات کے ساتھ

قوم میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک جدید ترقی پسند سیاست دان تھے۔ وہ پاکستان میں یورپ کے ممالک کی طرح کا آزاد اور ترقی یافتہ معاشرہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

وہ پاکستان کو ایک فلاحی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ وہ پاکستان کے ہر شہری کو تعلیم یافتہ بنانا چاہتے تھے۔ جس کے لئے انہوں نے پاکستان کے تمام اسکولوں اور کالجوں کو قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ ہر شہری کے لئے تعلیم لازمی قرار دے دی تھی اور ہر شہری کو میٹرک تک مفت تعلیم دینے کا اعلان کر دیا تھا۔

تعلیم ہی ایک بنیادی چیز تھی جو ہر انقلابی معاشرے کو وجود میں لانے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ جس کی بھٹو صاحب نے اپنے معاشرے میں بنیاد رکھ دی تھی۔

ان کا دوسرا سب سے بڑا انقلابی کارنامہ زرعی اصلاحات تھا۔ انہوں نے پاکستان میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ زمین کے لئے حد ملکیت کا قانون نافذ کر دیا۔ جس کی رو سے کسی شخص کے پاس ڈیڑھ سو ایکڑ یا دو سو ایکڑ زمین سے زیادہ زمین نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اگر زمین کی قسم نہری پانی کی ہو تو اس کی حد ڈیڑھ سو ایکڑ لگا دی اور اگر زمین بارانی ہو جس کا مدار بارش کے پانی پر ہوتا تھا اس کی حد دو سو ایکڑ مقرر کر دی۔ اس طریقے سے پنجاب اور سندھ میں جاگیرداروں سے لاکھوں ایکڑ زمین بلا معاوضہ حاصل کر لی گئی۔ اس طریقے سے سرحد اور بلوچستان سے کچھ زمین حاصل کی گئی اور اس تمام زمین کو جو جاگیرداروں سے حاصل کی گئی تھی ہر علاقہ کے مقامی کسانوں ہاریوں میں مفت تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ان کی زرعی اصلاحات کی یہ ابھی ابتدا تھی۔ افسوس کہ اس کی انتہا برپا کرنے کا ان کو جاگیرداروں اور جاگیرداروں کے محافظ افواج پاکستان کے جرنیلوں نے اور سرمایہ دار قوتوں کے محافظ امریکہ نے موقعہ ہی نہیں دیا۔

میں وزیراعظم بھٹو کی نیت اور خواہش کے بارے میں خود کچھ نہیں تحریر کرنا چاہتا۔ یہاں پر میں خود ان کی اقتدار حاصل کرنے کے بعد ان کی زرعی اصلاحات کے بارے میں ان کی کی گئی اس پہلی تقریر کا ایک خاکہ پیش کروں گا۔ ان کی تقریر کے الفاظ سے ان کی عوام پرستی کی روح کے طلاطم کا آپ خود ہی اندازہ کر لیں گے جو ان کے فانی جسم کے اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

میرے ہم وطنو! مزارعو! ہاریو! غریبو! آج کی رات تمہاری رات ہے۔ میں تم سے زرعی اصلاحات کے بارے میں گفتگو کرنے والا ہوں۔ میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نے وہ ظالمانہ اور

غیر منصفانہ جاگیرداری نظام بدل دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ جس کو تم صدیوں سے خاموشی کے ساتھ برداشت کررہے ہو۔ آج کا دن عہد آفریں دن ہے۔ کیونکہ ہم نے ایک ہی ضرب سے وہ روگ جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے جس نے اس ارض حسین کا چہرہ صدیوں سے مسخ کر رکھا تھا۔ ہم نے اپنے بچوں اور آپ کے بچوں کے لئے ایک جرأت آزمائی دنیا کا دروازہ کھول دیا ہے۔ ہم نے اپنی آنے والی نسلوں کا مستقبل محفوظ کردیا ہے۔ میں خدا اور اس کے بندوں کے سامنے سرخرو ہو رہا ہوں کہ آج کے دن پاکستان کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ تاریخ میں ایک شعبدہ بازی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ہماری کتاب آزادی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ ہماری زنجیریں کٹ رہی ہیں۔ آؤ ہم مل کر جشن منائیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ شہید بھٹو نے اپنے ان گنتی کے چند الفاظوں میں انسانی زندگی کے فکر و فلسفے کا ایک سمندر سمو دیا ہے۔ ان کا ہر لفظ ان کی روح کی حقیقت کا ترجمان ہے۔ یہ رفعت خیال کسی عام انسان کی ایجاد نہیں ہو سکتی۔ کچلے ہوئے ڈاؤن ٹراؤن طبقوں کے ساتھ اس طرح کا انداز تخاطب ایک روحانی قوت کے غیر معمولی صفات کے حامل انسان کا ہی ہو سکتا ہے۔

وزیر اعظم بھٹو کی یکم مارچ 1972ء کی دلپذیر تقریر اور روح پرور خطاب پر میں مزید کچھ تحریر نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ ان کی تقریر پر کئے گئے بائیں بازو کے ایک معروف رہنما جناب سردار شوکت علی مرحوم کا مختصر سا تبصرہ ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جو تبصرہ انہوں نے اپنی کتاب ''جمہوریت کا واحد راستہ'' کے عنوان سے تصنیف کی تھی۔ واضح رہے کہ سردار شوکت علی وزیر اعظم بھٹو کے انتہا درجے کے سیاسی مخالفین میں شمار ہوتے تھے۔ وہ اپنی سوچ اور فکر میں بے حد انتہا پسند تھے اور خود کو سوشلزم کا ماہر خیال کرتے تھے۔ وہ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے بانی اراکین میں سے ایک تھے۔ وہ اپنی کتاب کے صفحہ 77 پر فرماتے ہیں۔

مسند اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد آج تک کسی پاکستانی حکمران نے طبقاتی بنیاد پر کسی روندے ہوئے اور کچلے طبقے کو ان الفاظ سے مخاطب نہیں کیا تھا اور نہ ہی انہیں مل کر جشن منانے کی دعوت دی تھی۔ جس طرح کے بھٹو نے دی تھی۔ بھٹو صاحب کی زرعی اصلاحات کے عملی نتائج خواہ کچھ بھی ہوں۔ یہ ہمدردانہ الفاظ مظلوم و مقہور عوام کے دلوں میں اترتے چلے گئے۔ ان کی نظروں میں صدیوں بعد اس خطہ زمین پر ایک ایسا رہنما پیدا ہوا تھا جو ان کے دکھ درد بانٹنے کے لئے آواز

دے رہا تھا اور ان کے شانہ بشانہ جشن منانے کی دعوت دے رہا تھا۔

سردار شوکت علی جسے بھٹو صاحب کے سخت ترین سیاسی حریف اور ناقد کے ان کے بارے میں ادا کیے گئے چند الفاظ وزیراعظم بھٹو کی روح کا آئینہ دکھائی دیتے ہیں اور شہید بھٹو کے عزم کی صداقت کی تصدیق کے لئے بہت کافی ہیں۔

وزیراعظم بھٹو کا سٹیٹ لینڈ تقسیم کرنے کا منصوبہ

وزیراعظم بھٹو نے 1977ء کے انتخابات میں زرعی اصلاحات کرنے کے دوسرے مرحلے کا اعلان کیا تھا۔ جس میں دوبارہ زرعی اصلاحات نافذ کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو چونکہ خود جاگیردار تھے وہ پاکستان میں جاگیرداری نظام کی گہری اور مضبوط جڑوں سے واقف تھے۔ وہ جاگیرداری نظام کے چھتے کو بڑی احتیاط کے ساتھ ہاتھ لگانا چاہتے تھے۔ ان کی زرعی اصلاحات اس احتیاط کی زندہ مثال ہیں۔ ایک جاگیردار ہونے کی وجہ سے ان کی ملک کی سرکاری زمینوں کے تمام ریکارڈ کا علم تھا۔ پاکستان میں 1970ء میں ''سٹیٹ لینڈ،، یعنی سرکاری اراضی ملکیتی اراضی سے بہت زیادہ تھی۔ اور پاکستان کے ہر صوبے میں موجود تھی۔ لہٰذا انہوں نے اپنی زرعی اصلاحات کے پہلے مرحلے میں اس بات کا حکومتی سطح پر فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ تمام سرکاری زمین پاکستان کے بے زمین کسانوں میں ایک ترتیب کے ساتھ تقسیم کر دی جائے گی۔ اس کی ترتیب یوں تھی کہ یہ سرکاری زمین ہر صوبے میں ہر کسان خاندان کو 12 ایکڑ رقبے کے حساب سے مفت آلاٹ کر دی جائے گی۔ ان کی زرعی اصلاحات کا یہ ایک منصوبہ ہی اتنا زیادہ کافی اور قابلِ عمل تھا کہ اس سے پاکستان کے دیہی اور شہری علاقوں میں ایک طرح کا زرعی انقلاب برپا ہو جانا یقینی تھا۔

پاکستان میں ہاریوں کی تقدیریں بدل جانا ایک یقینی عمل تھا۔ ان زمینوں کو پانی مہیا کرنا اور قابلِ کاشت بنانے میں بھی حکومت کی مدد کا منصوبہ شامل تھا۔ یہ منصوبہ بندی 1975ء میں کی گئی تھی۔ وزیراعظم بھٹو نے اپنے 1976ء کے انتخابات میں اس منصوبے کا اعلان کر دیا تھا۔ افسوس کہ ان کی حکومت کے ختم کر دینے سے اس منصوبے پر وہ اس طرح عمل نہ کر پائے جس طرح وہ اپنے ذہن کے سینکڑوں دوسرے منصوبوں پر عمل نہیں کر پائے تھے۔

www.bhutto.org

وزیراعظم بھٹو کی نیشنلائزیشن

وزیراعظم بھٹو کا صنعتوں کو قومیانے کا فیصلہ ایک بہت بڑا انقلابی فیصلہ تھا۔ اس وقت کے لحاظ سے یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔ یہ فیصلہ اگر پیپلز پارٹی کے تحریری منشور کی حد تک کیا جاتا تو زیادہ سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور میں بھٹو صاحب نے صرف پاکستان کی بڑی انڈسٹری کو قومی تحویل میں لینے کا اعلان کیا تھا۔ جس انڈسٹری کو پرسٹیجس (Perstaguis) انڈسٹری کا نام دیا گیا تھا۔ جس میں تمام بنک اور انشورنس کمپنیاں بھی شامل تھیں۔ لوہے اور فولاد کے کارخانے تھے۔ پٹ سن اور بھاری انجینئرنگ کے کارخانے تھے۔ کیمیکل کے کارخانے، سیمنٹ بنانے کے کارخانے تھے۔ بجلی پیدا کرنے کے اور گیس اور تیل صاف کرنے کے کارخانے تھے۔ یہاں تک یہ منصوبہ بے حد قابلِ عمل تھا۔ وہ اس لئے کہ ان بڑی انڈسٹری کے لئے ایک ہنرمند ایڈمنسٹریشن موجود تھی۔ بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کو ماہرین اقتصادیات چلا رہے تھے۔ سرمایہ دار تو غیر حاضر قسم کے منافع خور مالکان تھے۔ ان کی ملکیت کا نظام ختم کر دینے سے بنکوں کو اور انشورنس کمپنیوں کے نظام میں کچھ خلل واقع نہیں ہو سکتا تھا۔

ان کے برعکس چھوٹی صنعتوں کے نظام کو حکومت کسی طور پر بھی قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان تمام چھوٹی صنعتوں کو ان کے مالکان اپنے تجربے اور اپنی مہارت کے بل پر چلائے ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر گھی ملیں، فلور ملیں، کاٹن جننگ فیکٹریاں، فرنس انڈسٹری، ٹیکسٹائل انڈسٹری اور اس طرح کی دوسری فیکٹریوں کو ان کے مالکان کے بغیر چلانا بے حد مشکل کام تھا۔ ان صنعتوں میں بے شمار صنعتیں خسارے میں جا رہی تھیں۔ مالکان اس خسارے کو اپنی بے ایمانی کی مہارت سے بچائے ہوئے تھے۔ مثلاً وہ بجلی کا بل پورا نہیں ادا کرتے تھے، ٹیکس بچایا کرتے تھے۔ بے حد مختصر مین پاور سے کام لیتے تھے۔ وہ چند لوگوں سے زیادہ لوگوں کا کام لیتے تھے۔ لہٰذا یہی انڈسٹری جب قومی تحویل میں لی گئی تو ہر فیکٹری کی بجلی کا بل پورا ادا کیا جانے لگا۔ ٹیکس پورا ادا کیا جانے لگ گیا۔ جس فیکٹری میں پچاس آدمی کام کر رہے تھے وہاں دو سو آدمی کو ملازم رکھ لیا گیا۔ اس طریقے کے ساتھ ان صنعتوں کو قومیانے کا منصوبہ بڑی سرعت کے ساتھ زوال پذیر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ ان تمام صنعتوں پر

www.bhutto.org

بنکوں کے بھاری قرضے تھے۔ جب ان صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا تو یہ تمام قرضے حکومت کی طرف منتقل ہو گئے۔

وہ مالکان جو بنکوں کے قرضے ہڑپ کر چکے تھے وہ صاف ان قرضوں سے بچ گئے تھے۔ وہ کھا پی کر اپنی گروی شدہ فیکٹریاں حکومت کے سر ڈال کر فارغ ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے بنکوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ صنعتوں کو قومیانے کے مسئلے پر بھٹو صاحب کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا۔ ان کے اس انقلابی اقدام کے خلاف سازش کی گئی تھی۔ اس سازش کے پیچھے سرمایہ داروں کا ہاتھ تھا۔ جنہوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے جو پیپلز پارٹی کے اندر موجود تھے اور ان معاملات میں ان کا عمل دخل تھا ان کے ذریعے بنکوں سے اپنی جان چھڑانے کے لئے یہ سازش کرائی تھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن کو کسی اعتبار سے بھی اس معاملے میں بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس طرح یہ ایک بے حد افسوس ناک بات تھی کہ تمام بیمار انڈسٹری کو نیشنلائزیشن کے نام پر حکومت کی گردن میں ڈال دیا گیا تھا جو ایک نوزائیدہ حکومت کے لئے خودکشی کے مترادف تھا۔ جس کے ذمہ دار ڈاکٹر مبشر حسن تھے۔

دوسری غلطی پاکستان پیپلز پارٹی حکومت کی

دوسری غلطی یہ تھی کہ ان صنعتوں کو چلانے کے لئے کوئی تیاری ہی نہیں کی گئی تھی۔ ایک سوشلسٹ اقدام کے لئے سوشلزم کے مسلمہ اصولوں پر عمل کرنا ضروری نہیں از حد ضروری ہوتا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس کے لئے پارٹی کے کیڈر کو تیار کیا جاتا۔ ان صنعتوں کو چلانے کے لئے پارٹی کے ورکروں کو ان کا انتظام دیا جاتا۔ جو اپنے انقلابی جذبے کے ساتھ ان ملوں کو چلاتے، کارکنوں کا، ملازموں کا حوصلہ بڑھاتے اور بھٹو صاحب کی نیشنلائزیشن کے اس انقلابی عمل کو کامیابی سے ہمکنار کرتے۔ ستم ملاحظہ ہو کہ مالکان سے فیکٹریوں کو لے کر بے رحم اور کرپٹ بیوروکریسی کو ان کا مالک بنا دیا گیا۔ افسر شاہی کو ان صنعتوں کا حکمران لگا دیا گیا۔ ان افسران کے وارے نیارے ہو گئے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان افسروں کے دن بدلتے دیکھے تھے جن کو ملوں کا ایڈمنسٹریٹر لگایا گیا تھا۔ ان افسروں کے اندر نہ تو کوئی قومی جذبہ تھا اور نہ ہی وہ بھٹو صاحب کی نیشنلائزیشن کے حق میں تھے۔ ان لوگوں کی لوٹ مار نے ان تمام فیکٹریوں کا دیوالیہ نکال دیا تھا۔

ہر فیکٹری کے اندر حالت یہ تھی کہ ہر مالک انڈسٹری نے دو کھاتے بنا رکھے تھے۔ ایک کھاتا سرکار کا تھا۔ دوسرا کھاتا مالکان کا تھا جو خفیہ کھاتا تھا۔ سرکاری کھاتے میں فیکٹری کے مال کو کم دکھایا جاتا تھا۔ باقی کے تمام مال کو خفیہ رکھا جاتا تھا۔ ان فیکٹریوں پر جب بیوروکریٹوں کو ایڈمنسٹریٹر لگایا گیا تو ان ایڈمنسٹریٹروں نے اور انتظامیہ نے مل کر وہ تمام مال فیکٹریوں سے باہر نکال لیا جو خفیہ کھاتوں میں پڑا تھا اور یہی مال فیکٹری کی اصل قوت تھا۔ جس کے بل پر یہ فیکٹریاں چل رہی تھیں۔ ظاہری کھاتوں میں تو یہ تمام فیکٹریاں خسارے میں چل رہی تھیں۔ تاکہ انکم ٹیکس سے بچا جا سکے۔

پیپلز پارٹی کے ورکروں کا کردار

پیپلز پارٹی کی نیشنلائزیشن کے اس نظام میں پارٹی کارکنوں کا کوئی کردار نہیں تھا البتہ چند ایک پارٹی عہدہ دار جو ڈاکٹر مبشر حسن کے پسندیدہ افراد تھے ان کو کچھ فیکٹریوں میں سرکاری نمائندوں کے طور پر مقرر کیا گیا تھا مگر ڈاکٹر صاحب کے ان پسندیدہ عہدہ داروں کا کردار انتہائی غیر سیاسی اور غیر انقلابی ثابت ہوا تھا۔ ان کارکنوں کی وجہ سے پاکستان پیپلز پارٹی کی بڑی بدنامی ہوئی تھی۔ خاص طور پر بادامی باغ کی بیکو فیکٹری جس میں لاہور کے صدر شیر محمد بھٹی کو معاون نگران لگایا گیا تھا۔ اس فیکٹری کے عجیب وغریب قصے مشہور ہو گئے تھے۔ اس فیکٹری میں کروڑوں روپوں کا خام لوہا مالکوں کے خفیہ کھاتوں میں پڑا تھا۔ جس کا سرکاری کھاتوں میں کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس تمام خام لوہے کو لوٹ لیا گیا تھا۔ کچھ سودا باز قسم کے نام نہاد سیاسی کارکنوں کو جن کا تعلق ڈاکٹر مبشر حسن اور افتخار تاری گروپ کے ساتھ تھا ان کو لوہے کے پرمٹ دیئے جاتے تھے۔ وہ وہاں سے کوڑیوں کے بھاؤ مال اٹھا کر باہر اس کو مہنگے داموں فروخت کرتے تھے۔

بلکہ ایسا ہوا کہ ہمارے سوشلسٹ قسم کے سیاسی کارکن اور پارٹی کے عہدہ دار خود انڈسٹری لسٹ بن گئے۔ انہوں نے بادامی باغ میں لوہے کی ڈھلائی کی فیکٹریاں لگانا شروع کر دیں۔ وہ فیکٹریاں کہ جن کو پارٹی کی حکومت نے قومی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ پارٹی کے عہدہ دار خود ان فیکٹریوں کے مالک بن گئے۔ باقی لوگ تو اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے مگر کامریڈ شیر محمد بھٹی جس کی وجہ شہرت سوشلزم تھا۔ جو ایک پرولتاری طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ تمام عمر وہ نیشنل عوامی پارٹی کے کارکن رہے تھے جو پارٹی خود کو کمیونسٹ پارٹی کہنے پر مصر ہوتی تھی۔ اس

www.bhutto.org

پارٹی کے تربیت یافتہ کامریڈ تھے۔ پیپلز پارٹی میں ان کی آمد ایک اچھا شگون تھا وہ پارٹی کارکنوں کے لئے ایک رول ماڈل تھے۔ جب انہوں نے بیکو فیکٹری کے قریب خودلوہے کی ڈھلائی کا کام شروع کر دیا تو پاکستان پیپلز پارٹی کے انقلابی فلسفے اور کردار کی نفی ہوگئی تھی اور یہ تمام کاروبار ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی قیادت کی چھتر چھاؤں میں شروع کیا گیا تھا۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

گویا جب کفر کعبے میں ہی اٹھ کھڑا ہو تو کسی کے مسلمان رہ جانے کا امکان باقی نہیں رہ سکتا۔

نیشنلائزیشن کی ناکامی کا تیسرا اہم عنصر

اس کی ناکامی کا تیسرا عنصر خود مزدور یونینز تھیں جن کے لئے یہ انقلاب برپا کیا گیا تھا۔ پاکستان میں ٹریڈ یونین پر ہمیشہ پابندی رہی تھی پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت پہلی حکومت تھی جس نے پاکستان میں ٹریڈ یونین پر سے پابندی ہٹا کر سرکاری طور پر ٹریڈ یونینز بنانے کی آزادی فراہم کی تھی۔ وزیراعظم بھٹو اور پیپلز پارٹی کی جدوجہد کا یہ کارنامہ خود اس کی اپنی حکومت کے لئے وبال جان بن گیا تھا۔ معاملہ یوں ہوا کہ ہماری لیبر یونینز کے لیڈر جن کی پرورش آمرانہ دور میں ہوئی تھی۔ وہ صنعتی نظام کو چلانے کا کوئی علم نہیں رکھتے تھے۔ ان میں اکثریت ان لیڈروں کی تھی جو سرکاری ٹاؤٹ ہوتے تھے، حکومتی ٹاؤٹ تھے ان کا کام سوائے ایجنٹی کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ان میں کچھ مالکان کے ٹاؤٹ ہوتے تھے۔ وہ لوگ اس طرح کی ٹاؤٹی کو ٹریڈ یونین کا کام بنائے ہوئے تھے۔ وہ سال ہا سال سے مفت تنخواہیں حاصل کرنے کے عادی بن چکے تھے۔ وہ کسی بھی فیکٹری میں فیکٹری کا کام کاج کچھ نہیں کرتے تھے۔ ان میں کچھ لوگ تو باقاعدہ غنڈے بن گئے تھے وہ اپنے تھانے چلاتے تھے۔ غریب کارکنوں کو خود سزا دیا کرتے تھے۔

ایک لیبر لیڈر کی خوفناک ذہنیت ملاحظہ ہو

ایم۔آر۔ڈی کی تحریک کے دوران میرے ساتھ میانوالی جیل میں نیشنل عوامی پارٹی کا ایک اہم لیبر لیڈر بشیر ظفر بولا قید تھا۔ وہ مجھ پر اپنی لیبر لیڈری کی دھاک بٹھاتے ہوئے گویا ہوا کہ پیپلز پارٹی کی

www.bhutto.org

حکومت کے دوران ہم نے ایک مل مالک کی لڑکی کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ تاکہ اس مل مالک سے اپنے مطالبات کو منوائیں۔ میں حیرت سے اس شخص کو دیکھتا رہا اس کی یہ بات آج بھی مجھے یاد رہ گئی ہے۔ اب جس ٹریڈ یونین کے لیڈروں کی یہ ذہنیت ہوگی وہ کسی صنعت کو چلانے کے ہرگز قابل نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا پیپلز پارٹی کی نیشنلائزیشن میں فیکٹری کے اندر ایک اہم ترین اور طاقت ور فریق ٹریڈ یونین بن گئی۔ جس کا کام فیکٹری کے لئے کام کرنا نہیں تھا۔ صرف مراعات حاصل کرنا تھا۔ لوگوں کو ملازمت دلوانہ ہوتا تھا۔ ہر طرح کا جائز نا جاء فائدہ اٹھانا ہوتا تھا۔ فیکٹری چلتی ہے یا نہیں چلتی اس سے ان کو کچھ غرض نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایک طرح کا غنڈہ ازم تھا ٹریڈ یونین نہیں تھی۔

اس کے علاوہ ٹریڈ یونین میں بے شمار ذہن کام کر رہے تھے۔ کوئی خود کو روس نواز بنائے ہوئے تھا۔ کوئی ماؤ نواز بنائے ہوئے تھا۔ ان لوگوں کی لگامیں کسی اور طاقت کے پاس ہوتی تھیں۔ وہ خفیہ قوتیں پیپلز پارٹی کی حکومت کو ناکام بنانا چاہتی تھیں۔ لہٰذا اس نوع کے ٹریڈ یونین کے لیڈر نیشنلائزیشن کو ناکام بنا کر بھٹو کی حکومت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

کراچی کی ٹریڈ یونین کا انداز

کراچی مزدور طبقہ چونکہ ممتاز علی بھٹو کی سندھ پرستی کی بنا پر پیپلز پارٹی کے خلاف کھلی بغاوت کر چکا تھا۔ پاکستان میں ٹریڈ یونینز کا سب سے بڑا نظام کراچی میں ہی واقعہ تھا۔ کراچی کے تمام ٹریڈ یونین کے لیڈر اردو سپیکنگ تھے۔ ان لیڈروں نے کھل کر پیپلز پارٹی کی حکومت کے صنعتی نظام کے پہیے جام کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ گودیوں اور پورٹوں پر صورت حال بے حد ابتر اور خراب بنادی گئی تھی۔ مزدور لیڈر اور تنظیمیں کھلم کھلا اسلحے کا استعمال کرتی تھیں۔ اس قسم کی صورتِ حال میں حکومتی انتظامیہ کی طرف سے بے حد افسوس ناک واقعات دیکھنے میں آیا کرتے ہیں اور کراچی میں وہی کچھ ہوا۔ انتظامیہ نے اندھا دھند گولیاں چلا کر ایک اچھی خاصی تعداد میں مزدوروں کو ہلاک کر ڈالا۔ وزیر اعظم بھٹو کی حکومت کے خلاف یہ واقعہ ایک بہت بڑی سازش تھا جو خفیہ ایجنسیوں کی جانب سے کرایا گیا تھا۔ جس واقعے کی وجہ سے وزیر اعظم بھٹو کی سیاسی ساکھ کو بڑا نقصان پہنچا تھا۔

وزیر اعظم بھٹو کراچی کے اس سانحے کے بعد کراچی گئے۔ وہاں پر انہوں نے اپنے اظہار غم کا جن الفاظ میں اظہار کیا تھا وہ بے حد دردناک انداز تھا۔ بھٹو صاحب کو کراچی شہر بہت پسند تھا۔

کراچی شہر کے فسادات اور ہنگامے میں شہر کی رونق تباہ ہوگئی تھی۔ جگہ جگہ شہید مینار اور شہیدوں کے مقبرے بنادیئے گئے تھے۔ ہر زبان پر انتقام انتقام کے نعرے تھے۔ بھٹو صاحب کے الفاظ تھے یہ میرے کراچی کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔ میں نے اقتدار اس لئے حاصل نہیں کیا تھا کہ کراچی کو شہید مینار اور شہیدوں کے مقبرے بنادیا جائے۔ میں نے تو اقتدار حاصل کیا تھا کہ ملک میں امن اور سلامتی کے مینار بن جائیں۔ میں دوستی اور محبت کی یادگاریں قائم کرنے کے لئے اقتدار میں آیا تھا۔ او سندھیو او مہاجرو مجھ پر رحم کھاؤ میں تو پہلے ہی بڑے امتحان دے رہا ہوں خدا کے لئے میرا اور امتحان نہ لو۔ آج ماضی کے تمام خوفناک مسائل ماضی کے تمام بلنڈرز تمام غلطیاں میری گود میں جمع کردی گئی ہیں۔ مارشل لاء ختم کرنا، آئین بنانا، جمہوریت بحال کرنا، معاشیات پر قابو پانا، کشمیر کا مسئلہ حل کرنا، بہاریوں کا مسئلہ حل کرنا، بنگلہ دیش کا مسئلہ حل کرنا صرف میرے ہی مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں ان تمام باتوں کو چھوڑ کر کسی طرف منہ کر جاؤں۔ مگر مجھے پاکستان کا خیال آجاتا ہے، آج کراچی میں ایوب خان زندہ باد کے نعرے لگائے جارہے ہیں۔ ایوب خان نے تو پورا لالوکھیت اور لیاری جلا دیا تھا۔ یہ غلط نعرے ہیں۔ خفیہ ایجنٹ یہ نعرے لگوا رہے ہیں۔ سازش ہو رہی ہے۔ میں کراچی کا رہائشی ہوں کیا کوئی شہری اپنے شہر کو ویران کرسکتا ہے۔

لہٰذا اس قسم کی صورت حال تھی جو نیشنلائزیشن کے بعد مختلف سازشوں کے ذریعے صنعتی علاقوں میں پیدا ہوگئی تھی یا کردی گئی تھی۔ نیشنلائزیشن تو مزدوروں کے حق میں کی گئی تھی۔ یہ کس طرح کی نیشنلائزیشن تھی یا اس نیشنلائزیشن کا یہ کیا مقدر تھا کہ ایک طرف تو ملک کے تمام سرمایہ دار اور بین الاقوامی گماشتہ سرمایہ دار اس نیشنلائزیشن کے خلاف تھے دوسری جانب جن کے لئے یہ نیشنلائزیشن کی گئی تھی وہ آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے تھے۔ سرمایہ داروں کے حکومت کے خلاف ہونے کی وجہ تو صاف سمجھ آتی تھی کہ ان کی فیکٹریاں ان سے چھین لی گئی تھیں۔ مگر مزدور ٹریڈ یونینوں کے فسادات کی کچھ سمجھ نہیں آسکتی کہ یہ کس لئے کرائے گئے تھے اور کس نے کرائے تھے۔ یہاں پر پھر میں وہی بات کروں گا اور کہوں گا کہ مزدور یونینوں کو اس کام کے لئے تیار نہیں کیا گیا تھا۔ مارشل لاء کی قائم شدہ ٹریڈ یونینوں اور ان کے سرکاری لیڈروں پر بھروسہ کرلیا گیا تھا۔ جو سراسر غلط اقدام تھا۔ نوے فی صد مزدور لیڈر خفیہ ایجنسیوں سے تنخواہیں پاتے تھے۔ ان ایجنسیوں نے ان کو استعمال کیا جس کی وجہ سے تمام صنعتی امن درہم برہم ہوکررہ گیا

www.bhutto.org

تھا۔ ہمارا نیشنلائزیشن کا معاملہ بھی بالکل چی گیویرا کی انقلابی جدوجہد کی طرح ثابت ہوا تھا۔ ایک ایڈونچرازم بن کر رہ گیا تھا۔ چی گیویرا جو ایک سچا انقلابی تھا اس نے بغیر کسانوں کو منظم کئے ان کی انقلابی تعلیم کئے ان کی حمایت میں انقلاب برپا کرنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ کسان بھی چی گیویرا کے خلاف برسرِ اقتدار حکومت کا ساتھ دینے لگ گئے تھے جن کسانوں کے لئے وہ جدوجہد کر رہا تھا اور چی گیویرا مارا گیا تھا۔ یہی حال ہماری نیشنلائزیشن کا ہوا تھا اور ہمارا ہوا تھا۔ جن کے لئے صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا تھا وہ خود حکومت کے خلاف جلوس نکال رہے تھے، کارخانے بند کروا رہے تھے۔

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

پاکستان پیپلز پارٹی کی نیشنلائزیشن کو انارکی میں تبدیل کر دیا گیا

پاکستان پیپلز پارٹی کی نیشنلائزیشن کو ایک مکمل سازش کے تحت ایک کھلی انارکی میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ پاکستان کا قومی پریس اس وقت بے حد طاقت ور تھا اور یہ قومی پریس رجعت پسندوں کے قبضے میں تھا۔ جن کی اکثریت کا تعلق جماعت اسلامی اور دوسری مذہبی تنظیموں کے ساتھ تھا۔ یہ رجعت پسند اخبار اور جرائد نیشنلائزیشن کو اپنے ایمان کے مطابق خلافِ اسلام خیال کرتے تھے۔ یہ سوشلزم کو کفر قرار دیتے تھے۔ جس طرح نوائے وقت کے سربراہ جناب مجید نظامی نے مجھے خود کہا تھا کہ بھٹو صاحب کے ساتھ ہمارا اختلاف ان کے سوشلزم کی وجہ سے ہوا تھا۔ لہٰذا یہ رجعت پسند اخبار اور ان کے مالکان سرمایہ داری کو اپنے عقائد کی رو سے جائز خیال کرتے تھے اور سرمایہ داروں کو بڑی مقدس گائے تصور کرتے تھے۔ ویسے بھی ان کے اخبارات ان سرمایہ داروں کے اشتہارات کی بدولت چلتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کے قومی پریس کا اور سرمایہ داروں کا قدرتی الحاق ہو گیا تھا ایک فطری سمجھوتا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان کا یہ رجعت پسند قومی پریس شروع روز سے خفیہ ایجنسیوں کے اشاروں پر چلنے کا عادی تھا۔ خفیہ ایجنسیوں کا فیصلہ تھا کہ بھٹو کی حکومت کو ناکام بنایا جائے۔ اس طرح ملک کی یہ تین بڑی مؤثر قوتیں اس مسئلے پر متحد ہوگئی تھیں۔

نیشنلائزیشن کے خلاف امریکا کا ردِعمل

وزیراعظم بھٹو جس وقت اقتدار میں آئے تھے وہ امریکا اور سوشلسٹ روس کی کولڈ جنگ کے عروج کا زمانہ تھا۔ امریکا سوشلزم اور نیشنلائزیشن کے انتہائی خلاف تھا۔ پاکستان چونکہ اپنے جغرافیائی اعتبار سے سوشلسٹ دنیا کے سامنے امریکا کے لئے ایک بہت اہم ملک تھا۔ پاکستان سوویت یونین کے خلاف امریکا کی جنگ کا ہمیشہ سے مرکز رہا تھا۔ جس کی بنا پر وزیراعظم بھٹو کے سوشلزم کے نعرے نے امریکا کی نیند حرام کردی تھی۔ پاکستان میں صنعتی نظام کو سوشلزم کے اصولوں پر قائم کرنا اور نیشنلائزیشن کرنا امریکا کے ان تمام اقدامات کی موت تھی جو اقدامات وہ سوشلسٹ دنیا کے خلاف کرنا چاہتا تھا۔ امریکا نے پاکستان کے سرمایہ داروں کی قوت کے بل پر پاکستان کے رجعت پسند پریس کے ذریعے اسٹیبلشمنٹ کی قوت کے بل پر سوویت یونین کے خلاف ایک آہنی دیوار بنا رکھی تھی۔

پاکستان کو اسلام کا قلعہ سب سے پہلے امریکنوں نے ہی لکھا تھا۔ امریکا کی سوشلزم کے خلاف اور روس کے خلاف تمام جنگ کا دار و مدار پاکستان پر تھا۔ وہ کسی قیمت پر پاکستان میں سوشلزم برپا ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ بھٹو صاحب کی شہادت کے بعد جنرل ضیاالحق نے ہی امریکا کو روس پر فتح دلوائی تھی۔ روس اور امریکا کی جنگ کا آخری فیصلہ پاکستان کی سرزمین پر ہی ہوا تھا۔ لہٰذا وزیراعظم بھٹو کی نیشنلائزیشن امریکا کے لئے ایک سرخ کپڑا تھا۔ امریکا نے اپنی پوری قوت اور وسائل کے ساتھ بھٹو صاحب کی نیشنلائزیشن کو پاکستان میں ناکام بنا دیا تھا۔ اس خطے میں امریکا کے اسٹیکس (staks) اس قدر بھاری اور ہائی تھے کہ وہ بھٹو شہید جیسے قوم پرست کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

پاکستان میں امریکا نواز گماشتہ سرمایہ داروں نے ملک سے باہر بھاگنا شروع کردیا۔ پاکستان میں ہر طرح کی سرمایہ کاری کرنے کا سلسلہ بند ہوگیا۔ پاکستان کی تمام دولت ملک سے باہر منتقل کردی گئی۔ وزیراعظم بھٹو نے سرمایہ کاری کے اس جمود کو حکومتی سطح پر پاکستان میں بھاری انڈسٹری لگا کر توڑا تھا۔ اس کے علاوہ وزیراعظم بھٹو نے پاکستان کے محنت کشوں کے لئے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں جانے کے دروازے کھول دیئے۔ پاکستان کے لاکھوں شہری عرب ممالک

میں جا کر کاروبار اور ملازمتیں کرنے لگ گئے۔ جس سے پاکستان میں عوام کی سطح پر پہلی بار دولت کی ریل پیل دیکھنے میں آئی تھی۔

نیشنلائزیشن کے خلاف پارٹی کے اندر سے سازش کی گئی

جہاں تک بیرونی قوتوں کی سازشوں کا تعلق تھا۔ ان کا وزیراعظم بھٹو کو کافی حد تک علم تھا جس کا تدارک وہ عوام کی قوت کے ساتھ کرتے چلے جا رہے تھے۔ مگر ان کی ان اصلاحات کے بارے میں جو سازش پارٹی کے اندر سے کی گئی تھی ان کا تدارک کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ مثال کے طور پر نیشنلائزیشن کے دوسرے مرحلے میں جن چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو حکومت کی تحویل میں لیا گیا تھا اس کو کسی اعتبار سے بھی نیشنلائزیشن نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ تو پوری پوری خودکشی کا سامان تھا۔ مثلاً چاولوں کے شیلر چلانے کا کام حکومت کس طریقے سے کر سکتی تھی۔ یہ سیزنل کام منڈی کے آڑھتیوں کے ساتھ مل کر شیلر مالکان کرتے تھے۔ یہ بڑا محنت طلب کام تھا۔ آڑھتی محض ایک مڈل مین کا کردار ادا کرتے ہیں مگر ان کا کام اس کاروبار میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہوتا ہے۔ یہ بڑے چھوٹے پیمانے کے لوگ ہوتے ہیں ان کے ساتھ انہی کی ذہنیت کے لوگ ہی پورا اتر سکتے ہیں۔ بیوروکریسی کے افسران اس کاروبار کو چلانے کے کبھی بھی اہل نہیں ہو سکتے تھے۔ اسی طرح کاٹن جننگ فیکٹریوں کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح کا سیزنل کام تھا جس میں کپاس کو وقت سے پہلے ادھار خریدا جاتا ہے۔ یہ بڑا محنت طلب کام تھا۔ کپاس کی بوائی کے ساتھ ہی کپاس کا سودا کر لیا جاتا ہے۔ زمینداروں کو بیج اور کھاد اور ایڈوانس وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ کیا افسر شاہی اس طرح کی سردردی کر سکتی تھی۔ کیا آٹے کی ملیں افسر شاہی چلا سکتی تھی۔ لہٰذا ان فیکٹریوں کو جب افسران کے قبضے میں دے دیا گیا جو افسران اس کاروبار کے سرکل کو قائم کرنے کے قابل ہی نہیں تھے۔ چند ہی دنوں میں یہ تمام فیکٹریاں بند ہونا شروع ہو گئیں۔ ان تمام چھوٹی فیکٹریوں کے ساتھ بے شمار محنت کشوں کا رزق وابستہ تھا۔ جو منڈی سے لیکر ان فیکٹریوں تک مال پہنچانے اور لے جانے کا کام کرتے تھے۔ وہ تمام بیکار ہو گئے۔ منڈی میں آڑھتیوں نے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ بے روزگار مزدوران کو جلوسوں کے لئے مفت حاصل ہو گئے۔ پنجاب میں منڈی کے آڑھتیوں کی اکثریت جماعت اسلامی کی حامی تھی۔

اس طریقے کے ساتھ جماعت اسلامی کی سٹریٹ پاور میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کو اپنے جلوسوں کے لئے ہر قصبہ اور ہر تحصیل میں بے روزگار مزدوروں کے لشکر میسر آ گئے جن کی مدد سے جماعت اسلامی نے حکومت کا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ غریب لوگ جو کل تک پیپلز پارٹی کا نعرہ مارتے تھے اپنی بے روزگاری کی وجہ سے پیپلز پارٹی سے دور ہٹنا شروع ہو گئے تھے۔ وزیراعظم بھٹو کو دھوکا دے کر پارٹی کے اندر کے سرمایہ داروں کے ایجنٹوں نے بظاہر تو یہ کام غریب محنت کشوں کی حمایت کا فریب دے کر ان سے کرایا تھا، مگر اس کام کا نتیجہ الٹا نکلنا تھا اور الٹا ہی نکلا۔ حکومت کا یہ اقدام سراسر غریب لوگوں کے خلاف ثابت ہوا۔

جس کا احساس بھٹو صاحب کو بہت بعد میں ہوا تھا۔ اس طرح کی حکومت کی نیشنلائزیشن حکومت کے کچھ مخالفین کے خلاف انتقامی کارروائی مشہور ہونے لگ گئی تھی۔ مثال کے طور پر چوہدری ظہور الٰہی کی بہت ساری فلور ملیں تھیں، اسی طرح کچھ جماعت اسلامی کے اراکین و مبتدین کے چاولوں کے شیلر اور کاٹن جننگ فیکٹریاں اور فلور ملیں تھیں۔ ان سب کو قومی تحویل میں لینے کے اقدام کو ایک سیاسی انتقام بنا دیا گیا تھا۔ حزبِ اختلاف کا حکومت پر الزام تھا کہ حکومت نے یہ سب کچھ حزبِ اختلاف کو مفلوج کرنے کے لئے کیا تھا۔ حزبِ اختلاف کے لوگوں کو مالی طور پر کمزور بنانے کے لئے ان کی قوت کو ختم کرنے کے لئے کیا ہے۔ حکومت نہ تو صنعتوں کو چلانے میں کامیاب ہوئی اور نہ ہی اپنے مخالفین کا زور توڑنے میں کامیاب ہوئی۔ الٹا ان معاملوں سے حکومت بدنام ہوئی اور عوامی سطح پر کمزور ہوتی چلی گئی تھی۔

پیپلز پارٹی کے متعلق غلط تاثر قائم کر دیا گیا

پیپلز پارٹی کے متعلق ایک غلط تاثر قائم کر دیا گیا کہ یہ پارٹی اور اس کی حکومت ہر طرح کی سرمایہ داری اور سرمایہ کاری کے خلاف ہے۔ پیپلز پارٹی فیکٹریوں کی طرح لوگوں کے مکانوں اور دوکانوں پر بھی قبضہ کر لے گی یا قبضہ کرا دے گی۔ ہر کاروباری انسان کے دل میں خوف پیدا کر دیا گیا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت ان کے کاروبار پر قبضہ کر لے گی۔ جس شخص کا بنک میں کچھ سرمایہ پڑا تھا اس پر خوف طاری کر دیا گیا کہ ایک دن حکومت ان کی دولت کو بھی قومی تحویل میں لے لے گی۔ اس غلط تاثر سے پاکستان کا ایک فعال اور بااثر شہری طبقہ کھاتا پیتا

باوسائل طبقہ پیپلز پارٹی کے خلاف متحد ہو گیا اور بالآخر وہ پی۔این۔اے کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اس کاروباری طبقے نے مرکزی قوت کا کردار ادا کیا تھا۔ افسوس کہ وزیراعظم بھٹو کی نیشنلائزیشن کے ہتھیار کو الٹا ان کی حکومت کے خلاف استعمال کیا گیا تھا۔ پاکستان کا ہر وہ شہری جو اپنے پاس تھوڑی بہت جمع پونجی رکھتا تھا وہ خود کو سرمایہ دار تصور کر کے پیپلز پارٹی کو اپنا دشمن خیال کرنے لگ گیا تھا۔ اس طرح بھٹو دشمن اندرونی اور بیرونی قوتوں کو ایک باوسائل طبقہ پیپلز پارٹی کی حکومت ختم کرنے کے لئے میسر آ گیا۔

وزیراعظم بھٹو کی نیشنلائزیشن کے سلسلے میں ولادی میر لینن کی نیشنلائزیشن کا ایک اقتباس

پاکستان کی طرح کے جاگیردار اور سرمایہ دار طبقوں کی گرفت میں جکڑے ہوئے فوجی جرنیلوں کے قبضہء قدرت میں آئے ہوئے ملک میں صنعتوں کو نیشنلائز کرنا ایک بہت بڑا خطرناک اقدام تھا۔ خطرناک اس لئے کہ قومیائی گئی صنعتوں کو چلانے کی کوئی پیشگی تیاری نہیں کی گئی تھی۔ صنعتوں اور زمین اور دوسری چیزوں کو کسی حکومت کا قومی تحویل میں لینا کس قدر مشکل اور دشوار کام ہوتا ہے اس کی ایک جھلک دکھانے کے لئے یہاں میں انقلابِ روس پر لکھی گئی معروف مستند کتاب ''سامراجی نظام کے خلاف انقلاب روس کے پس منظر اور پیش منظر کا تفصیلی جائزہ'' جس کو معروف ادیب محمد مسعود جوہر نے تحریر کیا تھا پیش کرتا ہوں۔ حوصلے سے ملاحظہ فرمائیں۔

سوویت روس کے کمیونسٹ سوشلسٹ انقلاب کی تکمیل کے بعد روس کی بالشویک پارٹی نے نہایت نیک دلی کے ساتھ لینن اور سینٹر کمیٹی کے فیصلے کے مطابق بالشویک انقلاب کی اصلاح کے لئے خود اپنی ایک مضبوط حزبِ اختلاف کی جماعت کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ تا کہ انقلاب پر کڑی نظر رہے۔ اس کے لئے روس کے معروف ترقی پسند لیڈر مورٹوف کی پارٹی کو جمہوری روایات کے مطابق حزبِ اختلاف کا لقب اور حقوق دے دیئے تھے۔ جس پارٹی کو اور اس کے لیڈر کو ہر طرح کی تنقید کرنے کی ہر طرح کی اجازت تھی۔ لینن کی نیشنلائزیشن کے بارے میں مورٹوف کا بیان ملاحظہ ہو۔ جو کتاب کے صفحہ نمبر 139 کے مطابق یوں تھا۔

قومی تحویل میں چیز کو لینے کے جبریہ قوانین کی کمیٹیوں نے کسانوں کو تباہ کر دیا ہے۔ سوویت حکومت کسانوں سے ہر شے جبریہ وصول کر لیتی ہے۔ لیکن اس کے عوض کچھ نہیں دیتی۔ معاملہ یوں ہوا تھا سوویت روس نے کمیونسٹ انقلاب کے تحت ہر شے کو قومیا لیا تھا۔ انقلابی حکومت کے عمال جبریہ طور پر دیہاتوں میں جا کر گھروں سے غلہ اور مویشی حاصل کرتے تھے۔ ہر چند یہ کام ملک وقوم کے وسیع مفادات کے پیشِ نظر کیا گیا تھا۔ مگر کسانوں کے غم و غصے کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے نہ صرف اپنے گھروں میں پڑا ہوا اضافی غلہ تلف کرنا شروع کر دیا تھا بلکہ اپنے مویشی ذبح کر ڈالے تھے۔ کسانوں کا کہنا تھا کہ ہم تباہ ہو جائیں گے لیکن اپنے مویشی اور غلہ حکومت کو نہیں دیں گے۔ کسانوں نے انقلابی حکومت کے عمال کے سامنے اپنی لہلہاتی فصلوں کو نذرِ آتش کر دیا۔

نیشنلائزیشن کے پہلے مرحلے پر سوشلسٹ کمیونسٹ بالشویک پارٹی بڑی مشکل کا شکار ہو گئی تھی۔ کارخانوں کو قومی تحویل میں لینے کے بعد کارخانوں کی کارکردگی بری طرح متاثر ہو گئی۔ کئی کارخانے بند ہو گئے۔ مزدوروں کی بے روزگاری میں اضافہ ہو گیا۔ مزدوروں نے ہڑتالیں کرنا شروع کر دیں۔ ایک طرح سے نیشنلائزیشن ناکام ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے نیشنلائزیشن کی پالیسی میں تبدیلی کرنی پڑ گئی تھی۔ اس پالیسی کے تحت طے پایا گیا تھا۔ (1) جس کارخانے میں مزدوروں کی تعداد 30 تھی یا اس سے کم تھی اس کو مالکان کو واپس کر دیا گیا تھا۔ (2) جن کارخانوں میں مزدوروں کی تعداد 70 سے کم تھی، ان کارخانوں کو ٹھیکوں پر دے دیا گیا تھا۔ (3) صرف ملک کی بنیادی صنعت وحرفت کے کارخانوں کو حکومت کے قبضے میں رکھا گیا تھا۔ (محمد مسعود جوہر کی کتاب انقلاب روس صفحہ نمبر 145)

(نوٹ) اس اقتباس کو کتاب میں شامل کرنے کا مقصد نیشنلائزیشن کی اصل حقیقت کو سمجھانا مقصود تھا۔ اگر بالشویک جیسی انقلابی پارٹی کی نیشنلائزیشن ناکام ہو سکتی تھی تو پیپلز پارٹی جیسی نو آموز انتخابی پارٹی کی نیشنلائزیشن کی کیا حقیقت ہو سکتی تھی۔

خواجہ رفیق کی شہادت اور میرا احتجاج

پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف اوپر بیان کی گئی ابتری تو بہت بعد میں پیدا ہوئی

www.bhutto.org

تھی۔ پارٹی کی حکومت کے ابتدائی دور میں عوام کی سطح پر پارٹی کا اور وزیر اعظم بھٹو کی مقبولیت کا گراف بہت بلند تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں وزیر اعظم بھٹو پاکستان کا پہلا سیاست دان تھا جس نے اپنی سیاست اور اپنے اقتدار کی بنیاد عوامی مسائل پر رکھی تھی۔ وہ ایشوز کی سیاست کرتے تھے۔ وہ پہلے سیاسی قائد تھے جن کو عوام کی بنیادی ضرورتوں کا علم تھا۔ ان کی سیاست کا اور ان کی حکومت کا تمام لب لباب لوگوں کی مدد کرنا تھا۔ لوگوں کی اقتصادی قوت میں اضافہ کرنا تھا۔ لوگوں کے مسائل کو حل کرنا تھا۔ انہوں نے انگریزی کے اس محاورے کو اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا جس کے مطابق کہا جاتا ہے کہ حکومت وہ ہوتی ہے، جو لوگوں کی حکومت ہو اور لوگوں کے لیے حکومت ہو۔

جہاں تک وزیر اعظم بھٹو کی ذات کا تعلق تھا وہ اپنی ذات کی قوت اور اپنی متحرک اور فعال قیادت سے لوگوں کے دلوں پر چھائے ہوئے تھے۔ لوگوں کی اکثریت ان کے کردار و عمل پر یقین رکھتی تھی۔ ان کی اپنی ذات کی طرف سے کبھی کوئی ایسا واقعہ درپیش نہیں آتا تھا جس پر لوگوں کو کبھی اعتراض ہو یا لوگ اس کو برا تصور کریں۔ ان کے ہاتھ اپنی حکمرانی میں بہت صاف ستھرے ہوا کرتے تھے۔ مگر ان کی بنائی ہوئی صوبائی قیادتوں اور حکمرانوں کے کردار و عمل سے لوگ بہت جلد متنفر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بھٹو صاحب کی حکمرانی میں اور صوبوں کے حکمرانوں کی حکمرانی کے طور طریقوں میں زمین آسمان کا فرق اور فاصلہ تھا۔ وزیر اعظم بھٹو قوم پر اپنی رہنمائی کے ذریعے حکومت کرتے تھے۔ مگر ان کے گورنر اور وزراء اعلیٰ اپنی تھانے داری کے ذریعے لوگوں پر راج کرتے تھے۔ بھٹو صاحب کی سیاست میں اور ان لوگوں کی سیاست میں اتنا بڑا تضاد تھا جس کا نتیجہ بھٹو صاحب کے لیے ہرگز ہرگز اچھا نہیں ثابت ہو سکتا تھا۔ پنجاب کے گورنر ملک غلام مصطفیٰ کھر نہ تو خود ایک قومی سیاسی کارکن تھے اور نہ ہی وہ سیاسی کارکنوں کی عزت اور مقام کا احساس رکھتے تھے۔ ان کے پسندیدہ کارکن کچھ اور ہی قبیل کے ہوا کرتے تھے۔ خواجہ رفیق پاکستان کی روایتی سیاست کا ایک جوشیلا کارکن تھا۔ وہ پاکستان کی احتجاجی سیاست میں ہی پل پوس کر جوان ہوا تھا۔ ہر حکومت کے خلاف احتجاج کرنا ان کی طبیعت کا خاصا بن چکا تھا۔ مگر ان کا احتجاج کسی بھی حکومت کے لئے خطرہ نہیں بن سکتا تھا۔ ان کا احتجاج چھوٹے سے جلوس اور ان کی مختصر سی تقریر تک ہی محدود ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب کی موت کا باعث اصغر خان تھا جس کے جلوس میں شرکت کرنا ہی خواجہ کی موت بن گئی تھی۔

ائیر مارشل اصغر خان کی فوجی سیاست

دنیا بھر کے فلسفیوں نے سیاست کے بارے میں متفقہ فیصلہ دیا ہے کہ کسی فوجی انسان کو نہ صرف فوجی انسان بلکہ کسی فوجی ذہن کے انسان کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ بلکہ اس طرح کے کسی بھی انسان کو سیاست کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ یہ لوگ پیدائشی طور پر اور فطری طور پر غیر جمہوری لوگ ہوتے ہیں۔ یہ قومی سیاست کی باریکیوں، مصلحتوں اور نزاکتوں سے عاری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ معاملہ کش ہوتے ہیں معاملہ فہم نہیں ہوتے۔ یہ انسان دشمن ہوتے ہیں انسان دوست نہیں ہوا کرتے۔ ائیر مارشل اصغر خان نے پاکستان کی سیاست میں دانش وروں، فلاسفروں اور داناؤں کے اس قول کو ان کی توقع سے بڑھ کر سچا ثابت کیا۔ یہ شخص تمام زندگی ایجنسیوں کے اشاروں پر سیاست کرتا رہا ہے۔ اصغر خان جمہوری اندازِ سیاست سے نابلد انسان تھا۔ سیاست اس کے نزدیک ذاتی دشمنی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی۔ وہ اپنے مخالف پر تنقید و تنقیص کا قائل نہیں تھا، اس کا نام و نشان مٹانے کا قائل تھا۔ اس کے سیاسی اہداف دشمن کے خلاف جنگ کرنا کے ہوتے تھے۔ اپنے حریف کو پھانسی دینا اس کی سیاست کا تکیہ کلام ہوتا تھا۔ وزیر اعظم بھٹو کی ذات کے لئے اس کے یہی الفاظ ہوتے تھے۔ شہید بھٹو کو سہالہ کے پل پر پھانسی لگانے کا مژدہ اصغر خان نے ہی قوم کو سنایا تھا۔ شہید بابا جفا کشانِ محبت تھا ان کے ساتھ ہوا جو ہوا۔ مگر اصغر خان اپنی تمام تر خون آشام سیاست کے باوجود ایک غلط اور ناکام سیاست دان تھا۔ جس کی شخصیت قومی سیاست کا ایک سیاہ باب ہے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی خفت اور جرم کے احساس میں جنرل یحییٰ خان کے کچھ فوجی جرنیل ساتھی باقی ماندہ پاکستان کے اقتدار کو ایک سازش کے تحت اصغر خان کو دینا چاہتے تھے۔ مگر فوجی جرنیلوں کی اکثریت نے ان کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ جرنیل ائیر مارشل اصغر خان کو اقتدار دے کر خود کو پاکستان کے عوام کے غیظ و غضب سے محفوظ خیال نہیں کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ائیر مارشل اصغر خان عوام میں انتہائی غیر مقبول انسان تھا۔ اتنا غیر مقبول تھا کہ اپنی اسمبلی کی نشست بھی نہیں جیت سکا تھا۔ لہٰذا کوئی لاجک نہیں بنتا تھا کہ اس شخص کو حکومت دے دی جائے۔ اس وقت ان تمام جرنیلوں نے وزیر اعظم بھٹو کو ہی حکومت دینے میں اپنی خیریت سمجھی تھی۔ مگر اندر

سے وہ وزیراعظم بھٹو کے اتنے ہی دشمن تھے جتنا کہ ائیر مارشل اصغر خان تھا۔ لہٰذا بھٹو صاحب کو اقتدار دینے کے فوراً بعد ان جرنیلوں نے اصغر خان کو اشارہ کر دیا کہ تم میدان میں ڈٹے رہو۔ ہم بہت جلد بھٹو حکومت کا تختہ الٹا کر تمہیں پاکستان کا صدر بنا دیں گے۔ ابھی پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کی کسی غلطی کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ فوجی سیاست دان بھٹو حکومت کے خاتمے کا مطالبہ کرنے لگ گیا تھا۔ اس شخص نے لاہور میں جلوس نکالا، جلوس ناصر باغ سے شروع ہوا۔ اصغر خان کے ہر جلوس میں جماعت اسلامی پیش پیش ہوا کرتی تھی۔ اس جلوس میں بھی جماعت اسلامی کے لوگ ہی پیش پیش تھے۔ خواجہ رفیق محض اپنے احتجاجی مزاج کے باعث اصغر خان کے جلوس میں شریک ہو گیا۔ یہ ایک مختصر سا جلوس تھا۔ جس جلوس سے وزیراعظم بھٹو کی حکومت کی صحت پر قطعی طور پر کچھ اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ اصغر خان کا جلوس مال روڈ اسمبلی چوک پر آ کر پاکستان پیپلز پارٹی کو گالیاں دے کر اور کچھ دھمکیاں دے کر ختم ہو گیا۔ خواجہ رفیق اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر اسمبلی کے دائیں جانب جانے والی سڑک سے کوپر روڈ کی طرف جا رہا تھا کہ وہاں پر ان کے کچھ کارکنوں کا کچھ لوگوں کے ساتھ جھگڑا ہو رہا تھا، ہاتھا پائی ہو رہی تھی۔ خواجہ ان کارکنوں کی آواز پر تانگے سے اتر کر ان کے قریب گیا، لڑنے والوں میں سے کسی نے گولی چلا دی جو سیدھی خواجہ صاحب کے سر میں لگی جو خواجہ صاحب کی موت اور شہادت کا باعث بن گئی۔ خواجہ رفیق کے ساتھ چونکہ میرا بیٹھنا اٹھنا تھا مجھے بھی دوسرے لوگوں کی طرح خواجہ رفیق کی موت کا بہت دکھ پہنچا تھا۔ مجھے اس قتل کے محرکات کا قطعی طور پر کچھ علم نہیں تھا۔ مجھے تو ایک سینئر سیاسی کارکن کے بلاوجہ قتل ہونے کا دکھ تھا۔

میں پاکستان پیپلز پارٹی کو کسی اعتبار سے بھی خواجہ کی موت کا ذمہ دار خیال نہیں کرتا تھا۔ میں نے ایک سیاسی ذہن رکھتے ہوئے سوچا کہ خواجہ صاحب کا قتل کسی طرح بھی پارٹی کے سر نہیں آنا چاہئے۔ مجھے اس وقت یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس قتل میں کن لوگوں کے خلاف پرچہ کرایا گیا ہے۔ میں نے اپنے چند سیاسی کارکنوں کے ناموں سے خواجہ صاحب کے قتل پر اظہارِ افسوس کا ایک مختصر سا بیان اپنے ذاتی نام کے ساتھ اخباروں کو ارسال کر دیا۔ میرے اس بیان کو ہمارے اخبار مساوات کے کچھ سینئر صحافیوں نے بہت پسند کیا تھا۔ انہوں نے اس بیان کو ایک اچھی روایت قرار دیا تھا۔ میرے اس تعزیتی بیان نے مجموعی طور پر پیپلز پارٹی کے بارے میں لوگوں پر ایک اچھا تاثر

چھوڑا تھا۔ میرے اس بیان کے آخر میں یہ جملے بھی شامل تھے کہ ان کے قاتلوں کو گرفتار کیا جانا چاہئے اور ان کو قرار واقعی سزا دینی چاہئے۔ خواجہ کے قتل کے الزام میں جب پرچہ درج کرایا گیا تو اس میں ان پر حملہ کرنے یا ان کے ساتھ جھگڑا کرنے والوں میں ایسے لڑکوں کے نام آئے جن کا تعلق افتخار تاری کے ساتھ تھا۔ وہ نام تاری گروپ کے ساتھ تعلق رکھنے والے نمایاں لڑکوں کے نام تھے۔ اب یہ خدا کی ذات جانتی ہے کہ ان کا تعلق اس قتل سے تھا یا نہیں تھا۔ مگر میرا احتجاجی تعزیتی بیان افتخار تاری اور اس کے ساتھیوں کو بہت گراں گزرا تھا۔ وہ لوگ پہلے بھی مجھے ناپسند کرتے تھے۔ اب تو ان کی ناپسندیدگی انتہا کو پہنچ گئی۔ اسی دوران وزیراعظم بھٹو لاہور گورنر ہاؤس تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے وعدے کے مطابق مجھے بلایا میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے ائیر مارشل اصغر خان کے خلاف مساوات میں بہت قطعے تحریر کئے تھے۔ ان قطعات میں سے ایک قطعہ خورشید حسن میر نے وزیراعظم کو ان کے دفتر جا کر سنایا۔ جس کو وزیراعظم بھٹو نے بہت پسند کیا۔ انہوں نے میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہی مجھے وہ قطعہ سنانے کا کہا۔

قطعے کا پس منظر یہ تھا کہ اصغر خان نے بیان دیا تھا کہ حکومت نے میرے سر کی پانچ ہزار روپیہ قیمت لگادی ہے۔ جو مجھے ماردے گا اس کو 5 ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ قطعہ ملاحظہ کریں۔

ہوائی خان

خود اپنے سر کی لگاتے ہیں قیمت پانچ ہزار
ہوائی خان کی یہ بات سننے والی ہے
کہا کسی نے تعجب ہے اتنی کم قیمت
جواب آیا کہ اندر سے سر جو خالی ہے

بھٹو صاحب قطعہ سن کر قہقہہ لگا کر ہنسے اور کہنے لگے۔ بہت خوب۔ اس کے ساتھ ہی مجھے انہوں نے پوچھا۔ لاہور شہر کا کیا حال ہے۔ میں نے ان کو کہا کہ ویسے تو شہر بالکل ٹھیک ہے مگر لاہور کو خواجہ رفیق کے قتل کا بہت افسوس ہے۔ بھٹو صاحب کہنے لگے کہ وہ تو کوئی اتنا بڑا آدمی نہیں تھا کہ جس کا سارا شہر افسوس کرتا۔ یہ لوگ تو کہتے ہیں ان کا اشارہ پنجاب کے حکمرانوں کی طرف تھا کہ وہ ایک معمولی آدمی تھا۔ میں نے کہا۔ وزیراعظم صاحب کیا عام آدمی کا قتل قتل نہیں ہوتا۔ میری

www.bhutto.org

اس بات پر بھٹو صاحب کا چہرہ کچھ غمزدہ سا ہو گیا۔انہوں نے مجھے پوچھا کہ خواجہ کس حلقے میں رہتا تھا۔ مجھے ان کے اس سوال کی گہرائی کا کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ اس علاقے کا پوچھنا چاہتے ہیں جہاں پر خواجہ رہتا تھا۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ افتخار تاری کے علاقے میں خواجہ رہتا تھا۔ان باتوں کے ساتھ ہی میری ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔وزیراعظم بھٹو کے جانے کے بعد میاں محمد اسلم آف بیڈن روڈ سے میری ملاقات ہوئی۔میاں صاحب مجھ پر بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تم لوگوں کو اپنا دشمن بناتے پھرتے ہو۔تم نے بھٹو صاحب کو کہا ہے کہ خواجہ رفیق کو تاری کے لڑکوں نے قتل کیا ہے۔ میں نے میاں صاحب کو کہا کہ میں نے ہرگز بھٹو صاحب کو ایسا نہیں کہا تھا۔ مجھ سے بھٹو صاحب نے خواجہ کے بارے میں یہ پوچھا تھا کہ وہ کس حلقے میں رہتے تھے۔ میں نے ان کو بتایا تھا کہ وہ تاری کے حلقے میں رہتے تھے۔میاں اسلم کہنے لگا کہ وہ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے بھٹو صاحب کو کہا ہے کہ ان لوگوں نے خواجہ پر حملہ کیا ہے۔ وہ تمہارے خلاف بڑے غصے میں ہیں ان سے بچ کر رہنا۔

میرا چونکہ ضمیر صاف تھا۔ مجھے ان لوگوں کا کچھ خوف نہیں تھا۔ میں اپنے معمول کے مطابق میاں عبدالستار نجم کے ساتھ اس کی گاڑی میں پرل کانٹی نینٹل ہوٹل سے نکلا۔رات کا وقت تھا۔ہم نے فیصلہ کیا کہ بھٹی ٹکہ شاپ مزنگ چونگی جا کر کھانا کھایا جائے۔ ہوٹل سے نکلتے وقت میں نے ایک گاڑی دیکھی جو لارنس روڈ کی طرف ہماری گاڑی سے آگے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اتفاق سے اس گاڑی کی طرف دیکھا۔ مجھے اس گاڑی میں کچھ جانے پہچانے لوگوں کے چہرے دکھائی دیئے۔ جب گاڑی ان کے قریب سے گزر گئی تو وہ دوبارہ ہمارے پیچھے چل پڑے مگر مجھے ان کے پیچھے آنے کا کوئی خیال نہ تھا۔

مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا

ہم لوگ مزنگ چونگی پہنچ کر میز کے ساتھ لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور کڑاہی گوشت تیار ہونے کا انتظار کرنے لگ گئے۔ میں اور میاں نجم آپس میں باتوں میں مصروف تھے کہ کسی نے یکدم پانی کا گلاس میرے منہ پر پھینک دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ چار آدمی مجھ پر پل پڑے۔انہوں نے مجھے بہت مارا۔ بڑی گالیاں دیں۔ان لوگوں نے مجھے بری طرح زخمی کر دیا۔ میرا چہرہ اور میرا

www.bhutto.org

سر لہولہان کر دیا۔ میں ان دنوں جوان تھا ان لوگوں کے قابو میں نہیں آ تا تھا۔ مار کھاتے کھاتے میں نے گوشت کاٹنے والے چھرے کو پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ بھاگ کر اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر چلے گئے۔ میں زخمی حالت میں مزنگ تھانے نجم کے ساتھ گیا۔ نامعلوم لوگوں کے خلاف پرچہ درج کرایا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ پرچہ میاں محمد اسلم آف بیڈن روڈ کے کہنے پر مجھ سے ختم کروا دیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ میاں اسلم گورنر کھر صاحب کے ایڈوائزر ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ تھا پاکستان پیپلز پارٹی کا اقتدار اور یہ تھا میری جدوجہد کا صلہ جو مجھ کو مل رہا تھا۔

موسم آیا تو نخلِ دار پہ میرے
سرِ منصور ہی کا بار آیا

واضح رہے کہ مجھ پر حملہ کرنے والے میاں افتخار تاری کے آدمی تھے جن کی کمان ہمارے دوست لقا بخاری کر رہے تھے۔

وزیر اعظم بھٹو کے ساتھ اچھے حالات میں گورنر ہاؤس میں ایک اور ملاقات

گورنر پنجاب ملک غلام مصطفیٰ کھر صاحب جو میرے ساتھ بلاوجہ ناراض تھے۔ وہ اور ان کے ساتھی میاں تاری اور ان کے سپیشل اسسٹنٹ شیخ جاوید الرحمٰن جو بلاوجہ میری جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے جوشِ انتقام کی تشفی کے لئے میری جگہ ایک اور شاعر کو شاعرِ عوام بنانے کی کوشش کی۔ جس شاعر کو وہ میری جگہ شاعرِ عوام بنانا چاہتے تھے وہ بھی پارٹی کا ہی ایک شاعر اور ہمدرد تھا۔ ان کا نام اعزاز احمد آذر تھا۔ اعزاز احمد آذر چونکہ شروع سے ہی سرکاری ملازم تھے وہ انتخابی جلسوں کی حد تک تو شاعری کیا کرتے تھے مگر پارٹی کے عملی طور پر سیاسی کارکن نہیں تھے۔ میرے وہ مداح تھے۔ میرا ان کے ساتھ کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں ان کا سینئر تھا وہ جونیئر تھے۔ یہ بات بھی میں ایک ادبی اصطلاح کے طور پر کہہ رہا ہوں۔ میں ایک انقلابی انسان ہوں۔ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ میری اعزاز احمد آذر کے ساتھ آج بھی وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔

گورنر ہاؤس لاہور میں گورنر کی جانب سے وزیر اعظم بھٹو کے اعزاز میں لاہور کے ورکروں کا اور وزراء کرام اور اسمبلی کے اراکین پر مشتمل ایک عشائیہ نما اکٹھ کیا گیا جس کو باقاعدہ جلسے کی شکل دے دی گئی۔ اس اکٹھ میں تلاوت کے بعد اسٹیج سیکرٹری نے اعلان کیا کہ اب شاعرِ عوام آپ کو اپنی

نظم سنائیں گے۔شاعرِ عوام میری جگہ کسی دوسرے کو پا کر وزیر اعظم بھٹو کو ان لوگوں کا ایسا مذاق پسند نہ آیا۔ انہوں نے بلند آواز سے کھر صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ گورنر صاحب یہ کون شاعرِ عوام ہے۔ ان کو جاوید الرحمٰن کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ غالباً انہوں نے نظم پڑھنا بند کروا دیا تھا۔ میں چونکہ خود اس جلسے میں مدعو نہیں تھا مجھے اس واقع کا وزیر اعظم بھٹو سے اور کچھ دوسرے لوگوں سے علم ہوا تھا۔ وزیر اعظم بھٹو نے مجھے گورنر ہاؤس بلایا۔ گورنر ہاؤس کے اوپر کی منزل پر انہوں نے اکیلے میرے ساتھ ملاقات کی۔ انہوں نے مجھے کہا۔ اقتدار کیا ملا ہے لوگوں کی گردنوں میں سریا آ گیا ہے۔ وہ اب انسان کو انسان بھی نہیں سمجھ رہے۔ ان کا اشارہ کھر صاحب کی طرف تھا۔ میں نے کہا کہ میں تو بس کھر صاحب کو اپنا ساتھی دوست سمجھتا ہوں۔ بھٹو صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ کل ان لوگوں نے کسی اور شاعر کو شاعرِ عوام بنا رکھا تھا۔ مجھے ان لوگوں کی اس حرکت پر بڑا دکھ ہوا تھا۔ تمہاری جدوجہد میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ میں نے گورنر کو حکم دیا کہ فوراً اسلم گورداسپوری کو مجھ سے ملوایا جائے۔ میں نے کہا کہ سر آپ نے مجھے عزت بخشی ہے۔ میرے لئے اتنا ہی بہت کافی ہے۔ اسی ملاقات میں وزیر اعظم بھٹو نے مجھے بڑی عجیب بات کہی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تم بھی اپنا دماغ ٹھکانے پر لاؤ۔ تم کہتے ہو کہ تمہیں ایمبیسڈر بنایا جائے۔ ایمبیسڈری کیا پیپلز پارٹی کا عہدہ ہے جو تمہیں دے دی جائے۔ میں نے کہا۔ وزیر اعظم صاحب میں اس کی پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں میں نے ہرگز ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا ہے۔ میں اس عہدے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ ملتان کے اشفاق احمد کو جب کوریا کا ایمبیسڈر بنایا گیا تھا تو میں نے محض جذباتی انداز میں میاں اسلم کو کہا تھا کہ مجھے بھی کسی سوشلسٹ ملک میں سفارت کاری کے لئے بھیج دیا جائے۔ یہ بات برائے بات ہی تھی۔ میرا مطالبہ ہرگز نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ سر میں نے کبھی آپ کو کوئی خط تحریر نہیں کیا کہ مجھے کوئی نوکری دی جائے۔ میں اسی طرح پارٹی کی ترجمانی کی ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہوں جس طرح میں اقتدار سے پہلے دیتا تھا۔ میں واحد پارٹی کارکن ہوں جو روزانہ پارٹی کے موقف اور آپ کی کارکردگی پر شعر کہتا ہوں اور مضمون لکھتا ہوں۔

پارٹی کے تمام لوگ حکومتی معاملات میں مصروف ہو گئے ہیں۔ میں جس مورچے پر پہلے ڈٹا ہوا تھا میں اسی پر آج بھی ڈٹا ہوا ہوں۔ وزیر اعظم کو میری باتوں سے خوشی ہوئی۔ فرمانے لگے میں کسی دوست کو فراموش نہیں کرتا آگے پیچھے ہو جانے والی بات کچھ اور ہے۔ میں نے ان کا شکریہ

ادا کیا اور یہ ملاقات اختتام پذیر ہوگئی۔ میں گورنر ہاؤس کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو نیچے افتخار تاری اپنے جیالوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اونچی آواز سے بولا کر آیاں ایں ساڈیاں چغلیاں، لا آیاں ایں ساڈیاں شکایتاں۔ میں نے اس کو کہا کہ تم لوگ اتنے اہم نہیں تھے کہ تمہاری باتیں کی جاتیں۔ اوپر جا کر وزیراعظم سے پوچھ لو۔ انہوں نے مجھے کیوں بلایا تھا۔

برہوں بکھیڑا سخت اویڑا، خویش قبیلہ لائم جیڑا

مارن ماں پیو ویر، تے ظالم لوگ شہر دے

شیخ صفدر علی مرحوم کی جگہ ضمنی انتخاب

شیخ صفدر علی مرحوم پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی اراکین میں سے ایک تھے۔ اس خصوصیت کے علاوہ وہ بھٹو صاحب کے چند ذاتی دوستوں میں سے ایک تھے۔ وہ سمن آباد کے علاقے سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ پارٹی کو ابھی اقتدار میں آئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی نشست پر ضمنی انتخاب کا معاملہ پیش آ گیا۔ مجھے اس حلقے کے تمام اہم پارٹی کارکنوں نے ضمنی الیکشن لڑنے کا مشورہ دیا۔ ویسے بھی اس حلقے میں مجھ سے زیادہ نمایاں اور کوئی دوسرا کارکن نہیں تھا۔ مگر پارٹی میں چونکہ ہر طبقے کا مافیا پیدا ہو چکا تھا۔ وہاں میرے جیسے غیر جانب دار اور صرف پارٹی کے وفادار انسان کو ٹکٹ کس طرح مل سکتا تھا۔ اس حلقے میں ایسے وکلاء بھی رہائش رکھتے تھے جو پارٹی کے ہمدرد تھے۔ ان وکلاء میں صرف میاں عبدالستار نجم ہی ایک ایسا سیاسی کارکن تھا جو پارٹی کے بنیادی کارکنوں میں سے تھا باقی تمام وکیل بھٹو صاحب کے انتخابی ریلے کے دوران دیکھنے میں آئے تھے۔ ان میں ایس۔ ایم۔ مسعود ایڈووکیٹ بھی تھے۔ ان کو ہم محبت سے شاہ صاحب کہا کرتے ہیں۔ شاہ صاحب میرے ہمسائے تھے اور میرے برابر کے فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔

میاں عبدالستار نجم نے لاہور ہائی کورٹ میں وکلاء کا اپنا ایک مافیا گروپ قائم کر رکھا تھا۔ اس گروپ کی کوشش ہوتی تھی کہ پارٹی کی حکومت کے ہر عہدے پر اپنے گروپ کے لوگوں کو تقرر کرایا جائے۔ وکلاء کے اس گروپ کی سربراہی شیخ جاوید الرحمٰن کیا کرتا تھا۔ ایس۔ ایم۔ مسعود کی اس وقت تمام اہمیت میاں عبدالستار نجم کے دوست ہونے اور وکلاء کے ان کے گروپ سے تعلق رکھنے

www.bhutto.org

سے تھی۔ پارٹی کے اقتدار کے کچھ عرصے بعد ان کو ٹریفک کا حادثہ پیش آ گیا۔ ہم تمام لوگ ویسے بھی شاہ صاحب سے محبت کرنے والے تھے مگر ان کے ساتھ حادثہ پیش آ جانے کی وجہ سے ہم ان کو اور بھی زیادہ عزیز جاننے لگ گئے تھے۔ میں اور چوہدری لیاقت حسین ایڈووکیٹ ہسپتال میں ان کی خبر گیری کو گئے تو شاہ صاحب نے کہا کہ اگر گورنر کھر میری مزاج پرسی کو آ جائے تو ہسپتال والے میرا زیادہ خیال کرنا شروع کر دیں گے۔ ہم دونوں شاہ جی کی صورت حال دیکھ کر بہت جذباتی ہو گئے۔ ہم وہاں سے سیدھے گورنر ہاؤس چلے گئے۔ شیخ جاوید الرحمٰن کو کہا کہ وہ گورنر صاحب کو اپنے وکیل بھائی کی تیمارداری کا کہیں۔ اس طرح کھر صاحب ہسپتال شاہ صاحب کی تیمارداری کو آئے۔ کھر صاحب نے شاہ صاحب کو سیکنڈری بورڈ کی لیگل ایڈوائزری دے دی۔ میں دوبارہ ملنے گیا تو ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ وہ اس لیگل ایڈوائزری سے اس قدر ممنون تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کھر صاحب نے ان پر احسانِ عظیم کر دیا ہے۔ شاہ صاحب علاج کے بعد روبہ صحت ہو گئے۔ پارٹی میں ضمنی انتخاب کا مرحلہ آ گیا۔ ضمنی انتخاب کے ٹکٹ کا فیصلہ وزیراعلیٰ پنجاب ملک غلام مصطفیٰ کھر کو کرنا تھا اور کھر صاحب کی تمام کمان شیخ جاوید الرحمٰن کے ہاتھ میں تھی اور جاوید الرحمٰن کا رابطہ میاں عبدالستار نجم کے ساتھ تھا۔ نجم اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل تھا۔ نجم کے کچھ اپنے ہی سیاسی تانے بانے تھے۔ ان میں صرف وکیل ہی اس کی ضرورت بن سکتے تھے۔ اس میں کوئی غیر وکیل فٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس حلقے کے ایم۔ این۔ اے شیخ محمد رشید نے بھٹو صاحب کو مجھے ٹکٹ دینے کی سفارش کی تھی۔ میں خود بھی ورکروں کا ایک وفد لے کر وزیراعظم ہاؤس گیا تھا۔ وزیراعظم کے ملٹری سیکرٹری کے ذریعے بھٹو صاحب سے رابطہ کیا گیا۔ بھٹو صاحب نے پیغام دیا کہ جا کر مصطفیٰ کھر کو ملو۔ اس سیٹ پر ہم دو ہی امیدوار تھے۔

میں نے ملک صاحب کے پی۔ اے سے رابطہ کیا۔ اس نے مجھے کہا۔ ملک صاحب دونوں امیدواروں کو وزیراعلیٰ ہاؤس بلائیں گے تب فیصلہ کیا جائے گا۔ میاں نجم اور جاوید الرحمٰن یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ٹکٹ مسعود شاہ کو دیا جائے گا۔ مگر میاں نجم اس قدر گہرا آدمی تھا کہ اس نے میرے ساتھ ٹکٹ کے بارے میں کوئی بات تک نہ کی۔ معاملہ چونکہ نجم کی وکلاء سیاست کا تھا ٹکٹ ایس۔ ایم۔ مسعود کو دے دیا گیا۔

ایس۔ ایم۔ مسعود کے بارے میں میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں

چند بہترین انسانوں میں سے ایک ثابت ہوئے ہیں جن کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ وہ بہت پڑھے لکھے انسان ہیں۔

میری لکھی ہی کوثر نیازی کے ہاتھ تھی

پنجاب میں جب ملک غلام مصطفیٰ کھر کی اور محمد حنیف رامے کی آپس کی اقتدار کی آویزش اور ایک دوسرے کے خلاف سازش جب بہت نمایاں نظر آنے لگ گئی تو خفیہ ایجنسیوں نے ان دونوں صاحبان کی چپقلش سے فائدہ اٹھانے کے لئے مولانا کوثر نیازی کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنانے کے لئے آگے بڑھانا شروع کر دیا۔ پارٹی کے اندر مرکز میں ایک مخصوص ٹولے نے بھٹو صاحب پر یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ یہ دونوں لوگ آپ کے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ کوثر نیازی ایک غیر جانبدار آدمی ہے۔ جس کا کوئی گروپ نہیں ہے یہ صرف آپ کی سیاست کرتا ہے۔ اس کو موقعہ دیا جانا چاہئے۔ ان باتوں کی بھنک کھر صاحب کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ کھر صاحب نے مولانا کو پنجاب میں نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ مولانا کی تقریر کا معاملہ ختم کر دیا گیا۔ نہ تو اس کو کسی ضمنی انتخاب میں تقریر کرنے کے لئے بلایا جاتا تھا اور نہ ہی پنجاب کی حکومت کے کسی معاملے میں مولانا کو شریک کیا جاتا تھا۔ مولانا بڑا گرگِ جہاں دیدہ تھا۔ بڑا سازشی ذہن کا چال باز اور مکار آدمی تھا۔ اس نے پنجاب میں اپنی رونمائی کا ایک دوسرا طریقہ نکالنے کی کوشش کی۔ وہ طریقہ شعر وشاعری اور مشاعرے کا طریقہ تھا۔ مولوی سمجھتا تھا کہ ملک غلام مصطفیٰ کھر اس میدان میں کورا ہے۔ لہٰذا اس میدان میں میرے مقابل نہیں آسکے گا۔ اس نے لاہور کے جشنِ بہاراں کے میلے کے موقعہ پر لارنس باغ کے اوپن ائیر تھیٹر میں سرکاری سطح پر مرکزی حکومت کی جانب سے ایک کل پاکستان مشاعرے کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔ یہ مشاعرہ مولانا کی اطلاعات کی منسٹری کی طرف سے کروایا گیا تھا۔ جس مشاعرے کی صدارت مولانا کوثر نیازی خود کر رہا تھا۔ مشاعرے میں فیضؔ، جوشؔ، فرازؔ، ظہیر کاشمیری، احمد ندیم قاسمی اور ان کی طرح کے تمام استاد شعراء کو شرکت کرنا تھی۔ ان کے علاوہ پاکستان کے دوسری صف کے تمام شعراء کو بلایا گیا تھا۔

اس مشاعرے کے دعوت نامے ہم لاہور کے شاعروں کو جب موصول ہوئے تو اس میں پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے شاعروں نے کوثر نیازی کی صدارت پر بڑی نکتہ چینی کی۔ ان

www.bhutto.org

نکتہ چینوں میں سرِ فہرست منیر نیازی تھا۔ میں چونکہ خود بھی ٹی ہاؤس میں بیٹھتا تھا۔ منیر نیازی اور دوسرے شاعروں کے ساتھ میری دوستی تھی۔ بلکہ بڑا جذباتی تعلق تھا۔ ان لوگوں نے مجھے پیپلز پارٹی کا اہم رکن خیال کر کے بڑا احتجاج کیا۔ مجھے کہا کہ میں بھٹو صاحب کو خط تحریر کروں کہ کوثر نیازی کو فیض، ظہیر کاشمیری اور جوش کی توہین نہیں کرنی چاہیۓ۔ مشاعرے کی صدارت ان بڑے بزرگ شاعروں سے کرانی چاہیۓ۔ منیر نیازی اور دوسرے شاعر سیاسی طور پر غیر عوامی قسم کے لوگ تھے۔ ان کی بس اپنی اَنا ہی تھی۔ مگر ان میں مردِ میداً ن ایک بھی نہیں تھا۔ میں چونکہ سیاسی طور پر ایک کمٹیڈ انسان تھا۔ میں نے ان کے احتجاج کو بڑی سنجیدگی سے لیتے ہوئے وزیرِ اعظم بھٹو کو خط تحریر کر دیا۔ وزیرِ اعظم بھٹو نے کوثر نیازی سے بات کی تو کوثر نیازی نے وزیرِ اعظم کو کہا کہ حضور اگر ان بزرگ شاعروں کو میری صدارت پر اعتراض نہیں ہے تو پیپلز پارٹی کے شاعر اسلم گورداسپوری کو کچھ اعتراض نہیں ہونا چاہیۓ۔ اسلم گورداسپوری میری ذاتی دشمنی میں مجھے بلیک میل کر رہا ہے، بدنام کر رہا ہے۔

بھٹو صاحب کے آفس سے مجھے انہی الفاظ پر مبنی خط آ گیا کہ اگر فیض کو اعتراض نہیں ہے تو تم کو اس قسم کے خط تحریر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جس رات مشاعرہ ہونا تھا مشاعرے سے پہلے ہم تمام شاعر پاک ٹی ہاؤس میں اکٹھے ہو گئے۔ وہاں سے ہی ہم سب کو مشاعرے میں جانا تھا۔

منیر نیازی اور کچھ دوسرے دوست کوثر نیازی کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کرتے رہے۔ کہتے رہے کہ ہم اپنی باری پر احتجاج کریں گے۔ ہم اس کی صدارت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم جوش صاحب سے مخاطب ہو کر یا فیض صاحب سے مخاطب ہو کر اپنا کلام سنائیں گے، وغیرہ۔ لہٰذا اس طرح کے باغیانہ قسم کے خیال سے لیس ہو کر ہم مشاعرے میں جا پہنچے۔ رات کا سہانہ سماں تھا۔ باغ کی فضا تھی۔ ہم تمام شاعر سرخوشی کے عالم میں تھے۔ نہ ہاتھ باگ پر تھا نہ پاؤں رکاب میں۔ اس عالم میں مجھے کلام سنانے کی دعوت دے دی گئی۔ مشاعرے کا تمام نظام مولانا کوثر نیازی نے جمعیت الطلباء کو دے رکھا تھا۔ تمام دائیں بازو کے نمایاں لوگ مشاعرے کے کرتا دھرتا بنے بیٹھے تھے۔ وہ مجھے ویسے ہی کافر خیال کرتے تھے۔ میں نے منیر نیازی کے پروگرام کے مطابق مائیک پر آتے ہی اعلان کر دیا کہ حضرات میری باری مشاعرے کا صدر فیض صاحب کو تصور فرمایا جائے۔

کوثر نیازی اپنے عہد کا راسپوٹین تھا

کوثر نیازی بڑا گھاگ قسم کا انسان تھا۔ بے حد خطرناک اور اندازوں سے زیادہ کینہ پرور تھا۔ بغض اور حسد اس کی فطرتِ ثانیہ تھے۔ وہ صحیح معنوں میں راسپوٹین تھا۔ اس نے مجھ سے بدلہ لینے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس کے انتقام کا طریقہ وہی گھسا پٹا پرانا دقیانوسی طریقہ تھا جو عام طور پر برصغیر کے مشاعروں میں شعراء کے دشمن اختیار کیا کرتے تھے۔ وہ طریقہ یہ ہوتا تھا کہ کچھ لوگ مشاعرے میں پھیل جایا کرتے تھے۔ کسی ایک شاعر کی باری پر ان میں سے ایک ایک کونے سے کھڑا ہو کر کہنا شروع کر دیتا تھا کہ ہم آپ کو سننا نہیں چاہتے۔ یعنی جس شاعر سے وہ کوئی انتقام لینا چاہتے تھے اس کو کہنا شروع کر دیتے تھے کہ نہیں سنیں گے۔ اس کے بعد دوسرا اٹھتا پھر تیسرا اٹھتا۔ اس کے بعد مجمع بھیڑ چال اختیار کر جاتا اور شاعر بے چارہ ہوٹ ہو کر گھر چلا جاتا۔

مولوی کا طریقہء واردات تو آزمودہ تھا۔ مگر یہاں شاعر کا معاملہ عام شاعروں سے مختلف تھا۔ جن شعراء کے خلاف یہ حرکت کی جاتی تھی وہ بے چارے صرف شاعر ہوتے تھے۔ یہاں اسلم گورداسپوری تھا شاعرِ عوام تھا اور سیاسی نظریاتی کارکن تھا۔ میں ان لوگوں میں سے کئی ایک کو جانتا تھا کہ وہ کون ہیں۔ میں نے مولانا کو کہا کہ یہ آپ کی سابقہ جماعت کے فرزندان جمیل ہیں۔ مہربانی فرما کر ان کو خاموش کرائیں۔ اس پر مولوی نے جلتی پر تیل ڈالنے کی کوشش کی۔ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا کہ شاعر سیاسی جلسے میں اور مشاعرے میں فرق ملحوظ رکھے۔

مولوی کا یہ فقرہ شورش کاروں کے حوصلے کو مزید بڑھاوا دینے کے مترادف تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ میری پسپائی کے درپے ہو گئے۔ میں نے وہاں پر موجود لوگوں سے درخواست کی۔ حضرات میں آپ کے لئے مارشل لاؤں سے لڑتا رہا ہوں۔ آپ میں پیپلز پارٹی کا کوئی ہمدرد نہیں جو میری مدد کر سکے۔ اس پر لوگ اپنی کرسیوں پر سے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ان لڑکوں کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ میرے ہمدرد زیادہ تھے۔ جمعیت کے طالب علم کم تھے۔ لوگوں کا شور ان پر چھا گیا۔ ایک پہلوان نما انسان نے بلند آواز سے کہا۔ پڑھو گورداسپوری میں دیکھتا ہوں کون شور کرتا ہے۔ میں نے لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ مشاعرہ پھر سے معمول پر آ گیا۔ ٹی۔ وی والوں نے ریکارڈنگ کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ مگر اس غیر متوقع صورت حال نے میرے اندر غم و غصے کا طوفان برپا کر

دیا۔ میں نے اصل غزل چھوڑ کر ایک بہت تند و تیز غزل سنانا شروع کر دی۔ وہ غزل مولوی نیازی کی بد معاشی کا مکمل جواب تھی۔ غزل ملاحظہ کریں۔۔

بس اسی بات پہ یاروں کو خفا رکھا ہے
اپنا انداز ذرا ان سے جدا رکھا ہے

ایک شعر میں نے مولانا کوثر نیازی کو مخاطب کر کے پڑھا۔ مولانا یہ آپ کے لئے ہے۔۔

رات نے اپنی حقیقت کو چھپانے کے لئے
اپنے دامن پہ ستاروں کو سجا رکھا ہے

یہ بڑا ذو معنی شعر تھا یعنی کوثر نیازی رات ہے جس نے اپنے باطن کی سیاہی کو چھپانے کے لئے فیض، جوش، ندیم، ظہیر اور فراز جیسے ستاروں کو اپنے گرد جمع کر رکھا ہے۔۔

لوگ انسان کو دامن سے جھٹک دیتے ہیں
ہم نے پتھر کو بھی سینے سے لگا رکھا ہے

یہ شعر ملاحظہ کریں۔۔

یہ جہاں خُلد سے بھی بڑھ کے حسیں ہے جس کو
شیخ نے حشر کا میدان بنا رکھا ہے

اس شعر نے تو مشاعرے میں قیامت برپا کر دی۔ لوگ کھڑے ہو کر داد دینے لگ گئے۔ کئی بار یہ شعر سنا گیا۔ یہ شعر حسب حال تھا۔ واقعاتی تھا۔ لوگوں کا آنکھوں دیکھا ماجرہ تھا۔ میرے ساتھ کئے جانے والے سلوک کا ترجمان تھا۔ اس شعر کے بعد اگلا شعر ایسا تھا جو میری پہچان بن گیا تھا۔ اس شعر پر فیض صاحب اور ظہیر کاشمیری صاحب نے برسرِ مشاعرہ بہ یک آواز کہا۔ کیا کہنے بہت خوب۔ فیض صاحب نے اپنی غنائی آواز میں کہا پھر پڑھو۔ شعر تھا۔۔

ان کو کیا خاک سزا دیں گے زمانے والے
جن کو احساس نے سولی پہ چڑھا رکھا ہے

یہی وہ شعر تھا جس شعر پر صوفی تبسم نے مجھے کہا تھا کہ تمہیں زندہ رکھنے کے لئے یہ ایک شعر ہی بہت کافی ہے۔ صوفی صاحب کی بات میں کچھ شک نہیں۔ میرے اس شعر نے ہی لوگوں میں میری شاعری کا تشخص قائم کیا تھا۔

www.bhutto.org

اس مشاعرے کے بعد عرصہ بعد فیض صاحب مجھے راولپنڈی کے فلش مین ہوٹل میں ایک دعوت پر ملے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ وہ شعر سناؤ۔ کوثر نیازی کے مشاعرے والا۔ میں نے ان کو یہ شعر سنایا۔ انہوں نے بڑا پسند کیا۔ اس غزل کا مقطع تھا۔

خیر مقدم کی جنوں خیز طلب نے اسلم
فاصلہ اور بھی منزل کا بڑھا رکھا ہے

یہ غزل تقریباً تمام کی تمام ہی کوثر نیازی پر طنز کے انداز کی تھی۔ مشاعرے میں جو صورتِ حال بن گئی تھی۔ اس صورتِ حال میں ایک سراپا آویزش کا اظہار تھی۔ مولانا کوثر نیازی نے مشاعرے کے بعد تحریری طور پر وزیراعظم سے شکایت کی کہ میں آپ کی حکومت کی گڈول کے لئے کام کر رہا ہوں۔ شاعروں اور دانش وروں کو حکومت کا ہمنوا بنا رہا ہوں۔ مگر اسلم گورداسپوری کو پارٹی کی عزت کا کچھ خیال نہیں۔ یہ نشے میں دھت ہو کر مشاعرے میں آ گیا۔ تمام مشاعرے کی فضا کو خراب کر دیا۔ جس کی وجہ سے پارٹی کی بہت بدنامی ہوئی، وغیرہ وغیرہ۔

پہلے تو اس نے آپ کو تحریری میری شکایت کی تھی۔ جب آپ نے اس کی شکایت کو قابلِ غور نہ سمجھا تو اس نے مشاعرے میں آ کر کمیونسٹ شاعروں کی حمایت میں میری مذمت کرنا شروع کر دی۔ مشاعرے میں غل مچانا شروع کر دیا۔ جس سے پارٹی کی سخت بدنامی ہوئی۔ یہ مشاعرہ کوثر نیازی کا مشاعرہ نہیں تھا یہ پیپلز پارٹی کا مشاعرہ تھا۔ یہ قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو کا مشاعرہ تھا۔ میں کوثر نیازی تو صرف آپ کا نمائندہ تھا۔

منیر نیازی کی دلچسپ بات

وزیراعظم بھٹو کو چونکہ یک طرفہ بات بتائی گئی تھی۔ مجھے اس بات کی وضاحت کا موقعہ ہی نہیں دیا گیا تھا۔ لہٰذا بھٹو صاحب ایک طویل عرصے تک میرے ساتھ ناراض رہے۔ وہ مجھے دیکھ کر آگے نکل جایا کرتے تھے۔ ان کی ناراضگی کا یہ ثبوت ہوتا تھا۔ وہ جس کسی سے ناراض ہوتے تھے۔ ایئرپورٹ پر اس کو دیکھ کر آگے چل دیتے تھے۔ ان کی ناراضگی کی وجہ سے میں حکومت کی ہر طرح کی سرگرمی سے علیحدہ ہو گیا۔ اس معاملے میں سب سے دلچسپ بات کرنے والی یہ ہے کہ منیر نیازی جس نے یہ اعلان کیا تھا کہ میں ملّاں نیازی کی صدارت کو کسی قیمت پر قبول نہیں

www.bhutto.org

کروں گا۔اس نے مشاعرے میں کسی قسم کا کوئی احتجاج نہ کیا۔ بلکہ انتہائی ادب اوراحترام کے ساتھ مولوی کوثر نیازی کو صاحب صدر کہہ کراپنا کلام سنانا شروع کردیا تھا۔منیر نیازی اس طرح کا ہاتھ میرے ساتھ پہلے بھی کرچکا تھا۔مگر میں اپنی بے وقوفی کی بناپراس کے قول وفعل کے بارے میں محتاط ہی نہیں ہوا تھا۔

اس واقعے سے پہلے جب پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت آگئی تو ریڈیواورٹیلیویژن سے پہلے مشاعرے کے دعوت نامے ہم شاعروں کو موصول ہوئے۔اس مشاعرے میں سلیم شاہد اور کچھ دوسرے شاعروں کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔منیر نیازی نے ان شاعروں کے احتجاج پراعلان کر دیا کہ وہ مشاعرے میں نہیں جائے گا۔

مجھے کہا کہ دعوت ناموں پر ہی ہم اپنا احتجاج تحریر کرکے دعوت نامے واپس ٹی۔وی والوں کو بھیج دیتے ہیں۔میں نے منیر نیازی کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے دعوت نامے کی پشت پرتحریر کر دیا کہ مندرجہ ذیل شاعروں کو مشاعرے میں بلایا جائے۔ان شاعروں کو اگر دعوت نامے ارسال نہ کیئے گئے اوران کو اگر مشاعرے میں شریک نہ کیا گیا تو میں مشاعرے میں شرکت نہیں کروں گا۔ہم لوگوں نے جدوجہد اس لئے کی تھی کہ زندگی کے ہر شعبے سے آمریت، رسم ورواج کو مٹایا جائے اوران میں عوامیت پیدا کی جائے۔اگر آپ ٹی۔وی کو پرانی نہج پر ہی چلائیں گے تو میں بہ حیثیت عوامی شاعراس وقت تک ٹی۔وی کے کسی پروگرام میں حصہ نہیں لوں گا۔جب تک کہ ٹی۔وی کے پروگرام کو عوامی نہ بنادیا جائے اوران لوگوں کو ٹی۔وی پر نہ بلایا جائے جن کو ماضی میں نہیں بلایا جاتا تھا۔

اس طرح ہم دونوں نے اپنے احتجاجی نوٹس کے ساتھ ٹیلیویژن کے دعوت ناموں کو واپس کردیا۔مگر جب مشاعرے کا دن آیا تو میں نے دیکھا کہ منیر نیازی مشاعرے میں اپنی غزل سنارہا تھا۔میں دوسرے دن جب پاک۔ٹی۔ہاؤس گیا تو ان تمام شاعروں نے منیر نیازی کی بدعہدی پر بڑے غم وغصے کا اظہار کیا۔کچھ دن تو منیر نیازی پاک ٹی ہاؤس کی طرف نہ آیا۔بالآخرایک شام اپنی مخصوص حالت میں پاک ٹی ہاؤس آیا۔

اتفاق سے میں ہی پاک ٹی۔ہاؤس کے باہر کھڑا تھا۔میں نے ان سے گلہ کیا کہ حضرت آپ نے یہ کیا حرکت کی تھی۔مجھ سے بائیکاٹ کرواکرخود مشاعرے میں چلے گئے۔ہمارے شاعر

www.bhutto.org

دوست آپ سے بے حد ناراض ہیں۔ منیر نیازی فرمانے لگا۔ اسلم گورداسپوری یہ گدھ ہیں، مقروح لوگ ہیں۔ ٹی۔ وی کے دعوت نامے کو واپس کرنے کے بعد میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ ان میں تو کوئی ایسا شاعر ہی نہیں ہے۔ جس کے لئے منیر نیازی احتجاج کرتا۔

میں نے کہا۔ خان صاحب وہ لوگ آپ کے ساتھ بہت ناراض ہیں۔ خان صاحب نے پنجابی میں کہا۔ اے سپ تے اے ٹھونویں مینوں ہمیشہ لڑدے ای رہندے نے۔ اتنے میں سلیم شاہد اور وہ دوسرے شاعر باہر آ گئے۔ پہلے ان کو سپ ٹھونویں کہہ رہا تھا۔ ان کو شاعر ہی نہیں مانتا تھا۔ اب ان کو کہہ رہا تھا کہ تم سب وڈے شاعر او۔ میں نے تمہارا احتجاج ان تک پہنچا دیا ہے۔ ہم نے مل کر ٹی۔ وی اسٹیشن پر قبضہ کرنا ہے۔ میں تمہاری نمائندگی کرنے گیا تھا، کر آیا ہوں۔ اب آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے۔

اقتدار میں کسی کا مختارِ کل ہونا غلط ہوتا ہے

اقتدار ایک ایسی نامراد اور بے برکت چیز ہے اس کا ایک ہی شخص کے پاس سمٹ کر رہ جانا بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ اقتدار میں جب ایک ہی شخص مختارِ کل بن جاتا ہے تو غرض مند خوشامدی مصاحبین لوگ اس شخص کو خدا بنا ڈالتے ہیں۔ اس کی مت مار دیتے ہیں۔ وہ شخص خوشامدیوں کے جھرمٹ میں رہتے ہوئے طاقت کے نشے میں بدمست ہو جاتا ہے۔

اقتدار کے نشے کی بدمستی میں نہ تو انصاف ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی عقل و ہوش کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ملوکیت اور آمریت کے اقتدار کے مقابلے میں جمہوریت اسی لئے زیادہ پھلی پھولی تھی کہ اس میں طاقت کو تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اقتدار کی طاقت کی تقسیم سے اقتدار میں اعتدال اور میانہ روی آ جاتی ہے۔ قدم قدم پر اقتدار کی چھان پھٹک سے کسی طرح کی بھی من مانی کا اندیشہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اقتدار زندگی کی باقی معمولات کی طرح کا ایک معمول اور اصول بن جاتا ہے۔

افسوس ملک غلام مصطفےٰ کھر کے اقتدار میں ایسا نہ ہو سکا۔ ان کا اقتدار ایک شخصی قسم کا تھانیدارانہ نوعیت کا اقتدار تھا۔ جس اقتدار کا دائرلو ہو نا زوال پذیر ہونا اٹل تھا اور یقینی تھا۔ ان کے اقتدار میں جٹ ازم کی وبا پھیل گئی۔ مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی میں جتنے بھی جٹ ممبران تھے ان کا ایک گروپ بنا لیا گیا۔ حکومت میں ہر مقام پر ان جٹ ممبران کو ترجیح دی جانے لگی۔ جس کی

www.bhutto.org

وجہ سے باقی ذاتوں کے ممبران اسمبلی کا خفا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ اس طریقے سے ممبران اسمبلی میں اور پارٹی کے اندر ایک خوامخواہ کی ٹسل پیدا کر دی گئی۔ جس کی ہر گز ضرورت نہیں تھی۔ یہ تو پیپلز پارٹی کی حکومت تھی جس میں ذات برادری کی کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہئے تھی۔ اسی ذات برادری کے بتوں کو ہی تو لوگوں نے 1970ء کے انتخابات میں پاش پاش کر کے پیپلز پارٹی کے گمنام اور چھوٹی چھوٹی برادریوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو منتخب کیا تھا۔ بہر صورت یہ ایک غیر سیاسی حرکت تھی جہالت تھی۔ جس کی وجہ سے بہت جلد پنجاب میں کھر کے خلاف ایک مضبوط مخالف دھڑا اسمبلی میں اور اسمبلی کے باہر متحد ہو گیا۔ اراکین اسمبلی وزیراعظم بھٹو کے پاس اپنی شکایات لے کر جانا شروع ہو گئے۔

انہوں نے صوبائی حکمران کے اس امتیازی سلوک کا وزیراعظم کے سامنے پردہ چاک کیا۔ اس کے علاوہ گورنر ہاؤس کی اس طرح کی کہانیاں سامنے آنے لگ گئیں جو کسی حکمران کی شہرت کے لئے نیک فال نہیں ہوا کرتیں۔ جس کی وجہ سے پنجاب کے لوگوں میں اور بالخصوص دانش ور طبقے میں کھر صاحب کا امیج بہت خراب ہونا شروع ہو گیا۔ کھر صاحب کے جٹ ہونے کی رعایت سے لوگوں نے کھر کو رنجیت سنگھ کہنا شروع کر دیا اور لوگ طرح طرح کی لطیفہ بازی کرنے لگ گئے۔ پنجاب میں کھر صاحب کے مقابلے میں وزارتِ اعلیٰ کا اصل مقابل حنیف رامے تھا۔ حنیف رامے خود کو ہر اعتبار سے کھر صاحب سے بہتر تصور کرتا تھا۔ وہ کھر کے مقابلے میں خود کو ایک عالم فاضل انسان خیال کرتا تھا اور خود کو اچھی شہرت کا حامل انسان تصور کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ بھٹو صاحب نے مصطفیٰ کھر کی محبت میں اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ لہٰذا رامے صاحب نے ملک غلام مصطفیٰ کھر کی حکمرانی کو بادل نخواستہ تسلیم کیا تھا اور یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

پہلے پہل تو حنیف رامے کھر صاحب کے بارے میں محتاط انداز میں باتیں کیا کرتا تھا مگر جب کھر صاحب کے اقتدار کی آمریت نے لوگوں کو ان کے خلاف کر دیا تھا۔ اس وقت وہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔

ملک غلام مصطفیٰ کھر کی بغاوت اور حنیف رامے کی آمد

سیاست یا قیادت کسی بھی ملک کی ہو یہ تنہا انسان کا کھیل نہیں ہوا کرتی۔ قومی سیاست میں

www.bhutto.org

ایک سیاست دان اور ایک لیڈر کے پاس جب تک ایک منظم سیاسی تنظیم نہ ہو وہ سیاست دان قومی سیاست کے تقاضے پورا نہیں کر سکتا۔ سیاست اور قیادت میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے وہ ایک قائد کے ساتھ اس کے چند انتہائی جاں نثار وفا شعار ساتھیوں کا ہونا ہوتی ہے۔ کوئی رہنما عوام میں کتنا ہی مقبول ہو۔ مگر اس کی مدد کے لئے کچھ خاص لوگوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

پوری دنیا کی تحقیق نے یہ بات ثابت کی ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحریک اسلام کی کامیابی میں ان کے چار ساتھیوں اور دوستوں اور پیروکاروں کا بہت اہم کردار تھا جو ہر مصیبت میں ہر مقام پر ان کے ساتھ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے رہے تھے۔ نہ تو کسی جنگ میں ان کے پاؤں میں لغزش آئی تھی اور نہ ہی کسی امتحان میں ان کے یقین وایمان میں کچھ کمی واقع ہوئی تھی۔ وہ زندہ تھے تو اپنے قائد کے لئے زندہ تھے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی کی اور کوئی خواہش نہیں تھی۔ خیر ان عظیم انسانوں کا مقام ومرتبہ تو بہت بلند ہے۔ ان کا مقصد بھی اعلیٰ اور ارفع تھا۔ مگر دنیا کے معاملات میں بھی ان کی مثال مشعلِ راہ ہے۔ دنیا کے جس سیاست دان کو اچھے دوست سیاست میں ملے وہ اپنی سیاست میں کامیاب ہوا ہے۔ ہمارے سامنے پنڈت نہرو کی مثال موجود ہے۔

پنڈت نہرو کو ہندوستان کی سیاست کو پروان چڑھانے کے لئے ایسے سیاست دان ساتھی مل گئے تھے۔ جو ہندوستان کی آزادی کی جنگ کے پہلی صف کے سپاہی تھے۔ بے حد بے لوث سیاسی کارکن تھے لوگ ان کو دیش بھگت خیال کرتے تھے۔ ایسے سیاسی کارکن تھے جنہوں نے خود کو ملک و قوم کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ بے حد سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں حکمرانوں کی سی شان وشوکت کی نمود ونمائش کا کچھ دخل نہیں تھا۔ وہ جو کچھ سوچتے تھے ملک وقوم کے لئے سوچتے تھے۔ جو کچھ کرنا چاہتے تھے ملک وقوم کے لئے کرنا چاہتے تھے۔ بے حد ڈیڈی کیٹ انسان تھے۔ قومی سیاست کو اپنا دھرم تصور کرتے تھے۔ نہ تو وہ جاگیردار بننا چاہتے تھے نہ سرمایہ دار بننے کی خواہش رکھتے تھے۔ ان کی ایک ہی خواہش تھی کہ لوگ ان کی عزت کریں ان سے پیار کریں۔ ہم نے دیکھا کہ ہندوستان آزادی کے بعد ایک ایسا ملک بن گیا جس کو لوگ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا ملک قرار دیتے ہیں اور جس کی جمہوریت اور جمہوری قیادت کا سلسلہ ایک تسلسل کے ساتھ چلتا چلا آ رہا ہے۔ جس میں کبھی کوئی خلا واقع نہیں ہوا۔

www.bhutto.org

پنڈت نہرو کے مقابلے میں قائداعظم کے ساتھ تمام جاگیردار، وڈیرے ان کے رفیقِ کار تھے۔ جو سیاست کو صرف اور صرف اقتدار کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ بڑے ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی سیاست کا نہ تو کوئی قومی نظریہ تھا اور نہ ہی کوئی سیاسی یا جمہوری مقصد ان کے پیش نظر تھا۔ وہ تمام کے تمام خود کو اس قوم کا حاکم خیال کرتے تھے۔ ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جو خود کو قوم کا خادم تصور کرتا۔ گویا یہ تمام کے تمام لیڈر تھے ان میں سیاسی کارکن کوئی بھی نہیں تھا۔

جس کی وجہ سے قائداعظم کو اپنی زندگی میں پاکستان کو ایک عوامی اور فلاحی ریاست بنانے میں وہ کامیابی نہ حاصل ہوسکی جو پنڈت نہرو کو حاصل ہوگئی تھی۔ قائد کی رحلت کے بعد تو یہ تمام وڈیرے پاکستان کے خود حکمران اور قائد بن گئے تھے۔ ان کی رحلت کے بعد تو پاکستان کو ایک جمہوری اور فلاحی ملک بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ پاکستان کی جاگیرداری کی سیاست تھی جس نے پاکستان کے ابتدائی ایام میں ہی فوج کے لئے سیاست میں آنے کا راستہ پیدا کر دیا تھا۔ اس لئے کہ کوئی بھی کمزور قوت کسی بڑی قوت کو اپنا تابع نہیں رکھ سکتی۔

قائداعظم کے بعد پاکستان کی سیاست میں ذوالفقار علی بھٹو ہی ایک ایسا قائد بن کر سیاست کے اُفق پر ابھر کر سامنے آئے تھے جن کو ہم قائدِ ثانی کہہ سکتے ہیں۔ یا جن کو پاکستان کا صحیح معنوں میں قومی رہنما کہا جا سکتا ہے۔ جس طریقے سے ہم نے پہلے کہا تھا کہ ہر قائد کے لئے چند مدبر ساتھیوں کا ہونا اشد ضروری ہوتا ہے۔ اچھے ساتھیوں کی ضرورت کا یہ اصول وزیراعظم بھٹو کی ذات کو بھی اسی طرح درپیش تھا جس طرح کہ بیان کیا گیا ہے۔ وزیراعظم بھٹو اپنی ذات میں خواہ کتنے بھی جینیس اور دانش ور تھے یا مدبر تھے یا معاملہ فہم تھے مگر وہ تنہا ملک و قوم کے معاملات کو حل کرنے کے مجاز نہیں ہوسکتے تھے۔ ہر اعتبار سے ان کو چند اچھے ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ سیاست میں ایک ٹیم ورک درکار ہوتا ہے جس کے بغیر کسی بھی لیڈر یا جمہوری حکمران کا کام مکمل نہیں ہوسکتا۔

کوئی انسان اکیلا خواہ کتنا بھی فعال اور متحرک ہو۔ اس کو اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے دوسرے لوگوں کو اپنی جدوجہد اور اپنے مشن میں شریک کرنا پڑتا ہے۔ ان کو اپنا راز دار بنانا پڑتا ہے۔ ان پر ہر طرح کا اعتماد کرنا ہوتا ہے۔ اب یہ کسی سیاست دان، قائد اور حکمران کے مقدر کی بات ہوتی ہے کہ اس کو اچھے لوگ اپنی معاونت کے لئے میسر آجائیں۔ اس میں جہاں مقدر کا عمل دخل ہوتا ہے وہاں ایک قائد کی اپنی مردم شناسی کا دخل بھی ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے لوگوں کو قابلِ

اعتبار خیال کرتا ہے۔

وزیراعظم بھٹو کے ساتھ مشکل یہ پیش آئی تھی کہ جب انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی بنائی تھی اس وقت کوئی بھی نامی گرامی صاحب حیثیت سیاست دان پیپلز پارٹی میں شامل نہیں ہوا تھا۔ تمام لوگ نوآموز اور نو واردانِ سیاست تھے۔ تقریباً تمام کے تمام ناتجربہ کار لوگ تھے۔ امورِ حکومت سے ناواقف تھے اور نہ ہی وہ کسی نوع کے بھی علم و دانش میں اپنی کوئی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی تمام تر پہچان ان کا تمام تعارف ان کا تمام نام و نمود صرف وزیراعظم بھٹو کی دوستی تھا اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ان میں کچھ تو اچھی شہرت بھی نہیں رکھتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے یہ دوست اور ساتھی ان کی ذاتی دوستی میں ان کے لئے سودمند اور فعال ثابت ہوتے ہوں۔ ان کے اعتماد پر پورے اترتے ہوں۔ مگر قومی معاملات اور امورِ مملکت کی مصلحتیں اور نزاکتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ذاتی دوستیاں اور ذاتی تعلقات کچھ اور ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہوسکتا کہ جو شخص ذاتی دوستی میں کارآمد ہو وہ سیاسی دوستی میں بھی کارآمد ثابت ہو جائے۔ یہ ممکن نہیں ہوسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ وزیراعظم بھٹو کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ ہر کام تو خود ان کی اپنی ذات نے سرانجام دینا ہے۔ حکومت کا ہر مسئلہ اور ہر معاملہ ان کی اپنی ذات نے طے کرنا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی ناتجربہ کاری سے ان کو کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ اگر یہ اصول ان کے من میں تھا تو یہ حکمرانی کے سائنسی اصولوں کے خلاف اصول تھا۔ اس لئے کہ اقتدار مٹی کے کھلونوں میں بھی جان ڈال دیا کرتا ہے۔ وہ تو چلتے پھرتے لوگ تھے۔

مجھے بے حد افسوس کے ساتھ تحریر کرنا پڑ رہا ہے کہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے معاملے میں جن کو انہوں نے اپنے اقتدار کے کلیدی عہدوں پر فائض کیا تھا وہ کچھ زیادہ خوش قسمت ثابت نہیں ہوئے تھے۔ ان کی دوستی کی گلیکسی کا ہر ستارہ شہاب ثاقب کی طرح ٹوٹ کر ان سے دور نکل جاتا تھا۔ اس اہم ترین مسئلے پر مجھے چونکہ اس وقت پنجاب کے ان کے دوستوں کے بارے میں بات کرنی ہے۔ پنجاب میں انہوں نے اپنے جس ساتھی کو یا جس دوست کو بھی پنجاب کا حکمران بنایا تھا۔ اس دوست سے ان کا اختلاف ضرور ہوا۔ نہ صرف اختلافات ہوئے بلکہ باتیں دشمنی کی انتہا کو پہنچ جاتی تھیں۔ میرے مشاہدے میں ان کی اس ذاتی دوستی کی نوازشات کا یہ پہلو بے حد کمزور تھا۔ ان کا ایک بھی ایسا جانشین نہیں تھا جس میں ان کی محبت اور ان کی قیادت کی تقلید میں

استحکام تھا۔ ان کا ہر جانشین ان کے خلاف بغاوت پر آمادہ نکلا۔ ان کے جانشین کا جب بھی ان کے ساتھ اختلاف ہوا۔ وہ ان کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے دشمنوں کے ساتھ مل گیا۔ خدا جانے ایسی کیا خرابی تھی ان کی دوستی کی نوازشات میں کہ ان کے جانشینوں اور دوستوں کا جب بھی ان کے ساتھ کچھ اختلاف ہوا۔ ان دوستوں اور جانشینوں کی بغاوت کے علاوہ درمیان کا اور کوئی راستہ ہی موجود نہیں رہتا تھا۔

اس معاملے کے بارے میں یا تو وزیر اعظم بھٹو کی ذات ہی کچھ انکشاف کر سکتی تھی یا ان کے جانشین بتا سکتے تھے کہ اصل ماجرہ کیا تھا۔ حکمرانوں کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اختلاف ہو جایا کرتے ہیں۔ دوستوں کے دوستوں کے ساتھ اختلافات ہو جایا کرتے ہیں۔ مگر اختلافات کی یہ کیسی نوعیات تھیں کہ نہ دوستی کا کچھ بھرم باقی رکھا جاتا تھا، نہ کچھ آنکھوں کی شرم ہوتی تھی، نہ کچھ لحاظ ہوتا تھا، نہ گئے دنوں کی یادوں کا کچھ احساس ہوتا تھا، نہ کسی نوازش کا کچھ پاس ہوتا تھا، نہ کسی مہربانی کا کوئی خیال باقی رہتا تھا۔ ان کا ہر جانشین ان کے خلاف شمشیر برہنہ بن جاتا تھا۔

یہ وہ تاریخی خلا تھا جو ساتھیوں کے معاملے میں دنیا کی بڑی شخصیتوں کی زندگی میں عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتا جو وزیر اعظم بھٹو کی سیاسی زندگی میں دیکھنے میں آیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ ان کی زندگی کو سب سے زیادہ نقصان اس خلا نے ہی پہنچایا تھا۔ پاکستان کے نامور دانشور شاعر بابا ظہیر کاشمیری مجھے کہا کرتے تھے اسلم گورداسپوری تیرے لیڈر کے پیڑ میں برکت کیوں نہیں ہے۔ کیا وہ ایک بھی قابلِ اعتماد ساتھی پیدا نہیں کر سکا۔ بابا کی اس بات کا میرے پاس کچھ جواب نہیں ہوتا تھا۔

بات ملک غلام مصطفےٰ کھر کے اقتدار سے شروع کی گئی تھی۔ یہ بتانے کی کچھ ضرورت نہیں کہ کھر صاحب کا بھٹو صاحب کے ساتھ کیا تعلق تھا یا کیسی دوستی تھی۔ میں چونکہ ان کی دوستی کو ان کے تعلقات کو بہت قریب سے دیکھنے والوں میں شامل تھا۔ میرے خیال میں یہ کچھ اس طرح کی دوستی تھی جس میں کبھی اس بات کا شائبہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان کے درمیان کبھی کوئی رخنہ آ جائے گا یا کبھی کوئی اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ یہ دوستی بھی اور استاد شاگرد والا معاملہ بھی تھا۔ بھٹو صاحب کے ساتھ جتنی مشاورت کھر صاحب کو حاصل تھی اتنی اور کسی کو حاصل نہیں تھی۔ میں نے اقتدار سے پہلے قومی سیاست میں بھٹو صاحب کو کھر صاحب کو ایسا کوئی ٹاسک کبھی دیتے نہیں دیکھا تھا جس

میں کھر صاحب کو کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑے یا کسی امتحان کا سامنا ہو۔ وہ کھر صاحب کو ہمیشہ اپنی پشت پر رکھتے تھے اور ہر معاملے میں خود کو آگے رکھتے تھے۔ وہ کھر صاحب پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ جس دن کھر صاحب کا بھٹو صاحب سے اختلاف ہوا اس دن سے آج تک سیاست سے میرا ایمان ہی اٹھ چکا ہے۔

کھر صاحب کی بغاوت کے بعد حنیف رامے کی بغاوت سے تو مجھے سیاست سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وزیر اعظم بھٹو کے رویے میں کوئی ایسی انتہا پسندی ہو جس کو اس کے ساتھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ان کا اس قدر دشمنِ ارباب وفا ہونا سمجھ سے باہر ہے۔ یہاں پتہ چلتا ہے کہ کھر صاحب اور رامے صاحب کی سیاست کا مدار بھٹو صاحب کی ذات سے وابستہ نہیں تھا وہ کسی اور قوت کے ہاتھ میں تھا۔ کسی ایسی قوت کے ہاتھ میں تھا جو بھٹو صاحب کو اقتدار سے محروم کرنا چاہتی تھی اور رفتہ رفتہ ان کی جان کی دشمن بن گئی تھی۔ میں نے حنیف رامے صاحب سے یہ سوال کیا تھا کہ آپ کا اختلاف اس قدر سیاسی دشمنی میں کیونکر تبدیل ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنی خاص مسکراہٹ سے بتایا تھا کہ جس طرح بھٹو صاحب سے بے شمار کام ایسے کروائے گئے تھے جو بعد میں ان کے خلاف ثابت ہوئے تھے اسی طرح ہم سے کچھ ایسے کام کروائے گئے تھے جو ہمارے بھی خلاف تھے اور بھٹو صاحب کے بھی خلاف تھے۔ جب میں نے مرحوم سے یہ سوال کیا کہ یہ تمام کام کروانے والا کون تھا تو انہوں نے گہری سوچ کے بعد کچھ بھی بتانے سے گریز کرتے ہوئے کہا کہ ''مقدر''۔

یہ بات چیت چونکہ رامے صاحب کے ساتھ ایک سیمینار میں اسٹیج پر بیٹھے ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے زیادہ تفصیل سے بات نہ ہو سکی تھی۔ بعد میں ان کی زندگی نے وفا ہی نہ کی کہ ان سے تاریخ کے ان پر اسرار اوراق کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو سکتی۔

کھر صاحب کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ پتہ بھی ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہلتا تھا۔ پنجاب پر ان کا مکمل قبضہ تھا۔ پارٹی پر بھی ان کو مکمل تسلط حاصل تھا۔ وہ اقتدار کے اور پیپلز پارٹی کے تمام سیاہ سفید کے مالک تھے۔ وہ جس کو چاہتے تھے عزت بخشتے تھے جس کو چاہتے تھے ذلیل کرتے تھے۔ ان کے اقتدار کی روش میں ایک جاگیردارانہ قسم کی غنڈہ گردی تھی۔ طاقت کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ ان کے اقتدار میں کسی دانش مندی اور دانائی کو کچھ دخل نہیں تھا اور نہ ہی ان کے حلقہء احباب

میں کوئی ایسا دانش مند تھا جو ان کی ذات کی اور ان کے اقتدار کی اس کمی کو پورا کر سکتا۔ ان کی کیبنٹ میں عام درجے کے لوگ تھے۔ جن کے خاندانوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی وزیر بن جائیں گے۔ ان کے لئے اقتدار ایک خواب کی طرح تھا۔ گویا وہ حسن بن صبا کی جنت میں داخل ہو گئے تھے وہاں سے باہر جانے کا یا نکلنے کا وہ تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ میں چونکہ ان لوگوں کے بہت قریب تھا ان کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنے والوں میں سے تھا۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر ہو یا اس کے تمام ساتھی وزراء وہ اپنے اقتدار کو دائم خیال کرتے تھے۔

قذافی سٹیڈیم کا جلسہ اور تاری فورس کی طاقت کا مظاہرہ

لاہور کا یہ جلسہ وزیر اعظم بھٹو کے استقبال کے لئے خصوصی طور پر قذافی سٹیڈیم میں منعقد کیا گیا تھا۔ وزیر اعظم بھٹو نے لوگوں کی شکایات کی وجہ سے جو کھر کے بارے میں ان سے کی جاتی تھیں۔ اس جلسے میں کھر صاحب کو نظر انداز کرتے ہوئے حنیف رامے کو جو کھر صاحب کے سینئر منسٹر تھے جلسے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ اس جلسے کا تمام انتظام حنیف رامے کے پاس تھا۔ ظاہر تھا کہ کھر صاحب اور ان کے حواری اپنی اس بے عزتی کو اور پسپائی کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہو سکتے تھے۔

وہ تمام کے تمام غیر سیاسی لوگ تھے ان کا اظہار ناراضگی کا طریقہ بھی غیر سیاسی ہی تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس جلسے کے انتظام کو درہم برہم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ افتخار تاری ہاتھ میں پستول تانے اپنے لڑکوں کو جلسہ کو اجاڑنے کے احکامات دے رہا تھا۔ میں نے اپنی معمول کی بے وقوفی کے مطابق تاری کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ آپ لوگوں کے اپنے وزیر اعظم کا جلسہ ہے کچھ تو خیال کرو۔ تاری نے انتہائی غنڈہ گردی کے انداز میں مجھے کہا۔ جا اوئے وڈیا شاعرا چلا جا ایتھوں گولی ماردیاں گا۔ مجھے رامے صاحب کا ایک ورکر بازو پکڑ کر تاری سے دور لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد رامے صاحب نے مجھے بلوا بھیجا۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ ایڈمنسٹریشن پوری طرح الرٹ ہے۔ یہ لوگ کچھ نہیں کرسکیں گے۔ تم ان کے قریب مت جاؤ۔ ان سے کوئی بات نہ کرو۔ تم انسان ہو یہ حیوان ہیں۔ ابھی رامے صاحب میرے ساتھ باتیں ہی کر رہے تھے کہ اسٹیڈیم کی سیڑھیوں میں گولی چلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر کے لئے جلسے کا ماحول

بے حد خراب بن گیا۔ میں نے راے صاحب کے ہاتھ سے مائیک پکڑ کر نعرے لگوانے شروع کر دیئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد لوگ اپنی اپنی جگہ پر دوبارہ بیٹھ گئے۔ میں نے یہ نعروں کا سلسلہ کافی دیر تک جاری رکھا۔ انتظامیہ نے جلسے کے ماحول پر پوری طرح قابو پا لیا اور اسی دوران بھٹو صاحب جلسہ گاہ میں تشریف لے آئے۔ ان کی تقریر کے ساتھ ہی جلسے کا ماحول تبدیل ہو گیا۔ جلسے کے بعد پتہ چلا کہ ایک کارکن کو گولی مار دی گئی تھی۔ جلسے کے اس واقعے کے بعد کھر صاحب اور راے صاحب کے اقتدار کی جنگ میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ کھر صاحب اور راے صاحب کے اقتدار کی چپقلش تو ایک سیاسی چپقلش تھی جو شخصی اقتدار کے ماحول میں ہمیشہ پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ مگر بھٹو صاحب کے اس جلسے کو ناکام بنانے کی سازش خفیہ اداروں کی سازش تھی جس کے لئے آلہء کار کھر صاحب کے جیالے تاری وغیرہ بنے ہوئے تھے۔

وزیراعظم بھٹو کے اقتدار کی یہ شہرت پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اُس نے تو عارضی طور پر بھٹو صاحب کو اقتدار دے کر اپنی جان بچائی تھی۔ وہ وزیراعظم بھٹو کے اقتدار کو اس طریقے سے کامیاب ہوتا ہرگز نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وزیراعظم بھٹو ان کے دستِ نگر رہ کر حکومت چلائے گا۔ مگر وزیراعظم بھٹو اپنی ذات میں وہ شہباز تھا جس کی اڑان اسٹیبلشمنٹ کی سوچوں سے بہت بلند تھی۔ ان کی پرواز خفیہ ایجنسیوں کی دسترس سے باہر ہو گئی تھی۔ خفیہ ایجنسیاں وزیراعظم بھٹو کے پر باندھنا چاہتی تھیں۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کے علاوہ خود امریکہ بہادر بھی ایک پسماندہ ملک کے حکمران کو اتنا بلند پرواز کرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس طریقے سے وزیراعظم بھٹو سٹیبلشمنٹ اور امریکہ کے مشترکہ دشمن قرار پا گئے۔ سیاست میں کسی حکمران کو ناکام بنانے کا آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک کے اس کے بااعتماد ساتھیوں کو اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا جائے۔ اس کے وفادار دوستوں کو اس کے خلاف یا اس کے سامنے یا اس کے مقابلے میں کھڑا کر دیا جائے۔ یہ حربہ اور یہ نسخہ ایک تیر بہ ہدف نسخہ ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی حکمران خواہ کتنا بھی مضبوط ہو۔ مگر جب اس کے دوست اس کے ساتھ غداری کرتے ہیں تو اس کی شخصیت کا تمام سحر ہوا ہو جاتا ہے۔ اس کے تشخص کا بت پاش پاش ہو جاتا ہے۔ لوگ جس شخص کے امیج اور تصور کو اپنے خوابوں کا دیوتا بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے تصورات کے خواب بکھر بکھر جاتے ہیں۔ ان کی عقیدت میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن کا اپنے آئیڈیل سے یقین اٹھ جاتا ہے۔

www.bhutto.org

بڑے انسانوں کی دشمن قوتوں کی سازش ہوتی ہے کہ لوگوں کے ذہنوں سے اس انسان کا طلسم توڑا جائے جن کو لوگ نا قابلِ شکست تصور کرنے لگ جاتے ہیں جن کو لوگ نا قابلِ چیلنج خیال کرتے ہیں اور جب کسی بڑی شخصیت کو چیلنج بھی اس کے اپنے ہی پیدا کردہ بونے کرتے ہیں تو اس طرح کا چیلنج اس شخصیت کے لئے بے حد پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔

یہ دنیا کا بدترین انتقام ہے جو کسی حکمران سے یا کسی انسان سے لیا جاتا ہے۔ دنیا کا ہر حکمران اپنے دشمنوں کا آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے۔ مگر اپنے دوستوں کی غداری کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان کے سامنے وہ بے بس ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ان کے حملے کے سدِ باب کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو ان کو دوست سمجھ کر ان کے ساتھ بغلگیر ہو رہا ہوتا ہے۔ اس کی محبت کی یہ وارفتگی اس کے غدار دوستوں کے لئے اس کے پہلو میں چھرا گھونپنے کے لئے بہت آسانی پیدا کر دیتی ہے۔ دوستوں کی غداری پر موت سے پہلے ہر بڑے انسانوں کے منہ سے بس ایک ہی ٹوٹا پھوٹا جملہ نکلتا ہے۔ (اٹ۔ٹو۔بروٹ) ''تم بھی بروٹس''۔

اٹ۔ٹو۔بروٹ

حکمرانوں کی سیاست میں اس نوع کی محسن کشی اور احسان فراموشی کا نقشہ ولیم شیکسپیئر نے ''سیزر'' کے قتل پر جس انداز میں کھینچا ہے جس کے تین حرف میں نے پیچھے تحریر کئے ہیں وہ قیامت تک انسانوں کی سبق آموزی کے لئے کافی ہیں۔ ان تین ادھورے لفظوں میں معنویت کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ اٹ۔ٹو۔بروکا پس منظر یہ تھا کہ قدیم روما کے حکمران سیزر کے خلاف اس کے دو درباری اس کے ایک انتہائی یارِ غار بروٹس کے ساتھ مل کر اس کے قتل کی سازش کرتے ہیں تاکہ اقتدار پر قبضہ کیا جائے۔

سیزر کے قاتل طے کرتے ہیں کہ ہم سب سیزر کے قتل کے برابر میں شریک ہوں گے۔ تینوں باری باری سیزر کو چھرا گھونپیں گے۔ سازش کے اسی معاہدے کے مطابق سب سے پہلے کاشکا سیزر کے سینے پر چھرے کا وار کرتا ہے۔ اس کے بعد کاشیس اپنا خنجر سیزر کے کلیجے میں اتار دیتا ہے۔ ان دونوں کے بعد معاہدے کے مطابق سیزر کا دوست بروٹس بھی سیزر کے پہلو میں اپنا چھرا گھونپتا ہے۔ وہ سیزر جو پہلے دو قاتلوں کے خنجروں کے وار پر خاموش تھا۔ وہ اپنے دوست

بروٹس کے خنجر کے وار پر خاموش نہ رہ سکا۔ قاتلوں کے وار اس پر اس قدر کاری پڑ چکے تھے کہ وہ پوری طرح اپنے الفاظ ادا کرنے کی سکت نہ رکھتا تھا۔ وہ اپنے دوست بروٹس کی سازش کی ذلالت پر خاموش نہ رہ سکا۔ اس کو اپنے قتل سے زیادہ بروٹس کی بے وفائی کا دکھ تھا۔ جس کے بارے میں وہ بروٹس کو صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ تم بھی بروٹس۔ محسن کشی کی سیاست میں یہ تین حرف ایک طرح کی ضرب المثل بن چکے ہیں۔ ان کے بعد اور کچھ کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ یعنی جس بات کی آپ توقع ہی نہ رکھتے ہوں وہ بات ہو جائے۔ تو یہ بات بڑی بدقسمتی ہوتی ہے۔ بات ملک غلام مصطفیٰ کھر کے پنجاب کے اقتدار کی کی جا رہی تھی۔ کھر صاحب کے اقتدار کے زمانے میں وزیر اعظم بھٹو اپنی کارکردگی کی بنا پر ایک ایسا آئیڈیل قسم کا رہنما حکمران بن گیا تھا جس کا کوئی بھی مقابل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پاکستان کی حزبِ اختلاف اصغر خان وغیرہ وزیر اعظم بھٹو کی شخصیت کے سامنے زیرو ہو چکے تھے۔ اس وقت پاکستان کے اندر کی اور باہر کی خفیہ طاقتوں نے بھٹو کے مقابل کسی کو کھڑا کرنے یا ان کے مدِ مقابل کسی کو لانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ تمام خفیہ طاقتیں ایسے انسان کو بھٹو کے سامنے لانا چاہتی تھیں جو لوگوں کو حیرت زدہ کر دے۔ جس سے بھٹو صاحب کی شخصیت کا طلسم پاش پاش ہو جائے۔ اقتدار کی تاریخی بدنصیبی میں ایسا شخص ہمیشہ برسرِ اقتدار حکمران کا کوئی قریبی دوست ہی ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا ان تمام خفیہ طاقتوں نے ملک غلام مصطفیٰ کھر کی ذات پر اپنا جادو چلانا شروع کر دیا۔ میں نے پیچھے پہلے بھی تحریر کیا تھا کہ بھٹو صاحب کے اقتدار کا معاملہ بھی ملک مصطفیٰ کھر نے ہی خفیہ قوتوں کے ساتھ اور جرنیلوں کے ساتھ طے کیا تھا۔ اس طریقے سے فوجی جرنیل کھر کو اپنا نمائندہ خیال کرتے تھے۔

اس کے علاوہ کچھ امریکن بھی کھر صاحب کو اپنی مخصوص سیاست کے لئے پسند کرتے تھے۔ امریکن سفیر تو ان دنوں کھر صاحب کے ساتھ اکثر شکار پر جایا کرتا تھا۔ خود ملک غلام مصطفیٰ کھر بھی پاکستان میں ان دو بڑی قوتوں کو ہی طاقت کا اور پاکستان کی حکمرانی کا سرچشمہ خیال کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی پنجاب کی حکمرانی کو ناگزیر تصور کرنے لگ گئے تھے۔ وہ یہ تصور ہی نہیں کرتے تھے کہ ان کی حکمرانی میں کوئی مداخلت کرے۔ یا ان کو اقتدار سے علیحدہ کرنے کا سوچ سکے۔ دوسری جانب وزیر اعظم بھٹو کی ذات پر مختلف اطراف سے بے حد دباؤ بڑھ چکا تھا کہ کھر کی بادشاہت کو ختم کر کے پنجاب میں کسی لبرل انسان کو وزیر اعلیٰ بنایا جائے۔ تا کہ پنجاب کی حکمرانی کی

www.bhutto.org

سیاست میں اعتدال پیدا کیا جائے اور کھر صاحب کے ایک مخصوص اقتدار پرست ٹولے سے لوگوں کی جان چھڑائی جائے۔ حکومت کے اندر حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ کھر صاحب کو مزید اقتدار پر فائض رکھنا سیاسی دانش مندی کے خلاف ہو گیا تھا، مگر کھر صاحب اس طرح کی کسی بھی وجہ جواز کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کے ساتھیوں کو اقتدار سے باہر نکلنا اپنی موت دیکھائی دیتی تھی۔ ان کا بھی کھر صاحب پر دباؤ تھا کہ کھر صاحب بھٹو صاحب کو مجبور کریں کہ وہ پنجاب میں کسی قسم کی حکومتی تبدیلی پیدا نہ کریں۔ اس کے علاوہ بے شمار خفیہ ایجنسیوں کے لوگ کھر صاحب کا گھیراؤ کئے ہوئے ہوں گے۔ لہٰذا کھر صاحب کے کانوں میں اپنے اقتدار کے حلقے کے ہر شخص کی ایک آواز پڑ رہی تھی کہ مقابلہ کیا جائے۔ ڈٹ جایا جائے۔ بھٹو صاحب کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس طرح اقتدار کی یہ رسہ کشی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ ان حالات میں خفیہ قوتوں نے کھر صاحب کے دل و دماغ کو اپنا یرغمال بنالیا۔ ان قوتوں نے کھر صاحب کو رفتہ رفتہ بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ انہوں نے شاید یہی کہا ہوگا کہ بھٹو صاحب کو بھی تو انہوں نے ہی وزیر اعظم بنایا تھا۔ وہ کیا کھر صاحب کو وزیر اعظم نہیں بنا سکتے۔ یقیناً ان خفیہ قوتوں نے کھر صاحب کو عندیہ دیا ہوگا کہ آپ قدم بڑھائیں باقی کام وہ خود سرانجام دیں گے۔

لاہور میں پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس

دنیا کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ پاکستان جیسا پسماندہ غیر ترقی یافتہ غریب چھوٹا ملک بھی کبھی پورے عالمِ اسلام کے حکمرانوں کا میزبان بن سکے گا۔ بادشاہوں اور سلطانوں کو پاکستان کی سرزمین پر بلا کر تمام عالمِ اسلام کے سربراہوں کی صف میں کھڑا کر دے گا۔
یہ معجزہ یہ کرشمہ اور یہ غیر معمولی کارنامہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو جیسی غیر معمولی شخصیت کی حامل قیادت ہی سرانجام دے سکتی تھی۔ بلاشبہ وزیر اعظم اپنی خارجہ پالیسی کے شعبے میں ایک جادوگر انسان تھے۔ خارجہ معاملات کو طے پانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ کاش کہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں بھی ان کو اتنی ہی کامیابی حاصل ہوتی جتنی کامیابی ان کو خارجی معاملات میں حاصل ہوا کرتی تھی۔
عالمِ اسلام کے کچھ جدید ممالک کی قیادتوں اور حکمرانوں کو چھوڑ کر باقی تمام ممالک میں

موروثی اقتدار کے حامل سربراہ موجود تھے۔ان میں شہنشاہ بھی تھے۔امیر بھی تھے۔سلطان بھی تھے اورفوجی جرنیل بھی تھے۔یہ تمام موروثی اقتدار کی حامل قیادتیں اپنے پرسنلٹی کلٹ میں انتہائی بے لچک بادشاہتیں تھیں۔کسی دوسرے حکمران کو خاطر میں ہی نہیں لانے والی تھیں۔ان اسلامی ممالک کے آپس کے اختلافات اس قدر زیادہ تھے کہ ممکن ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ کسی بھی مقام پر ایک ساتھ بیٹھنے کے لئے تیار ہوں یا آمادہ ہوں۔

ان سربراہانِ اسلام کو ایک جگہ اکٹھا کرنا اور اکٹھا بٹھانا میر تقی میر کے معشوقِ آہوصفت کو بس میں کرنے والی بات تھی۔بقول میر ؎

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونا مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے اس کو رام کیا

میر کے معشوق میں اور عرب حکمرانوں میں بس اتنا فرق تھا کہ وہ آہوئے رم خوردہ تھا۔ذرا سی آہٹ پر بھڑک اٹھتا تھا۔مگر یہ حکمران یہ شیخ وشیوخ اپنی مطلق العنانی کے انا خوردہ تھے۔ان کا تمام مشرق مغرب شمال جنوب ان کی اپنی ذات تھی۔ان کی قطار بندی کرنا ان کی صف بندی کرنا ان کو ایک جگہ بٹھانا اگر ناممکن نہیں تھا تو مشکل ضرور تھا۔یہ ذوالفقار علی بھٹو کا ہی کمال تھا کہ انہوں نے ناصرف ان تمام عالم پناہوں کو ایک صف میں کھڑا کیا بلکہ ان تمام کے تمام نے پاکستان کے وزیراعظم کو اپنا متفقہ رہنما منتخب کرلیا۔اپنا چیئر مین بنالیا۔

بقول مرزا غالب

دیکھ اے ساکنانِ خطہء پاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

مجھے مرزا غالب کی عالم آرائی کے معنی وزیراعظم بھٹو کی عالمی سربراہی کانفرنس کے چیئر مین اور میزبان بننے پر ہی سمجھ میں آئے تھے۔یوں لگتا ہے کہ مرزا غالب نے خطہء پاک کی تقریب استعمال کر کے یہ شعر ذوالفقار علی بھٹو کے لئے عالمی سربراہی کانفرنس کے بارے میں ہی کہا تھا۔

پاکستان میں اس وقت عالمی سربراہی کانفرنس کا انعقاد دنیا کی تاریخ میں ایک نیا باب تھا۔ عالمِ اسلام کی سیاست میں ایک جدید اور انقلابی تبدیل کا حامل تھا۔

واضح رہے کہ جن کی مساعی جمیلہ سے اس کانفرنس کا انعقاد ممکن ہوسکا تھا۔ان میں ایک تو

www.bhutto.org

سعودی عرب کے شہنشاہ شاہ فیصل تھے۔ دوسرے اسلامی ملک لیبیا کے معمر قذافی تھے اور متحدہ عرب امارات کے سلطان بن النہان اور شام کے جناب حافظ الاسد تھے اور وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ یہ کانفرنس صرف ایک روایتی حکمرانی کے اکٹھ کا جشن نہیں تھی۔ حکمرانوں کے ملاپ کا ایک میلہ نہیں تھی۔ یہ کانفرنس عالمِ اسلام کے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام تھی۔ عالمِ اسلام کے تشخص کا اظہار تھی۔ ایک ایسی دنیا اور ایسی قوت کے اتحاد کا مظہر تھی جو اپنی قوت سے بے گانہ تھی، جدا جدا تھی۔

ہر چندان کا قبلہ ایک تھا۔ دین ایک تھا۔ مگر ان کے خیالات ایک نہیں تھے۔ ان کے مسائل ایک نہیں تھے۔ ان کی زندگی ایک نہیں تھی۔ اسلامی کانفرنس نے ان کا سب کچھ ایک کر دیا تھا۔ بس یہ عالمِ اسلام کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عروج آدمِ خاکی تھا۔ جس سے یورپ کا سامراج تلملا اٹھا تھا کہ کہیں یہ ٹوٹے ہوئے تارے باہم مل کر مہِ کامل نہ بن جائیں۔ آفتاب نہ بن جائیں۔

انہوں نے پہلے تو شاہ فیصل کا خون کروا دیا اور بعد میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی پر چڑھوا دیا۔

عالم اسلام کی تاریخ میں نہ تو پہلے کبھی اس قسم کی اسلامی برادری کی قوت اور اخوت کا اتحاد اور اظہار ہوا تھا۔ اور نہ ہی اس کے بعد کبھی دیکھنے میں آیا ہے۔ واضح رہے کہ یہی وہ مسلمانوں کی قوت تھی جس نے وزیر اعظم بھٹو کو ایٹم بم بنانے کا حوصلہ عطا کیا تھا ورنہ پاکستان ایٹم بم بنانے کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ عالمی سربراہی کانفرنس ہی تھی جس کی وجہ سے پاکستان کے لوگوں کے لئے پورے عالمِ اسلام میں رزق کمانے کے دروازے کھل گئے تھے۔

افسوس کہ اس عالمی سربراہی کانفرنس کے خلاف امریکی سامراج نے اتنی گہری سازش سے کام لیا تھا۔ جس کا ادراک مسلمان ممالک نہیں کر پائے تھے۔ خود پاکستان کے اندر اس کانفرنس کا جو ادراک واحساس ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہو سکا یا نہ ہونے دیا گیا۔ آج تک اس کانفرنس کے محرکات کی تاریخ رقم نہیں کی گئی۔ اس کانفرنس میں کیا طے پایا تھا اس کو منظرِ عام پر نہیں لایا گیا۔ اس کانفرنس کے انعقاد کی وجہ کیا تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو اس کانفرنس کے ہیرو کس طرح منتخب ہوئے تھے۔ ان تمام باتوں پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کانفرنس کو بھی اسی طرح فراموش کر دیا گیا ہے جس طرح شاہ فیصل اور ذوالفقار علی بھٹو کو فراموش کر دیا گیا ہے۔

میں عالمی سربراہی کانفرنس کی کامیابی پر میں وزیر اعظم بھٹو کو اپنے اس شعر سے خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

www.bhutto.org

لوگ کیا زمانے میں عشق اب نہیں کرتے
آج کیوں نہیں ہوتے قیس و کوہکن پیدا

یہ عالمی سربراہی کانفرنس کا ہی نتیجہ تھا کہ پاکستان کو پٹرول پوری دنیا سے سستا دیا جاتا تھا اور پاکستان میں پٹرول کی قیمت پوری دنیا سے کم ہوا کرتی تھی۔

نوٹ: اس اسلامی سربراہی کانفرنس میں ہی وزیراعظم بھٹو نے عالمِ اسلام کے بادشاہوں کو ان کے ممالک سے نکلنے والے تیل کے ہتھیار کا احساس دلایا تھا۔ ان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے تیل کے ہتھیار سے پورے یورپ کی معیشت کو اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں۔ اسی کانفرنس میں منظور کیا گیا تھا کہ عالمِ اسلام کا بین الاقوامی اسلامی تجارتی بنک قائم کیا جائے گا۔

عالمی سربراہی اسلامی بنک بنانے کی ایک بہت جرأت مند کوشش تھی۔ یہ وہی کوشش تھی جس کی نقالی میں بعد میں یورپی ممالک نے یورپی یونین کے نام پر اپنا متحدہ بلاک بنایا تھا۔ مگر عالمِ اسلام اس قدر خوش قسمت نہیں ہو سکا تھا جتنا کہ ہمیشہ امریکی سامراج اور اس کے اتحادی یورپی حکمران طاقتیں خوش قسمت رہی ہیں۔ انہوں نے پاکستان کے فوجی جرنیل ضیاء الحق کے ہاتھوں عالمی سربراہی کانفرنس کے منتخب چیئر مین فخرِ ایشیا ذوالفقار علی بھٹو کو مروا کر اپنا راستہ صاف کر لیا تھا اور عالمِ اسلام تماشہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

ملک غلام مصطفیٰ کھر کا استعفیٰ

اسلامی سربراہی کانفرنس کے دوران ملک غلام مصطفیٰ کھر بہت پس منظر میں جا چکا تھا۔ وزیراعظم بھٹو نے دورانِ کانفرنس کھر کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ کھر صاحب بحیثیت وزیر اعلیٰ پنجاب نہ تو کسی بھی اسلامی سربراہ کے استقبال میں دکھائی دیئے اور نہ ہی ان کو الوداع کہتے نظر آئے تھے۔ اس کانفرنس کے تمام معمولات کو وزیراعظم بھٹو نے براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ یہ بات عام ہو چکی تھی کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے بعد کھر کو پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ کے عہدے سے ہٹا دیا جائے گا۔ خود کھر بھی حالات کی سرد مہری سے دلبرداشتہ ہو چکا تھا۔ صرف اسلامی جماعت کے سربراہوں کی روانگی کا انتظار کر رہا تھا۔ لہٰذا اس نے عین اس وقت لاہور ائیرپورٹ اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا۔ جب خود وزیراعظم بھٹو بھی لاہور ائیرپورٹ پر موجود

www.bhutto.org

تھے۔اس طرح حنیف رامے صاحب کی وزارتِ اعلیٰ کا اعلان کر دیا گیا۔

محمد حنیف رامے کا اقتدار

کھر صاحب کے مقابلے میں حنیف رامے صاحب پوری طرح میدان عمل میں برسرِ کار تھے۔ پنجاب میں رامے صاحب کی مددگار قوت بیوروکریسی کی تھی۔ بیوروکریسی کسی قیمت پر وزیراعظم بھٹو کو اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کو ایک طاقت ور اور مضبوط حکومت کی شکل میں دیکھنا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ان کی یہ سازش اسی طریقے سے کامیاب ہو سکتی تھی کہ پیپلز پارٹی کے لیڈروں کو آپس میں لڑایا جائے۔ پارٹی کی صفوں میں انتشار پھیلایا جائے۔ بھٹو صاحب کو اپنے ساتھیوں سے بیزار کر دیا جائے۔ان کو پارٹی کے لیڈروں سے مایوس کر دیا جائے۔تا کہ وہ کلی طور پر بیوروکریسی پر انحصار کرنے لگ جائیں۔ظاہر ہے بیوروکریسی پاکستان کی اندرونی اور بیرونی خفیہ قوتوں کے اشاروں پر کام کر رہی تھی کچھ ان کے اپنے بھی حکومتی مفادات تھے۔

جن مفادات کو پیپلز پارٹی کی مضبوط حکومت سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی وزیراعظم بھٹو کی ڈائنامیک (Dynamic) پرسنلٹی سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ وہ خود پاکستان کے اقتدار میں اپنی قوت اور طاقت کو کمزور ہوتا محسوس کرنے لگ گئی تھی۔ وہ وزیراعظم کو کھلا ہاتھ نہیں دینا چاہتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ کھر صاحب کے ساتھ حنیف رامے کی جنگ میں یک دم تمام پنجاب کی بیوروکریسی رامے صاحب کے حق میں ہو گئی تھی۔ بھٹو صاحب کو ہر ادارہ رامے صاحب کے حق میں رپورٹ کرنے لگ گیا تھا۔ یہ ایک طرح کی اپنے کھلاڑی کو کامیاب کرنے کی چال تھی۔

بیوروکریسی کے علاوہ رامے صاحب کی پنجاب میں سیاسی قوت کی پشت پر احمدی تنظیم کا ہاتھ تھا۔احمدیوں کی تنظیم کے بہت فعال لوگ رامے صاحب کے دوست تھے۔ان میں ایک اہم ترین نام راجہ غالب احمد کا تھا جو رامے صاحب کا کلاس فیلو اور ذاتی دوست بھی تھا۔احمدی تنظیم ایک منظم پڑھی لکھی تنظیم ہے۔پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ میں اس کو بہت اثر و رسوخ حاصل رہا ہے۔ خود رامے صاحب کی بیگم صاحبہ کا تعلق بھی شاید احمدی خاندان سے تھا۔یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ یہ مؤثر تنظیم پاکستان کے اقتدار میں ہمیشہ بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔اس کی اپنی بھی

www.bhutto.org

خواہش تھی کہ پنجاب کا اقتدار ان کی پسند کے کسی با اعتماد آدمی کے پاس رہے۔ کھر صاحب کی حکمرانی میں بھی ان کی نمائندگی شیخ جاوید الرحمٰن کرتا تھا۔ کھر صاحب کی شکاریات کی مصروفیات کی بنا پر اصل گورنر اور اصل وزیر اعلیٰ پنجاب شیخ جاوید الرحمٰن ہی ہوا کرتا تھا۔ مگر اب جب ان کی کھر شاہی کے خلاف بغاوت کا طلاطم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پنجاب کا اقتدار کسی دوسرے انسان کے پاس جانا ایک مجبوری بن گیا تھا تو اس صورت میں اس تنظیم کی شدید خواہش تھی کہ اقتدار ان کے با اعتماد پیپلز پارٹی کے لیڈر رائے صاحب کو دلایا جائے۔

اس انتقالِ اقتدار میں اس تنظیم نے خفیہ طور پر جو کوشش کی ہوگی اس سے تو ہم پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔ مگر ظاہری طور پر ان کے پیپلز پارٹی کے اندر ایک جانے پہچانے انسان راجہ منور احمد جو راجہ غالب احمد کے چھوٹے بھائی تھے ان کی کوششوں کا رائے صاحب کو اقتدار دلانے میں بڑا اہم کردار تھا۔ ابتداء میں تو ان کا کردار پنجاب میں پیپلز پارٹی کے اراکین صوبائی اسمبلی کو حنیف رامے کے حق میں کرنا تھا اور کھر صاحب کی مخالفت کرنا ہوتا تھا۔ یہاں تک تو ان کا کردار ایک سیاسی کردار تھا مگر بعد میں کھر صاحب کے ساتھ مقابلہ بازی میں راجہ صاحب نے حنیف رامے جیسے ادیب کو بھی پنجاب کا غنڈہ لاٹ ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ شاید راجہ صاحب کا اور مرحوم حنیف رامے صاحب کا اقتدار کا آئیڈیل ہی کھر صاحب کا اقتدار تھا یا شاید ان کو کسی وجہ سے یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ پنجاب کے لوگ اپنے حکمرانوں میں تھوڑی سی غنڈہ گردی کے عنصر کو پسند کرتے ہیں یا وہ غنڈوں بدمعاشوں کا حکومت میں کردار ضروری خیال کرتے ہیں۔ بہرصورت راجہ منور احمد نے رامے صاحب کی حکومت کو مقبول بنانے کے لئے تمام وہ غیر سیاسی حربے استعمال کئے جو کھر صاحب کے اقتدار میں وقوع پذیر ہوا کرتے تھے۔ افسوس کہ خود رامے صاحب بھی راجہ صاحب کے اس فلسفے سے متاثر دیکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے کلین شیو شریفانہ اور فنکارانہ چہرے پر خوامخواہ بھاری مونچھیں رکھ کر مونچھوں کو اقتدار کا تاؤ دینا شروع کر دیا تھا۔ ان کو وہم ہو گیا تھا کہ پنجاب کے لوگ صرف مونچھوں والے جاگیرداروں کو ہی اپنا اصل حاکم تصور کرتے ہیں۔ کسی پڑھے لکھے شریف آدمی کو اپنا غنڈہ لاٹ تصور ہی نہیں کر سکتے۔ یہ بات رامے صاحب کی ذہنی کمزوری کی علامت تھی۔ پنجاب کے عوام اگر مونچھوں کو یا جاگیرداروں کو ہی اپنا حاکم تصور کرتے ہوتے تو وہ ماضی میں نواب کالا باغ جس کی مونچھوں کا سائز اس کے قد سے بھی بڑا تھا اس کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار نہ کرتے۔ کالا باغ

www.bhutto.org

لوگوں میں انتہائی ناپسندیدہ انسان تھا۔اس کے بعد وہ کھر صاحب کی حکمرانی کے خلاف کبھی نفرت کا اظہار نہ کرتے اور رائے صاحب کبھی بھی پنجاب کے وزیراعلیٰ نہ بن پاتے۔

مگر اقتدار ایک ایسی بدقسمت بلا ہے کہ یہ اچھے اچھوں کی مت ماردیتا ہے۔ہم نے رائے صاحب کے اقتدار میں آنے کے فوراً بعد دیکھا کہ جس طرح کھر صاحب کی لاہور میں طاقت کا مظہر میاں تاری اس کا بڑا بھائی میاں جیجی اور میاں مودا ہوتا تھا اسی طرح رائے صاحب اور رانا منور کی طاقت کا مظہر لاہور میں جھنڈو شاہ اور اس کے کن ٹٹے نظر آنے لگ گئے تھے۔یہ ایک افسوسناک اور قابلِ نفرت بات تھی جس کا مجھے ذاتی طور پر بے حد افسوس ہے۔اس لئے کہ رائے صاحب کو پنجاب کا وزیراعلیٰ بنانے میں میری اپنی کوشش بھی شامل تھی۔

بیوروکریسی اور احمدیوں کی حمایت کے علاوہ پنجاب کا ہر پڑھا لکھا شریف شہری حنیف رائے صاحب کو پسند کرتا تھا۔خود پاکستان پیپلز پارٹی جو رائے صاحب کی اصل قوت تھی اس کا ہر اعتدال پسند ترقی پسند سیاسی کارکن رائے صاحب کی حمایت میں پیش پیش تھا۔وہ تمام پارٹی ورکر جن کو کھر صاحب کے اقتدار میں نظرانداز کردیا گیا تھا۔ان کی بھاری اکثریت تھی وہ تمام رائے صاحب کے ساتھ تھے۔دل و جان سے ان کو پسند کرتے تھے۔لاہور پارٹی کے دفتر اولمپک ہاؤس واقع ٹیمپل روڈ میں سب سے پہلے رائے صاحب کے حق میں خود میں نے تقریر کی تھی۔اس وقت تک لوگ کھر صاحب کے خلاف کھل کر بات نہیں کرتے تھے۔سب سے پہلے میں نے ہی مساوات اخبار میں اپنے قطعے میں رائے صاحب کو وزیراعلیٰ پنجاب بننے پر مبارک باد دی تھی۔مگر افسوس صد افسوس کہ اس دانش ور حنیف رائے کا اقتدار پاکستان پیپلز پارٹی اور وزیراعظم بھٹو کے لئے بہت مایوس کن ثابت ہوا تھا۔

ان کا اقتدار بھی اسی طریقے سے غیر سیاسی اور شخصی اقتدار تھا جس طرح کھر صاحب کا تھا۔ رائے صاحب کے اقتدار کی ناکامی سے بھٹو صاحب کے دل سے سیاسی کارکنوں کو اقتدار میں لانے کا خیال ہی ختم ہوگیا تھا۔اس طریقے سے خفیہ ادارے اپنی سازش میں کامیاب ہوگئے۔جو وزیراعظم بھٹو کو بے بس کرکے اپنا مجبورِ محض بنانا چاہتے تھے۔

حنیف رائے صاحب کو اقتدار ملتے ہی کھر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے علمِ بغاوت بلند کردیا۔ان کی کوشش تھی کہ پنجاب میں غدر مچا دیا جائے۔وہ اپنے خروج سے وزیراعظم بھٹو پر

www.bhutto.org

ثابت کرنا چاہتے تھے کہ پنجاب کو کھر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص کنٹرول نہیں کر سکتا۔ پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ تھا، طاقت کا مرکز تھا۔ وزیر اعظم بھٹو کے لئے بہت حساس صوبہ تھا۔ وہ پنجاب میں اقتدار کی سیاسی رسہ کشی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ فخر پنجاب میں کھر صاحب نے اپنے نادان دوستوں کے مشورے سے جس طرح کی ابتری پیدا کرنے کی کوشش کی وہ خود کھر صاحب کے لئے بھی سیاسی خودکشی تھی۔

ملک صاحب کے ساتھی پنجاب میں لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کر کے رامے صاحب کے اقتدار کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہر وہ حربہ اختیار کرنا شروع کر دیا جو امن عامہ کو خراب کر سکتا تھا۔ اتفاق سے رامے صاحب کے اقتدار میں آنے کے کچھ دنوں بعد کوٹ لکھپت میں ایک مزدور رہنما جس کا نام عبدالرحمٰن تھا وہ اپنے متحارب فریق کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ ملک صاحب کے ساتھیوں نے ملک صاحب کو مشورہ دیا کہ موقعہ غنیمت ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ عین اس وقت جب عبدالرحمٰن لیبر لیڈر کے ساتھی مزدور اپنے ساتھی کے قتل کے انتقام میں آگ بگولا ہوئے بیٹھے تھے ملک صاحب کے ساتھیوں نے جلتی پر تیل ڈالنے کے لئے ملک صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ مقتول کے ساتھیوں کا کوٹ لکھپت جا کر حوصلہ بڑھائے۔ ان کی حوصلہ افزائی کر کے ان کے انتقام کی آگ کو اور بھڑکایا جائے تاکہ مزدوروں کے مشتعل تصادم سے لاہور میں امن عامہ کی فضا کو خراب کیا جائے تاکہ بھٹو صاحب کو کھر کو ہٹانے کے غلط فیصلے کے احساس میں مبتلا کیا جا سکے۔ دوسری جانب راجہ منور احمد جو اس وقت رامے صاحب کا افتخار تارڑی بن چکا تھا۔ اس نے رامے صاحب کے ساتھ مشورہ کیا کہ کھر کو مزدوروں کی حمایت کرنے کی اس چال میں کامیاب نہیں ہونے دیا جانا چاہئے۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرنا چاہئے کہ وہ اپنی اس چال میں ناکام ہو جائے۔

کھر صاحب کے ساتھیوں نے کوٹ لکھپت کے مزدوروں میں جا کر کھر صاحب کی طرف سے ان کی حمایت کا پیغام دیا اور ان کے آنے کے وقت کا اعلان کر دیا۔ راجہ منور احمد نے جھنڈو شاہ کی سرکردگی میں شہر کے اوباشوں کا پورا لشکر وہاں پہنچا دیا۔ جیسے ہی کھر صاحب وہاں پہنچے یہ لشکران پر ٹوٹ پڑا۔ راجہ منور کے کن ٹٹوں نے کھر صاحب کے ساتھ ایسی شرمناک حرکتیں کیں کہ کھر صاحب بڑی مشکل سے وہاں سے اپنی عزت بچا کر بھاگ جانے میں کامیاب ہوئے۔ دونوں جانب سے اس طرح کی حماقتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ جو کافی عرصے تک چلتا رہا۔

www.bhutto.org

وزیراعظم بھٹو کا طریقہء اقتدار

بھٹو صاحب کی عادت تھی کہ وہ ہر سطح پر ایک دوسرے کے تقابل کو پسند کرتے تھے۔ سیاست کے قدیم طریقوں کے مطابق یہ طریقہ خود بخود ہی معاملات میں توازن پیدا کر دیتا ہے۔ اقتدار کی رسہ کشی میں جب نچلی سطح کے لوگ آپس میں جھگڑا کرتے ہیں تو فیصلہ کرنے والی اصل قوت اوپر والی قوت ہی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے لڑنے جھگڑنے والی دونوں قوتیں یا دونوں فریق اوپر والی قوت کے محتاج ہوتے ہیں۔ وہ دونوں فریق اوپر والی قوت کو خوش کرنے کی کوشش میں مبتلا رہا کرتے ہیں۔ مگر ایسا تب ہوتا ہے جب نیچے والی قوتیں اوپر والی مرکزی قوت کو اقتدار کی حتمی قوت تصور کرتی ہوں۔ لیکن جب نچلی قوتیں طاقت کا اور قوت کا مرکز کہیں اور تصور کر رہی ہوں۔ جب وہ اوپر والی مرکزی قوت کے خلاف سازش کرنے والی قوتوں کا آلہء کار بن چکی ہوں۔ تب وزیراعظم بھٹو کی یہ سٹریٹجی اور طریقہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ کھر صاحب اور حنیف رامے کو تو وزیراعظم بھٹو کو تخت سے اتارنے کے لئے لڑایا جا رہا تھا۔ اگر ان کو اتارنے میں کامیابی نہ بھی حاصل ہو۔ ان کو کمزور کرنا تو عین ممکن تھا اور بھٹو صاحب کو پارٹی کے رینک اینڈ فائل سے پارٹی کی نچلی سطح کی قیادت سے یا ان کے جانشینوں سے متنفر کرنا مقصود تھا۔ یہ سازش اپنے اندر کئی قسم کے منصوبے لئے ہوئے تھی جس کا ہر منصوبہ اسٹیبلشمنٹ اور بھٹو دشمن قوتوں کے ہی حق میں جاتا تھا۔ خود بھٹو صاحب کا اس میں نقصان ہی نقصان تھا۔ خفیہ قوتوں نے اپنی سازشوں سے بھٹو صاحب کا قریبی دوستوں سے اعتماد ہی مجروح کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے کسی دوست کو قابلِ اعتبار خیال نہیں کرتے تھے۔

حنیف رامے صاحب پر ایک تو مرکز کا دباؤ تھا۔ دوسرا ملک غلام مصطفیٰ کھر پنجاب میں ان کے لئے مانسٹر (Monster) بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے اقتدار میں ہر وہ طریقہ آزما رہے تھے جو کھر آزمایا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر کھر صاحب نے پنجاب میں اگر "جٹ گروپ" پیدا کیا تھا۔ رامے صاحب نے پنجاب میں ارائیں گروپ پیدا کر دیا۔ پنجاب کے تمام ارائیں وکلاء کو شادمان میں علامہ اقبال ٹاؤن میں رواز گارڈن میں پلاٹ دیئے گئے۔ پیپلز پارٹی میں صرف ان کارکنوں کو پلاٹ دیئے گئے جو ارائیں تھے۔ صحافت میں دو طرح کے صحافیوں کو پلاٹوں کی لوٹ سیل سے نوازا گیا تھا۔ ایک تو وہ صحافی تھے جو ارائیں تھے۔ دوسرے وہ صحافی تھے جو وزیراعظم بھٹو کے سخت

www.bhutto.org

خلاف تھے۔ بلکہ ان میں سے کئی تو ان کی جان کے دشمن تھے۔ نوائے وقت اخبار کے تقریباً تمام صحافیوں کو پلاٹ دیئے گئے۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی کے حامی صحافیوں کو پلاٹ دیئے گئے۔ گویا ان تمام لوگوں کو پلاٹ دیئے گئے جو پاکستان پیپلز پارٹی کے انتہائی مخالف اور دشمن لوگ تھے۔ جن میں بائیں بازو اور دائیں بازو کے تمام صحافی شامل تھے۔

رامے صاحب کی اس پلاٹوں کی لوٹ سیل کے خلاف وزیراعظم بھٹو کے پاس شکایات کا انبار لگ گیا۔ تمام مرکزی وزیر جو اپنے اپنے گروپ کے کارکنوں کو پلاٹ دلانے کے خواہش مند تھے وہ وزیراعظم کے کان بھرنے لگ گئے کہ رامے صاحب پنجاب میں اپنی دولت پروری اور اقربا پروری اور برادری پروری سے اپنا مضبوط دھڑہ قائم کررہے ہیں۔ وہ پنجاب میں اپنی قوت پیدا کر رہے ہیں۔ پنجاب کے بیشتر اضلاع میں ارائیں ڈپٹی کمشنر لگا رہے ہیں۔ یہ بات درست بھی تھی۔ رامے صاحب نے بیوروکریسی کے کلیدی عہدوں پر ارائیں افسروں کو تعینات کرنا شروع کردیا تھا۔ راؤ رشید سابق آئی۔جی پنجاب نے جو رامے صاحب کے عہد میں آئی۔جی پنجاب تھے اپنی کتاب میں تحریر کیا تھا کہ پنجاب کے 16 ضلعوں میں ارائیں ڈپٹی کمشنر لگائے گئے تھے۔ اس طرح کی باتیں جب وزیراعظم بھٹو کے نوٹس میں آنا شروع ہوگئیں تو وزیراعظم بھٹو نے رامے صاحب کو ان باتوں سے آگاہ کیا۔ بھٹو صاحب نے رامے صاحب کو کہا کہ تم ایک مصور ہو، آرٹسٹ ہو، آرٹسٹ رہو کھر مت بنو۔ میرے اپنے ذاتی تجربے کے مطابق ایک دانش ور کو صاف شفاف سیاست کرنی چاہئے تھی۔ اس کو ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے تھا جن باتوں سے گراوٹ پیدا ہوتی ہو۔ ایک دانش ور نہ تو غنڈہ گردی کرسکتا ہے اور نہ ہی ظلم کی حکمرانی کو قائم کرسکتا ہے۔ افسوس کے رامے صاحب نے اپنی دانش وری کی وکٹ کو چھوڑ کر کھر کی جاگیردارانہ سیاست کی وکٹ پر کھیلنا شروع کردیا جس پر کھیلنا نہ تو ان کے مزاج کے مطابق تھا اور نہ ہی ان کو زیب دیتا تھا۔

رامے صاحب کے اقتدار کے دو اہم واقعے

پنجاب میں وزیراعظم بھٹو کے لئے رامے اور کھر کی آپس کی ٹسل بڑی پریشان کن صورت اختیار کرگئی۔ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ ان دونوں کی سیاسی چپقلش سے ان کو فائدہ پہنچے گا۔ ویسا نہ ہوسکا۔ بلکہ کئی اور قسم کی مزید مشکلات پیدا ہونا شروع ہوگئیں جن کا پیچھے ذکر کیا گیا ہے۔ ان

www.bhutto.org

مشکلات کے علاوہ دو اور ایسے غیر معمولی نوعیت کے حامل واقعات پنجاب میں وقوع پذیر ہو گئے جن کی وجہ سے حنیف رامے صاحب اور وزیر اعظم بھٹو کے درمیان غلط فہمی کا پہاڑ کھڑا ہو گیا۔
اس میں ایک واقعہ تو وزیر اعظم بھٹو کا احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا واقعہ تھا۔

احمدیوں کو اقلیت قرار دینا

احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کے مسئلے پر رامے صاحب کے رویے کی تو ہم بعد میں بات کریں گے۔ اس بارے میں میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ وزیر اعظم بھٹو ایک سیاست دان تھے، ایک سیکولر انسان تھے۔ ان کی شہرت اور ان کی عظمت ایک ترقی پسند آزاد خیال دانش ور حکمران کی تھی۔ لوگ ان کو ایک سوشلسٹ اور انسانیت پرست انسان اور حکمران خیال کرتے تھے۔ ان کو اس طرح کے مذہبی معاملات میں الجھنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ ان کے احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا تمام تر فائدہ مذہبی تنظیموں کی متعصب قوتوں کو ہی پہنچا تھا۔ انہوں نے ان مذہبی قوتوں کو جو اس مطالبے کو اپنا 90 سال کا پرانا مطالبہ قرار دیتے تھے۔ احمدیوں کو اقلیت قرار دے کر ان قوتوں کو بنیاد پرستی اور فرقہ پرستی کو اور بھی قوت عطا کر دی تھی۔ احمدی فرقے کو اقلیت قرار دینے سے ان مذہبی انتہا پسندوں کے دین کی تکمیل نہ ہو سکی تھی۔ بلکہ بھٹو صاحب کے اس اقدام نے ان لوگوں کے تفرقہ کے اور کئی دروازے وا کر دیئے تھے۔

جو مذہبی فرقہ اکثریت میں تھا اس کا مطالبہ تھا کہ باقی تمام فرقوں کو اسی طرح اقلیت قرار دے دیا جائے جس طرح احمدیوں کو اقلیت قرار دیا گیا ہے۔

یہ بے حد خطرناک بات تھی۔ یہ سراسر غیر سیاسی، غیر اخلاقی اور غیر قومی باتیں تھیں۔ اس طرح کی باتوں سے ہماری قوم کا شیرازہ بکھر جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے کہ مُلّاؤں کی نہ تو کوئی قوم ہوتی ہے اور نہ کوئی ملک ہوتا ہے۔ ان کی قوم ان کا ملک ان کا عقیدہ ان کی انتہا پسندی ہوتی ہے۔ جس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ ان ملاؤں کے ذہن میں دنیا کا نقشہ انتہائی بدشکل نقشہ ہوتا ہے اور عارضی ہوتا ہے۔ ان کی اصل دنیا خیالی اور تصوراتی دنیا ہوتی ہے جس کو جنت کہا جاتا ہے۔ وہ اس دنیا کو ایک بدصورت دنیا خیال کرتے ہیں بقول شاعر اسلم گورداسپوری۔

یہ جہاں خُلد سے بھی بڑھ کے حسیں ہے جس کو
شیخ نے حشر کا میدان بنا رکھا ہے

www.bhutto.org

وزیراعظم بھٹو کی طرح کے خوبصورت انسان کو اس طرح کی باتوں میں ہرگز ہرگز ملوث نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ اس میدان کے انسان ہی نہیں تھے۔ ان کو قوم کا مذہبی پیشوا ہرگز نہیں ہونا تھا۔ قوم ان کو کوئی مذہبی امام خیال نہیں کرتی تھی۔ قوم ان کو قائد عوام اور ایک نجات دہندہ خیال کرتی تھی۔ ان کا خطاب فخرِ ایشیا تھا۔ مذہبی انتہا پسندی کے کسی کام سے ان کی عظمت میں اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ قوم نے ان کو مذہبی تنازع حل کرنے کے لئے ووٹ دے کر اسمبلی میں نہیں بھیجا تھا۔ قوم نے ان کو اپنی غربت کے خاتمہ کے لئے اپنا رہنما منتخب کیا تھا۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے استحصال کو ختم کرنے کے لئے اپنا وزیراعظم بنایا تھا۔

وزیراعظم بھٹو کی حکومت اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کسی ایک فرقے، کسی ایک برادری، کسی ایک قبیلے کی حکومت نہیں تھی یہ پوری قوم کی حکومت تھی۔ تمام فرقے سے متعلق لوگوں کی حکومت تھی۔ تمام اقلیتوں کی حکومت تھی۔ وزیراعظم بھٹو قائد عوام تھے لہٰذا ان کی حکومت صرف اور صرف عوام کی حکومت تھی۔ جس حکومت کو فرقہ وارانہ بحث وجدال سے باہر رہنا چاہئے تھا۔

حنیف رامے صاحب ایک تو خود آزاد منش انسان تھے بہت سیکولر ذہن کے آدمی تھے ان کی سیاست میں اس طرح کی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ مسئلہ رامے صاحب کے لئے اس لئے بھی اذیت کا باعث تھا کہ احمدی حضرات رامے صاحب کو اپنا نمائندہ تصور کرتے تھے۔ وہ ہر طرح سے رامے صاحب کے مددگار تھے۔ احمدیوں کے لئے اقلیت قرار پانا ان کے لئے ایک طرح کی ان کی سیاسی موت کے مترادف تھا جس کا وہ آج تک اظہار کرتے چلے آرہے ہیں۔ مگر ان کا حنیف رامے کی پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ کے دوران اقلیت قرار پانا ان کے لئے نہائی جاں گسل تھا، نا قابلِ برداشت تھا، صدمہ تھا۔ خود حنیف رامے صاحب اس مسئلے پر بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ان کے احمدی دوستوں کا ان پر دباؤ تھا کہ وہ مرکزی حکومت کو ان کو اقلیت قرار دینے سے منع کریں۔ (احمدی طالب علم فورس نے حنیف رامے کے دور میں ہی ربوا اسٹیشن پہ ریل میں سوار طالب علموں پر حملہ کر کے اپنی قوت کا اظہار کیا تھا۔ ان کا یہ اقدام رامے حکومت کے لئے اور خود ان کے لئے بہت غلط ثابت ہوا تھا۔) جہاں تک ان کو اقلیت قرار دیئے جانے کا مسئلہ تھا۔ رامے صاحب چونکہ خود بھی بھٹو صاحب کے اس اقدام کو غیر سیاسی اقدام تصور کرتے تھے۔ لہٰذا رامے صاحب نے بھٹو صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ اس مسئلے پر نظر ثانی کریں۔ یہ مسئلہ بھٹو

www.bhutto.org

صاحب کو بین الاقوامی سیاست کے میدان میں ایک رجعت پسند سیاست دان بنا دے گا۔ اس مسئلے سے بھٹو صاحب کی دنیا میں انسان دوستی کی شہرت مجروح ہو جائے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم سیاسی قوت ہیں ہم کو اس قسم کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔ جہاں تک تو احمدیوں کا مذہبی معاملہ ہے میں اس پر قطعی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس مسئلے کے صرف سیاسی پہلو پر بات کر رہا ہوں۔ میری گزارش یہ ہے کہ اگر یہ مسئلہ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا جس کو بھٹو صاحب نے حل کیا تھا۔ کیا پاکستان کی تمام مذہبی جماعتوں نے بھٹو صاحب کو اپنا رہنما تسلیم کیا تھا۔ کیا تمام مذہبی لیڈروں نے بھٹو صاحب کو اپنا امام بنالیا تھا۔ کیا پاکستان کی کسی بھی مذہبی جماعت یا اس جماعت کے امیر یا قائد نے بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کی مخالفت کی تھی۔ اگر وہ واقعی احمدیوں کو اقلیت قرار دینا اپنے ایمان کا حصہ خیال کرتے تھے۔ جس نے ان کے ایمان کے اس حصے کی تکمیل کی تھی یعنی بھٹو نے کیا انہوں نے ان کی پھانسی کو خلاف ایمان، خلاف اسلام، خلاف قرآن قرار دیا تھا۔ کیا ایک عاشقِ رسول کو پھانسی دینا ان کے لئے جائز تھا۔ ثابت ہوا کہ وہ تمام مذہبی عناصر جو بھٹو صاحب کو احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کے لئے مجبور کر رہے تھے وہ جھوٹے عاشقِ رسول تھے۔ وہ تمام کے تمام جی۔ ایچ۔ کیو کے ٹاؤٹ تھے۔ وہ صرف وزیراعظم بھٹو کو مذہبی معاملات میں ملوث کر کے ان کو ان کی سیاست کے اصل محاذ سے ہٹانا چاہتے تھے۔ ان کے لئے مشکلات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کی شہرت پر بنیاد پرستی کی مہر لگانا چاہتے تھے۔ رامے صاحب نے جب بھٹو صاحب کو اپنی سوچ کے مطابق مشورہ دیا تھا۔ بھٹو صاحب کے ارد گرد اس وقت تک اسٹیبلشمنٹ نے رجعت پسندوں کا حصار قائم کر دیا تھا۔ ان رجعت پسندوں کا پیش امام کوثر نیازی تھا۔ احمدیوں کو اقلیت قرار دلوانے میں سب سے پیش پیش اب کوثر نیازی تھا۔ خود جس کا اسمبلی کا انتخاب احمدیوں نے لڑا تھا۔ اس وقت چونکہ خفیہ ایجنسیاں بھٹو صاحب کو مذہبی بکھیڑوں میں ملوث کر کے ان کی شہرت کو داغ دار کرنا چاہتی تھیں جن کا سب سے بڑا ذریعہ کوثر نیازی تھا اور مرکز میں بیٹھے رجعت پسند تھے۔ ان تمام عناصر نے بھٹو صاحب کے کان بھرنے شروع کر دیئے کہ رامے آپ کی سیاست سے اتفاق نہیں کرتا۔ لہٰذا احمدیوں کا مسئلہ بھی ان تمام مسئلوں میں سے ایک تھا جو رامے صاحب اور بھٹو صاحب کے تعلقات کو خراب کرنے والے مسائل تھے۔ رامے صاحب چونکہ احمدیوں کے سیاسی رفیق تھے وہ اس معاملے میں بھٹو صاحب کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔

www.bhutto.org

راجہ منور احمد کے ساتھ گفتگو

میں چونکہ پارٹی کی تاریخ رقم کر رہا ہوں۔ لہٰذا میں نے ملک غلام مصطفےٰ کھر اور حنیف رامے کے اختلافات اور ان کی بغاوتوں کے بارے میں تاریخی حقائق معلوم کرنے کے لئے اور معاملات کی صحت کی تصدیق کرنے کے لئے راجہ منور کے ساتھ 15 مئی 2007ء کو ایک خصوصی ملاقات کی۔ اس ملاقات میں میں نے خاص طور پر ان سے احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کے معاملے میں ان سے دریافت کیا۔

راجہ منور احمد کی بات نے مجھے حیران کر دیا

میں نے راجہ منور احمد سے سوال کیا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کے معاملے کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا جواب تھا کہ وزیر اعظم بھٹو کا احمدیوں کو اقلیت قرار دینا نہ صرف ایک اصولی معاملہ تھا بلکہ ان کے لئے یہ معاملہ ایک مجبوری بن گیا تھا۔ راجہ صاحب نے اس مسئلے کا پس منظر یوں بیان کیا تھا کہ مولانا مودودی اور مفتی محمود اور شاہ احمد نورانی اور دیگر مذہبی انتہا پسند طبقوں نے بھٹو صاحب کے ساتھ ملاقات کر کے ان سے وعدہ کیا تھا کہ 1976ء کے آنے والے انتخابات میں اور انتخابات کے بعد بنائی جانے والی اگلی حکومت میں یہ تمام لوگ کھل کر ان کا ساتھ دیں گے۔ مگر اس پیش کش کے بدلے میں ہمارا ایک ہی مطالبہ ہے کہ آپ احمدیوں کو اقلیت قرار دے دیں۔

راجہ صاحب نے کہا کہ اس مسئلے پر وزیر اعظم بھٹو نے مجھے طلب کیا اور مجھ سے اس مسئلے پر مشورہ مانگا تھا۔ راجہ صاحب نے وزیر اعظم بھٹو کو جن کے ساتھ اس وقت خان عبدالقیوم خان اور خورشید حسن میر صاحب بیٹھے ہوئے تھے کہا کہ بھٹو صاحب احمدیوں کا فیصلہ تو قائداعظم کی وفات پر ہی ہو گیا تھا کہ یہ لوگ خود کو مسلمانوں کے اکثریتی دھڑے سے علیحدہ خیال کرتے ہیں۔ جس کی مثال انہوں نے سر ظفر اللہ خان جو پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ تھا اور احمدی تھا۔ اس کی ذات سے حوالے سے دی تھی کہ ظفر اللہ خان نے قائداعظم کے جنازے میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ جنازے سے کچھ دور کھڑے رہے تھے جس کی تصویریں موجود ہیں۔ اور اس نے جنازے میں اپنی شرکت نہ

www.bhutto.org

کرنے کے جواز میں کہا تھا کہ وہ اپنے مسلک کے اعتبار سے قائداعظم کو صحیح مسلمان خیال نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ ان کے جنازے کی نماز میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ راجہ صاحب نے کہا کہ میں نے بھٹو صاحب کو کہا کہ احمدی حضرات اپنی عقدیت کے مطابق کسی غیر احمدی کو مسلمان تصور نہیں کرتے۔ یہ فیصلہ جو آپ کرنا چاہتے ہیں یہ تو خود انہوں نے بہت پہلے سے کر رکھا ہے۔ آپ کا فیصلہ کچھ نیا فیصلہ ہرگز نہیں ہوگا۔ اب چونکہ پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ لہٰذا اس صورت میں ان کا اقلیت کہلانا یا قرار دیا جانا ایک حقیقت ہے۔ البتہ ان کو حکومتی اعتبار سے اقلیت قرار دینا ایک نئی بات ضرور ہوگا۔ راجہ صاحب کا کہنا تھا کہ اس مسئلے پر جب بھٹو صاحب نے احمدی فرقہ کے چیف کو بلا کر ان سے ان کے موقف کے بارے میں دریافت کیا تھا تو احمدی فرقہ کے چیف نے صاف صاف کہا تھا کہ ہم تو یہ خیال کرتے ہیں کہ جو مسلمان ہمارے مذہبی عقیدے کو تسلیم نہیں کرتا ہمارے لئے وہ کافر ہے۔

لہٰذا احمدیوں کے چیف کے اس بیان کے بعد وزیراعظم بھٹو کے پاس احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی باقی نہیں تھا۔ اس لئے کہ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت کے سامنے ان کو اقلیت ہی کہا جائے گا۔ اور بھٹو صاحب ایک اکثریت کے مقابلے میں ایک اقلیت کو ترجیح نہیں دے سکتے تھے۔ جبکہ اس میں مذہبی عقائد کا مسئلہ بھی زور پکڑ چکا تھا۔ واضح رہے کہ یہ الفاظ راجہ غالب احمد کے بھائی راجہ منور احمد کے ہیں جو میں نے یہاں تحریر کر دیئے ہیں۔

کھر اور رامے صاحب کا مسئلہ

راجہ منور احمد نے کھر اور حنیف رامے کی بھٹو صاحب کے خلاف بغاوت پر کہا کہ کھر صاحب کا بھٹو صاحب سے صاف الفاظ میں مطالبہ تھا کہ بھٹو صاحب کے اقتدار میں اس کا حصہ ہے۔ بقول راجہ صاحب کھر نے بھٹو صاحب کو کہا کہ اقتدار کے اس ڈرامے میں ان کا بڑا اہم کردار تھا۔ کھر صاحب نے بھٹو صاحب کو کہا کہ اس وقت جب آپ باہر تھے میں اگر آپ کو کہہ دیتا کہ پاکستان مت آئیں یہاں آنا آپ کی زندگی کے لئے خطرناک ہے تو آپ کبھی پاکستان نہ آتے۔ یہاں پر کوئی اور حکومت بن سکتی تھی۔ میں نے جرنیلوں کو آپ کو حکومت دینے پر آمادہ کیا تھا۔ لہٰذا میرا حصہ مجھے دیا جائے اور میرا حصہ پنجاب کی مستقل حکومت ہے۔

www.bhutto.org

راجہ صاحب کا کہنا تھا کہ پنجاب کی پاکستان میں ووٹوں کے لحاظ سے وہی حیثیت ہے جو متحدہ پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان کی ہوتی تھی۔ لہٰذا بھٹو صاحب کی وزارتِ اعظمٰی کا دارو مدار پنجاب پر تھا۔ وہ پنجاب پر کسی کا حق شفع تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔

میرا راجہ صاحب سے آخری سوال تھا کہ ان دونوں کے پیچھے کیا کوئی فوجی ہاتھ تھا۔ تو اس کا انہوں نے کچھ جواب نہ دیا تھا۔

میری ذاتی تحقیق کے مطابق

میری ذاتی تحقیق کے مطابق امریکہ اور فوجی جرنیل وزیر اعظم بھٹو کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ جس فیصلے کے مطابق پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ پاکستان میں آنے والے 1976ء کے انتخابات میں ہر صورت بھٹو صاحب کو ہرانا چاہتی تھی۔ ان کی کوشش تھی کہ کسی طریقے سے بھٹو صاحب کو اقتدار سے باہر کر دیا جائے۔ وہ بھٹو صاحب جیسے زبردست وزیر اعظم کو مزید برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ لہٰذا اسٹیبلشمنٹ نے اپنے طریقوں سے کھر اور رامے صاحب کو اس بات کا عندیہ دے دیا تھا۔ جس میں ان دونوں کا وزیر اعظم بنایا جانا بھی شامل تھا۔ لہٰذا یہ دونوں حضرات اسٹیبلشمنٹ کی سازش کا شکار ہو کر وزیر اعظم بھٹو کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے میں متحد ہو گئے تھے، یا کر دیئے گئے تھے۔

پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور امریکہ کے خفیہ ادارے اس بات کا فیصلہ کر چکے تھے کہ بھٹو صاحب کا ان کے کسی اتالیق کے ساتھ اعتماد نہ پیدا ہونے دیا جائے۔ وہ ان کے ہر جانشین کے ساتھ ان کا سیاسی اختلاف پیدا کرنا چاہتے تھے۔ حنیف رامے جب مرکز کی طرف سے مختلف طریقوں سے بہت ٹائٹ کئے جا رہے تھے۔ ان تمام خفیہ قوتوں نے کھر کی طرح ان کے ساتھ بھی رابطے پیدا کر لئے اور ان کو وزیر اعظم بھٹو کے خلاف ڈٹ جانے کا حوصلہ دینا شروع کر دیا۔

رامے صاحب بھی امریکہ کو اور فوج کو پاکستان کی اصل قوت خیال کرتے تھے انہوں نے بھی کھر کی طرح بھٹو صاحب کے مقابل کھڑا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ رامے صاحب کے دل کی تسلی کے لئے ان خفیہ قوتوں نے خفیہ طور پر اندر کھاتے سب سے پہلے کھر صاحب کی ان کے ساتھ صلح صفائی کرادی۔ رامے صاحب کی کھر صاحب کے ساتھ صلح کرانے کا کام چوہدری ظہور الٰہی نے

www.bhutto.org

سرانجام دیا تھا۔ رائے صاحب کی جب کھر صاحب کے ساتھ خفیہ صلح ہوگئی تو انہوں نے خود کو پنجاب میں مضبوط خیال کرنا شروع کر دیا۔ رائے صاحب نے بھی بھٹو صاحب پر یہ تاثر پیدا کرنا شروع کر دیا کہ اگر پنجاب سے ان کو ہٹایا گیا تو پنجاب بھٹو کے قبضے میں نہیں رہے گا۔ وزیراعظم بھٹو ایک شعلہ خوانسان تھے۔ وہ اس طرح کا رویہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ویسے بھی یہ سب کچھ ایک بہت بڑی سازش کے تحت ایک تسلسل کے ساتھ بھٹو صاحب سے کرایا جا رہا تھا۔ جس میں اسٹیبلشمنٹ کے لئے بھٹو صاحب کا آتشیں مزاج بڑا ممد و معاون ثابت ہوا تھا۔ وہ اپنے کسی مقابل کے دباؤ کو قبول نہیں کیا کرتے تھے اور کوئی اپنا ان کا آدمی اگر ان کو اکڑ دیکھانے لگے تو وہ بات ان کو سرے سے پسند نہیں آتی تھی۔

حنیف رامے کے دور میں دوسرا اہم واقعہ

حنیف رامے کے دورِ حکومت میں دوسرا اہم اور منحوس ترین واقعہ احمد رضا قصوری کے والد نواب محمد احمد کے قتل کا واقعہ تھا۔ وزیراعظم بھٹو کے عہدِ حکومت میں پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کی خفیہ ایجنسیاں اور امریکی سامراج کے خفیہ ادارے پاکستان میں بے شمار ایسے واقعات پیدا کر رہے تھے جس سے وزیراعظم بھٹو کی شہرت کو اور ان کی حکومت کے امیج کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ افسوس کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو تو شروع دن ہی عضوِ معطل بنا دیا گیا تھا۔ وہ اس سلسلے میں بھٹو صاحب کی کچھ مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے کہ وہ مکمل طور پر بے اختیار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جس طرح بھٹو صاحب اکیلے ہی اپنا اور اپنی حکومت کا دفاع کر رہے ہیں ان کا اور کوئی مددگار دیکھائی نہیں دیتا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کے ان کے اقتدار میں شریک دوستوں کی غداریوں اور بدعہدیوں نے بھٹو صاحب کی حکومت کو بہت کمزور اور بدنام کر دیا تھا۔ پاکستان کے غریب عوام تو وزیراعظم بھٹو کا دم بھرتے تھے ان کے ساتھ تھے۔ مگر پاکستان کے تمام بااثر طبقے جن کا رائے عامہ پر بڑا اثر ہوتا ہے وہ بھٹو صاحب کی حکومت کو بہت بدنام کر رہے تھے۔ خاص طور پر پنجاب میں بھٹو صاحب کی حکومت کو بڑی مشکلات میں ڈال دیا گیا تھا۔ پاکستان کے خفیہ اداروں نے اور عالمی طاقتوں کے خفیہ گٹھ جوڑ نے پنجاب کو بھٹو صاحب کے لئے ایک اکھاڑہ بنا دیا تھا۔ یہ تمام خفیہ قوتیں پنجاب کو وزیراعظم بھٹو کا واٹرلو ثابت کرنا چاہتی تھیں۔ نواب احمد کے قتل کا واقعہ پاکستان میں بھٹو دشمن قوتوں کا سب سے

خطرناک واقعہ تھا۔ یہ ایک سوچا سمجھا واقعہ تھا۔

یہ واقعہ بغیر کسی سازش کے ہرگز نہیں تھا اور یہی وہ سازش تھی کہ جس سازش کے تحت وزیراعظم بھٹو کو تختہ دار پر چڑھایا گیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کے عہدِ حکومت میں تین آدمیوں کے قتل کے واقعات دیکھنے میں آئے تھے۔ ایک ڈاکٹر نذیر کا قتل تھا۔ دوسرا خواجہ رفیق کا قتل تھا۔ تیسرا نواب احمد کا قتل تھا۔ جس طرح کہ ہم نے دیکھا کہ وزیراعظم بھٹو کو نہ تو ڈاکٹر نذیر کے قتل میں ملوث کیا گیا اور نہ ہی خواجہ رفیق کے قتل میں ملوث کیا گیا۔ وزیراعظم بھٹو کو صرف نواب محمد احمد کے قتل میں ملوث کیا گیا۔ جس کا بیٹا احمد رضا قصوری پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا ایک نمایاں کردار تھا۔ جو کچھ تو بھٹو دشمن خفیہ طاقتوں کے بل پر اور کچھ اپنے دماغ کی خرابی کی وجہ سے خود کو بھٹو دشمنی کا اشتہار بنائے ہوئے تھا۔ اسمبلی سے باہر اور اسمبلی کے اندر اس کی بھٹو صاحب کے خلاف ہرزہ سرائی مسلم تھی۔ لہٰذا احمد رضا کا قتل میں یا اس کے باپ کے قتل میں وزیراعظم بھٹو کا نام آسانی سے لیا جا سکتا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے والی فوجی حکومت نے نہ تو ڈاکٹر نذیر کے قتل کی کوئی تحقیق کرائی اور نہ ہی خواجہ رفیق کے قتل کی انکوائری کرائی۔ اس نے صرف اور صرف احمد رضا کے باپ نواب احمد کے قتل کی عدالتی کارروائی کا سلسلہ شروع کیا اور وزیراعظم بھٹو کے بدترین ذاتی دشمن وڈکسائی مولوی مشتاق کو مقدمے کا قاضی القضاۃ بنا دیا۔ مولوی مشتاق بدذات کو بھٹو صاحب کا مقدمہ دینے سے ہی سازش مکمل ہو جاتی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ نواب احمد کا قتل لاہور میں اس وقت کیا جاتا ہے جب پنجاب پر حنیف رامے کی حکومت تھی۔ دوسری بات جو انتہائی اہم بات ہے کہ قتل کی ایف۔ آئی۔ آر میں وزیراعظم بھٹو کا نام بطور قاتل شامل کیا گیا۔ کیا کبھی ایسا ممکن ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی طرح کے ملک میں وزیراعظم پر قتل کا مقدمہ بنا دیا جائے۔ کیا پاکستان میں عدل و انصاف اور جمہوری آزادی کا مظاہرہ صرف نواب احمد کے قتل کے سلسلے میں وزیراعظم بھٹو کی ذات کے ساتھ ہی کیا جانا تھا۔ اس قسم کے عدل و انصاف کا مظاہرہ ڈاکٹر نذیر اور خواجہ رفیق کے قتل میں کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کا ایف۔ آئی۔ آر میں نام درج کرنا ایک کھلی سازش تھی جس کو بیوروکریسی نے اور بھٹو صاحب کے اردگرد خفیہ ایجنسیوں کے لوگوں نے بھٹو صاحب پر ظاہر ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ کیا اس قتل میں صوبہ پنجاب کے وزیراعلیٰ حنیف رامے کا یا ڈی۔ آئی۔ جی وکیل خان کا یا ایس۔ ایس۔ پی لاہور اصغر

www.bhutto.org

خان ہلاکو کا یا آئی جی پنجاب راؤ رشید احمد خان کا نام یا مسعود محمود کا نام شامل کیا گیا۔ ایف۔آئی۔آر میں ان لوگوں کا نام بھی بطور قاتل شامل کیا جا سکتا تھا۔ مگر صرف اور صرف وزیراعظم بھٹو کا نام ہی شامل کیا گیا تھا۔ اس لئے کہ یہ سازش صرف ان کے خلاف کی گئی تھی۔ جس سازش میں کسی نہ کسی اعتبار سے یہ تمام لوگ شامل تھے جن کے میں نے نام درج کئے ہیں۔ ان لوگوں کو اس سازش سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آخر کس قانون کے مطابق ان سرکاری عہدہ داروں نے بھٹو صاحب کے نام کو ایف۔آئی۔آر میں درج کیا تھا۔ کیا احمد رضا قصوری کا بھٹو صاحب کا نام درج کرانے کا مطالبہ اتنا اہم تھا کہ یہ لوگ اس کے سامنے بے بس ہو گئے تھے۔ کون نہیں جانتا تھا کہ احمد رضا وزیراعظم بھٹو کے بدترین سیاسی دشمنوں میں سے ایک تھا۔ جہاں تک اس کے والد کے قتل کا تعلق تھا وہ ایک افسوس ناک مسئلہ تھا۔ مگر اس کے کہنے پر یا اس کے اسرار پر وزیراعظم بھٹو کا نام قتل کے مقدمے میں بطور قاتل شامل کرنا کہاں کی دانش مندی اور کہاں کا انصاف تھا۔ کہاں کی حکمرانی تھی۔ کیا یہ ایک کھلا مذاق نہیں لگتا کہ وزیراعظم بھٹو کی حکومت میں ان پر پنجاب میں قتل کا مقدمہ بنا دیا گیا۔ جہاں تک حنیف رامے کی ذات کا تعلق تھا ان کا بیان اس موقعے پر بے حد تعجب انگیز تھا۔ ان کا بیان تھا کہ احمد رضا ایک ہیجڑا ہے، کھسرا ہے۔ اس کو شہرت حاصل کرنے کی بیماری ہے۔ کیا اس موقعے پر صوبے کے چیف منسٹر کا اس قسم کا بیان دینا دانش مندی تھی جب کہ وہ خود کو دانش ور بھی تصور کرتے تھے۔ آئی۔جی پنجاب محترم راؤ رشید صاحب نے تو اپنی کتاب میں بڑے دھڑلے کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ میں نے ہلاکو خان کو حکم دیا تھا کہ احمد رضا جو بھی یا جس کا نام بھی لکھوانا چاہتا ہے ویسا لکھ دیا جائے۔ کیا احمد رضا راؤ صاحب کا نام لکھوانا چاہتا تو راؤ صاحب اس کی اجازت دیتے۔ میں نے یہ اعتراض راؤ رشید صاحب کی کتاب کی تقریب میں ان کی موجودگی میں کیا تھا جس کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے راؤ صاحب کو کہا تھا کہ وزیراعظم بھٹو کی گردن میں پھانسی کا پھندہ تو حنیف رامے خود راؤ رشید صاحب اور D.I.G وکیل خان اور اصغر خان ہلاکو نے ڈالا تھا۔ ضیاء الحق نے تو صرف پھانسی کا پھندہ کھینچا تھا۔ یہ کام تو بھٹو صاحب کے دوست ہی جلاد ضیاء الحق کی آسانی کے لئے کر گئے تھے۔

راؤ رشید کی بات کو اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ احمد رضا قصوری نے ایف۔آئی۔آر میں بھٹو صاحب کا نام دینے پر ضد کی تھی جس کی وجہ سے بھٹو صاحب کا نام دینا مجبوری بن گیا تھا۔ مگر ان کا

www.bhutto.org

نام ایف۔آئی۔آر میں دینے کے بعد کیا آئی۔جی۔پولیس نے اور اس وقت کے وزیراعلیٰ پنجاب حنیف رامے نے پولیس سے اس قتل کی باقاعدہ انکوائری کرائی تھی۔ ہرگز نہیں کرائی گئی تھی۔ یہ بات ان لوگوں کے سازش میں ملوث ہونے کی پوری پوری تصدیق کرتی ہے۔ کیا مرکز کے اور صوبے کے بھٹو حکومت کے اعلیٰ افسران نے اس کیس کو باقاعدہ انوسٹی گیشن کروانے کی زحمت گوارہ کی تھی۔ بھٹو صاحب کے ساتھی حکمران ٹولے نے اس کیس کی صرف جوڈیشل انکوائری کروانے پر کیوں اکتفا کیا تھا۔ صرف ہائی کورٹ کے جج سے انکوائری کروا کر اس کیس کو کیوں ختم کر دیا تھا۔ بھٹو صاحب کا کہنا تھا کہ مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ یہ کیس ختم کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ صورت حال یہ تھی کہ ہائی کورٹ کی انکوائری کے باوجود ایف۔آئی۔آر جوں کی توں تھانے میں پڑی رہی تھی۔ اس کو خارج کرنے کی نہ کوئی درخواست کی گئی تھی اور نہ ہی اس قتل کیس کے اخراج کی کوئی باقاعدہ قانونی کارروائی کرائی گئی تھی۔ ہائی کورٹ کی انکوائری کے باوجود قتل کیس اپنی جگہ جوں کا توں موجود تھا۔ جس کو مولوی مشتاق اور ضیاء الحق نے اپنے لئے تر نوالہ بنا لیا۔ وزیراعظم بھٹو کے قتل میں میں مولوی مشتاق اور ضیاء الحق کے ساتھ ان تمام لوگوں کو شریک قتل خیال کرتا ہوں جو بھٹو صاحب کے اس دور میں اقتدار میں تھے یا جن کا آئین اور قانون کے ساتھ تعلق تھا۔ اس لئے کے بقول شاعر ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

ترجمہ: مجھے بیگانوں سے کچھ گلہ نہیں ہے کہ میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا
گیا میرے اپنوں نے کیا تھا۔

آج میں ان باتوں کو تحریر کرتے ہوئے سوچتا ہوں کہ شہید عوام ذوالفقار علی بھٹو کی داستانِ الم ناک سے کتنے پوشیدہ راز ہائے درونِ خانہ سامنے آ رہے ہیں۔ جن کو تحریر کرتے ہوئے کلیجہ پھٹتا ہے۔ وزیراعظم بھٹو پر قتل کے اس مقدمے کے باقاعدہ اندراج کے بعد نہ تو بھٹو صاحب کی پنجاب کی حکومت نے اس مقدمے کو عدالتی کارروائی کے ذریعے ختم کرایا اور نہ ہی اس ایف۔آئی۔آر کو عدالت میں چیلنج کر کے اس مقدمے کا خاتمہ کیا گیا۔ یہ امر کس قدر افسوس ناک ہے کہ ان پر اس وقت قتل کا مقدمہ بنایا گیا جب وہ ملتان کے جلسہ عام میں لوگوں کو پاکستان میں

www.bhutto.org

سٹیل مل لگانے کی خوش خبری سنا رہے تھے۔

حنیف رامے کا بھٹو صاحب سے انوکھا مطالبہ

وزیراعظم بھٹو کا خیال تھا کہ کھر اور رامے جن کو وہ اپنی انگلی پکڑ کر سیاست میں لائے ہیں وہ ان کے وفادار رہیں گے یہ ان کی بھول تھی۔ قصہ مختصر رامے صاحب نے بھٹو صاحب کے ساتھ کھلا اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ باقی حکومتی تنازعے تو ایک طرف رہے۔ رامے صاحب نے بھٹو صاحب سے مطالبہ کر دیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی اس سنٹر کمیٹی کا اجلاس بلایا جائے جو 1970ء میں بنائی گئی تھی جس کے رکن میر علی احمد تالپور تھے، جے اے رحیم تھے، خورشید حسن میر تھے، معراج محمد خان تھے اور بعد میں میاں محمود علی قصوری بھی بنا دیئے گئے تھے اور جو کئی ایک وجوہات کی بنا پر پارٹی چھوڑ کر ہی چلے گئے تھے۔

رامے صاحب کا یہ مطالبہ بے حد ٹیڑھا مطالبہ تھا۔ اس لئے کہ سیاست میں جو معاملات وقوع پذیر ہو چکے ہوں۔ ان کو دوبارہ نہیں دھرایا جا سکتا۔ میاں محمود علی قصوری کے پیپلز پارٹی سے علیحدہ ہونے کی تفصیل میں پیچھے بیان کر چکا ہوں۔ مسٹر جے۔ اے۔ رحیم کے پارٹی سے اخراج کا معاملہ یوں پیش آیا تھا۔ جے اے رحیم صاحب پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل تھے۔ وہ اپنی اس حیثیت کے بارے میں کبھی کبھی بہت حساس بن جاتے تھے۔ ان کے مسئلے میں مصیبت یہ تھی کہ وہ تمام زندگی ملک سے باہر رہے تھے۔ ان کا اصل میدان سفارت کاری تھا۔

مسٹر جے۔ اے۔ رحیم کا پارٹی سے نکالے جانے کا واقعہ

سفارت کاری کا میدان مکمل طور پر عوامی زندگی اور عوامی سیاست سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ میدان بیوروکریسی کا میدان ہے۔ ہر سفارت کار صاحب بہادر ہوا کرتا ہے۔ انتہائی غیر عوامی انسان ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کے لگے بندھے اصول ہوتے ہیں۔ جن سے نہ وہ پیچھے ہٹ سکتا ہے اور نہ آگے بڑھ سکتا ہے۔ سیاست ایک روزمرہ کا سبجیکٹ ہے۔ اس میں مصلحتیں اور طرح کی ہوتی ہیں اس کی ضرورتیں اور طرح کی ہوتی ہیں۔ سفارت کار اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں جبکہ سیاست میں کسی عہدے دار کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ اس میں لوگوں کی مرضی

پر انسان کو چلنا پڑتا ہے۔

مسٹر جے اے رحیم ایک عوامی پارٹی کی سیکرٹری شپ کو بھی ایک بیوروکریٹ کی طرح چلانا چاہتے تھے۔ وہ وزیراعظم بھٹو کی کسی مجبوری کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بھٹو صاحب یہ جانتے بھی ہوتے تھے کہ ایک فریق ان کے ساتھ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اس کے باوجود اس فریق کی بات سن لیا کرتے تھے۔ وہ لوگوں کی اصلاح ان کی مقامی سیاست کی طاقت سے کیا کرتے تھے۔ لوگوں پر اپنا فیصلہ مسلط نہیں کرتے تھے۔ ان کے برعکس جے اے رحیم پارٹی کے عہدہ داروں کو ایک سرکاری ملازم کی طرح ٹریٹ کرتے تھے۔ ان میں پہلا نقص تو یہ تھا کہ وہ کسی کو ملتے ہی نہیں تھے۔ اس پر ظلم یہ تھا کہ جو فریق کسی طریقے سے ان تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ اپنے مخالف فریق کے بارے میں جو بھی کہتا تھا رحیم صاحب اس کو سچ مان لیتے تھے اور دوسرے فریق کے خلاف فیصلہ کرنے کا حکم صادر کر دیتے تھے۔ یہ معاملہ اتنا خطرناک نہیں تھا اس کو بھٹو صاحب سنبھال لیتے تھے۔ ان کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ ان کی تمام دوستیاں ملک سے باہر کے لوگوں کے ساتھ تھیں۔ پاکستان میں ان کی بے تکلفی بہت کم لوگوں کے ساتھ تھی۔ ان کی سیاست اور ان کی معلومات کا ذریعہ بھی ان کے باہر کے دوست تھے۔ ان کے باہر کے دوست ایک رومانی قسم کے کمیونسٹ انقلاب کے مفکر ہوتے تھے۔ جو خیالات کے بل پر انقلاب برپا کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر لندن میں ان کا سب سے بڑا مشیر طارق علی خان تھا۔

طارق علی کی طرح کے تمام رحیم صاحب کے دوست فلسفوں کے انقلابی تھے۔ عملی طور پر وہ انقلابی جدوجہد سے لاتعلق لوگ تھے۔ بے حد عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہوئے، غربت مٹانے کی باتیں کرنے والے تھے۔ رحیم صاحب بھٹو صاحب کی حکومت میں کسی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے ان لوگوں کے مشوروں کے مطابق باتیں کرتے تھے جن کا عمل کی سیاست کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ بھٹو صاحب کے اور رحیم صاحب کے درمیان اس طرح کا اختلاف مستقل رہا کرتا تھا۔

پارٹی کے اقتدار کی ابتداء میں ہی رحیم صاحب کا بھٹو صاحب کے ساتھ ذہنی اختلاف بہت بڑھ چکا تھا۔ اسی قسم کی ذہنی فضا کے تناؤ میں وہ واقعہ پیش آ گیا جس واقعہ کی وجہ سے رحیم صاحب پارٹی سے نکال دیئے گئے تھے۔

وہ واقعہ یہ تھا کہ وزیراعظم بھٹو نے پاکستان ممبران اسمبلی اور مرکز کے اہم بیوروکریٹ حضرات کو ذاتی طور پر کھانے کی دعوت پر بلایا جس میں ان کی کیبنٹ کے ممبران وزراء حضرات کو

بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس دعوت میں فوجی جرنیلوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ وزیر اعظم کی طرف سے یہ ایک قسم کا دوستی کا کھانا تھا۔ یہ رات کا کھانا تھا۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ وزیر اعظم بھٹو تقریباً 10 بجے رات تک اپنی کسی حکومتی مصروفیت کی وجہ سے کھانے کی محفل میں نہ پہنچ سکے۔ غالباً ایک چینی وفد کے ساتھ مصروف تھے۔ تمام مہمانوں کو کھانے کا وقت 8 بجے یا شاید 9 بجے کا دیا گیا تھا۔ مگر جب وقت 10 بجے رات سے کچھ منٹ اوپر چلا گیا تو مسٹر جے اے رحیم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ جے اے رحیم صاحب رات کو تھوڑی سی وسکی لیا کرتے تھے۔ اپنی اس عادت میں وہ بالکل انگریز تھے وہ اپنے کوٹے سے زیادہ ہرگز نہیں پیتے تھے۔ اس دعوت میں وہ اپنے کوٹے کے مطابق پی چکے تھے۔ اس کے بعد وہ فوری طور پر کھانا کھانا چاہتے تھے مگر وزیر اعظم کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے مہمانوں کو کھانا نہیں دیا جا رہا تھا۔ ایک تو وہ ویسے ہی غیر عوامی قسم کے انسان تھے۔ دوسرا ان کو نشہ بھی ہو چکا تھا۔ صورت حال ان کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر بھٹو صاحب کے خلاف تقریر کرنے لگ گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھی وزراء کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

انہوں نے ساتھی وزیروں کو کہا کہ تم لوگ بھٹو کے ذاتی ملازم ہو۔ میں ان کا ذاتی ملازم نہیں ہوں۔ ان کا رویہ بادشاہوں کا ہو گیا ہے۔ تم تمام لوگ مہاراجہ آف لاڑکانہ کا انتظار کرنا چاہتے ہو تو کرتے رہو۔ میں ان کا مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ کھانا بہت حساس کھانا تھا۔ وہاں پر کی جانے والی باتیں ریکارڈ ہو رہی تھیں۔ ویسے بھی وزیر اعظم کا تمام عملہ وہاں پر موجود تھا۔ جے اے رحیم تو وہاں سے واک آؤٹ کر کے چلا گیا۔ بدقسمتی دیکھیں کہ جے اے رحیم اپنی کار تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ وزیر اعظم کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ مگر معاملہ خراب ہو چکا تھا۔ وزیر اعظم بھٹو کی دشمن اسٹیبلشمنٹ تو اس طرح کے مواقعے ڈھونڈ رہی تھی۔ جس سے بھٹو صاحب کو پارٹی کے لیڈروں کے خلاف کیا جاتا۔ نوکر شاہی بھٹو صاحب کو تنہا کرنا چاہتی تھی۔ وہ بھٹو صاحب کو اس بات کا یقین دلانا چاہتی تھی کہ نوکر شاہی کے علاوہ ان کا کوئی وفادار نہیں ہے۔ لہٰذا اسی اسٹیبلشمنٹ کے نمائندے سابق آئی۔ جی پولیس سعید احمد خان جس کی شکل پر لعنت برسا کرتی تھی اس نے اس کھانے کے دوران ہی بھٹو صاحب کو جے اے رحیم کی تمام باتوں کو خدا جانے کن معنوں میں بتایا کہ بھٹو صاحب کھانے کے دوران ہی بے حد مشتعل ہو گئے۔ اوپر سے جے اے رحیم کے ازلی دشمن مولوی کوثر نیازی نے سعید احمد خان کی تائید کر کے جلتی پر تیل چھڑک دیا۔ واضح

www.bhutto.org

رہے کہ جے اے رحیم کوثر نیازی کو پروہت کہا کرتا تھا۔ ایک تو رات کا وقت تھا۔ بھٹو صاحب کی طبیعت میں جولانی آ گئی۔ انہوں نے غصے میں سعید احمد کو کہا کہ صبح اس سے استعفیٰ لے لیا جائے۔

سعید احمد کی تو ڈیوٹی ہی یہ تھی کہ بھٹو صاحب کو اسٹیبلشمنٹ کا قیدی بنا دیا جائے۔ وہ صبح سویرے جے اے رحیم صاحب کے بنگلے پر گیا اور اس نے انتہائی غلط اور بیہودہ انداز میں اس سے استعفیٰ پر دستخط حاصل کئے اور اس کو اور اس کے بیٹے کو گرفتار کر کے قریب کے تھانے میں پہنچا دیا۔ سعید احمد نے اتنا بھی انتظار نہ کیا کہ وزیراعظم کے صبح کے موڈ کا اندازہ کر لیا جاتا۔ ہو سکتا تھا کہ صبح وہ اپنے رات کے دیئے ہوئے حکم میں کچھ تبدیلی کر دیتے۔ مگر سعید احمد اس موقعے کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے وزیراعظم کے دفتر میں آنے سے پہلے ہی اپنا کام انجام دے لیا تھا۔ مسٹر جے اے رحیم اس سلوک کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دوسرے دن ہی پاکستان چھوڑ کر لندن چلا گیا۔ اس طرح جے اے رحیم کی رفاقت کا باب بھٹو صاحب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا یا ختم کر دیا گیا۔

رائے صاحب کا یہ مطالبہ کہ سنٹر کمیٹی میں جے اے رحیم کو بلایا جائے ایک ناممکن مطالبہ تھا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی اصل کوشش بھٹو صاحب کے ساتھ جنگ کرنے کی تھی صلح کرنے کی ہرگز نہیں تھی۔

مسٹر خورشید حسن میر بھی وزیراعظم بھٹو کے ساتھ اپنے اختلافات کی بنا پر پارٹی سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ ان کو بلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ میر رسول بخش تالپور، میر علی احمد تالپور، معراج محمد خان اور محمود علی قصوری تو بھٹو صاحب کے خلاف حزبِ اختلاف کے ساتھ رابطہ کر چکے تھے۔ اصغر خان کے اجلاسوں میں جانے لگ گئے تھے ان کا واپس آنا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ بلکہ محمود علی قصوری اصغر خان کی تحریکِ استقلال میں شامل ہو گئے تھے۔

حنیف رامے صاحب ان دنوں لاہور اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ڈیرہ جمائے ہوئے تھے۔ ان کے پیپلز پارٹی چھوڑنے سے تقریباً 2 دن پہلے میں ان کے پاس گیا۔ میں نے ان کو مشورہ دینا شروع کر دیا کہ لوگ وزیراعظم بھٹو کے ساتھ ہیں۔ ان کی وجہ سے ہی آپ اس مقام تک پہنچے ہیں۔ آپ کو لوگ غلط مشورہ دے رہے ہیں۔ انہوں نے میری بات پر بڑی برہمی کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تم کو شرم ہی نہیں آتی۔ بھٹو نے جو تمہارا حال کیا۔ اس کی مجھے خبر ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں ان کو کہا تھا کہ سر اسلم گورداسپوری کی بڑی جدوجہد ہے۔ مجھے حکم دیں کہ میں اس کے لئے

www.bhutto.org

کچھ کروں۔ انہوں نے مجھے کہا تھا۔ اسلم کا تم بہت نام لیتے ہو۔ اس کا دماغ بہت خراب ہے۔ آگے بات کرو۔ میں نے رائے صاحب کو کہا کہ ٹھیک ہے۔ بھٹو صاحب میرے لئے کچھ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے کیا کیا ہے۔ کیا باقی تمام کام آپ بھٹو صاحب کے کہنے کے مطابق کر رہے تھے۔

انہوں نے اس کے جواب میں بالکل جے اے رحیم کی طرح کی بات کی۔ وہ کہنے لگے۔ آپ لوگ بادشاہت کا ساتھ دے سکتے ہیں میں اپنی گردن کٹا لوں گا مگر آمریت کو قبول نہیں کروں گا۔ خدا جانے رائے صاحب نے اس طرح کی باتیں کن کن لوگوں کے ساتھ کی ہوں گی کہ معاملات نہ صرف ان کے پیپلز پارٹی چھوڑنے تک پہنچے بلکہ وہ کھل کر بھٹو صاحب کے سامنے آ گئے۔ رائے صاحب کو اور کھر صاحب کو اس طرح ننگے انداز میں اسٹیبلشمنٹ اور امریکی ذرائع نے وزیراعظم بھٹو کے خلاف استعمال کیا کہ ہر شخص اس بات کا اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ دونوں حضرات جو کل تک ایک دوسرے کا وجود مٹانا چاہتے تھے۔ وہ ایک ہی دن میں اس قدر شیر وشکر کس طرح ہو گئے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے اخبارات میں اعلان کر دیا کہ ہم دونوں تو بہت شریف آدمی تھے وزیراعظم بھٹو ہم کو اپنے مفادات کے لئے لڑایا کرتا تھا۔ اب ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں ہم ان کے چنگل سے آزاد ہو گئے ہیں۔ ہم اب پنجاب کے عوام کو بھی ان کے چنگل سے آزاد کرائیں گے۔ اس اعلان کے بعد ان دونوں حضرات نے مسلم لیگ جائن کر لی۔ واضح رہے کہ پاکستان میں مسلم لیگ اسٹیبلشمنٹ کی ایک ایسی جماعت ہے جو ہر عہد میں کسی نا کسی طریقے سے کسی نا کسی نام سے فوج کی داشتہ کا کام دیتی چلی آ رہی ہے۔ اس طریقے سے ہمارے یہ دونوں ساتھی بھٹو صاحب کے دونوں شاگرد یا جانشین ایک ہی رات میں فرزندِ مسلم لیگ بنا دیئے گئے تھے۔

نوٹ: وزیراعظم بھٹو نے میرے بارے میں دماغ خراب کی جو بات کہی تھی اس کا ایک پس منظر تھا۔ جس سے حنیف رائے صاحب واقف نہیں تھے۔ ابھی چونکہ بات کھر صاحب اور رائے صاحب کے خروج کی چل رہی ہے اس کی تکمیل کے بعد میں اس بات کے پس منظر کو بیان کروں گا جس کی وجہ سے انہوں نے وہ بات کہی تھی۔

امریکا اور اسٹیبلشمنٹ کی کامیاب سیاست

امریکا اور پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ وزیراعظم بھٹو کو سیاست اور حکومت کے معاملات میں تنہا

www.bhutto.org

کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ حنیف رامے صاحب کے اختلافات اس قدر بڑھا دیئے گئے کہ ان پر مقدمات کی بھرما کر دی گئی۔ ان کو سزا سنا کر جیل بھجوا دیا گیا۔ اسٹیبلشمنٹ ایسے پکے کام بھٹو صاحب سے کروا رہی تھی کہ ان کاموں میں کسی صلح کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی تھی۔ رامے صاحب کے سینٹ میں جانے سے ان کی صوبائی اسمبلی کی سیٹ خالی کروا دی گئی تھی۔ بھٹو صاحب کی حزبِ اختلاف اور اسٹیبلشمنٹ نے اپنی شو آف فورس کے لئے ملک غلام مصطفیٰ کھر کو اپنا مردِ مجاہد بنا کر ضمنی انتخاب میں کھڑا کر دیا۔ ضمنی انتخاب ہمیشہ ایک چائے کی پیالی کی طرح کا ہوتا ہے مگر اسٹیبلشمنٹ نے بھٹو صاحب کو خوفزدہ کرنے کے لئے اس کو سمندر کا طوفان بنا دیا تھا۔ میں نے ذاتی طور پر اس ضمنی انتخاب میں مرکزی اور صوبائی حکومت کی کچھ اس قسم کی حرکتیں خود دیکھی تھیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ خفیہ طاقتیں پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار کا جنازہ نکال رہی تھیں۔ وہ اس طرح کی حرکتیں کر رہی تھیں جن کی قطعی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کھر تو خوف کے مارے اپنے ساتھ لوگوں کا ایک لشکر لے کر آتا جاتا تھا مگر مرکزی اور صوبائی حکومت کے وزراء پولیس کی گاڑیوں کے تحفظ میں خوامخواہ ہوٹر مارتے ہوئے تمام دن اس حلقے میں گھومتے رہتے تھے۔ جس کو لوگ ناپسند کرتے تھے۔

ایک طرف تو تمام بھٹو دشمن عناصر اور تمام اپوزیشن کے حامی لوگ اس چھوٹے سے صوبائی حلقے میں جمع ہو گئے تھے۔ دوسری جانب خود حکومت اس حلقے میں اپنی حماقتوں سے اودھم مچائے ہوئے تھی۔ ایک باقاعدہ سازش کے تحت اس صوبائی حلقے کو پانی پت کا میدان بنا دیا گیا تھا۔

مجھے صادق حسین قریشی نے خاص طور پر بلایا اور کہا کہ بھٹو صاحب کا حکم ہے کہ تم ضمنی انتخاب میں تقریریں کرو۔ تم کھر کو جانتے ہو۔ سنا ہے اس نے تمہارے ساتھ زیادتیاں بھی کی تھیں۔ اب موقعہ ہے کہ تم اس سے اپنا انتقام لو۔ میں نے نواب صادق حسین قریشی کو کہا کہ انتقام ونتقام والی کوئی بات نہیں ہے۔ البتہ میں کھر صاحب کی سیاست کے خلاف ہوں اور اپنی تقریروں میں اس کو آڑے ہاتھوں لوں گا۔ میری تقریروں کا جواب کھر صاحب سے اور ان کے ساتھیوں سے نہیں بن پڑے گا۔ مگر میں نے ان کو کہا کہ اس کے لئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں گا۔ آپ اس کے لئے مولانا کوثر نیازی کو میرے ساتھ لگا دیں۔ میں چونکہ اس سازش سے واقف تھا۔ مجھے علم تھا کہ کوثر نیازی اس سازش میں شریک ہے۔ وہ اندر سے کھر کے ساتھ ہے۔ اسٹیبلشمنٹ اس کو اس الیکشن میں کبھی تقریر نہیں کرنے دے گی۔

میرا شبہ صحیح نکلا۔ وزیر اعظم بھٹو کو کہا گیا کہ کوثر نیازی کو ضمنی انتخاب میں لاہور بھیجنے سے کھر کی اہمیت میں اضافہ ہو جائے گا۔ لہٰذا اس کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ صوبائی حکومت خود ہی کھر سے نپٹ لے گی۔ وہ کوثر نیازی جو لاہور میں تقریر کرنے کے لئے لوگوں کو فون کیا کرتا تھا۔ وہ کھر کے انتخاب میں ایک سازش کے تحت لاہور نہ آیا۔

جہاں تک کھر کے انتخاب لڑنے کا تعلق تھا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ حلقہ نمبر 6 میں پیپلز پارٹی بہت مقبول اور مضبوط تھی۔ کھر صاحب ابھی تازہ تازہ اقتدار سے علیحدہ ہوئے تھے۔ عوام میں ان کی شہرت بہت داغدار تھی کوئی سنجیدہ انسان ان کو اس وقت پسند نہیں کرتا تھا۔

ہمارے جلسے بہت رونق والے ہوتے تھے۔ ہمارے انتخابی جلسوں میں مقامی ووٹر شرکت کرتے تھے۔ جبکہ کھر صاحب کے جلسوں میں پورے پاکستان کی حزب اختلاف کی جماعتوں کے باہر کے لوگ جمع ہوتے تھے جن کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کھر صاحب کے ساتھ افتخار تاری کے بدنام زمانے کن ٹٹے قسم کے لوگ ہوتے تھے جن کا تعلق تقریباً اسی علاقے سے تھا۔ لوگ ان کو جانتے پہچانتے تھے جن کی وجہ سے لوگ کھر صاحب کو اچھا تصور نہیں کرتے تھے۔ کھر صاحب کے جلسوں کی حالت بہت کمزور ہوتی تھی۔ کھر صاحب کی ذہنی حالت کا اس بات سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کھر صاحب کے دوست میاں محمد اسلم بیڈن روڈ والے ایک رات کمرشل جم خانہ میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھے کھر صاحب کے خلاف تقریریں کرنے سے منع کیا۔ میں نے ان کو کہا کہ یہ پارٹی کا انتخاب ہے۔ اس انتخاب میں جو بھی پارٹی کے امیدوار کے مقابلے میں ہوگا میں اس کے خلاف تقریر کرنا اپنا جمہوری حق خیال کرتا ہوں۔ میاں اسلم نے مجھے کہا کہ کوثر نیازی نے کھر کے خلاف تقریریں کرنے سے انکار کر دیا ہے تم بھی کر دو۔ میں نے ان کو کہا کہ کوثر نیازی میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔ میں پارٹی کا وفادار ہوں وہ پارٹی کے مخالفوں کا وفادار ہے۔ میری تقریریں کچھ سخت ہوتی تھیں ان کی دھوم زیادہ ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے کھر صاحب کے ساتھیوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری خوش قسمتی یہ ہوئی کہ میری سابقہ بیوی نیر میر جو کھر صاحب کے کیمپ میں شامل تھی یہ فیصلہ اس کی موجودگی میں کیا گیا تھا۔ نیر میر سے میری علیحدگی ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ مگر ہمارے درمیان ایک دوسرے کے لئے عزت احترام کا رشتہ بدستور قائم چلا آتا تھا۔ اس کو کھر صاحب کا یہ فیصلہ

اچھا نہ لگا۔اس کے علاوہ نیّر میر کی نظروں میں اسی انتخاب کی مہم کے دوران ایک واقعے سے میری عزت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔نیّر میر راوی روڈ کے ایک محلے میں کچھ خواتین کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر پر کھر صاحب کی حمایت میں اعلانات کر رہی تھی۔دوسری جانب سے میاں حامد یٰسین اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرہا تھا۔نیّر میر کی ساتھی خواتین کی گاڑیوں کی وجہ سے راستہ بند تھا جس پر میاں حامد یٰسین ایم۔این۔اے نے اعتراض کیا اور راستہ چھوڑنے کے لئے کہا۔دوسری جانب خواتین مشتعل ہو گئیں۔انہوں نے آگے سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔اس کے ردِعمل میں میاں حامد یٰسین اور اس کے ساتھیوں نے بھی جھگڑا کرنا شروع کر دیا۔میرا انتخابی کیمپ اس جگہ کے بالکل سامنے تھا۔میں نے جب آوازیں سنیں تو میں تیزی سے چوک میں گیا۔نیّر میر نے مجھ سے شکایت کی کہ حامد یٰسین نے ہم کو گالیاں دی ہیں۔میں نے میاں حامد یٰسین کو درخواست کی کہ آپ دوسرے راستہ سے چلے جائیں اور وہ چلے گئے۔اس کے بعد میں نے ان خواتین سے کہا کہ اگر حامد یٰسین سے کچھ زیادتی ہوئی ہے تو میں اس کے لئے آپ سب سے معافی مانگتا ہوں۔میری اس بات سے نیّر میر کی ساتھی خواتین خوش ہو گئیں اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اسی رات جب مجھ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو نیّر صاحبہ کو اپنے لیڈروں کا یہ فیصلہ اچھا نہ لگا۔وہ شاید ان لوگوں کو منع نہیں کر سکتی تھی۔مگر اس نے مساوات فون کر کے میرا فون نمبر حاصل کیا اور مجھے فون پر مطلع کیا کہ کل رات کو آپ پر حملہ کیا جائے گا۔آپ اپنا بندوبست کر لیں۔

اس معاملے میں سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہوئی کہ نیّر کے فون کے بعد میں شام کو ٹمبر مارکیٹ قلعہ گجھمن سنگھ کے جلسے میں تقریر کر کے فارغ ہوا تو ڈی۔آئی۔جی وکیل خان مجھے بلا کر پولیس کی گاڑیوں کی طرف لے گیا۔مجھے کہنے لگا کہ ہم کو اطلاع ملی ہے کہ کھر کے غنڈے تم پر آج رات حملہ کرنے والے ہیں۔

تم آج رات اکیلے کہیں نہ جانا، معاملہ بہت خراب ہو چکا ہے۔بس تم ایک آدھ دن احتیاط کر لو۔اس کے بعد معاملات خود بخود درست ہو جائیں گے۔نیّر کے کہنے پر تو مجھے کچھ خوف نہیں ہوا تھا۔مگر وکیل خان ڈی۔آئی۔جی کے کہنے پر میرے دل میں کچھ خوف پیدا ہو گیا۔میں نے تحفظ کے طور پر ایس۔ایم۔مسعود وزیر قانون پنجاب کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔

www.bhutto.org

تاج پورہ کا جلسہ

دوسرے دن شام کو تین بجے ملک غلام مصطفٰے کھر کا تاج پورہ گراؤنڈ میں جلسہ تھا۔ اسی دن وسن پورہ میں شام کو ہمارا بھی انتخابی جلسہ تھا۔ اس جلسے میں مجھے اور ایس ایم مسعود جو اس وقت پنجاب کے وزیر قانون تھے مشترکہ طور پر تقریر کرنی تھی۔ میں احتیاطاً ان کی کوٹھی اپر مال چلا گیا تاکہ ان کی سرکاری گاڑی میں جلسہ گاہ تک پہنچ جاؤں۔ وہاں پر برادرم افتخار احمد فتنہ نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ آج شام کو بھٹو کی حکومت لاہور کے تاج پورہ کے جلسے میں عوام کے خون سے ہولی کھیلنے والی ہے۔ آج کھر کو قتل کر دیا جائے گا۔ آج قائد عوام لاہور کے عوام کو اپنی محبت کا انعام بخشیں گے۔ واضح رہے کہ برادرم افتخار احمد فتنہ حنیف رامے صاحب کی حکمرانی میں راجہ منور احمد کے پرسنل سیکرٹری ہوتے تھے۔ جس حکومت کو تازہ تازہ ختم کیا جا چکا تھا۔ میں حیران تھا کہ مجھے اپنی حکومت ہوتے ہوئے ان باتوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ مگر وہ حکومت سے باہر ہو کر بھی وہ تمام باتیں کئے جا رہا تھا جو بعد میں حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئیں تھیں۔ افتخار احمد فتنہ کی باتوں سے مجھے ڈی۔ آئی۔ جی وکیل خان کی بات یاد آ گئی جو اس نے مجھے کہی تھی کہ ایک آدھ دن تک کھر کا بندوبست کر دیا جائے گا۔

وہاں بیٹھے ہم کو ایس۔ ایم۔ مسعود کے گھر ہی اطلاع مل گئی کہ ہمارا شام کا وسن پورہ کا جلسہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ میرے دل میں کھر صاحب کے جلسے کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا لوگ واقعتاً کھر صاحب کو پسند کرتے ہیں یا ان کو اپنا ہیرو خیال کرتے ہیں۔ میں وہاں سے خاموشی کے ساتھ اٹھا اور رکشے میں بیٹھ کر اپنے ایک دوست عنایت بھٹی کے گھر کی طرف چل نکلا۔ عنایت بھٹی کا گھر تاج پورہ کی گراؤنڈ کے سامنے سڑک کے پار شادباغ کی جانب تھا۔ تاج پورہ گراؤنڈ اس گھر کے بالکل سامنے واقع تھی۔ یہ گھر تین منزلہ تھا جس پر سے ہر چیز صاف اور شفاف دیکھائی دیتی تھی۔ میں گھر کی چھت سے جلسے کا نظارہ کرنے لگ گیا۔ میں نے دیکھا کہ باقاعدہ ٹرکوں پر لاد کر لوگوں کو باہر سے وہاں لایا جا رہا تھا۔ ایک بات میری سمجھ سے باہر تھی کہ وہاں پر جلسہ گاہ کی بائیں اور دائیں جانب پولیس ہی پولیس تھی۔ گویا تمام پنجاب کی پولیس کو وہاں جمع کر دیا گیا تھا۔ جس کی قطعی طور پر کوئی ضرورت نہیں تھی۔ عوام کی حاضری

www.bhutto.org

کے اعتبار سے وہ قطعی طور پر اتنا بڑا جلسہ نہیں تھا کہ جس کے لئے پولیس کا اتنا زیادہ اکٹھ کیا جاتا۔ پولیس کی اتنی بھاری تعداد کی نقل وحرکت نے علاقے پر دہشت تاری کر رکھی تھی۔لوگ سہمے سہمے تھے۔کوئی شخص نعرہ نہیں لگا رہا تھا۔تاج پورہ کی آبادی کے مکانوں کے ساتھ اسٹیج بنائی گئی تھی۔تاج پورہ گراؤنڈ کوئی بہت بڑی گراؤنڈ نہیں تھی وہ تو ایک چھوٹی سی پارک تھی۔جس کو اگر کھچا کھچ بھی بھر دیا جائے تو تین چار ہزار آدمیوں سے زیادہ لوگ اس پارک میں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔جلسے کی اسٹیج کو ایک خاص مقصد کے تحت ایک مکان کے ساتھ بنایا گیا تھا تاکہ کھر صاحب کو پیچھے کی طرف سے اتارا جاسکے۔ یہ جلسہ خفیہ ایجنسیوں کی سازش کے مطابق کیا گیا۔اس جلسے کا مقصد وزیراعظم بھٹو کی ذات کو زیرو بنانا تھا اور کھر صاحب کو ہیرو بنانا تھا۔ پہلے تو جلسے میں لوگ دور دور پھیلے ہوئے تھے۔ اسٹیج پر کچھ لوگ ہجوم کئے ہوئے تھے۔صرف اسٹیج پر مصطفیٰ کھر کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ان کو شیرِ پنجاب اور شیرِ پاکستان کہا جا رہا تھا۔جلسہ گاہ سے نعروں کا جواب بہت کم مل رہا تھا۔ لوگ ڈرے ہوئے تھے۔اتنے میں گاڑیوں کا ایک لشکر آنا شروع ہو گیا۔اس لشکر کے ساتھ ملک کھر صاحب جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔تھوڑی دیر کے بعد کھر صاحب کی تقریر شروع ہو گئی۔کچھ دیر تک کھر صاحب بڑی جوشیلی تقریر کرتے رہے۔ایک دم اسٹیج کی ایک جانب سے کھر صاحب کو کسی نے سانپ پکڑوا دیا۔وہ ایک مردہ سانپ تھا۔کھر صاحب نے سانپ لوگوں کو لہرا کر دکھایا کہ دیکھو میرے جلسے میں سانپ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ جس طرح میں نے اس سانپ کی گردن مروڑ دی ہے اسی طرح میں اس سانپ کی گردن بھی مروڑ دوں گا۔اس سانپ سے ان کی مراد بھٹو صاحب تھی۔بس کھر کا اتنا کہنا تھا کہ پولیس نے جلسہ پر ہلہ بول دیا۔آنسو گیس کے گولے برسنے لگے۔لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگ گئے۔کمزور لوگ اور معصوم بچے لوگوں کے پاؤں کے نیچے آکر کچلے گئے۔پولیس نے اس قدر آنسو گیس کے فائر جلسہ گاہ کی طرف کئے کہ جلسہ گاہ میں دھویں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔کھر صاحب اور ان کے ساتھی اسٹیج سے غائب ہو گئے۔تاج پورہ کے واقع سے خود میرے دل کو بھی انتہائی صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے یہ تمام سین دیکھ کر حکومت سے سخت مایوسی ہوئی تھی۔یہ کارنامہ پارٹی کی حکومت کا منہ کالا کرنے کے مترادف تھا۔لوگوں کے دلوں میں پارٹی کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی سازش تھی۔ایک طرح سے کھر کو جتانے کی سازش بھی ہو سکتی تھی۔

www.bhutto.org

اس سازش میں مارے صرف وہ لوگ گئے جو معصوم لوگ تھے جن کا کچھ گناہ نہیں تھا۔ جلسہ گاہ میں دھواں پھیل چکا تھا۔ آنسو گیس اس قدر فضا میں پھیل گئی تھی کہ مکان کی چھت پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ وہ تاج پورہ کا جلسہ تھا جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اگر کھر صاحب یہ جلسہ کر لیتے تو کچھ قیامت نہیں آجانی تھی مگر چونکہ یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت کیا گیا تھا۔ تاج پورہ کا واقعہ بالکل 12 مئی 2007ء کا کراچی کا ایم کیو ایم کے واقعے کی طرح کا واقعہ تھا جس میں 30 انسانوں کو لقمہء اجل بنا دیا گیا ہے۔ اس واقع سے پورا شہر اداس ہو گیا۔ تاج پورہ کا علاقہ ایک جنگ زدہ علاقہ بن گیا۔ لوگوں میں حکومت کے خلاف نفرت پیدا کر دی گئی۔ اس طریقے سے شیر محمد بھٹی کا انتخاب ایک مشکوک انتخاب بنا دیا گیا۔ پولیس کی اس حرکت سے کھر صاحب کی شکست کو فتح میں بدل دیا گیا اور حکومت کی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا گیا۔

تاج پورہ کے جلسے کے غلط واقع سے پاکستان پیپلز پارٹی اور وزیراعظم بھٹو کی شہرت کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ تاج پورہ کے جلسے میں غلط قوتوں نے لوگوں پر ثابت کیا تھا کہ وزیراعظم بھٹو کوئی ایسی مقدس چیز نہیں ہے جس کو للکارا نہیں جا سکتا۔ پنجاب میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو بھٹو کے لئے چیلنج بن سکتا ہے۔ اس جلسے کے بعد نوکر شاہی نے ایک اور بڑا عجیب کام کیا کہ اسی رات کھر کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کو کسی خفیہ مقام پر پہنچا دیا گیا۔ جس کا نام بعد میں دلائی کیمپ معلوم ہوا تھا۔ کوئی پوچھے کہ ان لوگوں کو دلائی کیمپ میں روپوش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

لاہور ہائی کورٹ میں ان اغوا کئے گئے لوگوں کے بارے میں پنجاب حکومت نے بیان دیا کہ یہ لوگ پنجاب کی حکومت کے پاس نہیں ہیں۔ اس طریقے سے یہ گرفتار شدہ لوگ پنجاب حکومت کے لئے سانپ کے منہ میں کرلی کی مثال بن گئے۔ جن کو نہ چھوڑا جا سکتا تھا اور نہ ہی گرفتار رکھا جا سکتا تھا۔ نوکر شاہی نے اس صورت حال سے گلو خلاصی کرانے کے لئے ان تمام لوگوں کو دلائی کیمپ آزاد کشمیر میں قید کر دیا۔ یہ تمام لوگ ایک طرح کے یرغمال تھے۔ بھٹو صاحب کو کہا گیا کہ کھر کی گردن دبانے کے لئے ان لوگوں کو یرغمال رکھنا ضروری ہے۔ آخر کار ان لوگوں کو اس وقت رہائی ملی جب وزیراعظم بھٹو کا تختہ الٹا دیا گیا۔ اس وقت ان لوگوں کو بھٹو کے ظلم کی داستان کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کے دل میں یہ شک رہ جائے گا کہ بھٹو

کے خلاف سازش نہیں کی گئی تھی۔ وزیراعظم بھٹو کے خلاف یہ سازش 1974ء میں ہی شروع کر دی گئی تھی جو سازش 1977ء کو اپنی تکمیل کو پہنچی تھی۔ اور اس سازش کے تمام کردار اپنا اپنا کردار ادا کرنے میں نمایاں انداز میں دیکھائی دے رہے تھے۔ کوئی ڈھکے چھپے نہیں رہ گئے تھے۔

وزیراعظم بھٹو نوکرشاہی کے حصار میں جکڑ لئے گئے

جے اے رحیم، خورشید حسن میر، رسول بخش تالپور، ممتاز علی بھٹو، ملک غلام مصطفیٰ کھر اور محمد حنیف رامے کے ساتھ وزیراعظم بھٹو کے اختلافات پیدا ہونے سے صرف ممتاز علی بھٹو کو چھوڑ کر باقی تمام کا پارٹی کو چھوڑ کر پیپلز پارٹی کے دشمنوں سے مل جانا وزیراعظم بھٹو کے لئے کسی صدمے سے کم نہیں تھا۔ اس معاملے کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ بھٹو صاحب کے ساتھ جو شخص بھی اختلاف کرتا تھا وہ درمیان کا راستہ ہی چھوڑ دیتا تھا وہ دوسری انتہا کی طرف چل دیتا تھا۔ جس کا نام ذاتی دشمن ہوتا ہے۔

معراج محمد خان کے ساتھ تو ان کے سیاسی اختلافات کی بات سمجھ میں آتی تھی کہ معراج محمد خان کی کمیونیکیشن کا نظام پارٹی سے باہر قائم تھا۔ وہ اپنے آپ کو پاکستان کے نام نہاد کمیونسٹوں کا نمائندہ قرار دیتے تھے۔ وہ اپنے اختلافات کا مرکزی نکتہ جاگیرداری قرار دیتے تھے اور جاگیرداری کو ختم کرنے کے داعی تھے مگر ان کے مقابلے میں ان کا دوسرا جانشین ملک غلام مصطفیٰ کھر تو خود وزیراعظم بھٹو کے جاگیردارانہ طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ لہٰذا کھر صاحب کا بھی اسی ایک ہی انتہا کی جانب چل نکلنا جس جانب معراج محمد خان اور دوسرے لوگ چل نکلے تھے، ایک حیرت ناک بات تھی۔

وزیراعظم بھٹو کی حکومت کی دشمنی میں دائیں اور بائیں کا یہ اتفاق اور اتحاد اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یہ ایک منظم سازش تھی۔ جس کو کوئی خفیہ قوت ایک تسلسل سے پروان چڑھا رہی تھی، اور اس سازش میں شریک تمام کردار مرحلہ وار اپنے اپنے وقت کے مطابق اپنا کردار ادا کرتے چلے جا رہے تھے۔

وزیراعظم بھٹو کو چونکہ نوکرشاہی نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ ان کو پے درپے ایک ہی بات باور کرائی جا رہی تھی کہ ان کی پارٹی میں کوئی ایک لیڈر بھی ان کی ذات کے ساتھ وفادار نہیں

ہے۔ان کی پارٹی اس قابل ہی نہیں ہے کہ ملک کی حکمرانی کے فرائض سرانجام دے سکے۔خاص طور پر حنیف رامے کی بغاوت سے معاملہ بے حد مایوس بن گیا تھا۔

کہو اسلم تم کب سرخ جھنڈا لے کر میرے خلاف نکلو گے

خدا جانے وزیراعظم بھٹو کو کس قسم کی رپورٹس خفیہ ایجنسیاں پیش کرتی تھیں کہ جب حنیف رامے صاحب نے بغاوت کا اعلان کر دیا تو وزیراعظم بھٹو کو اطلاعات دی گئیں کہ پارٹی کے تمام سوشلسٹ ترقی پسند کارکن پارٹی چھوڑ کر حنیف رامے کے ساتھ جا رہے ہیں یا جانے والے ہیں۔

ان دنوں فاروق اعظم کوثر نیازی کی مدد سے وزیراعظم بھٹو کا او۔ایس۔ڈی مقرر ہو چکا تھا۔

لاہور میں ایک روز وہ مجھے خاص طور پر ملا اور مجھ سے دریافت کرنے لگ گیا کہ سنا ہے کہ آپ حنیف رامے کے ساتھ پارٹی چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

میں نے ان کو کہا کہ آپ نے غلط سنا ہے۔میں پارٹی چھوڑ کر جانے والوں میں سے نہیں ہوں۔مجھے انہوں نے کہا کہ آپ نے پھر ٹاؤن ہال میں رامے کے ساتھ تقریر کیوں کی تھی۔میں نے کہا کہ اس وقت رامے صاحب پارٹی میں تھے چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔اس طرح کی صورت حال تھی کہ وزیراعظم بھٹو لاہور گورنر ہاؤس تشریف لائے اور انہوں نے چند ایسے پارٹی کارکنوں کو بلایا جو تھوڑی بہت ترقی پسندی کی شہرت رکھتے تھے یا جن کے بارے میں حنیف رامے کے ساتھ دوستی کا شبہ تھا۔ان کارکنوں میں جن کے نام مجھے یاد آ رہے ہیں ان میں شیر محمد بھٹی تھا، پروفیسر استقلال خان تھا، مرزا اکرم بیگ تھا، بہادر حسن بٹ تھا، میر حامد حسن تھا، اعجاز سیفی اور کچھ اور لوگ بھی تھے۔ہم سب کو وزیراعظم بھٹو کے سامنے پیش کیا گیا۔بھٹو صاحب دوسرے لوگوں میں سے تو کسی سے مخاطب نہ ہوئے۔انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔کہو اسلم تم کب سرخ جھنڈا لے کر میرے خلاف نکلو گے۔میں نے جواب میں کہا کہ سر کیا آپ مجھے بھی کھریا حنیف رامے خیال کرتے ہیں۔میری بات پر وہ مسکرا دیئے۔ان کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہو گئے۔میں چونکہ خلوص و ایمان کے ساتھ ان کا فالوور تھا جس کی ان کی پارٹی میں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔میں نے ایک دن پہلے مساوات میں قطعہ شائع کیا تھا۔میں نے بھٹو صاحب کو قطعہ سنایا۔قطعہ ملاحظہ کریں:

www.bhutto.org

ہے کوئی اور ہی اب ان کا قبلہ
یہ کعبہ چھوڑ کر جو جا رہے ہیں
ہمارے مصطفےٰ کھر اور رامے
یہ مل کر سوشلزم لا رہے ہیں

وزیراعظم بھٹو قطعہ سن کر بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ کارکن باشعور ہیں ان کو پارٹی کے خلاف سازشوں کو سمجھنا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے پارٹی کے بارے میں بڑی مایوس کن بات کی۔ انہوں نے کہا کہ میں پارٹی سے مایوس ہو چکا ہوں۔ اب مجھے سچے لوگوں کو آگے لانا ہوگا۔

بات نوکر شاہی کے حصار سے چلی تھی۔ نوکر شاہی نے بھٹو صاحب پر ثابت کر دیا تھا کہ ان کی پارٹی میں ان کے ساتھ کوئی لیڈر مخلص نہیں ہے۔ وہ جس کو وزارت سے نکالتے ہیں وہ سرخ جھنڈا پکڑ کر ان کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیتا ہے۔ پیپلز پارٹی ابتدا سے ہی تنظیمی اعتبار سے بہت کمزور جماعت تھی۔ اقتدار میں آنے کے بعد اس کی جو شکل بن گئی تھی اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا بھٹو صاحب کو جب پارٹی سے مایوس کر دیا گیا تو بھٹو صاحب نے اپنے تمام کام بیوروکریسی کے ذمے لگا دیئے۔ ان کے لئے صورت حال ہی ایسی بنا دی گئی کہ ان کا تمام انحصار افسر شاہی کی کارکردگی تک مرکوز ہو گیا۔

خاص طور پر 1975ء سے لے کر 1976ء تک ایک سال کے عرصے میں حکومتی معاملات میں پارٹی کا کردار ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ پارٹی کے تنظیمی معاملات بھی بیوروکریسی کے ہاتھ میں آ گئے تھے۔ وزیراعظم بھٹو کے دل میں پارٹی کی نمبر دو لیڈر شپ کے معاملے میں پہلے سے ایک خلا تھا۔ ان کو ایک بات کا گہرا احساس تھا کہ ان کے ساتھ تمام اپ سٹارٹ نوجوان چھوکرے سیاست میں شریک کار ہیں۔ ان کے ساتھ پنجاب کی سیاست کے ہیوی ویٹ سیاست میں شریک نہیں ہیں۔ سیاست کے ہیوی ویٹ ان کے سامنے اپنا سر خمیدہ نہیں کرتے۔ ان کے دل کی اس بے چینی کو ان کے اقتدار نے پورا کر دیا۔

پنجاب کے حکمران طبقے جن کا تعلق جاگیردار سیاست دانوں سے تھا وہ تمام اقتدار پسند جاگیردار وزیراعظم بھٹو کے اقتدار میں شریک ہونا شروع ہو گئے۔ یہ تمام پرانے جاگیردار سیاست

دان فوج کی خفیہ ایجنسیوں کے لوگ تھے۔ ان کو ایک سازش کے تحت پارٹی میں شریک کرادیا گیا۔ خود بھٹو صاحب کے اس احساس کی وجہ سے جس کا ذکر کیا گیا ہے ان کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ وہ سید ھے وزیراعظم ہاؤس جا پہنچے اور بھٹو صاحب کے سیاسی مشیر مقرر ہو گئے۔ حکومت کا تمام کاروبار حیات محمد خان ٹمن، مولوی کوثر نیازی، افضل سعید، سعید احمد خان، مسعود محمود کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ جس کی وجہ سے پارٹی کی اور وزیراعظم بھٹو کی حکومت پاکستان کے عوام سے کٹتی چلی گئی۔

خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو کے سیبوں کا تحفہ

وزیراعظم بھٹو کو لبنان کی حکومت کی طرف سے بے حد خوبصورت اور خوش ذائقہ سیبوں کا تحفہ دیا گیا۔ جو مقدار میں بہت زیادہ تھا۔ وزیراعظم بھٹو کی طرف سے ان سیبوں کو ملک کے کئی ایک اہم لوگوں کو تحفے کے طور پر تقسیم کیا گیا۔ خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو نے اپنی عنایت خاص سے مجھے بھی سیبوں کے تحفے سے مستفیض کیا۔ مجھے بیگم صاحبہ کی اس شفقت سے بہت خوشی ہوئی۔ سیبوں کے اس تحفے سے مجھے یاد پڑا کہ مغل بادشاہِ ہند بہادر شاہ ظفر نے مرزا غالب کو آموں کا تحفہ بھیجا تھا جس کے جواب میں مرزا غالب نے آموں کی تعریف اور بادشاہ کی قدر افزائی کی تعریف میں ایک کمال قصیدہ لکھ کر بادشاہ کو بھیجا تھا۔

میں نے خیال کیا کہ اسلم گورداسپوری تم بھی سخن ور ہو، تاریخی اعتبار سے تمہارے تحفے کی صورت حال بھی مرزا غالب کی طرح کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے ان کو آم آئے تھے تمہیں سیب آئے ہیں لہٰذا تمہیں بھی اس تاریخی روایت کو دہرانا چاہئے۔ تم کوئی عام انسان نہیں ہو کہ محض شکریے کا خط تحریر کر کے ان کی نوازش کی خانہ پری کردو۔ میں نے مرزا غالب کی تقلید میں اپنی شاعرانہ قوت کی مکمل شہ زوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحسینی قصیدہ تحریر کر کے خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو کو وزیراعظم ہاؤس ارسال کر دیا۔ اس وقت اس قصیدے کے چند ٹکڑے یاد آرہے ہیں۔ سیبوں کے زیادہ دیر تک پڑے رہنے سے ان کے خراب ہونے کے ڈر کے بارے میں تحریر کیا۔ اس لئے کہ تحفے کو تو عمر بھر سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ مگر سیبوں کے معاملے میں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

ہے خرابی کا ان کی ڈر ملحوظ
ورنہ تا عمر انہیں رکھوں محفوظ

www.bhutto.org

اے خدا سن فقیر کی فریاد
باغِ نصرت سدا رہے آباد

آخری شعر میں سیبوں کی رعایت سے باغِ نصرت کی آبادی کی دعا شاعری کی صنعت خاص کا ایک اچھا استعارہ تھا۔ بیگم صاحبہ چونکہ فارسی نژاد تھیں۔ انہوں نے اس قصیدے سے حظ اٹھایا۔ انہوں نے یہ قصیدہ بھٹو صاحب کو بھی سنایا۔ میں اس قصیدے کی بات کو بھول بھال گیا۔ اچانک ایک روز محکمہ ڈاک کے جنرل منیجر کا آدمی میرے پاس آیا کہ آپ کا ایک خاص خط وزیراعظم ہاؤس سے خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو کی طرف سے آیا ہے۔ میں آپ کی تصدیق کے لئے آیا ہوں۔ ہم کو حکم ہے کہ آپ کو خط دے کر آپ کے خط کے موصول ہونے کی وزیراعظم ہاؤس میں واپس اطلاع کی جائے۔ 4- مزنگ روڈ پر اس وقت میاں عبدالستار نجم اور چوہدری لیاقت حسین وڑائچ اور کچھ دوسرے دوست میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ محکمہ ڈاک کے اس خاص قسم کے خط دینے کے اہتمام کی وجہ سے ہماری توقعات کا انداز تبدیل ہو گیا۔ ہم نے خیال کیا کہ بھٹو صاحب کی اور بیگم صاحبہ کی مجھ پر کوئی نوازشِ خاص ہونے والی ہے۔ بیگم صاحبہ کے حوالے سے میرا خیال سیبوں کے قصیدے کی طرف جاتا تھا۔ میرے دوستوں کا خیال تھا کہ حکمران شاعروں کو ان کے قصائد کے کلام کے عوض سونے اور موتیوں سے تول دیا کرتے تھے۔ ان پر انعام و اکرام کی بارش کر دیا کرتے تھے۔ لہٰذا ان دوستوں کو میرے موتیوں سے تولے جانے کا یقین واثق ہو گیا۔ ان کا خیال تھا کہ وزیراعظم ہاؤس سے خط کے ذریعے کوئی بھاری رقم کا چیک بھیجا گیا ہے جس کی اتنی تحقیق اور تصدیق کی جارہی ہے۔ رسمی طور پر مجھے بھی ان کے خیالات سے اتفاق تھا۔ ہم اس طرح کی خوش فہمیوں کے گھوڑے دوڑا رہے تھے کہ ڈاک خانے کا کارندہ ایک خوبصورت لفافہ جس کے کناروں پر سنہری تلہ کی باریک ڈوری لگی ہوئی تھی وہ لایا۔ مجھ سے موصول کے دستخط لے کر مجھے دے دیا گیا۔

ہم نے چونکہ حکومتوں کی طرف سے تعریفی مکتوبات کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ لہٰذا اس مکتوب کی غیر معمولی سجاوٹ سے ہماری خوش فہمی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس پیکٹ نما لفافے کو کھولا تو لفافے کے اندر سے میرے قصیدے کے جواب میں بیگم نصرت بھٹو کا تحریر کردہ قصیدہ نکلا۔ جس کے آغاز کا شعر تھا۔

www.bhutto.org

دم وطن دوستوں کا بھرتی ہوں
ان کی میں دل سے قدر کرتی ہوں

جب میں نے اپنے دوستوں کو بیگم صاحبہ کا جوابی قصیدہ پڑھ کر سنایا تو چوہدری لیاقت حسین ایڈووکیٹ جو بے حد بزلہ سنج تھا۔ کہنے لگا کہ تم نے تو بھٹو خاندان کو شاہی خاندان تصور کر لیا تھا کہ قصیدے سے ان سے دولت لوٹنا چاہتا تھا۔ وہ عوامی حکمران ہیں۔ وہ پاکستان کی دولت کو قصیدوں پر نہیں لٹا سکتے۔ انہوں نے تمہارے کلام کے جواب میں کلام بھیج کر تمہارا حساب پورا کر دیا ہے۔ اس نے جو آخری بات کہی وہ اس کی مایوسی کی انتہا تھی۔ وہ بات اس نے پنجابی میں کہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''روندا قصیدیاں نوں۔''

بیگم نصرت بھٹو صاحبہ کی میرے نام تحریر کی گئی تعریفی نظم

16-مارچ1974ء
مکرمی اسلم گورداسپوری
تسلیم!

نکھری نکھری شگفتہ و شاداب
کیا لکھوں ایسی نظم کا میں جواب
فکرِ پاکیزہ دلنشیں زباں
اس میں جذبات جو ہوئے ہیں بیاں
ان کی میں دل سے قدر کرتی ہوں
دَم وطن دوستوں کا بھرتی ہوں
میرا ہر کام اِک علامت ہے
زندگی عزم کی صلابت ہے
چاہتی ہوں کہ ملک کے فنکار
حق و انصاف کی بنیں تلوار

مدعا یہ ہے اے قلم والو
تم قلم سے جہاد کرتے رہو
میں جو آگے بڑھی ہوں تم بھی بڑھو
بڑھ کے تم خدمتِ عوام کرو

مخلص

نصرت بھٹو

(بیگم نصرت بھٹو)

مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں نے بھٹو صاحب کا دل دُکھایا تھا

یہ ایک کہاوت مشہور ہے کہ حاکم کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے کبھی نہیں گزرنا چاہئے۔ مگر ہم نے چونکہ وہ حکمرانیاں ہی زیروزبر کردی تھیں جن سے اس طرح کی کہاوتیں جنم لیتی تھیں۔ ہم پاکستان پیپلز پارٹی کے تمام کارکن بڑی بے باکی کے ساتھ وزیراعظم بھٹو کے سامنے چلے جایا کرتے تھے اور جو بات بھی ہوتی ان سے کہہ دیا کرتے تھے۔ میں نے ان کو کبھی کسی کارکن کے سامنے آکر بات کرنے کا ان کو برا مناتے نہیں دیکھا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کارکن ان کو صرف اپنا چہرہ ہی دیکھاتے تھے وہ نام لے کر اس کارکن کی خیریت دریافت کیا کرتے تھے۔ میں نے یہ خوبی کسی دوسرے سیاسی لیڈر یا حکمران میں کبھی نہیں پائی۔ یہاں تک کہ وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو میں بھی یہ خوبی عنقا تھی۔

حنیف رامے صاحب کی بغاوت کے بعد وزیراعظم بھٹو پارٹی کے لیڈروں سے کچھ دل شکستہ ہو گئے تھے۔ حنیف رامے کی حکومت کے خاتمے کے بعد نواب صادق قریشی جیسے انتہائی غیر سیاسی لوگ پارٹی کی حکومت پر قابض ہو گئے تھے۔

ان کی طرزِ حکمرانی میں پیپلز پارٹی کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اور نہ ہی ان کی طرزِ حکمرانی میں پارٹی کا اور پارٹی کے کارکنوں کا کوئی کردار ہوتا تھا۔ ان کی حکومتی پارٹی بیوروکریسی تھی۔ پنجاب میں صادق قریشی کی حکومت کی وجہ سے وزیراعظم بھٹو کے ساتھ ہم سیاسی کارکنوں کا کوئی رابطہ نہیں رہ گیا

تھا۔ ایک لمبے عرصے تک ان کے ساتھ میرا کہیں آمنا سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔ کھر صاحب اور حنیف رامے صاحب کی حکومتیں غلط رخ اختیار کر گئی تھیں۔ جہاں تک پارٹی کے تنظیمی معاملات تھے وہ تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ تنظیموں کو بے اختیار بنا دیا گیا تھا۔ ہر کام سرکاری ملازم سرانجام دینے لگ گئے تھے۔ جہاں تک پارٹی کے مرکزی اور صوبائی وزراء کا تعلق تھا یہ تقریباً تمام حکومت زدہ ہو گئے تھے۔ ان میں پارٹی کا پہلے والا جذبہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ان کی گردنوں میں حکمرانی کے تناؤ آ چکے تھے۔ میں چونکہ ایک تو شاعرانہ مزاج رکھتا تھا دوسرا وزیراعظم بھٹو کے ساتھ جو میری خصوصی جان پہچان تھی اس کی وجہ سے میں وزیروں کو بہت کم خاطر میں لاتا تھا۔ میں کسی وزیر یا مشیر سے ملتا ہی نہیں تھا۔ جن لوگوں کے ساتھ میری دوستیاں تھیں وہ ایک ایک کر کے اقتدار سے باہر ہو گئے تھے۔ اب ایسا کوئی دوست باقی نہیں رہ گیا تھا جو وزیراعظم بھٹو کو میری یاد دلاتا۔ ان کے ساتھ میرے بارے میں بات کرتا۔ پارٹی کی حکومت کی میرے ساتھ اس لاتعلقی سے میرے اندر بڑی فرسٹیشن پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے اپنی حالت پر افسوس بھی ہوتا تھا کبھی کبھی تو غصہ بھی آتا تھا کہ میں نے جس پارٹی کے لئے اپنی زندگی کی قربانی دی ہے اپنی تمام صلاحیتوں کو قربان کر دیا ہے۔ وہی پارٹی اقتدار میں آ کر میرے ساتھ بدترین سلوک کر رہی ہے۔ پارٹی کی حکومت پارٹی کے بدترین دشمنوں کو نواز رہی تھی مگر مجھے بری طرح نظر انداز کر رکھا تھا۔ حکومت اور پارٹی کے اس رویے کے باوجود میں مساوات اخبار میں مسلسل پارٹی کی حمایت میں مضامین اور قطعات تحریر کرتا چلا آ رہا تھا۔
1975ء کے آخر میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ وزیراعظم بھٹو نے اپنی وزارت اطلاعات سے ان تمام صحافیوں کے نام مانگے جو ان کی حکومت کے حق میں لکھا کرتے تھے۔ اتفاق ملاحظہ کریں کہ ان کی خفیہ ایجنسیوں کے سیل نے ان کو جو لسٹ پیش کی اس پر سب سے پہلا میرا نام تھا۔ مجھے اس بات کا علم وزیراعظم بھٹو کے پرائم منسٹر ہاؤس سے موصول ہونے والے تعریفی خط سے ہوا تھا۔ جس میں خاص طور پر تحریر کیا گیا تھا کہ حکومت کے حق میں لکھنے والوں میں آپ کا نام ٹاپ پر ہے۔

مگر اس تعریفی خط کے بعد نہ تو کبھی بھٹو صاحب نے مجھے ملاقات کے لئے بلایا تھا اور نہ ہی پنجاب کی حکومت نے میرے ساتھ کبھی کوئی رابطہ کیا تھا۔ ایک بار مجھے معروف صحافی احمد بشیر کہنے لگا کہ صرف دو قطعے اپنی حکومت کے خلاف لکھ کر دیکھو دوسرے دن ڈائریکٹر پبلک ریلیشن تمہارے پاس خود چل کر آئے گا مگر میں چونکہ صحافی نہیں تھا پارٹی کا رکن تھا میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں

نے صبر شکر کر کے زندگی گزارنا شروع کر دی۔ میں نے اس بات کو اپنے دل سے ہی نکال دیا کہ میری پارٹی کی حکومت ہے۔

1974ء کے آخر میں میرے دل میں خیال آیا کہ وزیراعظم بھٹو کو کسی موقعہ پر جا کر اپنی شکل دکھانی چاہیے تا کہ ان کو یاد دلایا جائے کہ "کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا۔" یعنی کبھی کوئی شاعرِ عوام بھی ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ وزیراعظم بھٹو عید ہمیشہ لاڑکانے جا کر منایا کرتے تھے۔ میں نے بھی عید لاڑکانے جا کر منانے کا فیصلہ کر لیا۔ صبح عید تھی رات کو میں لاڑکانہ پہنچ گیا۔ لاڑکانہ کی عید گاہ جو المرتضیٰ کے بالمقابل تھی وہاں پر بھٹو صاحب کے ساتھ عید پڑھی۔ بھٹو صاحب عید کی نماز کے بعد نوڈیرو روانہ ہو گئے۔

وہ عید کے دن کا پہلا حصہ نوڈیرو میں منایا کرتے تھے شام کو وہ لاڑکانہ میں کھلی کچہری کیا کرتے تھے۔ نوڈیرو میں بھی ہزاروں لوگوں کی قطار تھی جو ایک طرف سے چلتی رہتی تھی۔ بھٹو صاحب اپنی حویلی کے صحن میں بیٹھ جاتے تھے اور لوگ قطار میں ان کے سامنے سے گزرتے جاتے تھے ان کو سلام کرتے جاتے تھے۔ بھٹو صاحب ہر شخص کے سلام کو بخوشی قبول کر کے اس کو عید مبارک کہتے جاتے تھے۔ اس طرح لوگ حویلی کے دوسرے راستے سے باہر نکل جاتے تھے۔ یہ طریقہ بالکل راجے مہاراجوں کا سا تھا۔ عید مبارک کہنے والے تمام لوگ بھٹو صاحب کے لاڑکانہ ضلع سے ہوتے تھے۔ جن میں اکثریت ان کے انتخابی حلقے کے لوگوں کی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ پورے پاکستان سے بھی بھاری تعداد میں لوگ وہاں پہنچ جاتے تھے۔ عید کے روز وزیراعظم بھٹو صاحب کے ساتھ نوڈیرو اور لاڑکانہ میں ملنا بے حد آسان ہوتا تھا۔

سندھ کے کلچر پر ہندووانہ کلچر کا گہرا اثر اور گہری چھاپ ہے۔ لوگ بڑی انکساری کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر سلام پیش کرتے ہیں۔ پاؤں تک کو چھوتے ہیں۔ ان کے اس انداز میں بے حد عقیدت دکھائی دیتی ہے۔

میں نوڈیرو میں جاکر علی جونیجو اور عبدالرزاق سومرو کے ساتھ ایک طرف بیٹھ کر یہ تمام نظارہ کرتا رہا۔ جس جگہ میں بیٹھا ہوا تھا یہ جگہ بھٹو صاحب کے بالکل سامنے تھی درمیان میں لوگوں کی قطار حائل تھی۔ جب بھی قطار کے لوگوں کو کچھ دیر کے لئے روک دیا جاتا تھا تو بھٹو صاحب سے آنکھیں چار ہو جاتی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا۔ میں نے اُٹھ کر ان کو سلام پیش کیا۔ انہوں نے

www.bhutto.org

سر ہلا کر سلام کا جواب دیا۔ میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا، قطار والا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا۔ واضح رہے کہ قطار میں مرد اور خواتین تمام شامل ہوتے تھے۔ اس طرح یہ سلسلہ تقریباً 2 بجے دن تک چلتا رہا۔ جب تمام لوگ وزیراعظم بھٹو کو سلام پیش کر چکے تو بھٹو صاحب کے لئے کھانا لگا دیا گیا۔ بھٹو صاحب کے حکم کے ساتھ باہر بیٹھے ہوئے تمام مہمانوں کو کھانے کی دعوت دی گئی۔ میں بھی تمام مہمانوں کے ساتھ کھانے والے احاطے میں چلا گیا۔ کھانے والے احاطے میں وزیراعظم کا کھانا ایک میز پر لگا ہوا تھا۔ بھٹو صاحب ایک کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ باقی مہمانوں کے لئے بڑی میز پر کھانا لگایا گیا تھا۔ ہر مہمان پہلے وزیراعظم صاحب کو سلام پیش کرنے کے لئے ان کی نشست کے قریب جاتا تب کھانے کی میز کی طرف آگے بڑھ جاتا تھا۔ میں سب سے آخر میں ان کی نشست کے قریب پہنچا سلام پیش کیا۔ بھٹو صاحب نے بڑے تعجب کے انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا کہ تم اسلم گورداسپوری ہو۔ میں نے کہا کہ جی ہاں ایکسی لینسی میں ہی اسلم گورداسپوری ہوں۔ ان دنوں شاید مجھ پر کچھ موٹاپا طاری ہو چکا تھا۔ وہ فرمانے لگے کہ حکومت کیا ملی ہے کہ تمام پارٹی کے کارکن پھٹنے والے ہوتے جا رہے ہیں۔ میں تو تم کو پہچان ہی نہیں سکا۔ تم تو بہت موٹے ہو گئے ہو۔ بہت تندرست ہو گئے ہو۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا میں نے حکومت سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا تھا۔ پارٹی کی حکومت کو بنے چار سال ہو چکے تھے۔ میں تو مسلسل عتاب میں ہی تھا۔ مساوات میں کام کر کے اپنی گذر بسر کرتا تھا۔ میری ذہنی کیفیت کچھ تلخ تھی۔ میں تو اپنی زبوں حالی وزیراعظم بھٹو کو دکھانے گیا تھا۔ ان کو اپنی بدحالی کی شکایت کرنے گیا تھا۔ اپنے نظر انداز کئے جانے کا گلہ کرنے گیا تھا۔ میرے اندر بہت تلخیاں تھیں میں ان کے اس مذاق کو اپنی تنگ ظرفی کی بنا پر برداشت نہ کر سکا۔ مجھے ان کا یہ مذاق ایک قسم کا استہزا محسوس ہوا۔ اگر وہ استہزا بھی تھا تب بھی مجھے کسی بھی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ افسوس کہ میرے اندر فرسٹیشن اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ لفظ تندرست مجھے کچھ چُبھ سا گیا۔ میں نے آگے سے کہا۔ یور ایکسی لینسی میرا صرف جسم ہی تندرست نہیں میرا ذہن بھی تندرست ہے۔

میرا یہ جواب انتہائی غلط اور احمقانہ تھا۔ اگر میری خواہش ان سے گلہ گزاری کی تھی تو اس کا یہ طریقہ ہرگز مناسب نہیں تھا۔ یہ سراسر بدتمیزی تھی۔ وزیراعظم بھٹو کو میرا غیر متوقع قسم کا غلط جواب سن کر بڑا غصہ آیا۔ وہ غصے سے لال پیلے ہو گئے۔ خدا گواہ ایک لمحے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ مجھے اپنی

www.bhutto.org

کھانے کی پلیٹ مارنے لگے ہیں۔ انہوں نے غصے سے کہا کہ تم سب لوگوں کا ذہن تندرست ہے۔ ایک میں ہی سِک مائنڈڈ ہوں۔ یوفول تم کو علم ہی نہیں کہ تم کیا بک رہے ہو۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی طبیعت پر قابو پالیا۔ مجھے میری غلطی کا احساس ہوگیا۔ میں نے فوراً کہاں۔ سائیں بے کار گھوڑا ہوں پھیل گیا ہوں۔ میری اس بات پر وہاں پر کھڑے تمام لوگ ہنسنے لگے۔ خود بھٹو صاحب بھی مسکرا دیئے اور مجھے کہنے لگے۔ کھانا کھاؤ۔ میں جب کھانا کھا رہا تھا تو مجھے ممتاز علی بھٹو جو ان دنوں وزارتِ اعلیٰ سے معزول ہو چکے تھے۔ اندر سے بھٹو صاحب کے ساتھ ناراض ناراض تھے۔ کہنے لگے کہ تم نے کل کا اخبار نہیں پڑھا تھا۔ میں نے ان کو کہا کہ میں بذریعہ ریل آیا ہوں۔ میں کل کا اخبار نہیں پڑھ سکا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کل ولی خان نے بھٹو صاحب کے خلاف بیان دیا تھا کہ بھٹو ایک بیمار ذہنیت کا آدمی ہے۔ اوپر سے تم نے بھی اس بات سے ملی جلی بات کہہ دی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کو غصہ آ گیا۔ ممتاز بھٹو کی اس بات سے میری پریشانی میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ کھانے کا سلسلہ ختم ہوگیا تمام لاڑکانہ کی طرف روانہ ہونے لگ گئے۔ میں بھی لاڑکانہ آ گیا۔ عبدالرزاق سمرو نے مجھے مشورہ دیا کہ شام کو بھٹو صاحب کو مل کر معافی مانگو۔ وہ خوش ہو جائیں گے۔ شام تک میں بڑی مصیبت سے دوچار رہا۔ سوچتا رہا کہ ان کے ساتھ کس طریقے سے بات کروں۔ شام کو جب میں المرتضیٰ پہنچا تو پہلے بھٹو صاحب باہر سڑک پر کھڑے ہو کر لوگوں کی درخواستیں خود وصول کر رہے تھے۔ مجھے ان کا یہ عوامی انداز بے حد پسند آیا۔ میں نے ان کے قریب پہنچ کر ان کے نعرے لگوانا شروع کر دیئے۔ لوگوں نے میرے نعروں کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ جواب دیا۔ جب وہ تمام لوگوں کی درخواستیں وصول کر چکے تو وہ المرتضیٰ کے اندر چلے گئے۔ وہاں بھی وہی نوڈیرو والا قطار کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ لوگ قطار میں چل کر بھٹو صاحب کو عید مبارک کہنے لگ گئے۔ اصل مسئلہ لوگوں کا اپنی شکایات پیش کرنے کا تھا۔ عید تو ایک بہانہ تھی۔ وزیر اعظم بھٹو نے ضلع کے تمام افسران کو اپنے ساتھ بٹھا رکھا تھا۔ ان کے علاوہ بھٹو صاحب نے میر مرتضیٰ بھٹو کو اپنے ساتھ بٹھا رکھا تھا۔ ان کو لوگوں کے مسائل سننے اور ان کو حل کرنے کی تعلیم دی جا رہی تھی۔

میں خود بھی بھٹو صاحب سے ملاقات کے لئے فریادیوں کی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ قطار آہستہ آہستہ چلتی رہی بالآخر میں وزیر اعظم بھٹو کے سامنے آ گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر بڑی محبت سے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ میں نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ انہوں نے انگریزی میں کہا۔ تم تو میرے مہمان ہو تم

www.bhutto.org

کو قطار میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ مجھ سے پوچھا۔ آجکل کیا کرتے ہو۔ میں نے کہا۔ سر وہی پرانا کام مساوات میں مضمون اور قطعے لکھتا ہوں۔

فرمانے لگے۔ بہت جلد میں تمہیں اسلام آباد بلاؤں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آپ سے واپس لاہور جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ میں صرف آپ کو قریب سے دیکھنے آیا تھا میرا مقصد پورا ہو گیا ہے۔

وزیر اعظم بھٹو کا مجھے اپنے ساتھ سری لنکا لے کر جانا

اس ملاقات کے کچھ عرصہ بعد مجھے مساوات اخبار میں اطلاع دی گئی کہ تم کو وزیر اعظم کے سری لنکا کے دورے میں مساوات کی طرف سے بطور صحافی وزیر اعظم کے ساتھ جانا ہے۔ اس میں مزید خوشی کی بات یہ ہوئی کہ اس دورے میں مساوات کے اس وقت کے ایڈیٹر میرے استاد بابا ظہیر کاشمیری کو بھی شریک کیا گیا تھا۔ ہم دونوں استاد شاگرد وزیر اعظم بھٹو کے ساتھ سری لنکا پہنچ گئے۔ میں نے اس دورے کی لحہ بہ لحہ کارروائی کو لکھنا شروع کر دیا۔ میرے خیال میں آیا کہ میں عام جرنلسٹ نہیں ہوں۔ میں پارٹی کا کارکن ہوں مجھے اس دورے کی کارروائی کو خصوصی توجہ کے ساتھ تحریر کرنا چاہئے۔ آغا شاہی اس وقت پاکستان کے سیکرٹری خارجہ تھے اور وہ ہمارے ساتھ تھے۔ گاہے بگاہے وہ پاکستان کے تمام صحافیوں کو ہدایات بھی دیتے تھے۔ ہمارا یہ دورہ چار روز کا تھا۔ وزیر اعظم بھٹو کی عادت تھی کہ وہ اپنے دورے میں زیادہ لوگوں کو ساتھ لے کر نہیں جایا کرتے تھے۔ مسز بندرانائیکے جو اس وقت سری لنکا کی وزیر اعظم تھی اس نے خاص طور پر وزیر اعظم بھٹو کی اس معاملے میں تعریف کی تھی کہ ہمارا خیال تھا کہ پاکستان ایک بڑا ملک ہے وزیر اعظم کے ساتھ بہت زیادہ مہمان آئیں گے مگر وزیر اعظم بھٹو نے ہم کو حیران کر دیا وہ بہت کم لوگ اپنے ساتھ لائے ہیں۔

آغا شاہی حکومت سری لنکا کی ہر تقریب میں مجھے نوٹس تیار کرتا دیکھتے تھے۔ دوسرے دن ہم لوگ جب سری لنکا کے فادر آف نیشن مسٹر نائیکے کے گاؤں ان کے مقبرے کو دیکھنے گئے تو میں نے ان کے مقبرے پر جو تحریر تھی اس کو اپنی دائری میں اتارنا شروع کر دیا۔ وہ تحریر پنڈت نہرو کے الفاظ میں تحریر کی گئی تھی۔ واضح رہے کہ مسٹر نائیکے کو سری لنکا کی آزادی کی جنگ میں شہید کر دیا گیا تھا۔ جب میں وہاں سے فارغ ہو کر مسٹر نائیکے کے محل کو دیکھنے کے لئے سیڑھی چڑھ رہا تھا تو مسٹر آغا شاہی

نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ آپ کا نام۔ میں نے ان کو اپنا نام بتایا۔ کہنے لگا۔ تمہارا اخبار کونسا ہے۔ میں نے مساوات کا نام لیا۔ مجھے کہنے لگا کہ تمہاری طرح دوسرا کوئی اخبار نویس اتنی محنت سے دورے کے محرکات کو تحریر نہیں کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ صرف جرنلسٹ ہیں میں پارٹی کا کارکن بھی ہوں۔ اس طرح آغا شاہی کے ساتھ بڑی بے تکلفی ہو گئی۔ آغا شاہی نے میرا نام اپنی نوٹ بک میں تحریر کر لیا۔ دورے کی تقریبات چلتی رہیں۔ تیسرے دن مسز بندرا نائیکے نے ایک دعوت خاص کا وزیراعظم بھٹو کے اعزاز میں اہتمام کیا۔ اس میں وفد کے چند گنتی کے لوگوں کو جانا تھا۔ آغا شاہی نے وزیراعظم کو صحافیوں کی جو لسٹ دی اس میں میرا نام سرِ فہرست تھا۔ بھٹو صاحب نے سوچا کہ آغا شاہی نے ان کو خوش کرنے کے لئے میرا نام سرِ فہرست تحریر کیا ہے۔ انہوں نے آغا شاہی کو کہا کہ یہ گورداسپوری تو شاعر ہے۔ آپ نے اس کا نام صحافیوں میں شامل کر کے سب سے پہلے اوپر تحریر کر دیا ہے۔ اس کی کوئی وجہ۔ آغا شاہی نے وزیراعظم بھٹو کو کہا کہ سر میں اس صحافی کو جتنی محنت کرتا دیکھ رہا ہوں اتنی اور کوئی نہیں کر رہا۔ میں اس کے کام سے بہت مطمئن ہوا ہوں اس وجہ سے میں نے اس کا نام اوپر تحریر کیا ہے۔ اصل میں ہوتا یوں تھا کہ ہمارے اخبار نویس صرف حکومت سری لنکا سے پروگرام حاصل کر کے اپنی خبریں ارسال کر دیتے تھے اس کے علاوہ وہ فارغ ہوتے ہی کھانے پینے میں مصروف ہو جاتے تھے یا گھومنے پھرنے چلے جاتے تھے۔ وہ دورے کی کارروائی کی تفصیل تحریر نہیں کرتے تھے۔ میں باقاعدہ تفصیل تیار کرتا تھا۔ میں جب سری لنکا کی اسمبلی میں گیا تو میں نے اسمبلی کے اسپیکر سے ملاقات کی۔ وزیراعظم بھٹو کے ساتھ ان کی ملاقات کی تفصیل حاصل کی۔ اسی طرح کولمبو شہر کے میئر سے بھٹو صاحب کے بارے میں تعریفی بیان حاصل کیا۔ مسز بندرا نائیکے سے وزیراعظم بھٹو کے بارے میں چلتے چلتے پوچھا کہ وہ ان کو کس طرح دیکھتی ہیں۔

اس کا جواب تھا:

(He is a excellent man and leader of the third world)

میں ان کی میزبانی پر فخر کرتی ہوں۔ آغا شاہی مجھے یہ سب کچھ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آغا شاہی کچھ اصول کا آدمی تھا۔ وہ میرا کام پسند کرتا تھا۔ وزیراعظم بھٹو نے ان کو حکم دیا کہ مساوات سے اسلم کو بلا لو باقی صرف ایڈیٹر بلائے جائیں اس سے کم عہدے کے صحافی اس مجلس میں نہ بلائے جائیں۔

www.bhutto.org

آغا شاہی نے مجھے کہا کہ وزیراعظم تو آپ کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ کہنے لگے کہ اب جو دعوت ہے اس میں صرف اخبارات کے ایڈیٹر کو شریک کیا گیا ہے۔ اس میں صرف آپ ہی ایک ایسے مہمان صحافی ہوں گے جو ایڈیٹر نہیں ہیں۔ یہ خصوصیت صرف آپ کی ذات تک ہی محدود ہے اور وزیراعظم کی اجازت اس میں شامل ہے۔ مگر جہاں تک میرا تعلق تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ بابا ظہیر کاشمیری جو میرے استاد تھے ان کو یہ مقام نہ دیا جائے۔ وہ ویسے بھی ایڈیٹر تھے۔ میں نے آغا شاہی کو کہا کہ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ میرے لئے اتنا اچھا سوچ رہے ہیں۔ میں نے یہ تو نہ بتایا کہ ظہیر صاحب میرے استاد ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے اخبار کے ایڈیٹر کا اس مجلس خاص میں نہ جانا اچھا نہیں لگتا۔ مہربانی فرما کر آپ وزیراعظم کے فرمان میں میری وجہ سے تبدیلی پیدا نہ کریں۔ مساوات کے بھی ایڈیٹر کو شرکت کی دعوت دیں۔ یہ ایک اصولی بات ہے۔ آغا شاہی اپنی عینک اتار کر میری طرف دیکھنے کے بعد بولا "یو آر ویری سٹرینج مین" تم بہت عجیب وغریب آدمی ہو۔ وہ وہاں سے دوبارہ بھٹو صاحب کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس ہوٹل کے ہال میں آ گئے۔ تیزی سے سیدھے میرے پاس آ گئے۔ کہنے لگے کہ میں نے آپ والی بات وزیراعظم کو کہہ دی ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ مساوات کے ایڈیٹر کو شریک کیا جائے۔ وہ بہت خوش ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھے کہا ہے کہ اس کی دیکھ بھال اچھی طرح کریں۔ اس کے بعد آغا شاہی نے میرے استاد بابا ظہیر کاشمیری کو خود تمام بات سے آگاہ کیا۔ بابا جی اپنی شرکت کا سن کر بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ وہاں کی تمام کارروائی رقم کر کے لائیں گے۔ مگر وہ کارروائی لکھ کر تو نہ لائے ان سے میں نے زبانی پوچھ کر اس مجلس کے نوٹس بنا لئے تھے۔

آغا شاہی کو میں نے کچھ تجاویز دیں

ایک صبح جب میں ہوٹل کے کمرے میں اخبار پڑھ رہا تھا تو اخبار میں ایک پاکستانی شہری کی گرفتاری کی خبر ایک بڑی سرخی کے ساتھ پڑھنے میں آئی۔ گرفتار پاکستانی ایک بڑا کاروباری آدمی تھا لینے دینے کے معاملے میں اس کو کسی نے اندر کروا دیا تھا۔ اس کی ضمانت دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ آغا شاہی کا کمرہ میرے ساتھ تھا۔ میں اخبار لیکر اس کے کمرے میں گیا۔ میں نے اس کو کہا کہ اس پاکستانی کی ضمانت کرانے کی سری لنکا کی حکومت کو سفارش کرنی چاہئے۔ آغا شاہی

www.bhutto.org

بنیادی طور پر تو ایک بیوروکریٹ تھا۔ کہنے لگا ہم کو کسی دوسرے ملک کے قانونی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ پاکستانی تو ہر جگہ اندر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے اس کو کہا کہ آغا شاہی صاحب اس آدمی کو جیل سے باہر لانے میں وزیراعظم بھٹو کی عزت میں اضافہ ہوگا۔ خود سری لنکا کی حکومت کی نظر میں بھٹو صاحب کا بڑا امیج بڑھ جائے گا کہ پاکستان کا وزیراعظم اپنے شہریوں کے لئے کس قدر حساس ہے۔ وہ فرمانے لگے۔ ہمارا قاعدہ ہے کہ ہم وزیراعظم کے علم میں لائے بغیر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ میں تمہارے حوالے سے یہ بات ان کے نوٹس میں لا دوں گا۔ اگر وہ کہیں گے تو ہم اپنی ایمبیسی کو اس کی مدد کا کہہ دیں گے۔

اسی دن دوپہر کو سیلون ریڈیو اسٹیشن جانا تھا۔

ریڈیو سیلون

سیلون ریڈیو اسٹیشن ہم پاکستانیوں کے لئے ایک بہت مانوس ریڈیو اسٹیشن تھا۔ خاص طور پر بابا ظہیر کاشمیری اور جناب ظہیر احمد بابر مرحوم اور کہنہ مشق جرنلسٹ برکی اور میں خود اس ریڈیو اسٹیشن کو دیکھنے کے لئے بہت جذباتی تھے۔ وزیراعظم بھٹو اس تاریخی ریڈیو اسٹیشن میں چند منٹ کے لئے تشریف لائے۔ ریڈیو اسٹیشن کے تاریخی رجسٹر میں اپنے تعریفی کلمات تحریر کئے اور وہاں سے وہ سری لنکا میں تعینات یورپی سفیروں کی دعوت میں چلے گئے۔ اس دعوت میں اخبارنویسوں کو نہیں بلایا گیا تھا۔ ہم لوگوں کو وقت مل گیا کہ ہم ریڈیو اسٹیشن کو تسلی سے دیکھ سکیں۔ ہماری خواہش کے مطابق ہم کو کلاسیکل گانوں کے شعبے میں لیجایا گیا۔ پہلی فرمائش ظہیر بابر کی تھی اس کے بعد برکی صاحب نے اپنی پسند کا گانا سنا۔ اس کے بعد میری فرمائش پر استاد بڑے غلام علی خان کی جنگلی بھیروں سنی گئی۔ واضح رہے کہ اس وقت تک میں نے استاد بڑے غلام علی خان کا گانا کبھی نہیں سنا تھا صرف ان کا نام ہی سن رکھا تھا۔ یہ جنگلی بھیروں ٹھمری ٹھاٹھ میں تھی جس کے بول تھے۔

کالے بادل برس گئے   آ جا بلم پردیسی

نوٹ: یہاں پر ایک بات تحریر کرنا انتہائی ضروری ہے کہ پاکستان ریڈیو پر استاد بڑے غلام علی خان کے گانوں کو نشر کرنے پر پابندی تھی۔ ان کو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل زیڈ۔اے۔ بخاری نے پاکستان چھوڑ کر ہندوستان چلے جانے کے جرم میں پرسونا نان گریٹا قرار دے دیا تھا

www.bhutto.org

یعنی ناپسندیدہ انسان قرار دے دیا تھا۔

کولمبو میں اتفاق کی بات تھی کہ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ استاد بڑے غلام علی خان کا گانا مجھے خواب کی طرح کا لگا۔ اس سے پہلے میں نے اس طرح کا جادو بھرا گانا کبھی نہیں سنا تھا۔ بابا ظہیر کاشمیری چونکہ کلاسیکل گانے کو سمجھنے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے موسم کی رعایت سے ایک گانے کی فرمائش کی جس کے بول تھے۔ ''ماہی ناں جاناں جاناں جاوے۔ بوندا تے برس رہیاں''

سیلون ریڈیو کا انچارج جو ایک ماہرِ موسیقی تھا وہ بابا ظہیر کاشمیری سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے بابا ظہیر کاشمیری سے ریڈیو اسٹیشن سیلون کے بارے میں پیغام حاصل کیا اور اس کو ہماری موجودگی میں ہی نشر کر دیا گیا۔ بابا ظہیر کے لئے کہا گیا برصغیر کا نامور دانش ور ترقی پسند شاعر ادیب آج ریڈیو اسٹیشن سیلون میں تشریف رکھتے ہیں۔ اب آپ ان کی آواز سماعت فرمائیں گے۔

میں نے ریڈیو اسٹیشن کے اطلاعات کے شعبے سے ریڈیو اسٹیشن کے قیام کی تاریخ اور مختلف ادوار میں اس کی ترقی کے مراحل کے واقعات کی تفصیل حاصل کی۔ ریکارڈ شدہ گانوں کی تعداد حاصل کی۔ سیلون ریڈیو اسٹیشن مجھے سری لنکا کا کم لگتا تھا زیادہ ہندوستان کا لگتا تھا۔ شاید ہندوستان کے ریڈیو اسٹیشن کے پاس بھی ریکارڈوں کا اتنا ذخیرہ نہیں ہوگا جتنا سیلون ریڈیو اسٹیشن کے پاس ہندوستان کے گانوں اور معلومات کا ذخیرہ تھا۔ دنیا کے ہر گانے والے کی آواز سیلون ریڈیو اسٹیشن میں موجود تھی۔ یہاں پر یہ بات قابلِ ذکر ہوگی کہ میں واحد پاکستانی صحافی تھا جو پروفیشنل صحافی بھی نہیں تھا۔ جس نے سیلون ریڈیو اسٹیشن کی تمام معلومات حاصل کی تھیں اور ان کو مساوات میں قسط وار شائع کیا تھا۔

پاکستانی شہری کی رہائی

شام کو آغا شاہی نے مجھے بتایا کہ وزیراعظم نے حکم دیا ہے کہ گرفتار پاکستانی کی مدد کی جائے۔ پاکستان کی ایمبیسی کو کہا گیا کہ اس شخص کی ضمانت کروائی جائے۔ دوسرے دن بعداز دوپہر وہ شخص کولمبو کے پرل کانٹی نینٹل میں ہمارے درمیان موجود تھا۔ وہ بے حد جذباتی ہو چکا تھا۔ وہ پاکستان کے وفد کے ہر آدمی کے پاؤں چھو رہا تھا۔ ایک ہی بات کہے جا رہا تھا۔ میں بھٹو صاحب کے پاؤں چومنا چاہتا ہوں۔ آغا شاہی اس شخص کو ہوٹل کے ہال میں لے آیا جہاں پاکستان کے تمام صحافی موجود تھے۔

www.bhutto.org

وہاں آغا شاہی نے انکشاف کیا کہ کل صبح اسلم گورداسپوری نے مجھے اس کی رہائی کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے وزیراعظم سے اس بات کا ذکر کیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اس پاکستانی کو رہا کرایا جائے۔ اس کی رہائی کا اصل محرک اسلم گورداسپوری ہے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس شخص کے رہا ہونے کی خبر یا کہانی بھی میرے حوالے سے صرف مساوات میں شائع ہوئی تھی کسی دوسرے اخبارنویس نے اس کا ذکر تک نہ کیا تھا۔ شاید وہ اخبارنویس اس بات کی اہمیت سے واقف نہیں تھے۔

وزیراعظم بھٹو کا بندرانائیکے کے اعزاز میں بنکویٹ

حکومتی آداب کے مطابق مسز بندرانائیکے کے بنکویٹ کے بعد آخری شب وزیراعظم بھٹو نے پاکستان کی جانب سے مسز بندرانائیکے کو بنکویٹ دیا۔ مسز بندرانائیکے کی دعوت کے صدارتی خطبے میں سری لنکا کے سینئر مرکزی وزیر نے علامہ اقبال کا ذکر کیا تھا۔ خود مسز بندرانائیکے نے کہا تھا کہ وہ علامہ اقبال کی طالب علم ہیں اور ان کے کلام کا انگریزی ترجمہ پڑھتی ہیں۔ اس نے کہا کہ کاش ایسا ہوتا کہ ہم آپ کو علامہ اقبال کا کلام آج سناتے۔

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

رات کو جب مسز بندرانائیکے بھٹو صاحب کی مہمان تھیں تو بھٹو صاحب نے مسز بندرانائیکے کو کہا کہ ہم آپ کی خواہش کو پورا کیے دیتے ہیں۔ ہم آپ کو علامہ اقبال کا کلام سنا دیتے ہیں۔ میری نشست وزیراعظم بھٹو کے دائیں جانب تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور مجھے کہنے لگے کہ علامہ اقبال کی وہ نظم تم کو یاد ہے۔ ''جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی، اس کھیت کے ہر خوشہء گندم کو جلا دو''۔ میں نے کہا۔ بالکل سر مجھے یاد ہے۔ کہنے لگے کہ سناؤ۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے خود اعلان کیا کہ معزز مہمانانِ گرامی ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال کے شعر ملاحظہ کریں۔

انہوں نے ملک اختر جو مرکزی وزیر تھے ان کو کہا کہ ترجمہ کرو۔

میں نے جب پہلا شعر پڑھا۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

www.bhutto.org

ملک اختر اس شعر کا صحیح طریقے سے ترجمہ نہ کر سکا۔ وزیراعظم بھٹو نے انقلابی انداز میں اس شعر کا خود ترجمہ کیا۔ انہوں نے دوسرے مصرعے کا کچھ اس طرح جذباتی انداز میں انگریزی میں ترجمہ کیا کہ پورا ہال تالیوں سے گونجنے لگ گیا۔ ان کا ترجمہ تھا۔ ڈائنامیٹ دی وال اینڈ پلرز آف دا ایکسپلائٹرز۔

Dynamite the walls and pillars of the exploiters.

اگلے شعر میں لفظ شین کی تکرار پر ملک اختر پھنس گیا۔ ملک اختر پرانے لاہوریوں کی طرح سین کو شین بولا کرتا تھا۔ جب اس نے کنجشکِ فرومایہ کا ترجمہ کیا تو وہ لٹل سپارو کو شپارو بول رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھ جانے کا کہا۔ اس کے بعد انہوں نے تمام نظم کا خود ہی ترجمہ کیا۔

جب میں نظم پڑھ چکا تو امریکہ کے سفیر نے اٹھ کر بڑے ادب سے داد دینے کے انداز میں کہا کہ مسٹر پرائم منسٹر "اِٹ از اے ٹیری بل سانگ" (It is a terribale Song) یہ ایک خوفناک گیت ہے۔

وزیراعظم بھٹو نے اس کے جواب میں کہا۔ "اٹ از ناٹ ٹیری بل سانگ۔ اٹ از اے پرے" یہ ایک دعا ہے۔ (It is a Pray)

علامہ اقبال نے یہ نظم "لینن خدا کے حضور میں" کے عنوان سے تحریر کی تھی۔ وزیراعظم بھٹو کی اس نظم پڑھوانے کی بیرون ملک اور اندرون ملک بڑی تشہیر ہوئی تھی۔ امریکہ نواز پریس نے اس پر تنقید کی تھی کہ مسٹر بھٹو ایک طرف تو غیر جانبداری کی سیاست کے علمبردار بنتے ہیں۔ دوسری جانب وہ سوویت روس کے سرخ انقلاب کا دنیا کو پیغام سنا رہے ہیں۔ پاکستان میں پاکستان ٹائم نے چوکھٹا لگا کر پہلے صفحے پر اس نظم کے پڑھائے جانے کی میرے نام کے ساتھ خبر شائع کی اور ساتھ ہی اس پر ایڈیٹوریل بھی تحریر کیا۔ تمام اردو اخباروں نے بھی اس خبر کو شائع کیا تھا۔ مساوات میں میں نے خود اس نظم کے پڑھائے جانے کی تمام داستان ایک مضمون کی شکل میں شائع کی تھی۔

سری لنکا کی چاندرات

سری لنکا میں چودھویں کے چاند کی رات جس کو ہم چاندرات کہتے ہیں بڑی دیومالائی رات

ہوتی ہے۔ بڑی ڈراؤنی قسم کی رات بن جاتی ہے۔ ہمارے پاکستانی وفد کو شام ہونے سے پہلے بار بار سری لنکا کی وزارتِ اطلاعات اور موسمیات کے افسروں نے تلقین کرنا شروع کردی تھی کہ آج رات شام 7 بجے کے بعد ہماری تمام سرگرمیاں ختم کردی گئی ہیں۔ ہم کو ہوٹل سے باہر جانے سے منع کردیا گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے ریڈیو اور ٹیلیویژن پر بار بار اعلان کیا جارہا تھا کہ تمام لوگ اپنا اپنا کام کاج شام سے پہلے مکمل کریں اور شام کے بعد اپنے گھروں سے باہر مت نکلیں۔ ہمارے وفد کو سری لنکا کے دارالخلافہ کولمبو کے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ ہوٹل کولمبو میں سمندر کے ساحل پر واقع ہے۔ ہوٹل کا پچھلا حصہ تقریباً سمندر کے اندر ہے۔ پاکستانی وفد کو ہوٹل کے تیسری منزل کے کمروں میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ہمیں جو کمرے دیئے گئے تھے ان کمروں کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی تھیں۔ ہوٹل کی انتظامیہ کی طرف سے ہم کو تاکید کردی گئی تھی کہ رات کو اپنے کمرے کی کھڑکی نہ کھولیں۔ وگرنہ سمندر کا پانی آپ کے کمرے میں آگرے گا۔ میں نے ہوٹل کی انتظامیہ کے اس تحریری ہدایت نامے کو پڑھنے کے بعد کھڑکی سے سمندر کی طرف خاص طور سے جھانکا۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے۔ سمندر کا پانی کافی نیچے تھا۔ مجھے ہوٹل کی انتظامیہ کی یہ ہدایت ایک مذاق لگی۔

تین بجے شام اسی ہوٹل میں وزیراعظم بھٹو اور مسز بندرانائیکے کی پریس کانفرنس تھی۔ اس پریس کانفرنس میں بھی اس بات کی تاکید کی گئی کہ کوئی مہمان رات کو ہوٹل سے باہر نہیں جائے گا۔ ہر مہمان کو کھانے پینے کا سامان اس کے کمرے میں پہنچا دیا جائے گا۔ اگر کسی کو کسی شے کی بھی ضرورت ہے تو وہ سات بجے سے پہلے ہوٹل کے معلومات حاصل کرنے کے شعبے کے لوگوں سے رابطہ کر کے وقت سے پہلے اپنی مطلوبہ چیزیں حاصل کرلے۔ اس لئے کہ سات بجے کے بعد ہوٹل کے تمام دروازے بند کردیئے جائیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ رات کو آناً فاناً کیا مصیبت آنے والی ہے۔ جبکہ دن کو ہر چیز معمول کے مطابق دکھائی دے رہی ہے۔

وزیراعظم بھٹو کی پریس کانفرنس 5 بجے ختم ہوگئی۔ اس کے بعد میں اپنے کمرے میں جا کر سمندر کی جانب نگاہیں لگا کر بیٹھ گیا۔ میں نے ہوٹل کی انتظامیہ سے رابطہ کر کے پوچھا کہ کیا ہوٹل کے اندر بھی نقل و حرکت کی ممانعت ہے۔ انہوں نے کہا۔ رات ایک بجے کے بعد آپ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جاسکتے ہیں۔ سری لنکا چونکہ غریب ملک تھا وہاں ٹوتھ پیسٹ تک

باہر سے آتی تھی۔ وزیر اعظم بھٹو نے اپنے وفد کو ایک تحریری مشورہ دیا تھا کہ کوشش کی جائے کہ سری لنکا کی حکومت پر کم سے کم اخراجات کا بوجھ ڈالا جائے۔ کھانے پینے کے معاملے میں بہت اختصار سے کام لیا جائے۔ کسی قسم کی فضول خرچی نہ کی جائے۔ بے حد محتاط انداز میں مہمان نوازی کا لطف اٹھایا جائے۔ سری لنکا سے باہر ہوٹل سے ٹیلیفون نہ کئے جائیں۔ مہنگی قسم کی چیزیں طلب نہ کی جائیں۔ اس ہدایت نامے کے پیش نظر میں نے اور بابا ظہیر کاشمیری صاحب نے فیصلہ کیا کہ ہم دال چاول اور شامی کباب کی ایک پلیٹ کا آرڈر دے کر اپنا کھانا منگوا لیتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے اپنے کمرے سے یہ آرڈر دے دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہوٹل کا آدمی آ گیا۔ اس نے کہا کہ ہم آپ کو اتنا آرڈنری کھانا سرو نہیں کر سکتے۔ یہ تو بہت معمولی کھانا ہے۔ دراصل یہ ہوٹل کا ملازم نہیں تھا حکومت کا ایک افسر تھا جس کو وفد کے کھانے پینے کے معاملات کی نگرانی کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ سری لنکا اتنا بھی غریب ملک نہیں ہے کہ اپنے مہمانوں کو اچھا کھانا بھی سرو نہ کر سکے۔ مہربانی فرما کر آپ ہمارے شیڈول کے کھانے کا انتظار کریں۔ ویسے اگر آپ کو دال چاول پسند ہیں تو وہ کھانے میں ویسے ہی شامل ہیں۔ ان کے لئے آپ کو آرڈر دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ شخص حیرانی کے ساتھ بولا کہ وزیر اعظم بھٹو کا تمام وفد بے حد کفایت شعاری سے کام لے رہا ہے۔ ہمیں علم ہے کہ مسٹر بھٹو نے اپنے وفد کو بے جا اصراف سے منع کیا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ لوگ اپنے لیڈر کی بات کو اس قدر اہمیت دے رہے ہیں۔ مگر ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ کھانے پینے کے معاملے میں تکلف سے کام نہ لیں۔ آپ کے وزیر اعظم کا اور آپ لوگوں کا خلوص ہمارے لئے بہت کافی ہے۔ اب شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے۔ میں چونکہ سمندر پر ہی ٹکٹکی باندھے ہوئے تھا۔ میں نے دیکھا کہ سمندر کی لہروں کی حرکت میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ آہستہ آہستہ لہریں تیز ہونا شروع ہو گئیں۔ جیسے جیسے رات آتی گئی پانی کی سطح بلند ہوتی گئی۔ جیسے ہی چاند نمودار ہونا شروع ہوا سمندر کی بے چینی میں اضافہ ہونے لگ گیا۔ عجیب و غریب قسم کی آوازیں آنے لگ گئیں۔ رات نو بجے کے قریب تو یہ تمام معاملہ ایک طلسماتی شکل اختیار کر گیا۔ ہوٹل کی کھڑکی سے سوائے چاند کی چاندنی کے اور پانی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جس سمندر کو میں کچھ دیر پہلے دیکھ رہا تھا وہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ چاند جب مزید افق پر ابھرا سمندر پاگل ہو گیا۔ اس کے بپھرنے میں اضافہ ہو گیا۔ سمندر کی لہریں ہوٹل کی

www.bhutto.org

تیسری منزل کی کھڑکی کے برابر دکھائی دینے لگ گئیں۔

یوں محسوس ہو رہا تھا کہ قیامت آ گئی ہے۔ اور قیامت کا صُور پھونکا جا رہا ہے۔ فضا میں آوازوں کا اس قدر شور تھا کہ ہم لوگ جو صورت حال سے ناواقف تھے خوف کھانے لگ گئے تھے۔ اس قدر خوفناک آوازیں پیدا ہو رہی تھیں یوں لگتا تھا کہ آسمان سے بلاؤں کا نزول ہو گیا ہے۔ رات گیارہ بارہ بجے تو یہ جوار بھاٹا کی قیامت اپنے پورے شباب پر تھی۔ ہوٹل کی کھڑکی سے باہر چاندنی ہی چاندنی دکھائی دیتی تھی۔ اس طرح کی چاندنی یا روشنی جس میں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ بارہ بجے کے قریب سمندر کی وحشت اپنے عروج پر تھی۔ تقریباً ایک بجے کے بعد اس قیامتِ صغرہ کے عتاب و عذاب میں کچھ کمی واقع ہونا شروع ہو گئی۔

جیسے جیسے چاند نیچے جانے لگا ویسے ویسے طوفان کی آوازوں میں کمی آنے لگ گئی۔ اس شور و غل میں کمی آنے کا سلسلہ بہت مدھم تھا، بڑا سست تھا۔ یہ تمام سلسلہ سمندر میں جوار بھاٹا پیدا ہونے کی وجہ سے وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ کولمبو کا سمندر جغرافیائی طور پر ایک ایسی جگہ واقع ہے جہاں پر چاند کششِ ثقل کا مرکز بنتا ہے۔ جہاں چاند سمندر پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس رات سری لنکا میں ہوائی جہاز یا ہوائی سروس کا سلسلہ بند کر دیا جاتا ہے بلکہ زمینی سفر بھی نہیں کیا جاتا۔ نصف شب کو چاند کی کششِ ثقل کی قوت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ آوازوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا کولمبو شہر کی اس دیومالائی رات کے سحر کا لطف اٹھاتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو سمندر کی حالت انتہائی مخدوش تھی اس طرح لاغر تھی جس طرح مرگی کے مریض کی مرگی کے دورے کے بعد ہو جایا کرتی ہے۔ سمندر بالکل نیم جاں دکھائی دے رہا تھا۔ ادھ موا نظر آتا تھا۔ سمندر کی حالت ہوبہو ویسی تھی جس طرح کسی شخص کی جن نکل جانے کے بعد ہو جایا کرتی ہے۔

سمندر کمزور اور تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی روزمرہ کی صورتِ حال پر واپس آ گیا تھا۔ اس طوفانی رات سے پہلے میں نے سری لنکا پر جو نظم کہی تھی۔ اس نظم میں سمندر کا نقشہ کچھ یوں کھینچا تھا۔

یوں سمندر تھا کہ جیسے کوئی بے کل ہاتھی
ایک ہی حرکتِ بے معنی پہ آمادہ ہو
لہریں چلتی تھیں مگر ایسے مسافر کی طرح
جس کی منزل ہی کوئی ہو نہ کوئی جادّہ ہو

www.bhutto.org

یہ ایک لمبی نظم تھی جس کو مساوات کے سری لنکا ایڈیشن میں شائع کیا گیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد ہمارے وفد کو واپس پاکستان روانہ ہونا تھا۔ ناشتے کی ٹیبل پر آغا شاہی صاحب مجھے مل گئے۔ پہلے تورات کے طوفانِ نوح کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میں نے وہاں پر بیٹھے وفد کے تمام دوستوں کو سری لنکا نظم سنائی۔ آغا شاہی نے فوری طور پر نظم کی کاپی حاصل کی۔

آغا شاہی سے ایک سوال

میں نے آغا شاہی سے پوچھا کہ آپ وزارتِ خارجہ کے امور کے ماہر ہیں۔ آپ بتا سکیں گے۔ وزیراعظم بھٹو کی خارجہ پالیسی کو آپ کس طرح کی پاتے ہیں۔ کیا یہ ماضی کی خارجہ پالیسی سے بہتر خارجہ پالیسی ہے۔ اس نے اپنی بات سری لنکا کے دورے سے ہی شروع کی۔ اس نے کہا کہ کیا اس سے پہلے ہمارے کسی حکمران نے اس طریقے سے جنوبی ایشیا کے ممالک یعنی سری لنکا کے ساتھ پاکستان کی اس طرح کی دوستی کا سلسلہ پیدا کیا تھا جس طرح بھٹو صاحب نے پیدا کیا ہے۔ اس وقت جب کہ ہندوستان ہمارا ایک روائتی نوعیت کا دشمن ملک ہے اور وہ ایک بڑا ملک ہے یہ ضروری تھا کہ جنوبی ایشیا کے باقی تمام ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات ہندوستان سے زیادہ مضبوط ہو جائیں۔ سری لنکا کا دورہ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

مجھے بے حد خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی ہوئی۔ جب آغا شاہی نے مجھے بتایا۔ وہ کہنے لگے کہ جس طرح آپ شاعری کرتے ہیں عام انسان کتنا بھی لائق فائق ہو وہ شاعری نہیں کر سکتا۔ اسی طرح بھٹو صاحب امورِ مملکت میں اور خاص طور پر خارجی امور میں ایک شاعر کی طرح ہیں۔ آغا شاہی نے کہا کہ آپ نے پاکستان کا جنوبی ایشیا کے چھوٹے ممالک کی خودمختاری کا علامیہ پڑھا ہے۔ اس علامیے میں بھٹو صاحب نے حکم دیا تھا کہ ہندوستان کا نام نہیں آنا چاہئے۔ اس میں ہم نے چند باتوں پر زور دیا تھا یعنی آزاد تجارت اور خودمختاری کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اور جنوبی ایشیا کو امن کا گہوارہ کہا ہے۔ ہمارے علامیے کے جواب میں سری لنکا کی حکومت نے ہندوستان کا نام لے کر ان کی آزادی میں مداخلت کرنے کی بات کی ہے۔ جو بات وزیراعظم بھٹو خود کہنا چاہتے تھے وہ بات انہوں نے سری لنکا کی حکومت سے کہلوا دی ہے۔ اب ہندوستان یہ نہیں کہہ سکتا کہ وزیراعظم بھٹو ہندوستان کو بدنام کر رہا ہے۔ آخری بات آغا شاہی نے کہی کہ وزارتِ خارجہ کا علم تو

وہی ہے جو بھٹو صاحب نے بھی پڑھ رکھا ہے اور ہم نے بھی پڑھ رکھا ہے۔ مگر اس علم کو عمل کی شکل دینے میں جو مہارت ان کے پاس ہے وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ ایک فنکار ہیں ہم لوگ اداکار ہیں۔ ایک فنکار اور اداکار میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

سیاسی حکمرانوں کے لئے ایک مشورہ

وزیراعظم بھٹو کا وفد پاکستان واپس آ گیا۔ چند ایک انگریزی اخباروں نے اس دورے کی کچھ خاص خاص خبریں شائع کیں۔ وہ بھی دورے کی جھلکیاں ہی کہی جا سکتی تھیں۔ مگر کسی ایک اخبار نے بھی مفصل انداز میں اس دورے کی روئیداد کو شائع نہ کیا۔ اخبارات کا دائرہ صرف نیوز ایجنسیوں کی خبروں تک ہی محدود رہا۔ یا دونوں ممالک کے مشترکہ علامیے کی کچھ باتوں کو شائع کرنے تک محدود رہا۔ ان اخبارات اور اخبار نویسوں کے برعکس میں نے اس دورے کی تمام تفاصیل کو قسط وار مساوات اخبار میں تحریر کرنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک ہفتے تک جاری رہا۔ اس کے علاوہ ہفتہ روزہ مساوات کا سری لنکا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ جس میں سری لنکا کی ثقافت اور اس کے موسم اور وہاں پر پیدا ہونے والے پھلوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا۔ ان کے شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ کے بارے میں لکھا گیا۔ جاندرات کے بارے میں لکھا گیا۔ سری لنکا کی قومی تاریخ اور ان کی قومی آزادی کے بارے میں تحریر کیا گیا۔

وزیراعظم بھٹو اور پاکستان کے بارے میں مسز بندرانائیکے نے جو تعریفی کلمات کہے تھے اس کے بارے میں تحریر کیا گیا۔ سیلون ریڈیو اسٹیشن کی تاریخ اور اس کی کارکردگی کے بارے میں تحریر کیا گیا۔ سری لنکا کی قومی اسمبلی جو ایک چینی انجینئروں کے کمال کا ایک حیرت کدہ تھی اس کی تصور کشی کی گئی۔ سری لنکا مندروں اور کلیساؤں کا ایک بت کدہ تھا۔ مندروں میں بت گری کچھ اس کمال کی تھی کہ کچھ بتوں کے زندہ ہونے کا شبہ گزرتا تھا۔ گوتم بدھ کے مجسمے گلیوں، بازاروں اور چوراہوں میں بہت نفاست کے ساتھ سجائے ہوئے تھے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی صلیب ہر طرف نظر کے سامنے رہتی تھی۔ ان کا چلیپا کولمبو شہر کی پہچان بنا ہوا تھا۔ میں نے اپنی سری لنکا نظم میں ان تمام باتوں کا ذکر کیا تھا۔ بدھا کے بارے میں نظم کے دو مصرعے یاد آئے ہیں۔ ملاحظہ کریں۔

www.bhutto.org

ہاتھ بدھا کے عقیدت سے بندھے تھے ایسے
ساری دنیا کے گناہوں کا جو کفارہ ہو

میں جب ہفتہ بھر سری لنکا کے دورے کے تاثرات تحریر کرتا رہا تو کچھ اخبارات نے وزارتِ اطلاعات سے شکایت کی کہ اس نے تمام تفاصیل صرف حکومت کے اخبار مساوات کو بہم پہنچائی ہیں۔ان تفاصیل سے ملک کے دوسرے اخباروں کو محروم رکھا گیا ہے۔

ان کا یہ احتجاج وزیر اعظم تک بھی پہنچ گیا۔وزیر اعظم بھٹو نے وزارتِ اطلاعات سے اس بارے میں تصدیق کا حکم دیا۔جس پر وزارتِ اطلاعات نے اپنی بے گناہی کو ثابت کرتے ہوئے رپورٹ دی کہ اسلم گورداسپوری چونکہ پارٹی کا کارکن تھا اور وزیر اعظم بھٹو چونکہ اس کے قائد تھے وہ دورے کی ہر اہم بات کو اپنے ریکارڈ میں تحریر کرتا رہا۔سری لنکا کے بارے میں جو کچھ مساوات میں تحریر کیا گیا یہ سب اس کی اپنی کاوش ہے اس کا وزارتِ اطلاعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

دوسری جانب مساوات کی اشاعت سے حکومتِ سری لنکا کے پاکستان میں سفیر نے تحریری طور پر حکومتِ پاکستان کا شکریہ ادا کیا۔میرے ساتھ خصوصی طور پر سفارت خانے کے ایک افسر نے رابطہ کیا۔ مجھے سفارت خانے کی طرف سے تعریفی خط دیا کچھ تحائف پیش کئے۔ جو گرم مصالحے اور چائے اور پھلوں کی شکل میں تھے۔خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو نے وزیر اعظم بھٹو کی طرف سے تعریفی خط مجھے ارسال کیا۔وزارتِ اطلاعات نے میرا شکریہ ادا کیا اور حکومت کی جانب سے مجھے اچھا خاصا انعام دیا گیا۔

بیرونی دوروں کے بارے میں تمام سیاسی حکومتوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی حکمرانی کے دوران اپنے ساتھ اپنی پارٹی کا ایک قلم کار کارکن ضرور لے کر جائیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ پروفیشنل جرنلسٹ دورے کی سیاسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لایا کرتے۔وہ صرف دو حکومتوں کی باہمی بات چیت تک کو ہی اپنے احاطہء تحریر میں لاتے ہیں۔یا کوئی اہم بات ان کی یادداشت کا حصہ بنتی ہے۔ان کی تمام صحافت خبر کی حد تک ہوتی ہے۔پیشہ ور صحافی بیرونی دورے پر کسی حکومت کے ساتھ جانا حکومت کا صحافیوں کو خوش کرنا تصور کرتے ہیں۔وہ دورے کو پاکستان کی خارجہ پالیسی کا اہم حصہ کم خیال کرتے ہیں۔سیر سپاٹا زیادہ خیال کرتے ہیں۔

وزیر اعظم بھٹو نے گورنر ہاؤس میں بلا کر مجھے شاباش دی اور کہا کہ آئندہ ہر بیرونی دورے

www.bhutto.org

میں مجھے وہ اپنے ساتھ رکھا کریں گے۔ مگر اس کے بعد حالات اور واقعات ہی تبدیل ہو گئے۔

وائے افسوس کہ ایں صحبتِ یار آخر شد
کہ روئے غنچہ نہ دیدم کہ بہار آخر شد

''افسوس کہ صحبتِ یار ہی ختم ہو گئی۔ ہم نے پھول کا منہ بھی نہ دیکھا تھا کہ
موسم بہار ہی ختم ہو گیا۔''

وزیراعظم بھٹو کو اسٹیبلشمنٹ نے تنہا کر دیا تھا

پنجاب میں غلام مصطفےٰ کھر اور حنیف رامے کی بغاوت کے بعد بیورو کریسی نے وزیراعظم بھٹو کو پاکستان پیپلز پارٹی سے مکمل طور پر علیحدہ کر دیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کھر اور رامے کو پیپلز پارٹی تصور کرتے تھے۔ ان دونوں کے پارٹی چھوڑ کر ان کے مقابل آ جانے سے وزیراعظم بھٹو کا پارٹی سے اعتماد ہی اُٹھ گیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کی اس مایوسی سے بیورو کریسی کو اپنی سازش پر عمل کرنے کا پورا پورا موقعہ ہاتھ آ گیا۔ بیورو کریسی وزیراعظم کو ہر ایسی رپورٹ پیش کرتی تھی جس سے ان کے دل میں پارٹی کے لئے بے زاری اور بداعتمادی پیدا ہو جاتی تھی۔ بیورو کریسی نے بھٹو صاحب کو اس قدر اپنے حصار میں لے لیا کہ بھٹو صاحب کا ہر فیصلہ بیورو کریسی کی رائے سے طے پانے لگ گیا۔ یہاں تک کہ پارٹی کی تنظیم نو کا کام بھی بیورو کریسی کرنے لگ گئی۔ 1976ء میں مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جس طرح وزیراعظم بھٹو بیورو کریسی کو ہی پیپلز پارٹی تصور کرنے لگ گئے تھے۔ پارٹی کی تنظیم نو کے سلسلے میں خفیہ ایجنسیوں کی مدد سے پارٹی کے اہم کارکنوں کی میرے سمیت فائلیں تیار ہونا شروع ہو گئیں۔ ان فائلوں میں کارکنوں کی مالی حالت سے لے کر سماجی حالت کی رپورٹ درج کی جاتی تھی۔ میرے بارے میں سی۔ آئی۔ ڈی کا ملازم میرے گاؤں ماڑی ٹھاکراں ضلع گوجرانوالہ تحصیل کامونکی جا کر میرے کردار کی تصدیق و تحقیق کرتا رہا جبکہ مجھے گاؤں چھوڑے ہوئے اس وقت تقریباً 20 سال ہو چکے تھے۔ تنظیم نو میں سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی رپورٹ پر تنظیم سازی کی جانے لگی۔ یہ تنظیم سازی 90 فی صد غیر سیاسی لوگوں پر مشتمل تھی۔ اس تنظیم سازی میں صرف کھاتے پیتے لوگ ہی عہدہ حاصل کر سکتے تھے۔ کسی نظریاتی سیاسی کارکن کو اس تنظیم سازی میں عہدہ نہیں مل سکتا تھا۔ اس تنظیم سازی کو 1977ء کے انتخابات کے

سلسلے میں مکمل کیا جارہا تھا۔ جس میں کسی بھی امیدوار کے لئے پارٹی کے نظریات کے ساتھ وابستگی کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس میں صرف ایک ہی بات کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا کہ عہدے دار صاحب حیثیت آدمی ہو۔ برادری والا ہو۔ پہلے تو بیوروکریسی کی رپورٹوں پر بنائی گئی اس تنظیم سازی نے ہی پاکستان پیپلز پارٹی کی اصل حیثیت کو ہی مسخ کرڈالا۔ اس کی تنظیموں کی صفوں سے عوامیت کو ہی خارج کردیا گیا۔ سب سیاسی کارکنوں کو سرے سے ہی نظرانداز کردیا گیا۔ باقی رہی سہی کسر پارٹی کی انتخابی ٹکٹوں کی تقسیم سے پوری کردی گئی۔ الیکشن کے ٹکٹ ہر ضلع کے ڈپٹی کمشنروں کی رپورٹوں کے مطابق دیئے گئے۔ اس طرح کے طریقہ کار میں اکثر جگہوں پر ایسے لوگوں کو ایم۔ این۔ اے اور ایم۔ پی۔ اے کے ٹکٹ دے دیئے گئے۔ جن کا پارٹی کے ساتھ دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ پارٹی کے اصل کارکنوں کو صرف ایسی جگہوں پر ہی ٹکٹ مل سکے جہاں ان کو ٹکٹ دینا ناگزیر تھا۔ جہاں پر کوئی کھاتا پیتا امیدوار اتفاق سے موجود ہی نہیں تھا۔ اس صورت حال میں چند پارٹی کے کارکنوں کو ٹکٹ مل گئے تھے مگر یہ تعداد بہت محدود تھی۔ ٹکٹ ہولڈرز میں بھاری تعداد نان کمٹیڈ لوگوں کی تھی۔ جن کا پارٹی کے پروگرام اور نظریات کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس سلسلے میں میں صرف لاہور شہر کی ہی مثال پیش کروں گا۔ لاہور میں 1977ء کے انتخابات میں میاں صلاح الدین، چوہدری عید محمد، میاں معراج دین کی طرح کے لوگوں کو ٹکٹ دے دیئے گئے۔ واضح رہے کہ یہ تمام وہ بدنامِ زمانہ لوگ تھے جن کو 1970ء کے انتخاب میں لوگوں نے شکستِ فاش دے کر عبرت کے نشان بنادیا تھا۔ لوگوں نے ان سے ایک طرح کا سیاسی انتقام لیا تھا۔ ان کو نفرت کا سامان بنادیا تھا۔ اور ان لوگوں کے مقابلے میں پارٹی کے کارکن امیدواروں کو کامیاب بنایا تھا۔ گویا 1977ء کا انتخاب ایک طرح کا 1970ء کے انتخاب کا ردِ انقلاب تھا۔ ان لوگوں کو ٹکٹ دینا ایک طرح کا پارٹی کے نظریات سے انحراف اور لوگوں کی توہین کرنے کے مترادف تھا۔ خود میرے لئے ان لوگوں کے لئے اپنی تقریروں میں تعریف و توصیف کرنا بہت دشوار ہوگیا تھا۔ 1977ء کے انتخابات کی صورت حال 1970ء سے بالکل مختلف تھی۔ ٹکٹ چونکہ زیادہ تر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو دیئے گئے تھے۔ ان کا ووٹ مانگنے کا طریقہ پیپلز پارٹی کے طریقے سے مختلف تھا۔ یہ لوگ برادریوں سے ووٹ مانگتے تھے۔ وہ عوامی جلسوں سے عوام سے ووٹ مانگنے کے طریقے سے ہی نابلد تھے۔ وہ شہر کے اہم لوگوں اور چوہدریوں سے ووٹ مانگتے پھرتے تھے۔ انتخاب میں لوگوں

کی اور پارٹی کے سیاسی کارکنوں کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے ہماری انتخابی تحریک میں پہلے کی طرح کا جوش وخروش ہی نہیں تھا۔ صرف وزیراعظم بھٹو کے ہی انتخابی عوامی جلسے کئے جاتے تھے۔ وہ اپنے جلسوں میں اپنی کارکردگی کے بل پر لوگوں سے ووٹ کی اپیل کرتے تھے۔ یہ انتخابی جلسے بھی سرکاری قسم کے ہوتے تھے۔ ان میں عوامی جوش وخروش کی روح کو ہی غائب کر دیا گیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کے جلسوں میں کارکنوں کا جوش وجذبہ دیکھنے میں آتا تھا۔ مگر جلسے میں کارکنوں کی شرکت رضاکارانہ ہوتی تھی۔ ان کو انتظامیہ کی طرف سے شریک نہیں کیا جاتا تھا۔

انتخابات کے جلسوں جلوسوں کے تمام معاملات بیوروکریسی یعنی افسر شاہی کے ہاتھوں میں تھے۔ ان کا طریقہ کار پرانا دقیانوسی اور غیر عوامی طریقہ تھا۔

افسر شاہی کے اس عمل دخل نے انتخابات کو حکومتی انتخابات بنا دیا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے مقابلے میں حزبِ اختلاف (پی۔این۔اے) کی عوام میں مقبولیت وزیراعظم بھٹو کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ مگر وہ چونکہ سیاسی طریقے سے جلسوں اور جلوسوں کی شکل میں انتخابی مہم چلائے ہوئے تھے۔ اس کا جوش وخروش ہر طرف زیادہ دیکھنے میں آتا تھا۔ افسر شاہی نے پاکستان پیپلز پارٹی کی اکثریت کو ایک سازش کے تحت بے عمل بنا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے حزبِ اختلاف کی حامی اقلیت کو سڑکوں پر نکلنے کا موقعہ مل گیا تھا۔ جس کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں ایک غلط تاثر قائم ہوتا گیا کہ لوگ پیپلز پارٹی کے خلاف ہو گئے ہیں اور پی۔این۔اے کے حق میں ہو چکے ہیں۔

پی۔این۔اے کا طریقہ کار یہ تھا کہ یہ جس شہر میں بھی جلسہ کرتی تھی پی۔این۔اے کی تمام پارٹیوں کے لوگ اس جلسے میں شرکت کرتے تھے۔ یعنی اگر لاہور میں جلسہ ہوتا تھا تو تمام پنجاب کی پی۔این۔اے کی پارٹیوں کے صدور لوگ اس جلسے میں ایک منصوبے کے تحت شامل ہوتے تھے جس کی وجہ سے اس کا جلسہ بڑا دکھائی دیتا تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی پر نوابوں کی حکمرانی

وزیراعظم بھٹو کے ذہن میں اقتدار کے لئے خفیہ اداروں نے اس بات کا یقین راسخ کر دیا کہ پیپلز پارٹی میں اب کوئی شخص بھی اس قابل نہیں ہے جو وزیراعظم بھٹو کی حکمرانی میں معاونت کر سکے۔ حکومت چلانے کا کام صرف اور صرف نسلی نوابوں کی اولاد ہی کر سکتی ہے۔ وہ بھاری بھرکم

www.bhutto.org

جاگیردار نواب خاندان کر سکتے ہیں جو انگریزوں کے آزمودہ نمک حلال خاندان ہیں۔ جن کی اپنی شناختیں ہیں۔ جن کی حکمرانی کے کردار کی تاریخ موجود ہے۔ لہٰذا وزیر اعظم کو امورِ مملکت میں پیپلز پارٹی کے عام سطح کے لوگوں کو شریک نہیں کرنا چاہیئے۔ جو وزیر اعظم کے لئے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ جبکہ بڑے خاندانوں کے لوگ وضع دار ہوتے ہیں اور وفادار ہوتے ہیں۔ یہ وہ اسٹیبلشمنٹ کا فلسفہ تھا جس سے پیپلز پارٹی کے عوامی اقتدار کا نعم البدل دیا گیا تھا۔

پنجاب کا وزیر اعلیٰ نواب صادق حسین قریشی بنا دیا گیا اور گورنر پنجاب بہاولپور کے حکمران نواب خاندان سے تعلق رکھنے والے نواب عباسی کو لگا دیا گیا۔

اس طرح نہ تو صادق قریشی کا پیپلز پارٹی سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی وہ پیپلز پارٹی کی سیاست سے اتفاق رکھتا تھا اور نہ ہی گورنر عباسی کا پیپلز پارٹی اور اس کے نظریات سے کسی قسم کا بھی کوئی واسطہ تھا۔ یہ دونوں نام کے حکمران تھے۔ حکومت کا تمام کاروبار بیوروکریسی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ جس کی وجہ سے پارٹی کا حکومت کے ساتھ کوئی رابطہ ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ 1976ء میں پیپلز پارٹی اور بھٹو صاحب کی حکومت کے درمیان اتنا بڑا خلا پیدا کر دیا گیا تھا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت میں اور جنرل ایوب خان کی حکومت میں کچھ بھی فرق باقی نہیں رہ گیا تھا۔ حکومت کا تمام اقتدار اور اختیار ایک مخصوص ٹولے کے پاس تھا۔ جس ٹولے کی سیاست اور اقتدار کا دارومدار افسر شاہی پر تھا۔ تمام حکومتی امور پولیس کے ہاتھوں طے پانے لگ گئے تھے۔ پاکستان کے عوام جس نے اپنی معصوم خواہشوں کی تکمیل کے لئے پیپلز پارٹی کو اپنا نجات دہندہ بنایا تھا۔ ان کو مایوسی کا شکار بنا دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے کردار کو حکومت سے باہر کر کے افسر شاہی کو حکمران جماعت بنا دیا گیا۔ جس کی وجہ سے قائد عوام وزیر اعظم بھٹو مکمل طور پر فوجی اور سول بیوروکریسی کے نرغے میں آ گئے۔

وزیر اعظم بھٹو پر ملتان کے نواح میں پہلا قاتلانہ حملہ کرانے والے نواب صادق حسین قریشی کے بارے میں ایک یورپی سفارت کار نے کہا تھا کہ جو شخص تین منٹ متانت کے ساتھ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ وہ وزیر اعظم بھٹو کے لئے خاک مددگار ثابت ہوگا۔ نواب صادق حسین قریشی نے اپنے ایک سالہ یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ کے اقتدار میں پورا شادمان پنجاب کے جاگیرداروں کو الاٹ کر دیا تھا۔ افسوس کہ جو لوگ ہزاروں ایکڑ زمینوں کی ملکیت رکھتے تھے۔ جن کے پاس پہلے سے لاہور میں بنگلے اور کوٹھیاں تھیں شادمان میں ان کو پلاٹ دیئے گئے۔ خود نواب صادق حسین قریشی جس کا

www.bhutto.org

گلبرگ نہر پر شاندار بنگلہ تھا اس نے تقریباً چار کنال کا رقبہ شادمان میں اپنے نام الاٹ کر کے اس پر عالیشان بنگلہ کھڑا کر دیا۔ پاکستان کے عوام قائد عوام کی ذات سے تو محبت کرتے تھے مگر وہ ان نوابوں اور قریشیوں سے بے حد نفرت کرتے تھے جن کو دوبارہ ان کے سروں پر مسلط کر دیا گیا تھا۔

1977ء کی پی۔این۔اے کی تحریک کی ابتدا میں لوگوں کی بددلی کا یہی احساس تھا جس نے پی۔این۔اے کو خالی سڑکوں پر دھن دنانے کا موقعہ فراہم کر دیا تھا۔ اس عہد میں پے در پے حکومت کی طرف سے کچھ ایسے کام کئے گئے تھے جن کی وجہ سے وزیر اعظم بھٹو کی ذات کو بے حد نقصان پہنچا تھا۔ 1977ء کے انتخابات کو مشکوک بنانے میں خفیہ اداروں کا پورا پورا ہاتھ تھا۔ انتخابات کے تقدس کو پامال بنانے کے لئے سرکاری سطح پر ہر وزیر کے بلا مقابلہ منتخب ہونے کے کارنامہ کو سراہا گیا۔ ہر اہم وزیر اور وزیر اعلیٰ کو نوکر شاہی نے بلا مقابلہ منتخب کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم بھٹو کو بھی اپنی اس گھناؤنی سازش کا شکار بنا دیا گیا۔ کوئی سوچے کہ کیا جان محمد عباسی کی طرح کا ایک اَن پڑھ مولوی لاڑکانہ سے قائد عوام کے مقابلے میں انتخاب جیت سکتا تھا۔ ہرگز نہیں جیت سکتا تھا۔ ناممکن تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر اسٹیبلشمنٹ کو چونکہ بھٹو صاحب کے انتخابات کو غلط ثابت کرنا تھا۔ انتخابات میں دھاندلی ثابت کرنی تھی۔ لہٰذا لاڑکانہ کے اس وقت کے ڈی۔سی پیپلز پارٹی کے آج کے فیڈرل کونسل کے سیکرٹری جنرل اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے سینٹر کمیٹی کے ممبر خالد احمد کھرل نے جان محمد عباسی مولوی کو اغوا کروا دیا تا کہ وہ اپنے کاغذات ہی جمع نہ کروا سکے۔ اس طرح ایک ننگی چٹی دھاندلی کے ذریعے وزیر اعظم بھٹو کو بلا مقابلہ رکن قومی اسمبلی منتخب کروا دیا گیا۔ کیا قائد عوام کو اس طرح کی کامیابی کی ضرورت تھی۔ کیا فخر ایشیا ایک مولوی سے ہار سکتے تھے۔ وہ ہرگز نہیں ہار سکتے تھے۔ ان کے مقابل امیدوار کو اغوا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مقابلے کے انتخاب میں جیت کر تو ان کی عزت میں اور اضافہ ہوتا تھا۔ ان کے جمہوری تشخص کا قد اور اونچا ہوتا تھا۔ مگر افسوس کہ بلاوجہ ان کی ذات پر دھاندلی کا اور اغوا کا الزام ثابت کر دیا گیا۔ وزیر اعظم بھٹو کے انتخاب کو اس طرح کی شکل دے کر خفیہ اداروں نے تمام انتخاب کو ہی گدلا بنا دیا تھا۔ لوگوں کا انتخاب کے بارے میں یقین ہی ڈگمگا گیا تھا۔ یہ وہ افسوسناک حرکتیں اور واقعات تھے جس سے قائد عوام کی ساکھ کو اندرونِ ملک اور بیرون ملک داغدار کر دیا گیا تھا۔ جس کا بہانہ بنا کر حزبِ اختلاف نے انتخابات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور وزیر اعظم بھٹو

کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا تھا۔ اور اس سازش کی تکمیل جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے ساتھ ہوئی تھی۔ اور بعد میں اس سازش کو قائد عوام کی شہادت کے ساتھ مکمل کر دیا گیا تھا۔

میرا قائد عوام کے ساتھ ایک دلی لگاؤ تھا۔ ایک استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا۔ مگر پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار کے آخری حصے میں میرا ان کے ساتھ بڑا فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں اتنی دور ان سے کر دیا گیا تھا کہ نہ تو میں ان کو مشورہ دینے کے قابل تھا اور نہ ہی ان کو حالات سے آگاہ کرنے کے قابل تھا۔ میری نظریاتی شاعری کی تو وزیراعظم بھٹو کے جلسوں میں ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ایک پنجابی کے اَن پڑھ شاعر کو ان کے جلسوں میں لے جایا جاتا تھا۔ وہ ہر جگہ ایک ہی نظم گا دیا کرتا تھا۔ بھٹو کے نعرے وجن گے وغیرہ۔

کھر صاحب کو دوبارہ گورنر بنایا گیا

ملک غلام مصطفےٰ کھر کو دوبارہ پنجاب کا گورنر بنایا گیا۔ بھٹو صاحب گورنر ہاؤس میں تشریف لائے۔ لاہور کے کارکنوں کو گورنر ہاؤس میں بلایا گیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ گورنر ہاؤس اجڑا اجڑا سا لگ رہا تھا۔ نہ تو گورنر ہاؤس میں وہ پہلی سی رونق تھی، اور نہ ہی کھر صاحب میں پہلی سی گورنری کی اٹھان تھی۔ وہ گورنر ہاؤس کے اوپر والے بڑے ہال میں چند لوگوں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ باہر کارکنوں کا ہجوم تھا۔ میں نے کھر صاحب کو کہا کہ وہ کارکنوں سے خطاب فرمائیں تاکہ ان میں کوئی جذبہ اور ولولہ پیدا ہو۔ مگر انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں دوبارہ گورنر ہاؤس کی سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ نیچے بھٹو صاحب کا ملازم نورا کھڑا تھا۔ میں نے نورے سے کہا کہ میں بھٹو صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔

اس نے مجھے کہا کہ صاحب ابھی تیار ہو رہے ہیں۔ ان سے ملاقات کرانا مشکل ہے۔ ہاں البتہ تم راستے میں میرے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔ میں نورے کے ساتھ اوپر گورنر ہاؤس کے ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ نورا ڈاکٹر مبشر حسن کو مسلسل برا بھلا کہے جا رہا تھا۔

ڈاکٹر مبشر حسن کا استعفیٰ

بھٹو صاحب کے لاہور آنے سے دو دن پہلے ڈاکٹر مبشر حسن نے پارٹی کے سیکرٹری جنرل

www.bhutto.org

کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ڈاکٹر مبشر حسن کے استعفیٰ کے خلاف کارکنوں میں بڑا غم وغصہ پایا جاتا تھا۔ کارکنوں کو ڈاکٹر صاحب کا یہ فیصلہ پسند نہیں تھا۔ میں خود ان لوگوں میں شامل تھا جو ڈاکٹر صاحب کے استعفیٰ کو غلط خیال کرتا تھا۔ وہ وقت بھٹو صاحب کی ذات کے لئے بے حد کٹھن اور خطرناک وقت تھا۔ اس وقت ان کو اپنے دوستوں کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس وقت ان کے ساتھ کسی قسم کا اختلاف کرنا، ان کی پشت میں خنجر گھونپنے کے مترادف تھا۔ لہٰذا عین اس وقت جب وزیر اعظم بھٹو کے خلاف فوجی جنرلوں کی اور امریکہ کی کھلی بغاوت دیکھائی دے رہی تھی، جب ہر طرف انارکی پھیلائی جا رہی تھی۔ پارٹی کے سیکرٹری جنرل نے سیکرٹری شپ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا، نہ صرف استعفیٰ دیا بلکہ چند مطالبات پر مبنی ایک احتجاجی خط لوگوں میں تقسیم کیا گیا جس پر ڈاکٹر صاحب کے دستخط تھے۔ اس خط میں سب سے اہم بات جو میں نے پڑھی تھی، وہ یہ تھی کہ بھٹو صاحب فوری طور پر جاگیرداری کو ختم کریں۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے کوئی پوچھے کہ بات آپ نے 1972ء میں کیوں نہیں کی تھی جب آپ وزیر خزانہ تھے۔ آپ نے 1972ء سے لیکر 1976ء تک جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کی بات کیوں نہ کی تھی۔ اس وقت آپ نے استعفیٰ کیوں نہیں دیا تھا۔ اب جبکہ وزیر اعظم بھٹو کی حکومت کا جہاز ڈوبنے والا تھا جب ہر طرف طوفان ہی طوفان تھا اس وقت ان سے اس قسم کا مطالبہ کرنا کہاں کی دانشمندی تھی۔ اس وقت جب فوج کی اور امریکہ کی اور حزب اختلاف کی سازش ان کا ناطقہ بند کئے ہوئے تھی۔ اس وقت پارٹی کے سیکرٹری جنرل کا وزیر اعظم بھٹو کا ساتھ چھوڑنا اس سازش کو تقویت دینے کے مترادف تھا۔ ان تمام قوتوں کی طاقت میں اضافہ کرنے کا باعث تھا جو بھٹو صاحب کی جان کی دشمن تھیں۔ بھٹو صاحب کو تنہا ثابت کرنے کی بات تھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن کا یہ معنی خیز کردار ان کو تاریخ کے ان تمام مجرموں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے جن کی سازش سے بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹایا گیا تھا اور ان کو پھانسی کے پھندے تک پہنچایا گیا تھا۔ افسوس کہ بھٹو صاحب کو شروع دن سے پسند ہی وہ لوگ تھے جو ان کے زوال کا سبب بنے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کو قاتلوں اور بے وفاؤں کی اشد ضرورت تھی۔ بقول شاعر اسلم گورداسپوری ؎

ہر جفا کار سے ہے ان کو محبت اسلم
ہر وفادار انہیں دل سے برا لگتا ہے

www.bhutto.org

میں بھٹو صاحب کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گئے۔ میرے ہاتھ میں ڈاکٹر مبشر حسن کا خط تھا۔ مجھے یہ خط نورے نے دیا تھا۔ بھٹو صاحب فرمانے لگے۔ میں ایک بار پھر دوستوں کی وفائیں دیکھ رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ سر ہماری وفائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ مجھے کہنے لگے کہ کارکنوں کو میرا پیغام دو کہ میں ان کے پاس آ رہا ہوں۔ میں نے گورنر ہاؤس کے لان میں کارکنوں میں اعلان کیا کہ وزیر اعظم چند ہی لمحوں بعد آپ کے درمیان تشریف لا رہے ہیں۔ وزیر اعظم بھٹو گراؤنڈ میں تشریف لائے اور انہوں نے نہایت مختصر سے الفاظ میں کارکنوں سے خطاب کیا۔ کارکنوں نے شکایت کی کہ ہم کو سڑکوں پر نکلنے نہیں دیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے کب روکا ہے تم لوگوں کو سڑکوں پر آنے سے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس بات کا انکشاف کیا کہ افواجِ پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل ضیاء الحق نے کل رات امریکہ کے سفیر کو اپنے گھر پر شراب کی پارٹی دی ہے۔ کمانڈر انچیف کا یہ اقدام آئین کے منافی ہے۔ ایک طرح کی بغاوت ہے۔ مگر ہم حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔

نوٹ: امریکہ کے سفیر کو شراب کی پارٹی دینے والا ضیاء الحق ہی بعد میں مردِ مومن کہلایا تھا۔

واشنگٹن سے لے کر اسلام آباد تک سازش کا جال پھیلایا گیا

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو دنیا کے بڑے شہ زور سیاست دان تھے۔ ایسے سیاست دان کو دام میں لانا امریکا کے ایجنٹ جرنلوں اور بھٹو دشمن طبقوں کے لئے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کام کے لئے امریکا کی قیادت میں پورا یورپ متحد ہو گیا تھا۔ امریکا نے خفیہ طریقے سے مشرقِ وسطیٰ کے شاہ و شیوخ کو بھی وزیر اعظم بھٹو کے خلاف پاکستانی فوج کے جرنیلوں کا ساتھ دینے کا انتظام کر دیا تھا۔ ملک کے اندر پاکستان کے تمام سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں مذہبی جماعتوں اور تنظیموں کو بلا تخصیص ان کے نظریات و سیاست ایک نکتہ پر متحد کر دیا گیا تھا کہ وزیر اعظم بھٹو کی حکومت کو ختم کر کے ان کو قتل کر دیا جائے۔ یہ طریقہ ایک طرح سے وزیر اعظم بھٹو کو تنہا کر کے اور ان کو چاروں طرف سے گھیر کر مارنے کا اختیار کیا گیا تھا۔

فوجی جرنیل اور ان کا پیش امام جنرل ضیاء الحق پاکستان کے تمام دائیں بائیں کے سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ بنا کر ثابت یہ کرنا چاہتا تھا کہ وزیر اعظم بھٹو کی حکومت کا تختہ

الٹاناوران کو پھانسی دینا گویا پوری پاکستانی قوم کا مطالبہ ہے۔فوج کے سیاسی جماعتوں کے اس متحدہ محاذ میں بڑے بڑے نام نہاد شرفاء کا نام بھی آتا ہے جن کے لئے صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے۔بقول غالب۔

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

وزیراعظم بھٹو کے خلاف پیپلز پارٹی کے اندر بھی سازش کرائی گئی تھی۔پارٹی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر مبشر حسن کا استعفیٰ پیپلز پارٹی کے اندر اسی سازش کا حصہ تھا۔جس سازش کو بعد میں مولوی کوثر نیازی اینڈ کمپنی نے پایہء تکمیل کو پہنچایا تھا۔پارٹی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر مبشر حسن کا خط پاکستان کے اندرونی سیاسی حالات اور بین الاقوامی حالات پر تبصرے اور تجزیے کا ایک طویل پلندہ ہے۔پارٹی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر مبشر حسن نے اپنے یہ تمام خدشات اور خیالات کا اظہار وزیراعظم بھٹو کی پانچ سالہ دور کی حکومت کے دوران کیوں نہ کیا۔وہ 5 سال تک حکومت میں برابر کے شریک رہے۔5 سال کے عرصے میں ان کو ان تمام باتوں کا کچھ خیال نہ آیا جن باتوں کا تذکرہ انہوں نے اپنے 1976ء کے انتخابات کے بعد خط میں کیا تھا۔وہ اگر واقعتاً ایک سیاسی مدبر تھے اور بھٹو صاحب کے خیر خواہ تھے تو ان کو یہ تمام تجزیہ 1976ء کے انتخابات سے پہلے پارٹی کے چیئرمین کو پیش کرنا چاہئے تھا تاکہ وہ ڈاکٹر صاحب کی اس خرد افروزی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حالات و واقعات پر غور کر سکتے۔اور سیکرٹری جنرل کے بیان کئے گئے خدشات کا کوئی سدِ باب کر سکتے۔اوران کے اس مشورے کی روشنی میں اپنی 1976ء کے انتخابات میں حصہ لینے کی تیاری کر سکتے۔مگر افسوس صد افسوس اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس وقت ڈاکٹر مبشر حسن خاموش رہے۔ان کی حالات کی سنگینی کا کچھ احساس نہ ہوا۔اور جب جنرل ضیاء الحق کے سازشی تمام فریقوں کے لشکر وزیراعظم بھٹو کے خلاف سڑکوں پر آ گئے اور جب امریکی سامراج کی وزیراعظم بھٹو کے خلاف سازش اپنے عروج کو پہنچی جب بھٹو دشمنی کے تمام فریق جن کا ڈاکٹر صاحب نے خط میں فرداً فرداً ذکر کیا ہے مکمل متحدہ اتحاد کے ساتھ بھٹو صاحب پر حملہ آور ہو گئے۔اس وقت معاملہ یہ کرو یا یوں کرو کے مشوروں کا نہیں تھا۔اس وقت معاملہ میدانِ عمل میں آ کر بھٹو دشمنوں اور عوام دشمنوں کی سازش کا مقابلہ کرنے کا تھا۔باقاعدہ میدان میں آنے کا تھا عین اس وقت جب چیئرمین بھٹو کو

www.bhutto.org

چاروں جانب سے دشمنوں نے گھیرا ڈال دیا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر مبشر حسن کا ان کو اپنی بقراطی کا مظاہرہ کرنا کہاں کی دانش مندی تھی۔ اس وقت ان سے جاگیرداری ختم کرنے کا مطالبہ کرنا کہاں کا انقلاب تھا۔ اس وقت ان کو طبقاتی جدوجہد کی سائنس پڑھانا ان کو سرمایہ داروں اور تاجروں اور دوکان داروں کی طاقت سے ڈرانا کہاں کی عقل مندی تھی۔ اس وقت انتخابی تجزیے کرنا کہ کس طبقے نے کس وجہ سے پیپلز پارٹی کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا ہے کی باتیں کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔ یہ سرکاری ملازمین یہ غریب لوگ ڈاکٹر مبشر حسن کو انتخابات سے پہلے کیوں یاد نہیں تھے۔ ان کا سماجی اور سیاسی شعور انتخابات سے پہلے کیوں غیر حاضر اور سویا ہوا تھا۔ ان کا یہ شعور 1976ء کے انتخابات کے بعد کیوں جاگا تھا۔ ان کو یہ تمام باتیں اور یہ تمام پہیلیاں وزیر اعظم بھٹو کے خلاف سازش ہو جانے کے بعد کیوں یاد آئی تھیں۔ کیا ڈاکٹر مبشر حسن بھٹو صاحب کی حکومت میں شامل ہوتے ہوئے یا پارٹی کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے خود کو ایک ہی کشتی کے سوار تصور نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ بھٹو اور خود کو ایک ہی کشتی کے سوار تصور کرتے تھے تو ان تمام خدشات کا سدِ باب کرنے کا مشورہ انہوں نے بھٹو صاحب کو 1976ء کے انتخابات سے پہلے کیوں نہ دیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے وزیر اعظم بھٹو کی نیشنلائزیشن کے بارے میں خط میں تحریر کیا ہے کہ ان کی نیشنلائزیشن کی وجہ سے تمام متاثرہ سرمایہ دار اور قومیائے گئے کارخانوں کے مالک وزیر اعظم کے خلاف ہو گئے تھے انہوں نے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو نقصان پہنچایا ہے اور اب وہ قومی اتحاد کی تحریک کو سرمایہ فراہم کر رہے ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق بھٹو صاحب کی نیشنلائزیشن پارٹی کے مفاد میں نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے کوئی پوچھے جتنے بنک نیشنلائز ہوئے تھے وہ تمام وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن کے زیرِ تسلط تھے۔ جتنی فیکٹریاں اور کارخانے قومیائے گئے تھے وہ سب کے سب ڈاکٹر صاحب کے زیرِ نگرانی تھے۔ ان تمام بنکوں میں اور کارخانوں میں ڈاکٹر صاحب کے من پسند جیالے ڈائریکٹر لگائے گئے تھے جو ڈاکٹر صاحب کے حکم سے لگائے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان تمام معاملات میں قادرِ مطلق تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہی لگائے گئے پیکو میں ڈائریکٹر شیر محمد بھٹی اور طارق وحید بٹ لوہے کے کارخانوں کے مالک بن گئے تھے۔ اگر وزیر اعظم بھٹو کی نیشنلائزیشن قومی مفادات میں یا پیپلز پارٹی کے مفادات میں نہیں تھی تو ڈاکٹر صاحب کو بہ حیثیت وزیر خزانہ پاکستان نیشنلائزیشن کے خلاف وزیر اعظم کو مشورہ دینا چاہیے تھا۔ نیشنلائزیشن سے پہلے ان کو اس

www.bhutto.org

کام سے باز رکھنا چاہئے تھا۔ جب نیشنلائزیشن کی گئی ڈاکٹر صاحب کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر جب وزیراعظم کے خلاف سازش سر چڑھ کر بولنے لگی تو ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف خط لکھ مارا بلکہ پارٹی کی جدوجہد سے ہی باہر ہو گئے۔ ایک طرح سے بھٹو صاحب پر عدمِ اعتماد ظاہر کر کے خود ہر چیز سے بری الذمہ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کوئی پارٹی کے عام رکن نہیں تھے وہ پارٹی کے سیکرٹری جنرل تھے وہ پارٹی کی حکومت کی کارکردگی اچھائی یا برائی کے اتنے ہی ذمہ دار تھے جتنے کہ وزیراعظم بھٹو تھے۔ ان کا گمان کے اس طریقے سے وزیراعظم بھٹو کو تنہا چھوڑ کر خود ان کے جہاز سے چھلانگ لگا کر ایک طرف ہو جانا سیاسی اخلاقی اور اصولی طور پر قابلِ تعریف بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن تو اپنے تحفظات کا عذر رکھ کر میدان سے باہر ہو سکتے تھے مگر وزیراعظم بھٹو ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے تو سب کچھ بھٹو صاحب پر ڈال کر کنارہ کشی کر لی تھی۔ بھٹو صاحب کس پر یہ سب کچھ ڈال کر جنگ سے باہر ہو سکتے تھے۔

ہمیں اے ناخدا آخر کس کو منہ دیکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

یہی وجہ تھی کہ وزیراعظم بھٹو نے گورنر ہاؤس لاہور میں اخبار نویسوں کے ڈاکٹر صاحب کے خط بارے میں پوچھنے پر کہا تھا کہ خط لکھنا کوئی بری بات نہیں ہے مگر خط لکھ کر بھاگ جانا کہاں کی عقلمندی ہے۔

ڈاکٹر مہدی حسن نے کہا ہے کہ بھٹو صاحب نے اخبار نویسوں سے کہا تھا کہ انہیں ڈاکٹر مبشر حسن کے خیالات سے اتفاق ہے تاہم عوام کو حقیقی زندگی کا ڈراما بھی دیکھنا چاہئے۔ یہ میرے علم میں نہیں ہے کہ وزیراعظم بھٹو نے یہ کب کہا تھا اور کہاں کہا تھا۔

یہاں پر ڈاکٹر مبشر حسن کے خط کا مکمل متن دیا جاتا ہے جس طویل ترین پلندے میں ڈاکٹر صاحب وزیراعظم بھٹو کو یہ کہہ کر ان کی حکومت سے کنارہ کش ہو گئے تھے کہ (1) ملک سنگین ترین خطرات میں ہے۔ (2) ڈاکٹر مبشر حسن کے نزدیک وزیراعظم بھٹو کی حکومت کا کوئی کام بھی گویا قابلِ تعریف نہیں تھا۔ (3) خط کے آخر میں وہ مشورہ دیتے ہیں کہ ایک وسیع ترین قومی حکومت بنائی جائے۔ واضح رہے کہ یہی مطالبہ پی۔ این۔ اے کی تمام پارٹیوں کا تھا کہ بھٹو صاحب اپنی

www.bhutto.org

حکومت کو ختم کر کے فوج کی نگرانی میں ایک قومی حکومت بنائیں جس میں ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کو شامل کیا جائے اور وہ عبوری قومی حکومت ملک میں نئے سرے سے انتخابات کرائے۔ (4) اپوزیشن کی جماعتوں کی طرف سے جنگ کا طبل بج گیا ہے لہٰذا میں آپ کو خدا حافظ کہتا ہوں۔

قومی متحدہ محاذ اور عوامی جمہوریت ــــ ڈاکٹر مبشر حسن کا خط

قومی اتحاد میں شامل نو جماعتوں نے عام انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے الزام لگایا ہے کہ حکومت نے پولنگ میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کی ہے اور الیکشن کمیشن اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اپوزیشن کی جماعتیں مصر ہیں کہ ان کا حکومت اور الیکشن کمیشن سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ حکومت اور انتخابات کرانے کی مشینری کو مسترد کرتے ہوئے مطالبہ کر رہی ہیں کہ وزیراعظم کو استعفیٰ دے دینا چاہئے اور عدلیہ اور فوج کی نگرانی میں دوبارہ عام انتخابات منعقد کرانے چاہئیں۔ یوں لگتا ہے کہ اپوزیشن پارٹیوں کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ اب ان کے سیاسی عزائم اور معاشی مقاصد کی تکمیل قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپوزیشن کی نشستوں پر بیٹھنے سے نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے حکومت سے مذاکرات کی پیش کش کو رد کر دیا ہے اور وہ احتجاج کرنے کے لئے سڑکوں پر نکل آئی ہیں۔

اپوزیشن کی جماعتوں کی طرف سے جنگ کا طبل بج گیا ہے ان کے اعلان جنگ کی پشت پر اصل قوت پاکستان کی صنعتی اور تجارتی برادری کی ہے۔ بدنام بائیس خاندانوں کی قیادت میں چھوٹے اور بڑے کارخانوں کے مالکان، تاجر، ٹھیکیدار، ٹرانسپورٹر، آڑھتی اور کمیشن ایجنٹ محاذ آرائی پر تل گئے ہیں۔ چونکہ ان میں ہنگامہ آرائی کی سیاست چلانے کے لئے سیاسی پختگی اور تنظیم کی کمی ہے، اس لئے انہوں نے جنگ لڑنے کے لئے دقیانوسی مُلّاؤں اور درمیانہ طبقے کے بعض رجعت پسند عناصر کی خدمات حاصل کی ہیں۔ وہ یہاں تک مجبور ہوئے لگتے ہیں کہ انہوں نے صوبہ سرحد کے جاگیرداروں کے اس عنصر تک سے غیر قدرتی اتحاد قائم کر لیا ہے جس نے وفاقی حکومت کے خلاف صوبائیت کا زہر کامیابی سے پھیلا رکھا ہے۔

صنعتی اور تجارتی برادری اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے شروع کی ہوئی اور نیک

www.bhutto.org

شگونوں سے عاری، اس جدوجہد کا اصل مقصد پنجاب اور سندھ کے جاگیردار حکمرانوں اور ان کے سرحدی اور بلوچستانی ساتھیوں سے سیاسی قوت چھین لینا ہے۔ پاکستان اور اس کے صوبوں کی نمایاں طور پر جاگیردار حکومتوں نے اپنی پانچ سال اور تین ماہ کی حکمرانی کے دوران صنعتی اور تجارتی برادری کی بے پناہ نفرت مول لے لی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ جاگیردار حکمرانوں سے بڑے سرمایہ داروں کا تضاد ایک ٹھوس سیاسی جنگ کی صورت اختیار کرنے لگا ہے اور پاکستان کے دستور کے ان حصوں کو رد کیا جا رہا ہے جو الیکشن یعنی اس طریق سے متعلق ہیں جس کے ذریعے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ حکمران طبقات کا کون سا حصہ ریاستی مشینری پر قابض ہوگا۔ یہ وہی دستور ہے جسے دستور ساز اسمبلی نے چند ہی سال پہلے متفقہ طور پر منظور کیا تھا اور جس پر قومی اتحاد کے ان رہنماؤں نے جو گذشتہ اسمبلی کے رکن تھے، دستخط کئے تھے۔ اب وہ اس سے منحرف ہو گئے ہیں۔ سرمایہ دار طبقے کی طرف سے دستور کی عام انتخابات سے متعلقہ دفعات پر عدم اعتماد کا اظہار حکمران طبقوں میں بنیادی اور گہرے اختلافات کی غمازی کرتا ہے۔

7 مارچ کے انتخابات کے نتیجے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہروں میں بالعموم حکومت کے خلاف ووٹ پڑے۔ کراچی، حیدر آباد، پشاور، کوئٹہ، ملتان، لائل پور، اور گوجرانوالہ میں نشستیں ہاری گئیں۔ لاہور کی نشستیں بڑی مشکل سے جیتی گئیں۔ لاہور میں جیت ترقی پسندانہ خطوط پر زبردست انتخابی مہم چلانے کا نتیجہ تھی۔ اس کے باوجود شہر کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جو یہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ وزیروں کے حلقوں میں دھاندلی نہیں کی گئی۔ چھوٹے شہروں میں حکومت کی مخالفت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اپوزیشن دور دراز کے ضلعوں کے بہت سے تجارتی قصبوں میں بھی ہنگامہ آرائی کرانے میں کامیاب رہی ہے۔

قومی اسمبلی کے لئے جس طرح ووٹ پڑے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تمام بڑے سرمایہ داروں، درمیانہ طبقے کے ایک بڑے حصے، نچلے درمیانہ طبقوں کے ایک حصے اور مزدوروں اور غریب کسانوں کے ایک حصے نے حکومت کے خلاف ووٹ ڈالے۔ اسی طرح سرکاری ملازمین کے نچلے حصوں نے بھی حکومت کے خلاف ووٹ ڈالے۔ سرکاری ملازمین کی دل برداشتگی کی وجہ صرف یہی نہیں کہ ان کی تنخواہیں کم ہیں اور مہنگائی زیادہ ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وزراء اور اعلیٰ حکام ان سے توہین آمیز سلوک کرتے ہیں۔ غریب عوام نے بالعموم اور کچی

www.bhutto.org

آبادیوں کے رہنے والوں نے بالخصوص، نیز چھوٹے دکانداروں، چھابڑی والوں، اقلیتوں اور عورتوں نے حکومت کو ووٹ دیئے، ماسوائے صوبہ سرحد اور کراچی کے، جہاں ان غریب طبقوں پر معاشی وجوہ کے علاوہ بعض دوسرے ملحوظات بھی اثر انداز رہے۔ سرحد کے بعض علاقوں میں تو نہایت ہی مظلوم، غریب اور پسماندہ عوام نے غریب مُلاؤں کی قیادت میں پیپلز پارٹی کے بڑے بڑے جفادری جاگیردار خوانین اور امیروں کے برج الٹا دیئے۔ اس کی وجہ طبقاتی تضاد کے علاوہ مقامی ملائیت کے غلبہ میں بھی مضمر تھی۔ سرحد کے مقابلتاً خوشحال علاقوں میں حکومت کی انتخابی شکست اس حقیقت کی مظہر ہے کہ مقامی جاگیرداروں کے ایک ٹولے نے حکومت کے خلاف صوبائیت کا زہر کامیابی سے پھیلا رکھا ہے۔

پنجاب اور سندھ میں غریب کسانوں نے پیپلز پارٹی کو ووٹ تو دیئے۔ لیکن یقیناً اس حد تک نہیں جس کی حکومت کو توقع تھی۔ جس حد تک حکومت کو کسانوں کی حمایت حاصل نہیں ہو سکی وہ کسانوں کی جاگیردار کے خلاف اور جاگیردار کے زیر اثر انتظامی مشینری کے خلاف ان کی نفرت کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ اس مایوسی اور بے دلی کا بھی عکس ہے جو کسانوں کو زرعی اصلاحات پر عملدرآمد نہ کرنے سے ہوئی ہے۔ اگر زرعی اصلاحات فی الحقیقت بنیادی نوعیت کی ہوتیں اور ان پر مخلصانہ طور پر اور صحیح معنوں میں عمل کیا جاتا تو غریب کسان پورے زور و شور سے حکومت کی حمایت کرتے۔

آبادی کے جو طبقے حکومت کے خلاف گئے ان کی یوں نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

1- بڑے اور چھوٹے مل مالکان (سابقہ اور موجودہ)

2- بڑے تاجر، آڑھتی اور کمیشن ایجنٹ

3- ٹھیکیدار، بس مالکان اور مال سپلائی کرنے والے

4- حکومت اور تجارتی اداروں کے مالکان

5- وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر اور دوسرے پیشہ ور

6- دائیں بازو کے بعض صحافی اور ادیب

7- بہت سے کسان اور محنت کش جو معاشی اصلاحات سے اس لئے مطمئن نہ ہو سکے کہ ان پر عمل خلوص نیت سے نہیں بلکہ نیم دلی سے کیا گیا

8- ملاؤں کی قیادت میں سرحد کے بارانی اور غریب ترین علاقوں کے غریب عوام

www.bhutto.org

9- قومیائے گئے سکولوں کے سابق مالکان اوران سے فوائد حاصل کرنے والے دوسرے افراد سرمایہ دار طبقے کے نقطہء نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کی حکومت سے شکایات حقیقی اور ٹھوس ہیں، مثلاً

1- اس کے صنعتی اور مالی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا ہے اور بعض تجارتی اور درآمدو برآمد کے کاروبار کو قومیا لیا گیا ہے۔

2- قیمتوں، تنخواہوں، اجرتوں اور پیداوار کی حد مقرر کر کے مارکیٹ کے آزاد عمل میں مداخلت کی گئی ہے۔ یہ تو معاشی حکمت عملی کے بعض ایسے پہلو ہیں جنہوں نے آبادی کے مقابلتاً قلیل حصے ہی کو متاثر کیا ہے اور نچلے درمیانہ طبقے کو بنیادی طور پر متاثر نہیں کیا۔ تاہم اپوزیشن درج ذیل امور کی بناء پر تقریباً تمام طبقوں اور خاص طور پر شہروں کی آبادی میں خاصی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

3- شہروں میں شاہراہوں پر جان و مال کے عدم تحفظ میں اضافہ ہو گیا۔ یہ بڑھتی ہوئی غنڈہ گردی کا نتیجہ ہے جس کی سرپرستی جاگیردار ٹولے نے کی ہے اور ان کے نمائندہ بعض وزیروں اور افسروں نے بھی کی ہے اور بڑے رسہ گیروں اور سمگلروں نے بھی۔

4- بدعنوانی اور رشوت ستانی جس کی بدنامی کی لپیٹ میں بعض وزراء تک آ گئے۔

5- عدلیہ کی مشینری کا درست کام نہ کرنا اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں غیر معمولی تاخیر ہونا۔

6- سرکاری کارخانوں اور تجارت، صنعت اور مواصلات کے نظام میں خامیاں۔

7- تعلیمی نظام کے بارے میں والدین کا عدم اطمینان۔

8- درمیانہ طبقوں کے افراد کے دلوں میں دیانت اور اہلیت کی پوری قدر نہ کرنے والے بعض نیم تعلیم یافتہ ارباب بست و کشاد کے خلاف نفرت۔

9- سرمایہ داروں، جاگیرداروں، تاجروں، صنعت و تجارت کے انتظامی عہدے داروں اور بعض وزیروں کے ناقابل برداشت حد تک شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ۔

10- انکم ٹیکس اور دوسرے ٹیکسوں اور واجبات کی وصولی کرنے والوں کا غلط برتاؤ۔

11- بلدیاتی انتظام میں بدنظمی، شہروں میں بجلی، پانی، صفائی وغیرہ کے انتظامات کے نقائص۔

www.bhutto.org

12- شہری ٹرانسپورٹ میں ناقابل برداشت بدنظمی۔

13- بڑے شہروں میں مکانوں کے بڑھتے ہوئے کرائے اور بڑے مالکان کا کرائے داروں سے تشدد اور ظلم کا سلوک۔

14- پیشہ ورانہ تربیت یافتہ نوجوانوں کی قابلیت اور معیاری کام کے اعتراف سے گریز۔

15- دفتری کاموں میں تاخیر اور سرخ فیتے کا چکر۔

ہر طبقے کی حکومت کا ساتھ نہ دینے کی وجوہات الگ الگ تھیں۔ جس حد تک جس طبقے کو بھی حکومت سے شکایت ہوئی اسی حد تک اس نے اپوزیشن کا ساتھ دیا۔ نیا سرمایہ دار طبقہ نہ صرف معاشی عدم تحفظ کی وجہ سے سخت پریشان اور نالاں ہے بلکہ اس کے ایک قدامت پسند حصے پر یہ احساس بھی غالب آ گیا ہے کہ اس کے روایتی معاشرتی، اخلاقی اور ثقافتی ڈھانچوں کو سنگین خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ ایسے نعروں کی حمایت میں شد و مد سے اٹھ کھڑا ہوا ہے جو آج اس کے اپنے کاروباری اور سرمایہ داری مفاد کے خلاف ہیں۔ جہاں تک روایتی، معاشرتی، اخلاقی اور ثقافتی اقدار کو خطرے کا تعلق ہے تو یہ خطرہ بظاہر نچلے درمیانہ طبقے نے زیادہ محسوس کیا ہے اور اسے مُلّا نے ہوا دی ہے۔ مُلّا کہتا ہے کہ معاشرے کی روایتی اقدار کو سامراج اور سرمایہ داری سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے بلکہ یہ خطرہ سوشلزم کی جانب سے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاشرے کی ہر برائی سوشلزم کی پیداوار ہے۔ اس کا سامراج، سرمایہ داری اور جاگیرداری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مُلّا کی ''نظریاتی جنگ'' سامراج، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے ابلیسی نظام سے نہیں ہے بلکہ وہ سوشلزم کے موہوم خطرے سے برسرپیکار ہے۔ دیکھا جائے تو موہوم خطرے کا یہ احساس پاکستانی معاشرے کے تمام رجعت پسند عناصر میں یکساں طور پر موجود ملے گا۔ یہ جاگیرداروں میں بھی ہے اور قبائلی نظام کے وابستگان میں بھی۔

1- پاکستان کے نظریہ قومیت کو فروغ دینا چاہئے اور تمام ترقی پسندانہ خیالات اور اقدامات ملک دوستی اور حب الوطنی پر مبنی ہونے چاہئیں تاکہ پاکستان آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے ناقابل شکست بن جائے۔

2- ملک کے مکمل دفاع کے لئے قومی مسلح افواج کی نگرانی میں ایسی مقامی دفاعی کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جو غریب کسانوں، محنت کشوں اور تمام طبقات کے محب وطن عناصر پر مشتمل ہوں۔ ان

www.bhutto.org

کمیٹیوں کی امداد سے قومی سطح پر عوامی ملیشیا کو تربیت دینے کا پروگرام شروع کیا جائے۔

3- پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ علاقائی توسیع پسندی، سامراجی غلبے اور بالا دستی کے خلاف ملک کی خود مختاری و آزادی کا تحفظ ہو سکے۔

4- مزدور لیڈروں سمیت سارے سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ شہری آزادیاں جاری و ساری کی جائیں شہریوں کے بنیادی حقوق کے منافی قوانین کو منسوخ کیا جائے۔

5- ملکی وحدت اور سالمیت کو نقصان پہنچائے بغیر جہاں تک ممکن ہو معاشی طور پر پسماندہ علاقوں کو سیاسی خود مختاری دی جائے۔ مقامی ثقافت کے فروغ پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہونی چاہئے۔ تمام علاقائی زبانوں کو تحفظ دیا جائے اور ان کے نشو ونما کی ضمانت بہم پہنچائی جائے۔ قومی ترقی میں معاشی طور پر پسماندہ علاقوں کو ترجیح دی جائے۔ قومی معاملات میں ان کی شرکت حقیقی اور مکمل ہونی چاہئے۔

6- جاگیرداری کا خاتمہ کیا جائے اور غریب کسان کو اس لعنت سے نجات دلائی جائے۔ علیحدگی پسندی اور صوبائیت پرستی کی جاگیرداری بنیادوں کو بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ ختم کر دیا جائے۔ غیر زرعی علاقوں میں جاگیرداری سے بھی پرانے سیاسی، معاشرتی اور معاشی استحصالی نظام کا خاتمہ کر کے ان کے غریب و پسماندہ عوام کو ہر لحاظ سے آزاد کرایا جائے۔ ان علاقوں کی پوری طرح سے معاشی، معاشرتی تعلیمی اور تکنیکی امداد کی جائے اور ان کی ثقافت اور انفرادیت کا تحفظ کیا جائے۔

7- جاگیرداری کے خاتمے کے لئے مندرجہ ذیل بنیادی اقدامات کی ضرورت ہے:

ا۔ بٹائی کا جو سلسلہ بڑے غیر حاضر جاگیرداروں کا رائج کردہ ہے اور اس کی جو بھی صورت صوبہ سرحد اور بلوچستان میں رائج ہے اسے یکسر ختم کر دیا جائے۔

ب۔ ایسے مالکان زمین کی جو واقعی خود کاشت کرتے ہیں اور مستقل وہیں رہتے ہیں، حوصلہ افزائی کی جائے اور انہیں پورا تحفظ دیا جائے۔ ان کے لئے زمین کی حد ملکیت کا تعین خاندانی بنیاد پر کیا جائے۔ ساری فالتو زمین بے زمین کسانوں میں بلا معاوضہ تقسیم کی جائے۔

ج۔ جو لوگ سرکاری ملازمت، بیماری یا بڑھاپے یا کسی اور معقول وجہ سے خود کاشت کرنے سے معذور ہیں ان کے مفاد کا مناسب تحفظ کیا جائے۔

www.bhutto.org

د۔ چھوٹے مالکان زمین کو ان کے گزارے کے لئے مزید زمین دی جائے اور درمیانے درجے کے مالکان زمین کو رعایتیں دی جائیں۔

8- درمیانہ درجے کے کاروباری اور چھوٹے کارخانہ دار کے مفادات کا تحفظ کیا جائے سٹور والوں، دوکانداروں اور چھوٹے صنعتی یونٹوں کے مالکوں کی پوری امداد کی جائے اور انہیں کسی بھی طرح ہراساں نہ کیا جائے۔ درمیانہ اور چھوٹے سرمایہ دار کی حوصلہ افزائی کی جائے، ان سے کی گئی بے انصافیوں کی تلافی کی جائے اور اس سرمایہ داری کا خاتمہ کیا جائے جو غیر ملکی استحصالی سرمایہ کار کے گماشتے پیدا کرتی ہے یا افسر شاہی کو سرمایہ دار بناتی ہے۔ قومی معیشت کی بنیاد خود انحصاری پر رکھنی چاہئے۔

9- بے حد آمدنی حاصل کرنے اور بے حساب دولت جمع کرنے کے حق پر پابندی عائد کی جائے۔ آمدنی اور دولت کی حد پر پابندی لگانے کا مطلب یہ ہے کہ دولت سے جو معاشرتی اور سیاسی قوت حاصل ہوتی ہے اسے روکا جائے۔ یہ حد اتنی کم ہونی چاہئے کہ دولت کا ضیاع اور غیر ضروری استعمال نیز شاہ خرچی اور تعیش کا امکان ختم ہو کے رہ جائے۔

10- شہروں میں محنت کشوں کو اور دیہات میں کسانوں کو حقیقی سیاسی قوت حاصل ہونی چاہئے۔ انتظامیہ، عدلیہ، ٹیکس وصول کرنے اور سرمایہ تقسیم کرنے کا موجودہ نو آبادیاتی سلسلہ ختم کر دیا جائے کیونکہ اس کی رو سے تمام متعلقہ اختیارات اوپر کے چھوٹے سے حلقے میں مرکوز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ختم کر کے محنت کشوں اور تمام طبقات کے ترقی پسند عناصر پر مشتمل عوامی طبقات کا نظام قائم کیا جائے۔ تمام دیوانی اور فوجداری اختیارات، ماسوائے ان اختیارات کے جو قومی سلامتی سے متعلق ہوں عدلیہ کا نیا عوامی نظام قائم کر کے اس کی تحویل میں دے دینے چاہئیں۔ ہر جگہ مقامی کمیٹیاں قائم کی جائیں جو مزدوروں، کسانوں اور دوسرے سارے طبقات کے ترقی پسند عناصر کے حقیقی نمائندوں پر مشتمل ہوں۔ ان کمیٹیوں کے دائرہ اختیار میں وہ تمام منصوبے ہوں جو خوراک، صحت، اشیائے خوردنی کی تقسیم، تعلیم، مقامی ٹرانسپورٹ وغیرہ سے متعلق ہوں۔ ان کی منصوبہ بندی، انہیں روبہ عمل لانے کے طریقوں اور ان کے انتظام کا مسئلہ بھی پوری طرح ان کمیٹیوں کے دائرہ کار میں ہونا چاہئے۔ بڑے صنعتی اداروں، بڑے زرعی فارموں اور ریلوے، بجلی، نہروں وغیرہ جیسے قومی

اداروں میں محنت کشوں کے لئے صحیح جمہوری اور موثر کردار کی بنیاد رکھی جائے۔

11- پاکستان کی عورتوں کو جاگیردارانہ نظام کی زنجیروں سے پوری طرح آزاد کیا جائے۔ انہیں مساوی سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ ہر طبقہ کی عورتوں کی مکمل آزادی اور عزت افزائی کے بغیر قوم کی حقیقی ترقی اور خوشحالی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

12- تمام مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے اپنے عقیدے کے مطابق چلنے کی پوری آزادی حاصل ہونی چاہئے اور کسی کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ ہونے دیا جائے۔

13- ہر اس ثقافتی، تخلیقی اور علمی سرگرمی کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے جو نوے فیصد سے زیادہ آبادی کے مفادات کا تحفظ کرے اور ان کو فروغ دے۔

14- ترقی پسند اور محب وطن صحافیوں، ادیبوں، شاعروں، استادوں اور دوسرے دانشوروں کو پوری امداد دی جائے تاکہ وہ عوامی جمہوریہ کے قیام میں موثر کردار ادا کرسکیں۔

15- سرکاری، نیم سرکاری اور پیشہ ور ملازمین کی شرائط ملازمت درج ذیل طریق سے بدل دی جائیں اور ان کی نگرانی کے لئے درج ذیل مشینری قائم کی جائے تاکہ

ا۔ وہ اعلیٰ معیار کا کام بلاخوف اور بلا رورعایت کرسکیں۔

ب۔ ان کے خلاف انکوائری اور اس کا فیصلہ نیز دوسری انضباطی کارروائیوں کا فیصلہ عدل و انصاف سے ہوسکے۔

16- طلباء کو پورا تحفظ ملنا چاہئے، انہیں ملکی معاملات میں شرکت کا حق دینا چاہئے، ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے کہ وہ غریب کسانوں، محنت کشوں اور تمام طبقات کے ترقی پسند عناصر کو متحرک و منظم کریں۔

ان اصولوں کی بنیاد پر قائم شدہ وسیع ترین عوامی متحدہ محاذ ایک ایسی قومی حکومت کی تشکیل کرے جو سامراج نواز، عوام دشمن اور وطن فروش جاگیرداروں اور گماشتہ سرمایہ داروں کے اثر و رسوخ سے بالاتر ہو۔ صرف ایسی حکومت ہی وطن عزیز کی سالمیت و آزادی کی ضامن ہوسکتی ہے اور ملک کے سارے علاقوں کو صحیح معنوں میں یکساں ترقی وخوشحالی کی راہ پر گامزن کرسکتی ہے اگر خدانخواستہ ملک پر معدودے چند بڑے جاگیرداروں کا غلبہ رہا یا کسی فوجی ٹولے کی آمریت مسلط ہوگئی یا مٹھی بھر گماشتہ سرمایہ داروں کی سیاسی بالادستی قائم ہوگئی یا عنان اقتدار کلی یا جزوی طور پر

www.bhutto.org

بھارت نواز عناصر کے ہاتھ میں چلی گئی تو علاقہ پرستی کا بھوت ناگزیر طور پر دھا چوکڑی مچائے گا اور سارے اندرونی اور بیرونی دشمن اس سے فائدہ اٹھا کر ہمارے وطن کو تباہ کر دیں گے۔

نوٹ: واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب کا وہ خط جو بھٹو صاحب کو دیا گیا تھا وہ بہت مختصر تھا۔ یہ خط میں نے ڈاکٹر مہدی حسن صاحب سے حاصل کیا ہے جس میں لاتعداد اضافے پائے گئے ہیں۔

مرحوم شیر محمد بھٹی کا استعفیٰ

وزیراعظم بھٹو کے خطاب کے بعد گورنر مصطفیٰ کھر کے کہنے پر شیخ محمد رشید اور لاہور کے کچھ کارکنوں کو گورنر ہاؤس میں رک جانے کا کہا گیا۔ جن میں میں بھی شامل تھا۔ گورنر کھر کی صدارت میں شیخ محمد رشید اور ہم کارکنوں کے ساتھ ایک ہنگامی نوعیت کی مجلس ہوئی۔

افسوس کہ کھر صاحب کی اس میٹنگ میں جمع شدہ کارکنوں میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو بعد میں ہم پارٹی ورکروں کے خلاف وعدہ معاف بن گئے تھے اور ہماری مخبری کر کے ہم کو پکڑوایا کرتے تھے۔ جن کا لیڈر طارق وحید بٹ تھا۔

اس میٹنگ میں گورنر کھر کو اپنے کسی ذریعے سے خبر ملی تھی کہ پیپلز پارٹی لاہور کا صدر شیر محمد بھٹی اپنی صدارت کے عہدے سے مستعفی ہو رہا ہے۔ یہ خبر ہمارے لئے ایک بم شیل سے کم نہ تھی۔ گورنر کھر صاحب نے شیخ محمد رشید کو کہا کہ وزیراعظم بھٹو صاحب نے کہا ہے کہ شیخ صاحب بھٹی صاحب سے رابطہ کریں اور اس کو کہیں کہ وہ صرف چند دن تک کے لئے حوصلہ کریں اور استعفیٰ نہ دیں۔ میں اور مرحوم عارف اقبال حسین بھٹی خود ہی شیر محمد بھٹی کے پاس گئے تاکہ ان کو اس بات سے روکا جا سکے۔ شیر محمد بھٹی صاحب اس وقت رواز گارڈن میں رہائش رکھتے تھے۔ جہاں پارٹی کی حکومت کی جانب سے ان کو پلاٹ دیا گیا تھا۔ جس پر انہوں نے ابھی نیا نیا گھر تعمیر کرایا تھا۔ ان کے استعفیٰ دینے کی نوبت یوں پیدا ہوئی تھی کہ ہمارے جانے سے ایک روز پہلے پی۔ این۔ اے کے چند مشتعل کارکنوں نے ان کے گھر کے آگے جمع ہو کر نعرے لگائے تھے اور ان کو پیپلز پارٹی چھوڑنے کا کہا تھا۔ بصورتِ دیگر ان کو دھمکی دی تھی کہ ان کے گھر کو آگ لگا دی جائے گی۔ ایک حکمران پارٹی کے ایک اہم ترین عہدہ دار کے گھر کے آگے غنڈوں کا جمع ہو جانا

اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ پی۔این۔اے کی تحریک میں خفیہ ایجنسیاں کام کر رہی تھیں۔ پسِ پردہ صوبائی حکومت غنڈوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ وگرنہ لاہور میں اس وقت تقریباً کرفیو کا سا سماں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود بھٹی صاحب کے گھر کا گھیراؤ کیا گیا تھا۔ یہ ایک قسم کی باقاعدہ فوجی چال تھی کہ مقابل فوج کے کمان دار کو بھگوڑا بنا دو باقی سپاہ خود بخود میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔ لاہور کے صدر شیر محمد بھٹی کو اسی فارمولے کے تحت مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا تھا۔ لہٰذا میں اور عارف اقبال حسین بھٹی مرحوم شیر محمد بھٹی کے گھر گئے۔ ہم سے پہلے بابا سوشلزم شیخ محمد رشید صاحب بھٹی صاحب کے ساتھ بات چیت کر چکے تھے۔ بھٹی صاحب جب ہم کو ملے وہ بے حد گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ غنڈے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ پنجاب حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ اس صورت میں مجھے اپنے بچوں کو بچانا ہے۔ میں نے شیخ رشید صاحب کو کہہ دیا ہے کہ آپ کسی دوسرے آدمی کو لاہور کا صدر بنا دیں۔ میں کل اپنے عہدے سے مستعفی ہو جاؤں گا۔ شیر محمد بھٹی نے اپنے استعفیٰ کے ساتھ ڈاکٹر مبشر حسن کے استعفیٰ کا ذکر کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ڈاکٹر مبشر حسن جیسے لیڈر پارٹی چھوڑ کر جا سکتے ہیں تو ایک اور کارکن بھی پارٹی کے عہدے کو چھوڑ سکتا ہے۔ دراصل شیر محمد بھٹی صاحب ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کے گروپ سے تعلق رکھتے تھے ان کی سیاست ڈاکٹر مبشر حسن کی سیاست ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے پارٹی کو چھوڑنے کی وجہ سے بھٹی صاحب میں بہت مایوسی پیدا ہو گئی تھی جس کا انہوں نے اس وقت اظہار بھی کیا تھا۔ وہ اس وقت ڈاکٹر مبشر حسن کی زبان بول رہے تھے۔ وہ ایسی باتیں کر رہے تھے جو ڈاکٹر مبشر حسن کے خط میں تحریر کی گئی تھیں۔ جن کو یہاں پر دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن ان کے استعفیٰ دینے کا معاملہ ایک خوف کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اور انتظامیہ کی سازش کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ جس انتظامیہ نے پی۔این۔اے کے غنڈوں کو شیر محمد بھٹی کے گھر کا گھیراؤ کرنے کا موقعہ فراہم کیا تھا۔ اس میں لاہور پیپلز پارٹی کی تنظیمی کمزوری کا بھی دخل تھا جو اپنے صدر کے گھر کے تحفظ کا کوئی سدِباب نہ کر سکی تھی اور اس سے بھی زیادہ پنجاب کی حکومت کے وزیراعلیٰ نواب صادق حسین قریشی کی ذمہ داری تھی کہ وہ پارٹی کے ورکروں کو حکومتی تحفظ فراہم کرتا۔

www.bhutto.org

یہ تحریک نہیں تھی ایک سازش تھی

1977ء کی پی۔این۔اے کی تحریک نہیں تھی۔ یہ ایک بین الاقوامی سازش تھی۔ وزیراعظم بھٹو کے خلاف سازش کا آغاز امریکہ نے کیا تھا۔ اس سازش کا آغاز 1973ء میں ہوا تھا جب وزیراعظم بھٹو نے ایٹم بم بنانے کا آغاز کیا تھا۔ جس کی ابتدا فرانس کے ساتھ ایٹمی معاہدے سے شروع ہوئی تھی۔ وزیراعظم بھٹو کے خلاف امریکہ کے انتقام میں اضافہ پاکستان میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد سے ہوا تھا۔ امریکہ ہرگز ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ عالمِ اسلام کے شاہ وشیوخ اقتدار کے خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائیں اور اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل بن جائیں اور نہ ہی امریکہ یہ برداشت کرسکتا تھا کہ عالمِ اسلام کو وزیراعظم بھٹو کی طرح کا بیدار مغز عالمی رہنما میسر آجائے۔ وزیراعظم بھٹو نے عالمِ اسلام کے سربراہوں کو پہلی مرتبہ ان کو تیل کے ہتھیار کے تصور سے روشناس کیا تھا۔ ان میں احساس اور شعور پیدا کیا تھا کہ پورے یورپ کی معیشت کا لیور عربوں کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا تیل پیدا کرنے والے ممالک جو چاہیں امریکہ سے منوا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی ممالک کی مشترکہ بنک کاری کے نظام کو قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

واضح رہے کہ یورپ کی معیشت کا تمام نظام اسلامی ممالک کی دولت پر قائم ہے جو یورپ کے بنکوں میں جمع شدہ ہے۔ یہ دولت اگر یورپ کے بنکوں سے نکال کر اسلامی بنک کاری کے نظام میں منتقل ہو جاتی تو یورپ کے بنکوں کے دیوالیہ ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اسلامی سربراہی کانفرنس کے بعد امریکہ نے وزیراعظم بھٹو کے ایٹمی پروگرام کو عالمِ اسلام کا مشترکہ ایٹمی پروگرام قرار دیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کی امریکہ کے ساتھ ان دو باتوں پر ٹھن گئی تھی۔ امریکہ کی وزیراعظم بھٹو کی دشمنی کی انتہا پاکستان میں امریکہ کے وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر کے دورے کے وقت کھل کر سامنے آگئی تھی۔ جس دشمنی میں امریکہ نے کوئی لگی لپٹی رکھنے کا تکلف نہیں کیا تھا۔ جس دورے کے اختتام پر دلی کے ہوائے اڈے پر ہنری کسنجر نے بیان دیا تھا کہ وزیراعظم بھٹو نے اگر ایٹمی پروگرام ختم نہ کیا تو ان کو دنیا کی بدترین مثال بنا دیا جائے گا۔ کسنجر کی یہ دھمکی ہندوستان کی سرزمین پر کھڑے ہو کر دینے سے اس دھمکی کی سنگینی میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ امریکہ اگر اس قسم کی دھمکی پاکستان کے کسی فوجی حکمران کو دیتا تو اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ کس بلا کے قوم پرست تھے ذوالفقار

www.bhutto.org

علی بھٹو کہ انہوں نے سپر طاقت کی دھمکی کا یہ جملہ کہہ کر مذاق اڑایا تھا کہ ''افسوس کہ سامراج کے پاس زندگی کے لئے کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔'' اس لئے کہ سامراج ہمیشہ موت کا بیوپار کرتا ہے۔ یہ خود زندہ رہنے کے لئے دوسروں کو موت دیتا ہے۔ گویا لوگوں کی یا انسانوں کی موت پر سامراج کی زندگی کا دارومدار ہے۔ جو سراسر ایک غیر انسانی فعل ہے۔ ایک اژدھے کی زندگی ہے جو اپنی زندگی کے لئے لوگوں کو نگل جاتا ہے۔ سامراج ایک درندہ ہے۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو کے یہ مختصر ترین الفاظ قیامت تک امریکہ سامراج کا منہ چڑاتے رہیں گے۔

تیل نکالنے کا اختلاف

امریکہ کا وزیراعظم بھٹو کے ساتھ تیسرا اختلاف پاکستان سے پٹرول نکالنے پر ہوا تھا۔ امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان میں تیل دریافت کیا جائے۔ پاکستان میں تیل کی دریافت امریکہ کے مالی مفادات کے لئے نقصان دہ تھی۔ وزیراعظم بھٹو چونکہ ''سن آف دی سائل'' تھے یعنی دھرتی کے بیٹے تھے وہ پاکستان کو بڑی سرعت کے ساتھ ہر طرح سے خودکفیل ملک بنانا چاہتے تھے۔

ان کو اندازہ تھا کہ عالمی طاقتوں کو ایک خودکفیل پاکستان ہرگز پسند نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پاکستان کے تمام بنیادی مفادات کے کام جلد از جلد مکمل کرنا چاہتے تھے۔

پاکستان کی تیل کی ضرورت کا پندرہ فی صد ہی ابھی دریافت ہوا تھا کہ بھٹو صاحب کو شہید کر دیا گیا تھا۔ آج تک کسی فوجی حکومت کی جرات نہیں ہوسکی کہ وہ پاکستان میں تیل کی دریافت میں مزید پیش قدمی کر کے پاکستان کو تیل کی دولت سے مالا مال کرے۔ پاکستان کی سرزمین میں تیل موجود ہے مگر امریکہ اس کو نکالنے کی اجازت نہیں دے رہا۔

بلوچستان میں سونا نکالنے اور دوسری معدنیات نکالنے پر بھی امریکہ نے پابندی لگا رکھی ہے۔ جس کو پاکستان کی ہر فوجی حکومت تسلیم کرتی چلی آ رہی ہے۔ وزیراعظم بھٹو اس پابندی کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے تمام قدرتی معدنیات کو دریافت کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔ جس کو ان کے بعد مکمل طور پر ختم کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح سندھ تھرپارکر کے کوئلے پر بھی امریکہ کو اعتراض تھا جہاں آج 2009ء میں بھی کام شروع نہیں کیا گیا۔

امریکہ وزیراعظم بھٹو کی نیشنلائزیشن کے بھی خلاف تھا۔ پاکستان میں ان کی ہیوی انڈسٹری

کی تنصیبات کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر سوویت یونین کی مدد سے لگائی گئی سٹیل مل کا پاکستان میں لگایا جانا امریکہ کی جنوبی ایشیا کی پالیسی کے سخت خلاف اقدام تھا جس کو امریکہ کسی قیمت پر برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

امریکہ کا سوویت یونین کے خلاف آخری معرکہ

امریکی سامراج اور یورپ کے عالمی سرمایہ داری نظام کی سوویت یونین کے خلاف جنگ کے آخری معرکے کا وقت آ گیا تھا۔

امریکہ اور تمام سامراجی یورپ ایک صدی سے اپنی سرمایہ داری کے نظام کے تحفظ کے لئے سوشلسٹ سوویت یونین کے ساتھ ''کولڈ وار'' یعنی ایک طرح کی خاموش جنگ میں مبتلا تھا۔ ان دونوں سپر طاقتوں کے درمیان پوری دنیا میں زندگی کے ہر شعبے میں بغیر اعلانِ جنگ کئے ایک طرح کی جنگ جاری تھی۔ پوری دنیا دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ کچھ اقوامِ عالم یا ممالک سوویت یونین کی حمایت میں امریکہ کے خلاف اعلانِ جنگ کئے ہوئے تھے اور کچھ ممالک عالمی سرمایہ داری کے حق میں سویت یونین کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ پوری دنیا کے غریب عوام سوویت یونین کے ساتھ تھے اور پوری دنیا کے استحصالی حکمران اور طبقے امریکہ کے حق میں تھے۔ یہ حکمران اور طبقے سوشلسٹ نظامِ حکومت کو اپنی آمریت اور اپنی ناجائز دولت کی فراوانی کو اپنی موت خیال کرتے تھے۔

امریکہ جو دنیا میں ان تمام استحصالی حکمرانوں کا اور سرمایہ داروں کا محافظ تھا وہ دنیا سے استعماری نظام کی اصلیت کو چھپانے کے لئے اور سرمایہ داری نظام کی اصلیت کو چھپانے کے لئے اپنی اس سامراجی لوٹ کھسوٹ کی جنگ کو کمیونزم کے خلاف مذاہب عالم کے جہاد کا نام دیتا تھا۔ وہ اپنی اس سفاک سامراجیت کی جنگ کو مقدس جنگ کا نام دیتا تھا۔ وہ اس کو کفر اور اسلام کی جنگ کا نام دیتا تھا۔ اس کی تحریک اور اس کا عالمی فلسفہ تھا کہ کمیونسٹ خدا کو اور مذہب کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کسی رسول کو تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا کمیونسٹ تمام اہلِ دین کے خلاف ہیں۔ اس طریقے کے ساتھ عیار سامراج امریکہ نے اپنی استحصالی جنگ کو مذہب کی جنگ بنا رکھا تھا۔ اپنی استعماریت کو خدائی جنگ کا نام دے رکھا تھا۔ اور وہ پوری دنیا کے بھوکے ننگے عوام کو مذہب کے نام

www.bhutto.org

پر ایکسپلائٹ کر کے سوویت یونین کے مقابلے پر کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ اپنی اس عیاری میں سو فی صد کامیاب ہوا۔ اس نے پوری دنیا کو سوشلسٹ سوویت یونین کے مقابلے میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ سوشلسٹ سوویت یونین کے واٹرلو یا شکست کا اصل میدان چونکہ اسلامی ممالک افغانستان تجویز کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے عالمِ اسلام کو اس انسانیت کش جنگ کا فرنٹ مین بنایا گیا تھا۔ گویا سوویت یونین کی جنگ عالمِ اسلام اور سوویت یونین کی جنگ تھی۔ یہ کفر اور اسلام کی جنگ تھی۔ جس میں تمام مسلمان بادشاہوں اور شیوخ نے دل کھول کر دولت فراہم کی تھی۔ عیسائی دنیا اور عیسائیت تو صرف کافر سوویت یونین کے خلاف مسلمانوں کی اخلاقی مددگار تھی۔ اصل معرکہ تو مسلمانوں کے خدا اور سوویت یونین کے کفر کے درمیان تھا۔ اس جنگ کے آخری ایام میں یہ جنگ صرف اور صرف مسلمانوں کی اور روسیوں کی جنگ دیکھائی دیتی تھی۔ امریکہ اور یورپی ممالک تو اس جنگ میں مسلمانوں کو ہر طرح کی جنگی اور مالی امداد دینے تک کے پابند تھے۔ اس وقت امریکہ پورے عالمِ اسلام کو القاعدہ بنانے پر تلا ہوا تھا۔ امریکہ کی اس جنگ میں دنیا کا ہر مسلمان مجاہد تھا۔ جنگ میں مرنے کی صورت میں امریکہ اس کو جنت میں جانے کی گواہی دیتا تھا۔ بچ جانے کی صورت میں اس کو غازی ہونے کی بشارت دیتا تھا۔ امریکہ کے کہنے کے مطابق یہ جنگ تمام اہلِ کتاب کی جنگ تھی۔

یہ جنگ چونکہ پاکستان کے قریب کے ملک افغانستان میں لڑی جانی تھی۔ لہٰذا پاکستان امریکہ کی اس عالمی سرمایہ داری کے نظام کے تحفظ کا اصل مورچہ تھا اور اصل قوت تھا۔ یہ جنگ اس وقت تک امریکہ کی اپنی خواہشات کے مطابق نہیں لڑی جا سکتی تھی جب تک کہ پاکستان کلی طور پر امریکہ کے ہاتھ میں نہ آئے۔ اور خاص طور پر افواجِ پاکستان کا امریکہ کے ہاتھ میں آنا ازحد ضروری تھا۔ فوج کے علاوہ اس جنگ کی دوسری قوت پاکستان کی مذہبی قوتیں، مذہبی فرقے، مذہبی تنظیمیں، مذہبی عالم جو فوج کے ساتھ اس جنگ کا ہراول دستہ تھے ان کا امریکہ کے حق میں منظم ہونا بے حد ضروری تھا بلکہ اشد ضروری تھا۔ لہٰذا پاکستان میں فوج اور مذہبی قوتوں کو اقتدار میں لانا اس جنگ کی کامیابی کے لئے پہلی شرط تھی اور یہ شرط اس وقت پوری ہو سکتی تھی جب پاکستان میں فوجی حکومت ہو۔ غیر آئینی حکومت ہو، آمریت ہو۔ یہ جنگ امریکہ کی زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ یہ یورپ کے استعماری نظام کے تحفظ کی جنگ تھی۔ امریکہ کو سوویت یونین کو تباہ و برباد کر

کے دنیا کی واحد سپر طاقت بنا تھا۔ امریکہ اس کے لئے پوری دنیا تباہ کرنے کو تیار تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو پہاڑ کی طرح امریکہ کی راہ میں حائل ہو گئے تھے

امریکہ کو پوری دنیا میں ہر اس قوت کی ضرورت تھی جو مذہبی بنیاد پرستی پر ایمان رکھتی تھی۔ عالم اسلام کے چونکہ تمام بادشاہ اور حکمران ناجائز حکمران تھے۔ ان کی حکمرانی کا دارومدار ہی مذہبی بنیاد پرستی پر قائم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان تمام غیر جمہوری حکمرانوں نے امریکہ کے لئے اس جنگ میں اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے۔

خاص طور پر پاکستان میں امریکہ کو ایک کٹر قسم کی مذہبی جنونیت کی حامل حکومت کی ضرورت تھی۔ امریکہ پاکستان میں کسی طرح کی آزاد خیالی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہر طرح کی ترقی پسندی کو اپنی سوچ کی موت خیال کرتا تھا۔ وہ ہر طرح کی روشن خیالی کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس کو پاکستان میں نہ تو عقل و دانش کی حکمرانی کی ضرورت تھی اور نہ ہی کسی قومی ہیرو اور قومی رہنما کی ضرورت تھی، اور نہ ہی پاکستان کے عوام کے کسی مقبول رہنما کی یا حکمران کی ضرورت تھی۔ امریکہ کے عزائم کو سمجھنے کے لئے قارئین کی آسانی کے لئے آخری اور حتمی بات کر دیتا ہوں۔ جس کے بعد اس مسئلے پر مزید کوئی مثال دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

امریکہ کو وزیراعظم بھٹو کے مقابلے میں جنرل ضیاء الحق جیسے ڈریکولے کی ضرورت تھی۔ ایک بدشکل، بدوضع اور بدکردار آدمی کی ضرورت تھی۔ شہید بھٹو کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ ایسے تاریخی مرحلے پر ایک فیصلہ کن مرحلے پر امریکہ کی راہ میں حائل تھے۔ جس مرحلے پر امریکہ اپنی زندگی کی اپنے نظامِ سرمایہ داری کی آخری جنگ لڑ رہا تھا۔ اس کے لئے ''ناؤ آر نیور'' (Now or Never) والی بات بن چکی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں اس کو پاکستان میں ایک سنوج اور مرسنری حکمران کی ضرورت تھی۔ کرائے کے قاتلوں کی ضرورت تھی۔ ایک قوم دشمن انسان کی ضرورت تھی۔ مگر یہ سب کچھ ذوالفقار علی بھٹو کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ وہ ایک سچے اور کھرے انسان تھے۔ ان کی فطرت میں ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ بلاشبہ ان کا قد امریکن حکمرانوں سے بہت بڑا تھا۔ وہ ان کے سامنے کسی طرح بھی سر نہیں جھکا سکتے تھے۔

یہ مسئلہ حق و باطل کی جنگ کا تھا۔ جس میں حق پرست اپنی موت کا فیصلہ خود کیا کرتے ہیں۔

www.bhutto.org

ایسے موقعوں پر حق پرستوں کا فیصلہ ہمیشہ شہادت کا عظیم فیصلہ ہوا کرتا ہے اور شہید بھٹو نے اپنی شہادت کا عظیم فیصلہ کر کے تاریخِ عالم میں اپنی عظمت کو زندہ جاوید کر دیا۔

یہ رتبہء بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اور حافظ شیرازی نے تو اس قبیل کے لوگوں کی عظمت کو لازوال قسم کا خیراجِ عقیدت پیش کر کے ان کو لافانی بنادیا ہے۔

ہرگز نہ میرد آں کے دلش زندہ کن بہ عشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما

ترجمہ: وہ ہرگز نہیں مرتے جن کے دل عشق نے زندہ کر دیئے ہوں۔ وہ اوراقِ عالم پر نقش ہو جاتے ہیں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، یعنی زندہ جاوید ہو جاتے ہیں۔

پاکستانی قوم کے عروج کا زمانہ

انسانی تاریخ میں قومیں فتح اور شکست اور عروج اور زوال سے دوچار ہوتی رہتی ہیں۔ جب کسی قوم کے عروج کا زمانہ ہوتا ہے اس وقت اس قوم کا شعور اس کا رہنما ہوتا ہے۔ قوم کے شعور کو زندہ اور اجاگر کرنے کے لئے قیادت کے اجالے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلاشبہ وزیراعظم بھٹو کی قیادت ہی پاکستان کی قوم کے لئے وہ اجالا تھا جس نے پاکستان کی قوم میں زندگی کی روح پھونک دی تھی اور ان کی قیادت کا مختصر ترین عرصہ ہی پاکستانی قوم کے عروج کا وقت تھا۔ جس میں تمام سیاسی معاشی سماجی اور ثقافتی روایات کی بنیادیں پروان چڑھی تھیں اور انسانی رشتوں کی اعلیٰ قدریں تشکیل پائی تھیں۔ جس نے پاکستان کے ٹوٹے پھوٹے ملک اور معاشرے کو آپس میں جوڑ دیا تھا اور پاکستان کے معاشرے میں تخلیقی قدروں اور صلاحیتوں نے جنم لیا تھا۔ سوشلزم کے نام پر محنت کشوں کا شعور بیدار ہوا تھا۔ مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کو قوم کی عملی زندگی کے دھارے میں شریک کیا گیا تھا۔

آرٹ اور ادب میں ترقی ہوئی تھی۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی

www.bhutto.org

ایجادات کو قومی زندگی کی ترقی کا ذریعہ بنایا گیا تھا۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ قوم کو خود کفالت اور خودانحصاری کی راہ پر گامزن کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔

وزیراعظم بھٹو کا دور ہی پاکستان میں قومی اداروں کی بنیادیں رکھنے کا دور تھا۔ اس سے پہلے فوج اور بیوروکریسی کے ادارے کے علاوہ اور کوئی قومی ادارہ موجود نہیں تھا۔

1- پاکستان میں پہلی مرتبہ پاکستان کا آئین بنا کر پاکستان میں آئینی اور جمہوری ادارے کی بنیاد ڈالی گئی اور پہلی مرتبہ ہر شہری کے بنیادی حقوق کو قانونی تحفظ دیا گیا اور خواتین کو برابر کے حقوق دیے گئے۔

2- پاکستان میں پہلی مرتبہ تعلیم کو عام کیا گیا۔ میٹرک تک مفت تعلیم کا بندوبست کر دیا گیا۔ ملک میں درجنوں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا گیا۔

3- پہلی مرتبہ ہیوی انڈسٹری کمپلیکس کی بنیاد رکھی گئی۔ پاکستان میں جہاز سازی اور اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کیے گئے۔

4- پاکستان میں ایٹمی توانائی کا شعبہ اور مرکز قائم کیا گیا۔ جس شعبے کی مدد سے پاکستان ایک ایٹمی طاقت بننے میں کامیاب ہوا۔

5- پاکستان میں جدید صنعت کاری کو فروغ دیا گیا اور ملک کی تمام بنیادی صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا گیا۔ جس میں انشورنس کمپنیاں اور بنک شامل تھے۔

6- پاکستان کی خارجہ پالیسی کو دنیا میں ایک مثالی خارجہ پالیسی کا درجہ دیا گیا۔

7- زرعی اصلاحات کی گئیں اور مزید زرعی اصلاحات کرنے کا منصوبہ بنایا گیا اور پاکستان میں ایک زرعی انقلاب لانے کا راستہ اپنایا گیا۔

8- پاکستان میں لیبر لاز بنائے گئے۔

9- پاکستان میں آرٹ کونسل اور الحمرا آرٹ سینٹر کے ادارے قائم کیے گئے۔

10- پاکستان کے ہر بڑے شہر میں ثقافتی مرکز قائم کیے گئے۔

11- سوویت یونین کی مدد سے کراچی میں سٹیل مل لگا کر پاکستان کو انجینئرنگ کے شعبے میں اور تعمیرات کے شعبے میں اور صنعتی تعمیرات کے شعبے میں خود کفیل بنا دیا گیا اور پاکستان میں بھاری مشینیں بنانے کے سلسلے کی بنیاد رکھی گئی۔

www.bhutto.org

12- پاکستان بھر میں کچی آبادیوں کو پکی آبادیوں کا درجہ دیا گیا۔ کروڑوں بے گھر لوگوں کو گھر دیئے گئے اور ان کو ان مکانوں کے مالکانہ حقوق دیئے گئے جو بھٹو حکومت کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔

وزیر اعظم بھٹو ایشیا اور تیسری دنیا کے ممالک کی خود مختاری کے علمبردار تھے وہ عالمی طاقتوں کے توازن کے لئے سوویت روس کا برقرار رہنا اور اس کے کردار کو عالمی سیاست کے لئے ضروری خیال کرتے تھے جو امریکہ کو کسی قیمت پر قبول نہیں تھا۔

امریکہ کا وزیر اعظم بھٹو کی سوچ کے ساتھ اختلاف تھا

امریکہ کے وزیر اعظم بھٹو کے ساتھ بنیادی اختلافات تقریباً یہی تھے جن کا پیچھے ذکر کیا گیا ہے۔ مگر امریکہ کا سب سے بڑا اختلاف وزیر اعظم بھٹو کی سوچ کا اختلاف تھا۔ امریکہ جو خود کو دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور تصور کرتا تھا بلکہ کلیم کرتا تھا وہ وزیر اعظم بھٹو کی سوچ کو اپنی سپر سوچ میں مداخلت تصور کرتا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کے قومی ایجنڈے کو اپنے عالمی ایجنڈے میں رکاوٹ خیال کرتا تھا۔ امریکہ پاکستان جیسے پسماندہ ممالک کے وزیر اعظم کو ایک خود مختار وزیر اعظم نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ وزیر اعظم بھٹو کو وہ باتیں کرنے اور کہنے کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا جو باتیں امریکہ خود کرتا تھا۔

وزیر اعظم بھٹو ایک سپر مین تھا

امریکہ اگر سپر طاقت تھا تو وزیر اعظم بھٹو اپنے مشن اور اپنی جدوجہد میں ایک سپر مین کا درجہ رکھتا تھا۔ ہر چند وزیر اعظم بھٹو کا ملک چھوٹا تھا مگر بھٹو لیڈر بڑا تھا۔ وزیر اعظم بھٹو پاکستان کے لئے ہر پہلو پر اسی انداز سے سوچتے تھے جس انداز سے امریکی امریکہ کے بارے میں سوچتے تھے۔ وزیر اعظم بھٹو کے وہی ہدف تھے جو سپر طاقت امریکہ کے تھے۔ امریکہ نے اگر اپنی قوم کو ایک ترقی یافتہ قوم بنایا تھا۔ وزیر اعظم بھٹو بھی اپنی قوم کو ترقی یافتہ بنانا چاہتے تھے۔ امریکہ نے اگر امریکہ کو ایٹمی طاقت بنایا تھا۔ وزیر اعظم بھٹو بھی پاکستان کو ایٹمی قوت بنانا چاہتے تھے۔ امریکہ اگر تیسری دنیا کے ممالک کو اپنا غلام رکھنا چاہتا تھا۔ وزیر اعظم بھٹو تیسری دنیا کو امریکہ کے پھندے سے آزاد کرانا

چاہتے تھے۔ یہی نظریہ وزیراعظم بھٹو کا اسلامی دنیا کے بارے میں تھا۔ امریکہ وزیراعظم بھٹو کو پاکستان کا اور تیسری دنیا کا لیڈر اور عالمی مدبر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ امریکہ پاکستان میں حسب سابق اپنی من مانی کرنا چاہتا تھا۔ جس کی وزیراعظم بھٹو امریکہ کو اجازت نہیں دیتے تھے۔

امریکہ کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر کی دھمکی

امریکہ جب اپنے خفیہ طریقوں کے نامہ و پیام سے وزیراعظم بھٹو کو ان کے اہداف سے ہٹانے میں ناکام ہو گیا تو اس نے وزیراعظم پاکستان کو آخری تنبیہہ کے لئے امریکہ کا سب سے طاقت ور انسان وزیر خارجہ ہنری کسنجر پاکستان بھیجا تا کہ وہ وزیراعظم بھٹو کے ساتھ رو برو بیٹھ کر بات کرے اور ان کو پاکستان کے ایٹمی پلانٹ کی تنصیب سے باز کرے۔ اس کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک اور تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک میں امریکہ کے خلاف وزیراعظم بھٹو اپنی چلائی گئی سیاسی اور معاشی تحریک کو ختم کرے جو تحریک ان ممالک میں امریکہ کے مفادات کے لئے ایک بہت بڑے خطرے کا باعث تھی۔

وزیراعظم بھٹو نے ہنری کسنجر کا بہت شایانِ شان استقبال کیا۔ اس کو پاکستان کی روائتی مہمان نوازی سے نوازا۔ اس کے بعد انہوں نے پاکستان کے شہر لاہور میں جس شہر کو پاکستان کا بھٹو صاحب دل کہا کرتے تھے اس کے گورنر ہاؤس میں ایک شاندار شاہی استقبالیہ دیا۔ اس استقبالیہ میں مہمان اور میزبان دونوں کو حکومتی طریقوں اور آداب کے مطابق خطاب کرنا تھا۔ پاکستان کو ان دنوں ابھی سیلاب کی تباہ کاری کا سامنا تھا۔ اور سیلاب کی ستم کاری کی یاد ابھی تازہ تھی۔ وزیراعظم بھٹو کو چونکہ علم تھا کہ اس کا مہمان صرف مہمان نہیں ہے۔ یہ ایک سامراج کا بھیجا ہوا خونی ہرکارہ ہے۔ یہ مہمان نہیں ہے بلکہ یہ مہمانِ اجل ہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ مہمان ان کے لئے موت کا پروانہ لے کر آیا ہے۔ مگر وزیراعظم بھٹو چونکہ ایک قوم پرست عاشق تھے اور ملک وقوم کے عشق کے پروانے تھے۔ کشتہء عشق تھے۔ وہ کسنجر کی نہ تو ذات سے مرعوب ہوئے اور نہ ہی وہ اس کی کسی دھمکی کو خاطر میں لائے۔

انہوں نے اپنے استقبالی خطاب میں انتہائی شاعرانہ اندازِ کلام سے کسنجر پر اپنا مافی الضمیر ظاہر کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم صدیوں سے پسماندہ ہیں صدیوں سے قدرتی اور غیر قدرتی آفات کا

شکار ہیں۔ ہم کشتۂ ستم لوگ ہیں۔ کچلے ہوئے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ کبھی تو ہم پر آسمانوں سے بجلیاں ٹوٹ کر گرتی ہیں اور کبھی زمین سے ہم پر سیلاب اور بھونچال اُمڈ پڑتے ہیں مگر ہم ان آفات کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم ان زلزلوں کو اپنے ہاتھوں کی قوت سے تھام لیتے ہیں۔ ہم سیلاب کے ریلوں کو اپنے سینوں سے روک لیتے ہیں۔

پچھلے دنوں ہمارے دریا ہم سے بگڑ گئے تھے اور وہ ہماری آبادیوں پر بپھر کر چڑھ دوڑے تھے۔ ہمارے یہ دریا بھی سپر طاقت کی طرح اندھی طاقت ہیں یہ اکثر ہم پر چڑھ دوڑتے ہیں ہمارا نقصان کرتے ہیں۔ ہم ان کے بپھرنے کی خُو کو جانتے ہیں۔ ہم ان کے اشتعال اور ان کے غصے کو ہمت کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ ہم ان کی بپھری ہوئی لہروں کو گزر جانے دیتے ہیں۔ بالآخر یہ ہمارے سمندر میں جا گرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہماری یہ ڈپلومیسی اور قوتِ برداشت کی جنگ صدیوں سے چلتی چلی آ رہی ہے۔ ہم نے برداشت اور تحمل کی خرد کاری اور سفارت کاری اپنے ان دریاؤں سے ہی سیکھی ہے۔

ہم ہر آنے والے طوفان کا وہ خواہ سیاسی ہو یا اقتصادی ہو یا قدرتی ہو، اس کا مقابلہ صبر و تحمل کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہم طاقت کا مقابلہ طاقت سے نہیں کرتے۔ ہم ہر مشکل کا مقابلہ محبت رواداری اور امن و آشتی کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ ہماری امن و آشتی کا ہی نتیجہ ہے کسنجر صاحب کہ ہمارے دریا ہار جاتے ہیں ہم جیت جاتے ہیں۔ ہم نے ہر قوت اور طاقت کی تباہ کاری اور ستم رانی سے یہ سبق سیکھا ہے کہ ہمارا امن کا جذبہ سب سے بڑی قوت ہے۔

اور یہ ہمارے امن کی منصوبہ بندی کا کرشمہ ہے کہ ہم اپنے خرابوں کو پھر سے آباد کر لیتے ہیں۔ اور ہم اپنے منہ زور دریاؤں کو پھر سے راستی کے ساتھ بہنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ انہوں نے تقریر کے آخر میں میری سیلاب نظم کے آخری شعر کو اپنے انداز میں بیان کیا تھا کہ پانی پلوں کے نیچے سے ہی گزرتے اچھے لگتے ہیں۔ میری سیلاب نظم تھی۔ جس کے آخری بند کے دو شعر تھے۔ جس میں میں نے پانیوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

آج تم کتنے بھی سرکش ہو کوئی بات نہیں
تم کو اک روز اترنا ہے اترنا ہوگا

☆

www.bhutto.org

آج تم اُوج ثریا پہ پہنچ جاؤ تو کیا
پانیوں تم کو پلوں سے ہی گزرنا ہوگا

اس تقریب کے بعد رات کو وزیر اعظم بھٹو نے ہنری کسنجر کے اعزاز میں لاہور کے شاہی قلعے میں ان کو آخری استقبالیہ دیا۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے ہنری کسنجر کو برصغیر کی تاریخ کے حوالے سے نہایت علامتی انداز میں اس کے اس خفیہ پیغام کا جواب دیا تھا جس کا جواب وہ پہلے گورنر ہاؤس کے استقبالیہ میں دریاؤں کے حوالے سے دے چکے تھے۔ ہنری کسنجر نے ان کو اپنے مخفی پیغام میں کہا تھا کہ مسٹر بھٹو ہم آپ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ مگر آپ جو کام کر رہے ہیں اس کا اشارہ ایٹمی پلانٹ کی طرف تھا۔ وہ کام ہم کو ناپسند ہے۔ آپ کے ایٹمی پلانٹ سے اس خطے میں طاقت کا توازن بگڑ جائے گا۔ ہم پاکستان جیسے بھوکے ننگے ملک کے ہاتھ میں اتنا خوفناک ہتھیار آتا دیکھ کر لرز جاتے ہیں۔ ہم اس کو عالمی امن کے لئے ایک تباہ کن بات تصور کرتے ہیں۔ آپ ابھی اس کی ابتدا میں ہیں آپ جو چاہیں ہم سے لے لیں۔ آپ کے اقتدار کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا آپ ابھی اور اسی وقت اس کو بند کرنے کا وعدہ کریں اور اس کی تنصیبات کے مقام کو امریکہ کے حوالے کر دیں۔

لہٰذا یہ وہ خفیہ پیغام تھا جو ہنری کسنجر کی آمد سے پہلے بھٹو صاحب کو مل چکا تھا جس پیغام کا ہنری کسنجر بھٹو صاحب سے روبرو بیٹھ کر جواب حاصل کرنے پاکستان آیا تھا۔

شاہی قلعے کی دعوت میں وزیر اعظم بھٹو نے مغل دور کی عشقیہ داستان جو شہزادہ سلیم اور انارکلی کے نام سے مشہور ہے۔ اس داستان کو اپنے اندازِ سخن کا ذریعہ بنا کر کسنجر کو ایک مختلف حوالے سے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ مسٹر کسنجر مغلِ اعظم شہنشاہ اکبر اپنے وقت کی ایک سُپر طاقت تھا۔ اس نے ایک گانے والی کنیز کو جس کا نام انارکلی تھا اس کو اپنے ولی عہد کے ساتھ عشق کرنے سے منع کیا تھا۔ مگر مسٹر کسنجر ہماری سرزمین کا عشق بہت سچا ہوتا ہے۔ یہ کسی طاقت کو نہیں مانتا۔ لہٰذا انارکلی نے اپنے عشق کی قوت کے بل پر مغل بادشاہ جو ایک سُپر طاقت تھا اس کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کنیز اپنے عشق پر قربان ہوگئی تھی۔

بادشاہ اکبر نے اس کنیز کو اپنی حکم عدولی پر اس قلعے کی ایک دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔ وہ کنیز مر کر اَمر ہوگئی۔ انارکلی کا نام اکبر اعظم کے برابر آج لیا جاتا ہے۔

www.bhutto.org

مسٹر کسنجر ہم کچھ اس قسم کے تاریخی پس منظر میں پل کر بڑے ہوئے ہیں۔ ہماری صدیوں کی لوک داستانیں ہماری ثقافت کا حصہ ہیں اور ہماری زندگیوں پر اُن کا گہرا اثر ہے۔ ہم ہر اعتبار سے محبت بھرے لوگ ہیں اور زندگی کو ہر انداز سے عشق کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم اپنی جان پر کھیلنے والے لوگ ہیں ہم سے کسی دوسرے کو کچھ خطرہ نہیں ہوسکتا۔ اس فقرے کے بعد انہوں نے اپنی تقریر ختم کر کے ہنری کسنجر کو خطاب کی دعوت دی تھی۔ ہنری کسنجر نے اسی تقریب میں وہ تاریخی جملہ کہا تھا۔ جس کا اکثر کتابوں میں ذکر ملتا ہے کہ میں نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ بات کرنے میں ہمیشہ دِقت محسوس کی ہے۔ اس نے کہا خواتین وحضرات یہ میری بدقسمتی ہے کہ آج مجھے بھٹو صاحب کے خطاب کے بعد تقریر کرنا پڑ رہی ہے۔ جو اس وقت دنیا کے سب سے بہتر اور بڑے مقرر ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ایک اچھی تقریر کی ہے بلکہ انہوں نے مجھ سے بہتر انگریزی زبان استعمال کی ہے۔ میں مسٹر بھٹو کے ساتھ بات کرتے ہوئے ہمیشہ محتاط رہا کرتا ہوں۔ میں ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب رات بھی کافی ہوگئی ہے اور صبح مجھے ہندوستان بھی جانا ہے۔ میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور مسٹر بھٹو کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ہنری کسنجر وزیر اعظم بھٹو کے دونوں خطابات سے ان کے مافی الضمیر کو سمجھ چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ بھٹو صاحب نے ان کو مختلف انداز میں ان کے پیغام کے بارے میں نفی میں جواب دے دیا ہے اور ان کے عفریت کا مقابلہ کرنے کے اشارے دیئے ہیں۔ کبھی سیلاب کے حوالے سے کبھی انارکلی کی بغاوت کے حوالے سے۔ لہٰذا اس کا شاہی قلعے کی دعوت میں خاص طور پر ہندوستان جانے کا اعلان کرنا یہ ایک امریکہ کی ناراضگی کا کھلا اعلان تھا۔ اس کو علم تھا کہ ہندوستان پاکستان کا دشمن ملک ہے۔ لہٰذا دشمن کا دشمن دوست والی بات کہہ کر ہنری کسنجر دوسرے دن صبح ہندوستان پہنچ گیا۔ اور ہندوستان کی سرزمین پر کھڑا ہو کر کسنجر نے ایٹمی پلانٹ کے حوالے سے صاف الفاظ میں وزیر اعظم بھٹو کا ذکر کرتے ہوئے وہ دھمکی دی تھی جو دنیا کی تاریخ میں انتہائی سیاہ الفاظ میں رقم ہو چکی ہے کہ ہم ذوالفقار علی بھٹو کو دنیا کے لئے ایک عبرت ناک مثال بنادیں گے۔

We will make a Horrible example of Mr. Bhutto

افسوس کہ آج تک وزیر اعظم بھٹو کو نہ تو ملکی سطح پر ان کو وہ مقام و مرتبہ دیا گیا ہے: جس کے وہ مستحق تھے اور نہ ہی پاکستان کے دانش وروں نے ان کو وہ اعزاز عطا کیا ہے جس کا وہ حق رکھتے تھے۔

وزیراعظم بھٹو نے تختہ ءدار پر چڑھ کراپنے عشق کا وہ ثبوت پیش کر دیا تھا۔جس ثبوت کو حافظ شیرازی نے عاشقوں کی پہچان قرار دیا تھا۔ان کا شعر تھا۔

طہارت گر نہ بہ خونِ جگر کند عاشق
بقول مفتیٔ عشقش درست نیست نماز

ترجمہ: عاشق جب تک اپنے خون جگر سے اپنی نماز کے لئے وضو نہ کرے
بقول مفتیٔ عشق اس کی نماز ہی درست نہیں ہوسکتی۔

وزیراعظم بھٹو نے جو انارکلی والی بات کی تھی امریکہ نے ان کو دار پر چڑھا کر پوری کر دی۔

ڈاکٹر مبارک علی کے ساتھ ایک علمی اختلاف

ہمارے ملک کے معروف جدید اور ترقی پسند تاریخ کے موجد جناب ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتاب ''تاریخ اور آج کی دنیا'' کے نام سے لکھی گئی اپنی کتاب کے صفحہ 80 پر ہیرو پرستی کے حوالے سے نپولین اور ہٹلر کا ذکر کرتے ہوئے ان کے عروج اور ان کے زوال کی مثال دیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ جب ان لوگوں کی وقت اور حالات کو ضرورت نہ رہی تو نپولین کو سینٹ ہلینا کے مقام پر بے بسی کے دن گزار کر مرنے پر مجبور کر دیا تھا اور ہٹلر کو خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں ہم ذوالفقار علی بھٹو کی مثال دے سکتے ہیں کہ جن کی شخصیت نے ایک ماحول اور حالات میں لوگوں کو ابھارا، لیکن جب حالات بدل گئے اور ان کی ضرورت نہ رہی تو ان کی زندگی کے آخری دن بھی ایک عام انسان کی طرح جیل میں گزرے۔

پہلی بات

اس معاملے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ نپولین اور ہٹلر دونوں فوجی جرنیل تھے۔وزیراعظم بھٹو ایک سیاسی اور عوامی قائد تھے ان کی کئی اعتبار سے ان کے ساتھ مثال نہیں دی جاسکتی۔

دوسری بات

نپولین اور ہٹلر دونوں غیر جمہوری قوت کے مالک تھے۔فوجی جرنیل اور ڈکٹیٹر تھے۔وہ ایک

www.bhutto.org

فاشسٹ حکمران تھے۔ جبکہ ذوالفقار علی بھٹو ایک منتخب جمہوری وزیراعظم تھے۔

تیسری بات

نپولین اور ہٹلر کا کسی طریقے سے بھی کوئی عوامی تشخص نہیں تھا جبکہ ذوالفقار علی بھٹو قائدِ عوام تھے۔

چوتھی بات

ڈاکٹر صاحب بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ نپولین کے آخری ایام بے بسی میں گزرے اور ہٹلر کو خودکشی کرنا پڑی مگر وہ ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے آخری ایام بھی ان کی ہی طرح یا ان کے بقول عام انسان کی طرح جیل میں گزرے۔

زمین آسمان کا فرق

ان دو انسانوں اور ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی اور موت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان دو انسانوں کی موت سے خصوصاً ہٹلر کی موت سے پوری کائنات نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ ان دونوں کی زندگی بچانے کے لئے کسی ایک انسان نے بھی احتجاج نہیں کیا تھا۔

1- مگر وزیراعظم بھٹو کی زندگی بچانے کے لئے سات جیتے جاگتے انسانوں نے بطورِ احتجاج اپنے جسموں کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ خود کو چوراہوں میں آگ لگا دی تھی۔ یہ احتجاج دنیا کی تاریخ کا انوکھا اور نرالا احتجاج تھا۔ جس کی دنیا کی سیاسی تاریخ میں کہیں مثال نہیں ملتی۔

2- ہزاروں سیاسی کارکنوں نے مارشل لاء کی عدالتوں سے اپنے احتجاج کی پاداش میں جیلوں میں کوڑے کھائے تھے۔

3- لاکھوں سیاسی کارکن جیلوں میں ڈال دیئے گئے تھے۔ خواتین تک کو شاہی قلعے میں قید رکھا گیا تھا۔

رہی ہیرو پرستی کی بات

دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ ہر قوم کے کچھ ثقافتی ہیرو ہوتے ہیں، اور کچھ سیاسی اور سماجی اور

www.bhutto.org

قومی شناخت کے ہیرو ہوتے ہیں۔ جن کی زندگی سے کسی قوم کی چاہتوں اور خواہشوں اور کردار و عمل کا اندازہ ہوتا ہے اور جن کی موت سے کسی قوم کے اجتماعی احساسات پر پڑنے والے اثرات کو معلوم اور محسوس کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ کسی بھی قوم میں دونوں طرح کے ہیرو کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ جس طرح پنجاب کی ثقافتی تاریخ سے ہیر اور رانجھے اور مرزا صاحباں کے عشق کی داستان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، جس طرح سندھ کی ثقافتی تاریخ سے سسی اور پنوں کے عشق کی داستان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ذوالفقار علی بھٹو کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اس لئے کہ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے محنت کش غریب عوام کے عزم اور ارادوں کی علامت تھے۔ وزیر اعظم بھٹو کی جیل کی آخری زندگی ایک طلاطم اور ہیجان خیز زندگی تھی۔ جو پوری دنیا کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے تھی۔ ان کی آخری زندگی ایک بہت بڑا المیہ تھی۔ پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے بھٹو کی شکل میں پوری قوم کو کوٹھی لگا رکھا تھا۔ اور ان کی پھانسی پاکستانی قوم کے اجتماعی احساسات کی پھانسی تھی اور قومی اجتماع کا قتل تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا مقولہ ہٹلر اور فوجی ڈکٹیٹروں کی زندگی اور موت پر تو صادق آ سکتا ہے وہ کسی قوم پرست پر صادق نہیں آ سکتا۔ یہاں پر میں محترم نذیر ناجی کے کالم کا ایک حصہ تحریر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں جو میرے موقف کی تائید میں ہے۔

کالم نویس نذیر ناجی

نذیر ناجی صاحب اپنے کالم میں لکھتے ہیں کہ افسوس کی بات ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ قائم نہ کیا گیا، جو مختلف محققین اور سکالرز کی خدمات حاصل کر کے ذوالفقار علی بھٹو کے اس تاریخی کردار کا احاطہ کرے، جو انہوں نے پاکستان، برصغیر، مسلم دنیا اور مغربی ایشیا کی تاریخ سازی میں ادا کیا۔ اس حوالے سے کئی موضوعات توجہ طلب ہیں۔ امریکہ نواز آمریت کے اندر رہ کر پاک چین تعلقات کی بنیاد رکھنا اور پھر ان تعلقات کے عالمی تاریخ پر اثرات۔ تیسری دنیا کی اجتماعی طاقت کو منظم کرنے کے لئے اقوام متحدہ کے متبادل ادارے کے قیام کا منصوبہ بنانا اور اس کی ناکامی کے اسباب وجوہ پر تحقیق۔ مغربی پاکستان کے جاگیردارانہ معاشرے میں ایک عوامی تحریک کو جنم دینا اور انتخابات کے ذریعے انقلابی صورتحال پیدا کر دینا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں توازن اقتدار

www.bhutto.org

کے لئے بھٹو صاحب کی کوششیں اور ان کے خلاف آمریت کی سازشیں۔ جن کے نتیجے میں ملک دولخت ہوا۔ ایک شکست خوردہ ملک کے سربراہ کی حیثیت سے فاتح ملک کے ساتھ ایسا معاہدہ کر لینا، جو فریقین کی طاقت کے تناسب سے پاکستان کے حق میں زیادہ تھا۔ اپنی ہی پیدا کردہ انقلابی صورتحال کو حکومتی ضروریات کے تحت عوام دشمن قوتوں کے حق میں سازگار کر دینا۔ اسلامی کانفرنس، تیل کا ہتھیار اور پھر اس ہتھیار کے استعمال کے نتائج کی وجہ سے دنیا بھر کے سیاسی نقشے میں تبدیلی۔ پاکستانی سیاست اور معاشرے پر ذوالفقار علی بھٹو کے اثرات۔ میں نے سرسری طور پر سوچ کر یہ چند موضوعات تلاش کئے ہیں، جن میں سے ہر موضوع پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

پاکستانی قوم کا زوال

میں نے پیچھے جس طرح قوموں کے عروج کے بارے میں چند علامتوں اور مثالوں سے تحریر کیا تھا کہ قوموں کے عروج کے زمانے میں قوموں کا تشخص اپنے کمال کو چھو رہا ہوتا ہے۔ اسی طریقے سے قوموں اور معاشروں کے زوال کے زمانے میں ان کی زندگی کا ہر شعبہ زوال کا شکار بن جاتا ہے۔ ان کے ادارے ان کی روایات ان کی قدریں تمام کی تمام زوال پذیری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ زوال کے وقت ہر قوم انحطاط کا شکار ہو جاتی ہے۔ معاشرہ ایک ہی جگہ پر رک جاتا ہے، کھڑا ہو جاتا ہے۔ لوگ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہونے لگتے ہیں۔ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ ماضی پرستی اور قدامت پرستی کا شکار بن جاتے ہیں۔ لوگوں کی سوچنے سمجھنے کی قوت مسخ ہو جاتی ہے۔

اعلیٰ انسانوں کی رسوائی اور اعلیٰ قدروں کی پسپائی سے لوٹ جھوٹ، فریب، سازش، بدعنوانی اور منافقت کا شکار بنا دیئے جاتے ہیں۔ لوگ سہل زندگی کا راستہ اپنانا شروع ہو جاتے ہیں۔ بدعنوان ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کی زوال پذیر ذہنی فضا میں لوگوں کو زندگی کے اعلیٰ اور ارفع مقاصد سے بیگانہ کر دیا جاتا ہے۔ اچھے اور برے کی تمیز ختم کر دی جاتی ہے۔ جس میں کوئی قوم ایک قوم کی بجائے ایک ہجوم کی زندگی بسر کرنے لگ جاتی ہے اور انسانی معاشرے میں محسن کشی اور احسان فراموشی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔

www.bhutto.org

لوگوں کو جبر اور تشدد کے ذریعے مذہب زدہ کیا جاتا ہے۔ جس طرح جنرل ضیاء الحق نے وزیر اعظم بھٹو کے سیاسی اور سماجی اور معاشی اور ثقافتی عروج کو ختم کر کے لوگوں کو مذہب کی آڑ میں ذہنی طور پر زوال پذیر کر کے پاکستان کے معاشرے کو ایک زوال زدہ معاشرہ بنا دیا تھا۔ جس کا تسلسل جنرل مشرف کی حکمرانی کی شکل میں ایک مختلف انداز سے آج 2007ء تک چلتا چلا جا رہا ہے اور پاکستانی عوام اور قوم کا وہ عروج کا زمانہ ایک خواب بنا دیا گیا تھا۔ جو زمانہ وزیر اعظم بھٹو کی حکومت کے دور میں معاشرے میں دیکھنے میں آیا تھا۔ جو زمانہ پاکستان میں تخلیقی قدروں کے عروج کا زمانہ تھا۔

پی۔ این۔ اے کی کہانی

پاکستان کے پرانے سیاست دان آغازِ پاکستان سے ہی کسی نا کسی حوالے سے اسٹیبلشمنٹ کے ایجنٹ بنا دیئے گئے تھے۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اس سرزمین پر پہلا سیاست دان تھا جو جنرل ایوب خان کی حکومت سے علیحدہ ہو کر اسٹیبلشمنٹ کے خلاف قومی سیاست میں داخل ہوا تھا۔ جنہوں نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پاکستان کے عوام کی سیاست کی پاکستان میں بنیاد رکھی تھی۔ لہٰذا وزیر اعظم بھٹو کی عوامی سیاست نے پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور پاکستان میں اس کے حامی سیاست دانوں کو پاکستان کی سیاست سے ہی باہر کر دیا تھا۔ پاکستان کے شکست خوردہ سیاست دان اور شکست خوردہ اسٹیبلشمنٹ دونوں ہی بھٹو صاحب سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ ہماری قوم کی بدنصیبی یہ ہوگئی کہ ان دونوں زخم خوردہ سانپوں کو عالمی سپر طاقت امریکی سامراج کی آشیرباد حاصل ہوگئی۔ اور یہ دونوں خونی بھیڑیئے اس آہوے خوش شکل اور خوش خرام پر ٹوٹ پڑے۔ پی۔ این۔ اے جس کو قومی اتحاد کا نام دے کر فوج اور امریکہ نے بھٹو صاحب کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر حزبِ اختلاف کی شکل میں اکٹھا کیا تھا۔ اس کا ایجنڈا امریکہ کی اس عالمی پالیسی کا ایجنڈا تھا جو امریکہ نے روس کے خلاف مرتب کیا تھا۔ جس میں روس کو کافر ثابت کرنا تھا اور اس کے خلاف امریکہ کی استعماریت کی جنگ کو کفر اور اسلام کی جنگ بنانا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قومی اتحاد کا سب سے بڑا نعرہ تھا کہ شراب کو بند کیا جائے۔ پاکستان میں شراب پر پابندی عائد کی جائے۔ پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنایا جائے۔ مولوی کوثر نیازی جو وزیر اعظم کے ساتھ فوج نے ابتداہی

میں منتقی کر دیا تھا۔ اس نے امریکہ اور فوج کی سازش کے تحت بھٹو صاحب پر زور دینا شروع کر دیا کہ آپ شراب پر پابندی لگا کر قومی اتحاد کے نعرے کو ہی ختم کر دیں۔ مولوی کوثر نیازی کی یہ چال پاکستان کی قومی زندگی کے رفلیکشن کو ہی تبدیل کرنے کی چال تھی۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے عوامی کلچر کو تباہ کرنے کی چال تھی۔ ان کے سیکولر نظامِ حکومت کو ختم کرنے کی چال تھی۔ پاکستان کو ایک بنیاد پرست ملک بنانے کی چال تھی۔ جس کی امریکہ کو اس وقت اشد ضرورت تھی۔ پاکستان میں شراب کو بند کرنا رجعت پسندوں کا پلہ بھاری کرنے والی بات تھی۔ ان کی ایک طرح کی عوامی فتح ثابت کرنے والی بات تھی۔ اس کے بعد ہماری حکومت کے پاؤں پھسلتے ہی گئے جم نہ سکے۔ یہاں تک جمعے کی چھٹی بھی کر دی گئی۔ میں نے بڑی دل خراش غزل تحریر کر کے وزیراعظم بھٹو کو بھیجی تھی مگر اس وقت بڑی دیر ہو چکی تھی۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ کریں۔

دین و دنیا جن کے ہاتھوں ہے خراب
بند کر دی ان کے کہنے پر شراب

احتسابِ حشر سے فارغ ہوئے
ہو چکا دنیا میں ہی اپنا حساب
زندگی کی جس سے خوشیاں ختم ہوں
شیخ کا وہ فعل ہے کارِ ثواب

بے خودی میں بیت جائے زندگی
ہوش میں رہ کر تو جینا ہے عذاب

شراب پر پابندی لگا کر پاکستان کے معاشرے کو رجعت پسند معاشرہ بنانا مقصود تھا اور بھٹو صاحب کی عوامی شہرت کو داغدار کرنا مقصود تھا۔ قومی اتحاد کی بات تو انتخابات میں دھاندلی سے چلی تھی اور معاملہ شراب پر پابندی کی طرف کر دیا گیا۔ یہ ایک باقاعدہ منصوبہ بندی تھی۔ ائیر مارشل اصغر خان وزیراعظم بھٹو کو سہالہ کے پل پر پھانسی دینے کا جو کہہ رہا تھا وہ ایک منصوبہ بندی کے تحت کہہ رہا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کے لئے زمین ہموار کر رہا تھا۔ خان عبدالولی خان جو

اس وقت بھٹوازم کے خاتمے کی بات کر رہا تھا وہ پھانسی کی ہی بات کر رہا تھا۔

مقامِ افسوس ہے اور پاکستان کی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ پاکستان کے تقریباً تمام حزب اختلاف کے سیاست دانوں نے جو پی۔این۔اے کے نام پر ایک سیاسی اتحاد کی شکل میں جمع تھے۔ان سب نے فوجی جرنیلوں کے ساتھ مل کر ایک عوامی سیاست دان اور منتخب وزیراعظم کو پھانسی پر چڑھایا تھا۔یہاں تک کہ حبیب جالب جیسا آزاد منش شاعر بھی شراب بند کروانے والے جلوس میں سب سے آگے چل رہا تھا۔اور شراب بند ہونے کے بعد خود ہی بھٹو شہید پر طعنہ زن تھا کہ اس نے شراب بند کر دی۔یہ بھٹو دشمنی کی انتہا تھی۔

نظامِ مصطفیٰؐ

پی۔این۔اے کی وزیراعظم بھٹو کے خلاف چلائی گئی تحریک کو میں نے پیچھے تحریر کیا تھا کہ یہ ایک بین الاقوامی سازش تھی۔ہم دیکھتے ہیں کہ پی۔این۔اے میں شامل تمام جماعتوں اور ان کے لیڈروں کا تمام تر احتجاج 1976ء کے انتخابات میں دھاندلی کے الزام سے شروع ہوا تھا۔ان تمام جماعتوں کا مطالبہ تھا کہ دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کے احتجاج میں پابندی شراب اور جمعہ کی چھٹی کا مطالبہ شامل ہو گیا یا کرا دیا گیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے معاملہ نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ تک جا پہنچا۔خفیہ طاقتوں نے جب دیکھا کہ بھٹو حکومت دوبارہ انتخابات کے لئے رضامند ہو رہی ہے۔پی۔این۔اے کی جماعتوں کے دوبارہ انتخابات کروانے کے مطالبے کو حکومت تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتی دیکھائی دے رہی ہے۔ان خفیہ طاقتوں نے نظامِ مصطفیٰؐ کا نعرہ دے کر احتجاج اور مطالبے کی تمام شکل کو ہی تبدیل کر دیا۔دوبارہ انتخابات کروانے کا مطالبہ پس پشت چلا گیا، اور تمام تحریک پر مذہبی انتہا پسندی کے نعروں کو مسلط کر دیا گیا۔نہ تو پی۔این۔اے کی پارٹیوں کے پاس نظامِ مصطفیٰؐ کا کوئی ایجنڈا تھا۔نہ کوئی اس نعرے کے مطابق ان کے پاس منشور تھا۔

پی۔این۔اے کے جلسے جلوسوں میں تمام رجعت پسند جماعتیں ایک ہی نعرہ لگا رہی ہوتی تھیں کہ نظامِ مصطفیٰؐ لائیں گے۔مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ایک اخبار نویس نے انٹرویو میں سوال کیا کہ مولانا حکومتیں ہمیشہ کسی منشور اور دستور پر چلائی جاتی ہیں یا بنائی جاتی ہیں آپ کے

www.bhutto.org

نظامِ مصطفیٰ کا دستور اور منشور کیا ہو گا۔ ان کا جواب تھا کہ قرآن۔ صحافی نے جواب میں کہا کہ قرآن میں تو کوئی سیاسی حکومت بنانے کا کوئی مخصوص کلیہ اور قاعدہ نہیں ہے اور نہ ہی تشکیلِ اقتدار اور انتقالِ اقتدار کا کوئی طریقہ بتایا گیا ہے۔ اس میں تو عدل و انصاف کی بات اور ہدایت کی گئی ہے۔ آپ لوگوں کو آج کی دنیا کے حکومتی قاعدوں کے مطابق اپنا کوئی منشور قوم کو پیش کرنا چاہئے۔ آپ محض نظامِ مصطفیٰ کا جذباتی نعرہ لگا کر قوم کو گمراہ کر رہے ہیں۔ مولانا کا جواب تھا۔ ہم گمراہ قوم کو ہی درست کرنے کے لئے نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ صحافی نے دوبارہ سوال کیا۔ اگر حکومت نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کا اعلان کر دے تو کیا آپ اس کو تسلیم کر لیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ (26 جون 1977ء روزنامہ وفاق)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ان تمام باتوں سے صفائی دیکھائی دیتا ہے کہ ان کا احتجاج وزیر اعظم بھٹو کی حکومت سے دوبارہ انتخابات کرانے کا ہرگز نہیں تھا۔ وہ فوج کے ذریعے ان کی حکومت کا تختہ الٹانا چاہتے تھے۔ جس میں وہ جنرل ضیاء الحق کے فوجی کوپ سے کامیاب ہو گئے تھے۔ وزیر اعظم بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد پی۔ این۔ اے کے تمام لیڈران کا گویا کوئی مطالبہ ہی نہ رہا۔ نہ ان کو دوبارہ انتخابات کرانے کا مطالبہ یاد رہا اور نہ مولانا مودودی کو اور مفتی محمود اور شاہ احمد نورانی کو نظامِ مصطفیٰ یاد رہا۔ نہ نوابزادہ نصر اللہ خان اور نصر خان اور عبدالولی خان کو انتخابات کی دھاندلی یاد رہی۔ اب ان تمام گرگوں کا نعرہ تھا کہ پہلے احتساب پھر انتخاب۔ حیف ہے بقول اسلم گورداسپوری ۔

ناصحوں پیروں نے اسلم مفتی و مُلّاؤں نے
مسندوں کو بیچ کر ایماں کا سودا کر دیا

وزیر اعظم بھٹو کی مودودی سے ملاقات

وزیر اعظم بھٹو جو پاکستانی قوم کے منتخب رہنما تھے اور عالمِ اسلام کے منتخب چیئرمین تھے، وہ اپنی قوم کے اور عالمِ اسلام کے مستقبل کے امین تھے۔ وہ اپنی قوم اور عالمِ اسلام کے وسیع تر مفادات کی خاطر اپنے اقتدار کے لئے کچھ مزید وقت چاہتے تھے، ان کی مدبرانہ دور اندیشی کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے تمام اہداف پورے کریں جو ان کی مستقبل کی منصوبہ بندی کا ایجنڈا ان کے

www.bhutto.org

دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ جس کے لئے انہوں نے مولانا مودودی کے گھر جانے میں اپنی کسرِ شان خیال نہ کیا۔ ان کا ایک انتہائی مخالف لیڈر کے گھر چل کر جانا ان کی قومی سیاست کی ذمہ داری کا ایک بہت بڑا ثبوت تھا۔ مگر بنیاد پرست کٹر مُلاّں بڑے سفاک ہوتے ہیں۔ ان کے سینے میں دل کی جگہ انتقام ہوتا ہے۔ وہ اپنے انتقام کو اپنی سیاست کی عظمت خیال کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا مودودی پر ان کے چل کر جانے کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ الٹا ان تمام رجعت پسندوں کی ان پر حجت تھی کہ بھٹو کو مودودی کے گھر آنا پڑا ہے۔ مودودی کے گھر جانے پر ہمارے لیفٹ کے لیڈروں نے بڑی پھبتیاں کسی تھیں۔ ان پی۔ این۔ اے کے تمام لیڈروں سے اور بائیں بازو کے خود ساختہ لیڈروں سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ یہ تمام لوگ خود تو پی۔ این۔ اے کی شکل میں بھٹو دشمنی میں مولانا مودودی کے اتحادی بنے ہوئے تھے۔ اس کے لئے ان کو کوئی شرم وحیا نہیں تھی۔ مگر بھٹو کا مودودی کے پاس جانا بھٹو کے لئے طعنہ تھا۔ گویا ان تمام بے اصولوں کا بھٹو سے اصولوں کا مطالبہ تھا۔

عین اس وقت جب پی۔ این۔ اے کے لیڈر بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کے مطالبے کر رہے تھے۔ میں نے نواب زادہ نصر اللہ خان مرحوم کو امیر خسرو کے شعر کی شکل میں خط تحریر کیا تھا۔ جس خط میں آداب وسلام کے بعد عرض کیا تھا۔

جفا کم کن کہ فردا روزِ محشر
بہ روئے عاشقاں شرمندہ باشی

نواب زادہ صاحب بلا کے سخن فہم تھے اور سخن ور بھی تھے۔ بھٹو صاحب کی شہادت کے بعد جب ایم۔ آر۔ ڈی بنی تو میں نے نواب صاحب سے اپنے خط کے بارے میں ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ جب میں نے آپ کا خط پڑھا تو اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ امیر خسرو نے جیسے یہ شعر ہمارے لئے ہی لکھا تھا۔ کہنے لگے کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنا مختصر اتنا معنی خیز اور اتنا عبرت ناک خط نہ اس سے پہلے کبھی پڑھا تھا اور نہ بعد میں کبھی پڑھا ہے۔

5- جولائی 1977ء

وزیر اعظم بھٹو نے پی۔ این۔ اے کی تمام شرائط کو تسلیم کر لیا تھا۔ پی۔ این۔ اے میں صرف

www.bhutto.org

ائیر مارشل اصغر خان ہی ایک ایسا شخص تھا جو مذاکرات کی کامیابی کے خلاف تھا۔ اس فوجی ایجنٹ کے علاوہ پی۔ این۔ اے کے باقی تمام لیڈر مذاکرات کی کامیابی پر خوش تھے۔ دوسری صبح اس معاہدے پر دونوں فریقوں کے دستخط ہونے تھے کہ رات کی تاریکی میں فوج نے وزیر اعظم بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹا دیا اور وزیر اعظم بھٹو کو گرفتار کر کے مری پہنچا دیا گیا۔ اسی طرح ان کی مرکزی کابینہ کے چند اہم ترین وزیروں کو بھی مری میں بھٹو صاحب کے ساتھ نظر بند کر دیا تھا۔ ضیاء الحق کا پہلا اعلان تھا کہ بھٹو صاحب اور ان کے ساتھیوں کو حفاظتی طور پر نظر بند کیا گیا ہے۔ اس کے اس بیان سے ظاہر یہ کیا جا رہا تھا کہ ان لوگوں کی جان کو خطرہ تھا۔ نظر بند کئے جانے والوں میں حفیظ پیرزادہ، ممتاز علی بھٹو، مولانا کوثر نیازی، راؤ رشید اور کچھ دوسرے لوگ تھے۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر صاحب کے بارے میں کہا گیا تھا کہ ان کو گرفتار کر کے راولپنڈی میں ہی رکھا گیا تھا جہاں پر فوجی جنرل ان سے علیحدہ مذاکرات کرتے رہے تھے۔ مری میں ہی جنرل ضیاء الحق نے ان تمام نظر بندوں کے ساتھ ملاقات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

وزیر اعظم بھٹو کا جنرل ضیاء الحق کے ساتھ آمنا سامنا

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

جنرل ضیاء الحق کی وزیر اعظم بھٹو کے ساتھ ملاقات محض ایک چال تھی۔ ضیاء الحق کا بھٹو صاحب کی حزبِ اختلاف کے تمام لیڈروں کے ساتھ رابطہ تھا۔ جو ضیاء الحق کے ساتھ بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹانے میں شریک تھے۔ وزیر اعظم بھٹو کے ساتھ ضیاء الحق ملاقات کر کے ظاہر یہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ تمام سیاست دانوں کے ساتھ ملاقات کر رہا ہے۔ اس میں کوئی تخصیص والی بات نہیں ہے۔ ضیاء الحق عبداللہ بن ابی کا بھی باپ تھا۔ وہ ایک منافق انسان تھا اور فطرتی اعتبار سے بے حد فریبی اور دغا باز اور احسان فراموش انسان تھا۔ اس کے ہر ایکشن میں کوئی فریب مستور ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وزیر اعظم بھٹو کو اس کو دیکھ کر بڑی اذیت ہوگی بڑا غصہ آئے گا۔ مگر وہ چونکہ اپنی مار پر تھا۔ وہ اپنے فریب کے مطابق بھٹو صاحب کے پاس مری میں ان کی نظر بندی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ بھٹو صاحب کے کہنے کے مطابق ان کا کہنا تھا کہ مجھے جنرل ضیاء الحق کو دیکھ

کر تمام واقعات یاد آ گئے۔ ایک فلم میرے ذہن میں چلنا شروع ہو گئی کہ کس طرح یہ مکار شخص سر جھکا کر بات کیا کرتا تھا۔ شیکسپیئر نے ایک جگہ کہا تھا کہ:

"Be aware from that person how is our curtious to you."

''اس آدمی سے خبردار رہو جو حد سے بڑھ کر تمہاری خوشامد کرتا ہو۔''

بھٹو صاحب نے ضیاء الحق سے پہلی بات کہی کہ جنرل صاحب پاکستان کے آئین کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ تم جانتے ہو تمہارا کوپ ایک بغاوت ہے، آئین کے خلاف ایکٹ ہے، غداری ہے، جس کی سزا موت ہے۔

ضیاء الحق نے گھبرا کر کہا کہ سر میں مجبور تھا۔ ملک میں خانہ جنگی ہو جانے کا خطرہ تھا۔ یہ فیصلہ آرمی کونسل کا مشترکہ فیصلہ تھا۔ ملک میں جلد آزادانہ انتخابات کرائے جائیں گے اور فوج واپس بیرکوں میں چلی جائے گی۔

بھٹو صاحب نے کہا۔ خدا کرے جنرل ایسا ہی ہو۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے کہا کہ اب ہمارا مستقبل کیا ہے۔ ضیاء الحق کہنے لگا۔ آج رات میں انتخابات کا اعلان کردوں گا۔ کل صبح آپ کو آزاد کر دیا جائے گا۔ عوام کا جو فیصلہ ہوگا اس کو تسلیم کیا جائے گا۔ وزیراعظم بھٹو نے کہا کہ تم یہ سب کچھ کس آئین کے تحت کرو گے۔ میں تو خود دوبارہ انتخابات کا اعلان کر چکا تھا۔ میرے اعلان کے بعد مارشل لاء لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ ضیاء الحق کہنے لگا کہ حزبِ اختلاف کے قائدین کا مطالبہ تھا کہ فوج انتخابات کرائے۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ ان کا تو میرے ساتھ معاہدہ ہو چکا تھا۔ صبح دستخط ہونے تھے کہ تم نے مارشل لاء لگا دیا۔ ضیاء الحق نے کمال ڈھٹائی کے ساتھ کہا کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے پاکستان کے سیاست دانوں کے مشورے کے ساتھ کیا ہے۔ اس معاملے میں وہ تمام ہمارے ساتھ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جنرل ضیاء الحق کمرے سے باہر جانے کے لئے کھڑا ہو گیا اور Best of Luck کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے بھٹو صاحب کے ساتھ ہاتھ ملانے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

وزیراعظم بھٹو کی اور جنرل ضیاء الحق کی اس ملاقات پر کچھ لوگ محبت سے یہ محسوس کرتے تھے کہ بھٹو صاحب کو ضیاء الحق کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آنا چاہئے تھا۔ اس کے ساتھ کسی قسم کے غصے کا اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بڑی مصلحت سے کام لینا چاہئے تھا۔ اس کو آئین شکنی کے

جرم کا خوف نہیں دلانا چاہئے تھا۔اس کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کرنا چاہئے تھی اور در پردہ اس کو اپنے ساتھ ملا لینا چاہئے تھا۔

یہ خواہش کچھ لوگوں کی محبت کا مظہر تھی۔مگر وہ ایک اٹل حقیقت کو محسوس نہیں کرتے تھے۔وہ حقیقت یہ ہے کہ حالات خواہ کتنے بھی خطرناک تھے بھٹو صاحب اپنی فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔وہ ایک صاف اور شفاف فطرت کے انسان تھے، جو محسوس کرتے تھے وہ زبان پر لے آیا کرتے تھے۔وہ ایک منافق انسان کے ساتھ منافق نہیں بن سکتے تھے۔یہ صرف دو انسانوں کے درمیان کی بات نہیں تھی۔یہ دو فطرتوں کے درمیان بات تھی۔دو ضمیروں کے درمیان مقابلہ تھا۔دو خونوں کا امتحان تھا۔یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ بھٹو صاحب ضیاء الحق کی طرح کی ریاکاری سے کام لیتے۔یہ سودا بھٹو صاحب کے ضمیر میں ہی نہیں تھا۔اب جو بات بھٹو صاحب میں عنقا تھی۔اس کے بارے میں کسی قسم کے افسوس کا اظہار کرنا اور یوں تصور کرنا کہ بھٹو صاحب اگر یوں کرتے تو یوں نہ ہوتا۔ایک محض جذبہ ہے، محبت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔بقول مرزا بیدل

جوہر جامِ جم از کانِ جواہر دگر است
تو تمنا ز گلِ کوزہ گراں ی داری

ترجمہ: جامِ جمشید کی مٹی کسی اور ہی کان کی ہوتی ہے۔کمہاروں کی مٹی سے اس جوہر کی تمنا نہیں کی جا سکتی۔

بھٹو صاحب کی مٹی میں اور ضیاء الحق کی مٹی میں بہت فرق تھا۔اتنا فرق تھا جتنا جمشید بادشاہ کے بنائے جانے والے جام کی مٹی میں اور عام کمہاروں کے پیالے بنانے والی مٹی میں ہوتا ہے۔ضیاء الحق کی مٹی گندی اور کیچڑ تھی۔شہید بابا کی مٹی خونِ خاک شہیداں کی پاک مٹی تھی۔جو اپنا ہی جوہر رکھتی تھی۔

اکتوبر 1977ء کے انتخابات کا اعلان

جنرل ضیاء الحق نے اکتوبر 1977ء کے انتخابات کا اعلان کر دیا۔وزیر اعظم بھٹو اور ان کے تمام ساتھیوں کو آزاد کر دیا گیا۔وزیر اعظم بھٹو نے خود کو حکومتی ذمہ داریوں سے نجات پاتے ہی پاکستان کے عوام کے ساتھ اپنا رابطہ بحال کرنے کا نعرہ اختیار کرتے ہوئے لاہور اور ملتان کے طوفانی دورے کا اعلان کر دیا۔اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے لاہور آنے کا اعلان

کیا۔ لاہور وہ بذریعہ ہوائی جہاز تشریف لائے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن اور غریب عوام فوجی جرنیلوں کی سازش کا ادراک کر چکے تھے۔ تمام کارکن گلے شکوے بھول کر بھٹو صاحب کے استقبال کو چل نکلے۔ لاہور کے غریب عوام سیلاب کی طرح مال روڈ سے لے کر ہوائی اڈے تک ایک کارواں کی شکل میں دیکھائی دے رہے تھے۔ میں چونکہ شروع سے بھٹو صاحب کے جلسوں جلوسوں میں شریک رہتا تھا۔ میں نے اس انداز کا بھٹو صاحب کا استقبال پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کے پہلے استقبالوں میں لوگوں کی محبت اور جوش وخروش ہی دیکھنے میں آیا کرتا تھا۔ مگر اس استقبال کی نوعیت کچھ مختلف تھی۔ اس میں لوگوں میں جوش وخروش کے علاوہ ایک قسم کا غصہ اور ناراضگی کا کھلا اظہار ظاہر ہو رہا تھا۔ لوگ فوجی جرنیلوں کی بھٹو صاحب کے خلاف کی گئی سازش کے خلاف باقاعدہ احتجاج کے لئے سڑکوں پر آئے تھے۔ لوگ فوج اور امریکہ اور پی۔ این۔ اے کے لیڈروں کو گالیاں دے رہے تھے ان کا سیاپا کر رہے تھے اور بھٹو صاحب کے حق میں نعرے لگاتے چلے جا رہے تھے۔ یہ مظاہرہ دراصل لوگوں کا وزیر اعظم بھٹو کے حق میں زندہ جاوید ریفرنڈم تھا۔

لاہور کے لوگ بھٹو صاحب کی اکثریت ثابت کرنا چاہتے تھے۔ لوگ پی۔ این۔ اے کی مقبولیت کا پردہ چاک کرنا چاہتے تھے۔ لاہور کا ہر غریب شہری اپنی ایمان داری کے ساتھ ذمہ داری کے ساتھ اس استقبال میں اپنی حاضری ظاہر کرنے کے لئے ہوائی اڈے کی طرف روانہ تھا۔ نہ تو پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے کسی قسم کی ٹرانسپورٹ کا کوئی انتظام تھا اور نہ ہی ہوائی اڈے کی جانب کوئی بس وغیرہ آ جا رہی تھی۔ لوگ پیدل چل رہے تھے۔ ایک طرح کا میلے کا سماں تھا۔ ایک لانگ مارچ تھی لوگوں کا ایک احتجاجی سفر تھا۔ لوگوں کا ہجوم سیلاب کے پانی کے ریلے کی طرح رواں دواں تھا۔ حضرات یہی وہ جلوس تھا جس کو دیکھ کر جنرل ضیاء الحق اور اس کے ساتھی جرنیلوں نے وزیر اعظم بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ وزیر اعظم بھٹو جب ہوائی جہاز سے اتر کر وی۔ آئی۔ پی لاؤنج کی عمارت کے بائیں جانب کھلے گیٹ کی طرف پیدل چل کر آ رہے تھے تو میں نے ایک طرف سے نوجوانوں کا ایک ریلہ آتے دیکھا۔ یہ نوجوانوں کا ریلہ طالب علموں کا جلوس تھا۔ طالب علموں نے جہانگیر بدر کو اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور یہ ریلہ لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا بھٹو صاحب کے سامنے پہنچ گیا تھا۔

جہانگیر بدر کا جلوس اور لاہور میں پہلی کوڑوں کی سزا

جہانگیر بدر کو طالب علموں نے چونکہ اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے جہانگیر بدر کو پہچاننا سب کے لئے آسان ہو گیا تھا۔ بھٹو صاحب طالب علموں کے نعروں کا جواب اپنا ہاتھ ہلا کر دے رہے تھے۔ لوگوں کا ہجوم سمندر کی طرح ہوائی اڈے کے ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ دور دور تک سر ہی سر دیکھائی دے رہے تھے۔ بھٹو صاحب نے ہوائی اڈے پر ایک گاڑی پر کھڑے ہو کر بہت مختصر سا خطاب کیا۔ وہ خطاب میگا فون کے ذریعے تھا ان کی آواز قریب کے لوگ ہی سن سکتے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو کہا کہ میرے اور آپ کے خلاف سازش ہو چکی ہے۔ یہ سازش اصل میں پاکستان کے خلاف ہے۔ پاکستان کے عوام کے خلاف ہے۔ میں چونکہ پاکستان اور پاکستان کے عوام کا محافظ ہوں۔ میرے ہوتے پاکستان کے دشمنوں کی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ میں ایک بار نہیں ہزار بار انتخاب لڑنے کو تیار ہوں۔ مجھے پاکستان کے عوام پر اعتماد ہے۔ اس سازش کا آپ کو اور مجھے مل کر مقابلہ کرنا ہے۔ آج کا معاملہ صرف استقبال کا معاملہ ہے۔ آپ کی حاضری کا معاملہ ہے۔ میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا تھا کہ آج ہم اپنی گنتی کے لئے باہر آئے ہیں، حاضری کے لئے آئے ہیں۔ وہی بات بھٹو صاحب کہہ رہے تھے۔ میں بہت جلد لاہور میں انتخابی جلسہء عام کروں گا۔ خدا نے چاہا تو میں امریکہ اور اس کے ایجنٹوں کو شکستِ فاش دوں گا۔ میں ہر طرح آپ کے ساتھ رہوں گا۔ آپ کے لئے اگر مجھے مرنا بھی پڑا تو مروں گا۔ مگر آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ بھٹو صاحب کی اس بات پر لوگ بے حد مشتعل ہو گئے۔ ضیاء الحق کو کانا، کتا کہنے لگ گئے۔ ہجوم میں ایک طرح کی آگ دیکھائی دے رہی تھی۔ بھٹو صاحب نے لوگوں کو ہوائی اڈے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک دم لوگوں نے اپنا رخ ہوائی اڈے کے باہر کی جانب تبدیل کر لیا اور یہ سیلاب ہوائی اڈے سے آہستہ آہستہ باہر نکلنا شروع ہو گیا۔

جہانگیر بدر کے ساتھ جو دوسرا لڑکا لوگوں کے کندھوں پر سوار تھا وہ نوجوان مشہور ایکٹر شاہنواز تھا۔ میں اور چوہدری اسلم گل جلوس کے ساتھ ساتھ چل کر ہوائی اڈے سے باہر آ گئے اور تیزی کے ساتھ لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گئے جو ہجوم باہر سڑک سے لاہور شہر کی جانب رواں تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے تمام کارکنوں کے چہرے جلوس میں نظر آ رہے تھے۔ جب ہمارا جلوس پیدل چلتا ہوا

www.bhutto.org

ہوائی اڈے سے کافی فاصلے پر پہنچ گیا تو پیچھے سے مسافروں کی کچھ گاڑیاں آنا شروع ہوگئیں۔ایک گاڑی میں مولانا شاہ احمد نورانی ہم کو دکھائی دیئے۔ان کی گاڑی لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے آگے نکل گئی۔ آگے لوگوں کے ہجوم میں سے کسی شخص نے لوگوں کو مولانا کی طرف متوجہ کرنے کے لئے آواز بلند کی اور پنجابی میں کہا کہ اوئے نورانی قاتل نوں پھڑلو۔غالباً یہ اشتعال خفیہ ایجنسی کی طرف سے لوگوں کو دلایا گیا تھا تا کہ سیاسی لیڈروں کو عوام سے اور پیپلز پارٹی سے ڈرایا جائے اور ان کو بھٹو صاحب کے خلاف کر دیا جائے۔تا کہ وہ ضیاء الحق کو اپنا نجات دہندہ تصور کریں۔ لوگ شاہ احمد نورانی کی گاڑی پر پل پڑے۔پیپلز پارٹی کا ایک جانا پہچانا کارکن سلامت علی قریشی اور اس کا بھائی جو اس ہجوم میں موجود تھا اس نے یہ تمام واقعہ بعد میں لوگوں کو سنایا تھا۔اس کے مطابق لوگوں نے شاہ احمد نورانی کے سر سے ان کی رنگدار پگڑی جو مشدی کی طرح تھی وہ اتار دی تھی۔لوگ اس مشدی کا سرا پکڑ کر بھاگ رہے تھے۔اور یہ دستار دور تک لوگوں کے ہاتھوں میں نظر آ رہی تھی۔ جس کو ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔اس طرح سلامت علی کے بقول کہ اس اشتعال میں اس کا ہاتھ بھی مولانا کی پگڑی پر جا پڑا تھا جس کو لوگوں نے تار تار کر دیا تھا۔ ہر چند یہ واقعہ فوجی حکومت کی طرف سے کرایا گیا تھا مگر اس واقعے سے لوگوں کی پی۔این۔اے کے لیڈروں کے خلاف نفرت کا جو اظہار کیا گیا تھا وہ اظہر من الشمس تھا، جو فوجی حکمرانوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے بہت کافی تھا۔ مگر فوجی جرنیلوں کی آنکھیں نہیں ہوتیں ان کے پاس بندوقیں ہوتی ہیں۔

اس جلوس اور استقبال کے بعد دوسرا استقبال ملتان میں اس لاہور کے استقبال کے دوسرے دن تھا۔پورا ملتان شہر ہی ہوائی اڈے پر اُمڈ آیا تھا۔پنجاب میں یہ ایک طرح کا بھٹو صاحب کے حق میں عوام میں مقبولیت کا ریفرنڈم تھا۔فوجی جرنیل اور ان کا آقا جو پی۔این۔اے کی مصنوعی مقبولیت سے اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے کہ بھٹو عوام کی مقبولیت کھو چکا ہے۔فوجی حکمران لوگوں کے ہجوم اور ان کا جوش ولولہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ان کا خیال تھا کہ بھٹو کو وہ آسانی کے ساتھ سیاست سے باہر کر دیں گے۔بھٹو صاحب کی عوامی مقبولیت سے ان کا یہ خیال بہت خام ثابت ہو گیا۔لہٰذا ملتان کے جلوس کے بعد فوجی حکمرانوں نے وزیراعظم بھٹو کو مزید کسی دوسرے شہر میں جلوس لیڈ کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔فوجی عدالتوں کے ہر شہر میں مورچے قائم کر دیئے گئے۔ سب سے پہلے لاہور میں جہانگیر بدر کو گرفتار کر کے ان پر مارشل لاء ضابطہ کے تحت سمری ملٹری

www.bhutto.org

کورٹ میں مقدمہ چلا کر ان کو ایک سال قید بامشقت اور 10 کوڑوں کی سزا دی گئی۔ میرا خیال ہے کہ لاہور میں مارشل لاء کی یہ سب سے پہلی قید اور کوڑوں کی سزا تھی جو جہانگیر بدر کو سنائی گئی تھی۔ جہانگیر بدر کے ساتھ شاہ نواز ا یکٹر کو بھی ایک سال قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ ان کے بعد علامہ شاہ احمد نورانی کی پگڑی اچھالنے کے جرم میں سلامت قریشی اور اس کے بھائی اور کچھ دوسرے کارکنوں کو بھی ایک سال قید بامشقت اور کوڑوں کی سزا سنائی گئی تھی۔ اسی طرح ملتان شہر کے کارکنوں کو بھی قید اور کوڑوں کی سزا سنائی گئی تھی۔ وزیراعظم بھٹو کی گرفتاری اور کارکنوں کی قید اور کوڑوں کی سزاؤں سے جنرل ضیاء الحق کے عزائم کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ اب کسی شخص کے دل میں یہ غلط فہمی باقی نہیں رہ گئی تھی کہ جنرل ضیاء الحق انتخابات کروا کر اقتدار سے علیحدہ ہو جائے گا۔

بھٹو صاحب کی لاہور آمد

وزیراعظم بھٹو فوجی حکمرانوں پر اپنی عوامی مقبولیت کا مظاہرہ کرنے کے بعد لاہور تشریف لائے۔ فاروق لغاری کے گھر ان کا قیام تھا۔ میں صبح گیارہ بجے کے قریب لغاری ہاؤس گیا۔ فاروق لغاری کے گھر کے اردگرد بے شمار پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ انتہائی خوف و ہراس کی فضا تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ بات نوٹ کی کہ بھٹو صاحب کی آمد پر اس قدر کم لوگ وہاں پر موجود تھے۔ میرے خیال کے مطابق کارکنوں کی تعداد 100 سے بھی کم تھی۔

وزیراعظم بھٹو کے ساتھ ان کے جو ساتھی وہاں بیٹھے تھے ان کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی مجبوری کے تحت وہاں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بھٹو صاحب کے ہمراہ بیٹھنے والوں میں ملک غلام مصطفیٰ کھر، نواب صادق حسین قریشی اور سردار فاروق احمد لغاری وغیرہ تھے۔ ان کے چہرے فق ہو چکے تھے ان کے رنگ زرد پڑ رہے تھے۔ تمام کے تمام بے خوابی کا شکار لگتے تھے۔ کسی کے منہ پر رونق نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی کے ساتھ کوئی بات کرتے تھے۔ یہ ایک طرح کی ایک بے رونق قسم کی محفل آرائی تھی۔ جس میں نہ تو پیپلز پارٹی کا کوئی رنگ تھا اور نہ ہی کوئی ولولہ تھا جو ہمیشہ قائد عوام کی موجودگی میں دیکھنے میں آیا کرتا تھا۔ اس اجلاس کے انعقاد کی ذمہ داری نواب صادق حسین قریشی پر تھی اس نے فوجی حکمرانوں کے خوف سے کسی کو اس اجلاس کی اطلاع ہی نہیں دی تھی۔ بس گنتی کے چند لوگوں کو وہاں پر بلایا گیا تھا۔ اس طرح کی صورت حال سے فوجی حکومت کی مدد کے لئے یہ ثابت

کرنا مقصود تھا کہ اب پیپلز پارٹی میں کوئی دم خم باقی نہیں رہ گیا۔ ایک طرح کا بھٹو صاحب کو تنہا ثابت کرنے کی سازش تھی۔ فوج کے ایجنٹ پیپلز پارٹی کو ایک اُجڑا ہوا باغ ظاہر کرر ہے تھے۔ ان کا بھٹو صاحب کے ساتھ بیٹھنے کا انداز صاف ظاہر کرر ہا تھا کہ وہ ایک مجبوری کے تحت وہاں پر بیٹھے ہیں۔

وہاں پر موجود کارکنوں نے بھٹو صاحب کو سلام پیش کیا اور ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے بھٹو صاحب کی نظر شیر محمد بھٹی مرحوم پر پڑی۔ بھٹو صاحب نے بڑے تلخ لہجے میں شیر محمد بھٹی کو طنزاً کہا کہ کہو شیر خان تم یہاں کیسے آئے ہو۔ میں نے تمہیں پیغام بھیجا تھا کہ حوصلہ کرو مت ڈرو مت بھاگو یہ صرف میرے دشمن ہیں کسی اور کو کچھ نہیں کہیں گے۔ مگر تم تھے کہ دم دبا کر بھاگ گئے تھے۔ مرحوم شیر محمد بھٹی نے اپنی صفائی میں کہا کہ پی۔ این۔ اے کے غنڈے میرا گھر جلا دینا چاہتے تھے۔ جس کی وجہ سے میں استعفیٰ دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بھٹو صاحب نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حوصلہ کرو اور وقت کا سامنا کرو۔ ان کا یہ پیغام ایک طرح سب کے لئے تھا جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی اس بات کے بعد کارکنوں نے باری باری لیڈروں کی بے اعتنائی کے گلے شکوے کرنا شروع کر دیئے۔ جن کو بھٹو صاحب بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ سنتے رہے۔ اس مجلس میں دوسرے کارکنوں کی طرح مجھے بھی بات کرنے کا موقعہ مل گیا تھا۔ میں ابھی اپنی بات کا آغاز ہی کرر ہا تھا کہ بھٹو صاحب خود گویا ہو گئے۔ مجھے شکوے کے انداز میں کہنے لگے آؤ شاعرِ عوام تم نے انتخابی جلسوں میں پہلے جیسی گرم جوشی نہیں دیکھائی۔ تم مجھے میرے کسی جلسے میں دیکھائی نہیں دیئے تھے۔ بھٹو صاحب کی یہ بات میرے لئے بڑی تکلیف دہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پنجاب حکومت کے بلاوے کے بغیر پنجاب میں ان کے ہر بڑے انتخابی جلسے میں خود جا کر نظم پڑتا تھا اور خطاب کرتا تھا۔ ان جلسوں کا معاملہ یوں ہوتا تھا کہ یہ سرکاری جلسے ہوتے تھے۔ ڈپٹی کمشنر اور کمشنر جلسوں کی کمان کرتے تھے۔ وزیر اعظم بھٹو کی آمد سے پہلے تلاوت کروا کر مجھے نظم پڑھنے یا خطاب کرنے کی دعوت دے دی جاتی تھی۔ ان کے جلسے میں آنے کے ساتھ ہی ان کی تقریر کروادی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے میرا ان کے ساتھ آمنا سامنا ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بھٹو صاحب کو کہا کہ مُرشد آپ اپنے وزیر اعلیٰ سے پوچھ لیں اپنے ان وزراء سے یا کارکنوں سے پوچھ لیں۔ میں آپ کے ہر جلسے میں حاضری دیتا رہا ہوں۔ (میں بھٹو صاحب کو محبت سے مُرشد کہا کرتا تھا) مگر چونکہ آپ کے جلسوں کا وہ پہلا سا عوامی طریقہ نہیں رہا

تھا۔ حکومتی طریقہ تھا۔ میں آپ کی آمد سے پہلے نظم سنا کر فارغ ہو جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ کے ساتھ ملاقات نہیں ہو سکتی تھی۔ بھٹو صاحب نے نواب صادق قریشی سے میری بات کی تصدیق چاہی تو صادق قریشی نے کہا کہ یہ ہر بڑے انتخابی جلسے میں آ تا رہا ہے۔ بھٹو صاحب نے صادق قریشی کو کہا کہ تم نے تو مجھے رپورٹ دی تھی کہ پیپلز پارٹی کے پرانے کارکن ناراض ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے ہیں۔ وہ انتخابی جلسوں میں شریک ہی نہیں ہوتے۔ صادق قریشی نے کہا کہ سائیں وہ میں نے دوسرے لوگوں کے بارے میں کہا تھا شاعر صاحب کے بارے میں نہیں کہا تھا۔

دراصل بھٹو صاحب کو خیال تھا کہ پارٹی کے پانچ سالہ اقتدار میں مجھے بری طرح نظر انداز کیا گیا تھا۔ وہ میری طبیعت سے واقف تھے۔ ان کے ساتھ اقتدار کے دوران دو ایک بار میری کچھ ناخوشگوار باتیں ہو چکی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ آج تو یہ بے حد احمقانہ باتیں کرے گا۔ بڑا احتجاج کرے گا۔ بڑی تلخ باتیں کرے گا۔ جس کے لئے وہ میری کوئی غلطی پکڑ کر مجھے ہی قصوروار ثابت کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ میں کوئی کڑوی کسیلی بات نہ کہہ سکوں۔ مگر جب پہلی بات میں ان کو میری صفائی مل گئی تو انہوں نے ایک دوسری بات شروع کر دی کہ تم خود اپنے دشمن ہو۔ تم کبھی عقل کی بات ہی نہیں کرتے تھے۔ تمہاری ضد تھی کہ تم کو سفیر لگایا جائے۔ تم غلط آفس کا تقاضا کرتے تھے۔ تم ڈپلومیٹ نہیں تھے۔ تم کو سفیر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ میں نے گزارش کی کہ وزیر اعظم صاحب میں نے آپ کو کبھی کہا تھا کہ مجھے سفیر لگایا جائے۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے تو نہیں کہا تھا میرے دوستوں کو کہا تھا۔ یہ بات انہوں نے قریب بیٹھے ہوئے ملک غلام مصطفےٰ کھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہی۔ میں نے کہا کہ سر میں آپ کے دوستوں کو اس قدر جھوٹا خیال نہیں کرتا۔ میری اس بات پر کارکنوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔

میں نے کچھ ناراضگی کے انداز میں کہا کہ وزیر اعظم صاحب آج آپ ان اپنے دوستوں کی وجہ سے ہی یہاں پر اس حال میں بیٹھے ہیں۔ میں آج آپ کے ساتھ کوئی گلہ گزاری نہیں کرنا چاہتا۔ آج میرا خون مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں آپ سے اپنی محرومی کے گلے شکوے کروں۔ میں فقیر آدمی ہوں اپنی فقیری میں مست ہوں۔ میں نے کہا کہ فخرِ ایشیا معاملات بہت خوفناک ہو چکے ہیں۔ مجھے آپ کی زندگی چاہئے۔ آپ کی خیریت چاہئے۔ آج ہم سب کو اس سازش کا سامنا کرنا ہے جو آپ کے اور پاکستان کے خلاف کی

جا چکی ہے۔ میں پہلے سے بھی زیادہ آپ کے لئے قربانی دینے کو تیار ہوں۔ میرا آپ کے ساتھ عشق ہے سیاست نہیں ہے میں آپ کو اس قوم کے لئے ضروری خیال کرتا ہوں مجھے اپنے نظر انداز کیئے جانے کا کوئی گلہ نہیں ہے۔

میری باتوں سے بھٹو صاحب کے متفکر چہرے پر کچھ روشنی دیکھائی دی۔ ان کے چہرے پر کچھ خوشی کے آثار نمایاں ہوئے۔ انہوں نے بے حد محبت کے ساتھ کہا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اسلم پارٹی کو شاعروں اور ادیبوں کی ضرورت ہے۔ ہم کو ایک بار پھر جدوجہد کرنی ہے۔

اس کے ساتھ ہی بھٹو صاحب کھڑے ہو گئے اور وہ اخبار نویسوں کے ساتھ باتیں کرنے لگ گئے۔ میرے ساتھ پارٹی کے معروف کارکن میاں منیر اور خواجہ ناہید وہاں موجود تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر بھٹو صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ایک دم ٹھہر گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس وقت تنظیم میں اور الیکشن میں ورکروں کو آگے لایا جائے تا کہ مارشل لاء کا مقابلہ کیا جا سکے۔ بھٹو صاحب نے مسکرا کر کہا (Keep in tuch with me) میرے ساتھ رابطہ رکھو۔

مجھے صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دیا گیا

جنرل ضیاء الحق کے انتخابات کے اعلان کے بعد پارٹی کے ٹکٹوں کی تقسیم کا نئے سرے سے سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اُمیدواروں سے درخواستیں مانگی گئیں۔ میں نے بابا سوشلزم شیخ محمد رشید کے نیچے صوبائی سیٹ کے لئے درخواست دی جہاں میری رہائش تھی۔ یہ مزنگ اور سمن آباد کا علاقہ تھا۔ اس سیٹ پر بابا سوشلزم پیر سید ناظم حسین شاہ کو ٹکٹ دینا چاہتے تھے۔ وہ ان کے لئے بڑے کمٹیڈ تھے۔ اتفاق سے طارق وحید بٹ کو ملٹری کورٹ سے سزا ہو جانے کی وجہ سے شاد باغ مصری شاہ کی صوبائی سیٹ خالی ہو گئی تھی۔ بابا سوشلزم نے میرا نام اس سیٹ کے لئے تجویز کر دیا۔ اس علاقے میں ایم۔ این۔ اے کا ٹکٹ سید ایس۔ ایم۔ مسعود کو دیا گیا تھا۔ جہاں سے اب دوبارہ ان کو قومی اسمبلی کا انتخاب لڑنا تھا۔ میں نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ اگر میں آپ کے نیچے ٹکٹ صوبائی سیٹ پر آ جاؤں تو آپ کو کچھ اعتراض تو نہ ہو گا۔ شاہ صاحب نے کہا کہ میرے پاس تو وہاں کوئی ڈھنگ کا اُمیدوار ہی نہیں ہے اگر تم آ جاؤ تو مجھے خوشی ہو گی۔ میں نے وزیر اعظم بھٹو صاحب کو ایک مختصر سا خط تحریر کیا۔ اس وقت وہ لاڑکانہ میں تھے۔ اس خط میں میں

www.bhutto.org

نے ان کو اس صوبائی سیٹ کے خالی ہونے کا بتایا اور کہا کہ آپ اگر مناسب خیال کریں تو میں وہاں سے انتخاب لڑنے کے لئے تیار ہوں۔ بھٹو صاحب نے بیگم اشرف عباسی کو کہا کہ وہ لاہور جائیں اور میرے ساتھ رابطہ کریں۔ بیگم اشرف عباسی صاحبہ لاہور تشریف لائیں تو انہوں نے مجھے بیگم خاکوانی کے گھر بلایا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ کی مالی حالت کیسی ہے۔ الیکشن میں تو بہت خرچہ ہوگا۔ اب حکومت والی بات تو نہیں ہے۔ اب تو سب کچھ امیدوار کو ہی کرنا پڑے گا۔ میں نے بیگم اشرف عباسی کو کہا۔ بیگم صاحبہ یہ انتخاب کبھی نہیں ہوں گے۔ کیا ضیاء الحق اپنی موت کے لئے انتخابات کروائے گا۔ خدا کے لئے آپ کارکنوں کو آگے لائیں تا کہ وہ جلسے جلوس کر کے فوجی جرنیلوں کو ڈرائیں تا کہ وہ اپنے غلط ارادوں سے باز رہیں۔ آپ پہلے کی طرح مال دار شرفاء کو ٹکٹ نہ دیں جو تحریک کے زمانے میں ڈرتے گھروں سے ہی نہیں نکلے تھے۔ بیگم اشرف عباسی نے بھٹو صاحب کو رپورٹ کی کہ بحیثیت ایک اُمیدوار تو گورداسپوری بہت موزوں اور فٹ انسان ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹوں کے فیصلے تو 1977ء کو ہو چکے تھے۔ تقریباً تقریباً وہی ٹکٹ ہولڈرز دوبارہ انتخاب کے لئے موجود تھے۔ جب تحریک چل رہی تھی اس وقت ان ٹکٹ ہولڈرز میں سے کئی ایک پارٹی سے علیحدہ ہو گئے تھے یا غیر متحرک ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے تھے۔ مگر دوبارہ جب انتخابات کا اعلان ہوا تو وہ لوگ پھر سے اپنے انتخابی حلقوں میں ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے سرگرم ہو گئے۔ ان کا کلیم تھا کہ وہ ان حلقوں کے کامیاب اُمیدوار ہیں۔ ان لوگوں کی پارٹی کے اندر لابی بھی بڑی مضبوط تھی۔ یہ موقعہ پرست لوگ صرف انتخاب کی حد تک پارٹی کے ساتھ تھے۔ مگر افسوس کہ پارٹی ان سنگین حالات میں بھی اس بات کا ادراک نہیں کر پا رہی تھی۔ یہ ایک اچھا اور غنیمت موقعہ تھا کہ پارٹی کے سیاسی کارکنوں کو انتخاب میں امیدوار کے طور پر زیادہ سے زیادہ آگے لایا جاتا۔ میں پارٹی کی ہر سطح پر اس بات پر زور دیتا رہا مگر وہ الیکشن مافیا ایک بار پھر اپنے حلقوں میں ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پارٹی کی ٹکٹوں میں صرف ان حلقوں میں ردوبدل کیا گیا جن حلقوں میں ٹکٹ ہولڈرز پارٹی چھوڑ کر چلے گئے تھے یا کسی وجہ سے نااہل قرار پا گئے تھے۔ لہٰذا اس طرح کے حلقے معدودے چند تھے جن میں امیدواروں کی تبدیلی ناگزیر ہو گئی تھی۔ میرا حلقہ بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس طرح کے غیر فیصلہ کن حلقوں کے

www.bhutto.org

تمام نئے امیدواروں کو اسلام آباد میں پیر صفی الدین آف مکھنڈ کے گھر بلایا گیا۔ وہاں پر سنٹر کمیٹی کا اجلاس ہوا جس کی صدارت وزیراعظم بھٹو نے فرمائی۔ وہاں جب میں پہنچا تو پارٹی کا اور بھٹو صاحب کا مستقبل بے حد خطرے میں دکھائی دے رہا تھا۔ میں پارٹی کے اہم لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ وہ مختلف بہانے بنا کر وہاں سے بھاگ رہے تھے۔ سب سے پہلے وہاں پر سعودی عرب کے سفیر تشریف لائے۔ بھٹو صاحب کی ان کے ساتھ طویل ملاقات ہوئی۔ میں نے سعودی عرب کے سفیر جن کا نام غالباً ریاض الخطیب تھا ان کی آمد پر سعودی عرب اور بھٹو دوستی کے بہت نعرے لگوائے۔ تاکہ سفیر کو علم ہو سکے کہ وزیراعظم بھٹو سعودی عرب کے لئے بھی اتنا ہی اہم ہیں جتنا کہ پاکستان کے لئے۔

سعودی عرب کے سفیر کے جانے کے بعد ٹکٹوں کے امیدواروں کو کمیٹی نے بلانا شروع کیا۔ میری باری پر مجھے بلایا گیا۔ وزیراعظم بھٹو خلاف معمول آسمانی رنگ کے شلوار کرتا میں ملبوس اپنے پاؤں چھوٹی سی اسٹول پر دراز کئے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے مولانا کوثر نیازی، عبدالحفیظ پیرزادہ، رفیع رضا، ممتاز علی بھٹو، شیخ محمد رشید، ملک غلام مصطفیٰ کھر، غلام مصطفیٰ جتوئی، پیر صفی الدین، صاحبزادہ فاروق علی، حامد رضا گیلانی، نواب صادق قریشی اور کمال افسر بیٹھے تھے۔

گویا کہ ساری سینٹر کمیٹی بیٹھی تھی۔ بھٹو صاحب کے ساتھ ایک کرسی خالی تھی مجھے اس کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ بھٹو صاحب نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ میں ان کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔

کوثر نیازی کا گمراہ کن مشورہ

مجھے جب بیٹھنے کا کہا گیا اس وقت مولانا کوثر نیازی بھٹو صاحب سے سلسلہ کلام جاری کئے ہوئے تھا۔ میں خاموش بیٹھ کر مولوی کی گفتگو کو سننے لگا۔ مولوی بھٹو صاحب کو مشورہ دے رہا تھا کہ ہم کو آئین کے نام پر فوجیوں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کا کہنا تھا کہ فوجیوں نے آئین توڑ کر پاکستان سے غداری کی ہے۔ ان کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ مولوی کوثر نیازی اس وقت وزیراعظم کے میڈیا کے انچارج تھے۔ باہر دنیا بھر کے اخبار نویس اور کارکن موجود تھے۔ بھٹو

www.bhutto.org

صاحب کو ان اخبار نویسوں کے ساتھ خطاب کرنا تھا۔ وہ اپنے خطاب کے بارے میں سینٹر کمیٹی کے لوگوں سے مشورہ مانگ رہے تھے اور مولوی کوثر نیازی ان کو باقاعدہ فوج کے خلاف اُکسانے کا مشورہ دے رہا تھا۔

سینٹر کمیٹی کے وعدہ معاف گواہ صادق قریشی، کمال اظفر، حامد رضا گیلانی، مصطفیٰ کھر اور غلام مصطفیٰ جتوئی خاموش بیٹھے تھے۔ ان کی ترجمانی مولوی کوثر نیازی کر رہا تھا۔ کوثر نیازی کا مشورہ تھا کہ بہت سخت لہجہ اختیار کیا جائے۔ فوجی جرنیلوں کو آئین کا مجرم قرار دیا جائے۔

مولوی کوثر نیازی کی بات کو بابا سوشلزم شیخ محمد رشید نے کاٹتے ہوئے کہا کہ ہم کو تمام جرنیلوں کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس طرح تو وہ اپنے خوف میں مبتلا ہو کر ایک ہو جائیں گے اور ہمارے خلاف انتہائی اقدام تک پہنچ جائیں گے۔ سعودی سفیر نے بھی کہا ہے کہ آپ فوج کے خلاف اور امریکہ کے خلاف زیادہ انتہا پسندی نہ دکھائیں۔ کوئی صلح کا راستہ نکالنے کی کوشش کریں۔ وزیر اعظم بھٹو صاحب کو صرف انتخابات کی بات کرنی چاہئے۔ فوج پر زور دیں کہ فوج ایمان داری کے ساتھ منصفانہ انتخابات کرائیں اور جس کو عوام ووٹ دیں۔ اس کو حکومت سونپ دے۔ اب فیصلہ فوج کو کرنا ہے کہ وہ اس ملک میں جمہوریت چاہتی ہے یا انارکی چاہتی ہے۔ قانون چاہتی ہے یا لاقانونیت چاہتی ہے۔ میری حیرت کی انتہا ہو گئی جب میں نے کوثر نیازی کو بھٹو صاحب کے سامنے بڑی جرات سے بات کرتے دیکھا بڑی اداکاری کرتے پایا۔ اس نے بڑے تمسخر سے شیخ رشید کی بات کو کاٹا۔ کہا کہ یہ بہت کمزور باتیں ہیں۔ جب تک ان خاکی وردی والوں کو ڈرایا نہیں جائے گا یہ انتخاب نہیں کرائیں گے۔

نوٹ: یہاں پر میں ایک بات پیشگی کرتا چلوں کہ وزیر اعظم بھٹو کی گرفتاری کے بعد یہی شخص مولوی کوثر نیازی لاہور میں صادق قریشی کے گھر بیگم بھٹو کے ساتھ سخت اختلاف کر رہا تھا کہ فوج کے خلاف محاذ آرائی نہ کی جائے کوئی جلسہ جلوس نہ کیا جائے بھٹو صاحب پر قتل کے مقدمے کی کارروائی کو لاہور ہائی کورٹ میں معمول کے مطابق چلنے دینا چاہئے۔ صرف عدالتوں تک لڑائی محدود رکھنی چاہئے۔ عدالتوں سے باہر پارٹی کو کسی قسم کی کوئی سرگرمی نہیں کرنی چاہئے۔ اس کے خلاف کوئی مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ کوثر نیازی کا کہنا تھا کہ ہماری کسی قسم کی بھی تحریک سے فوج کو لاء اینڈ آرڈر کے خراب ہونے کا بہانہ مل جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔

www.bhutto.org

وزیراعظم بھٹو نے کوثر نیازی کو ہاتھ کے اشارے سے بات کرنے پر منع کیا۔ جب وہ خاموش ہوا تو بھٹو صاحب میرے ساتھ مخاطب ہو کر پوچھنے لگے باہر کیا حالات ہیں۔ میں نے کہا کہ لوگ ایک ہی بات کر رہے ہیں کہ آپ کے خلاف فوج اور امریکہ کی سازش ہو چکی ہے۔ آپ کے خلاف قتل کا مقدمہ بنایا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ ایک دن پہلے اخبار میں آیا تھا کہ وزیراعظم بھٹو کے خلاف نواب احمد قصوری کے قتل کے الزام میں مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ بھٹو صاحب نے کہا مگر کوثر نیازی تو اس خبر کو اخبار کی من گھڑت خبر کہہ رہا ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ باہر اخبار نویسوں میں تو یہ بات عام ہو رہی ہے کہ قتل کا مقدمہ بنایا جا رہا ہے۔ میں نے احتراماً اس میں بھٹو صاحب کا نام نہ لیا۔ صرف اتنا ہی کہا کہ قتل کا مقدمہ بنایا جا رہا ہے۔ میں نے موقعہ غنیمت جان کر کہا کہ سر ایسا لگتا ہے فوج انتخاب کرانے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ اس کے عزائم کچھ اور ہی دیکھائی دے رہے ہیں۔ آپ اپنے حامی جرنیلوں سے رابطہ کریں، ان کو مدد کے لئے کہیں۔ وزیراعظم بھٹو نے میری اس بات کو سن کر کہا ''کچھ اور'' میں نے عرض کیا کہ سر میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ ان کا خیال تھا کہ میں اپنی ٹکٹ بارے میں کچھ کہوں گا۔ انہوں نے خود ہی کہا کہ تمہارے بارے میں ایک بات کہی جا رہی ہے کہ تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ سر میرے پاس آپ خود ہیں۔ آپ کے ہوتے مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ میری اس بات پر تمام لوگوں نے قہقہہ لگا دیا۔ خود بھٹو صاحب بھی بہت مسرور ہوئے۔ اس طرح اجلاس کا سکوت ٹوٹ گیا اور وقتی طور پر ماحول کی سنجیدگی چھٹ سی گئی۔ مسکراتے ہوئے بھٹو صاحب نے کہا کہ او کے۔ اس طرح میں اجلاس سے باہر آ گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ملک غلام مصطفےٰ کھر باہر تشریف لائے اور انہوں نے مجھے مبارک دی کی تمہارے ٹکٹ کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس سے کچھ دیر بعد اعلان کیا گیا کہ تمام اخبار نویس لان میں آ جائیں بھٹو صاحب ان سے خطاب فرمائیں گے۔ بھٹو صاحب پیر صفی الدین کی انیکسی کی چھت پر چڑھ کر خطاب کرنے لگ گئے۔ تمام سینٹر کمیٹی کے لوگ بھی ان کے ساتھ اوپر چھت پر چڑھ گئے۔ لان میں کیمرے والوں نے بھٹو صاحب کی تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ سامنے کیمرے دیکھ کر ملک غلام مصطفےٰ کھر، کمال افسر اور کوثر نیازی ایک طرف ہٹ گئے۔ کیمروں کی زد سے دور چلے گئے پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

www.bhutto.org

لوگ میرے ساتھ تصویر بھی اتروانا نہیں چاہتے

وزیراعظم بھٹو نے اخبار نویسوں کو مخاطب کر کے ایک تاریخی بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو اب تو لوگ میرے ساتھ تصویر اتروانے سے بھی خوف کھا رہے ہیں۔ وہ ڈر کر پیچھے ہو گئے ہیں۔ بھٹو صاحب کی یہ بات درپیش صورتِ حال کو لوگوں کو سمجھانے کے لئے بہت کافی تھی۔ بھٹو صاحب نے بہت سخت تقریر کی آئین والی بات کی، آئین توڑنے کی بات کی۔ ان کی تقریر تقریباً کوثر نیازی کے مشورے کا ہی مجموعہ تھی۔ وہ دوٹوک قسم کی تقریر تھی۔ جس میں انہوں نے کہا کہ میں اب آزاد ہو گیا ہوں۔ اب میرے گلے میں مملکت کی حکمرانی کا بوجھ نہیں ہے۔ میں عوام کے ساتھ رابطہ کروں گا۔ میں اپنی نئی جدوجہد کا آغاز کروں گا۔ میں بھاری اکثریت سے واپس آؤں گا۔ میں تمام چوروں کو ننگا کر دوں گا۔ میں عید کے بعد اپنی انتخابی مہم کا آغاز کروں گا۔ آج شام میں واپس کراچی جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔

بھٹو صاحب کی تقریر کے بعد جب وزراء کرام باہر نکلے تو میں نے کوثر نیازی سے کہا کہ مولانا ہم کو چاہئے کہ ہم فوجی جرنیلوں کو اعتماد میں لیں تاکہ وہ الیکشن کے وعدے پر قائم رہیں۔ ہم کو ان کو ڈرانا نہیں چاہئے۔ مولوی نے میرے سوال کا جواب اپنی عین فطرت کے مطابق دیا۔ جس میں ذرا سنجیدگی نہیں تھی۔ اس نے مجھے طنز کے طور پر کہا کہ اب آپ کو ٹکٹ جو مل گیا ہے۔ اب آپ کو تو صرف انتخاب کی ہی فکر ہوگی۔ مجھے مولوی کے اس انتہائی نامعقول جواب سے بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کے بعد میں نے شیخ رشید صاحب سے اس معاملے میں بات کی۔ شیخ صاحب نے کہا کہ پارٹی کے اندر بہت بڑی سازش ہو رہی ہے۔ بھٹو صاحب کو فوج کے ساتھ لڑایا جا رہا ہے اور فوج کے ساتھ لڑائی کی وہ باتیں کر رہے ہیں۔ جن کے جرنیلوں کے ساتھ رابطے ہیں!

مجھے اپنی قسمت پر ہنسی آ رہی تھی

میں جب پیر صفی الدین کے گھر سے باہر نکل رہا تھا تو مجھے اپنی قسمت پر ہنسی آ رہی تھی کہ میری قسمت میں سوائے جدوجہد کے اور کچھ تحریر ہی نہیں ہے۔ مجھے اگر ٹکٹ بھی ملا ہے تو اس وقت

ملا ہے جب پارٹی پر فوج کا حملہ ہو چکا ہے۔ وزیر اعظم بھٹو کی زندگی اور موت کا مسئلہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔ گویا اس سے بھی کوئی خطرناک اور بد قسمت وقت اور کیا ہوگا۔ لوگ اقتدار کے مزے لوٹ کر بھاگتے دکھائی دے رہے تھے اور میں اپنے گلے میں صوبائی ٹکٹ کا طوق ڈال کر ایک بار پھر آمادہ بہ جنگ تھا۔ میں با قاعدہ اس صورت حال پر ہنس رہا تھا اور باہر گاڑی کی طرف جا رہا تھا جہاں میرا بھانجا انوار اللہ خان میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تو اس نے سمجھا کہ میں ٹکٹ مل جانے کی وجہ سے بہت خوش ہوں۔ اس نے میرے گلے مل کر مجھے مبارک دی اور بڑی ہی خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے اس کو کہا کہ انوار میں خوش نہیں ہو رہا ہوں۔ یہ انتخابات ہرگز ہرگز نہیں ہوں گے۔ بھٹو صاحب کے ساتھ سازش کی جا رہی ہے۔ خدا جانے ہمارا کیا انجام ہوگا۔ میں انوار اللہ خان سے یہ باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں گوجرانوالہ کے بابا فاضل رشیدی کچھ کارکنوں کے ساتھ بلند آواز میں کچھ لوگوں کو اور پارٹی کو گالیاں دیتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئے۔ کہنے لگے کہ گورداسپوری یہ پارٹی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اتنی ناانصافی اتنا ظلم میرے حلقے کا امیدوار بھاگ چکا ہے اس کے باوجود ایک غیر سیاسی مال دار انسان کو مولوی کوثر نیازی نے ٹکٹ دلوا دیا ہے۔ میرا آج بھٹو صاحب سے بھی ایمان اٹھ گیا ہے۔ اب میں اس پارٹی میں مزید نہیں رہ سکتا۔ بابا فاضل رشیدی ایک طرح سے پارٹی کے بانی اراکین میں سے تھا۔ ان کو گوجرانوالہ شہر کا اس وقت صدر بنایا گیا تھا جب پارٹی کی گوجرانوالہ میں بنیاد رکھی گئی تھی۔

بابا فاضل رشیدی

ایک دیانت دار کا مریڈ ہونے کی حیثیت سے میرا فرض بنتا ہے کہ فاضل رشیدی کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا جائے۔ فاضل رشیدی پرانے احراری انداز کا شعلہ بیاں مقرر تھا۔ بلکہ کسی وقت شاید وہ مجلسِ احرار سے وابستہ بھی رہا تھا۔ فاضل رشیدی بے حد خوبصورت شاعر تھا۔ میرا اس کے ساتھ تعارف 1969ء میں گوجرانوالہ کے جلسہء عام میں ہوا تھا۔ جوانی میں پہلوانی کا شوق رکھتا تھا۔ تقریر بھی پہلوانوں کی طرح کرتا تھا۔ اسٹیج کو باقاعدہ اکھاڑہ تصور کرتا تھا۔ تقریر کے معاملے میں میرا اس کے ساتھ ہمیشہ دنگل رہتا تھا۔ مجلسِ احرار کے مقرروں کی طرح تقریر میں

www.bhutto.org

برمحل شعر کا استعمال کرنا اس کا خاصا تھا۔ بلکہ شعر کو ذہن میں رکھ کر پہلے تقریر کا مضمون ہی شعر کے مطابق بنایا کرتا تھا۔ پھر جب تقریر میں شعر کا پیوند لگاتا تھا تو تقریر دو آتشہ ہو جاتی تھی۔ فاضل رشیدی کے ساتھ بھی میری طرح شاعر ہونے کا لاحقہ تھا۔ وہ بھی اپنی تعریف پر سمرقند و بخارہ بخشنے پر ہروقت تیار رہتا تھا۔ خود گکھڑ میں رہائش رکھتا تھا، صدارت گوجرانوالہ شہر کی کرتا تھا۔ گوجرانوالہ شہر کے پیپلز پارٹی کے لوگ فاضل رشیدی کے ساتھ اپنی تمام محبت کے باوجود جب کبھی انتخابات کا موقعہ آتا تھا تو اس فاضل رشیدی کو جس کو پہلے وہ بابائے شہر گوجرانوالہ کہا کرتے تھے۔ اس وقت وہ اس کو آؤٹ سائیڈر کہہ دیا کرتے تھے۔ گوجرانوالہ شہر میں کشمیری، آرائیں، جٹ اور راجپوت برادریوں کا انتخابات میں گٹھ جوڑ ہو جاتا ہے۔ ہمارے میاں اظہر حسین ڈار پیپلز پارٹی گوجرانوالہ کے سب سے بڑے دانشور لیڈر ہیں۔ ٹکٹوں کی تمام جمع تقسیم وہی کیا کرتے تھے۔ میاں اظہر حسین ڈار میرے بہت پرانے دوست ہیں خدا ان کو سلامت رکھے۔ ٹکٹ بورڈ کے سامنے بیان دیا کرتے تھے کہ باباجی کا گوجرانوالہ شہر سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جب ٹکٹوں کے معاملے طے پا جاتے تو دوبارہ اسی کو ہی بابائے شہر بنالیتے تھے۔

بابا فاضل رشیدی کا میری طرح شاعر ہونا ہی اس کے لئے مصیبت بنا ہوا تھا۔ جس طرح مجھے عام حالات میں پارٹی کا ہر لیڈر شاعرِ عوام کہہ کر میری عزت افزائی کیا کرتا تھا مگر جب انتخابات کی بات ہوتی تھی تو مجھے شاعر قرار دے کر انتخاب لڑنے سے نااہل بنادیا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ تو شاعر ہے۔ اس کا کام الیکشن لڑنا نہیں ہے۔

اس دن اس کے ٹکٹ کا فیصلہ بھی ہونا تھا۔ مگر فاضل رشیدی کو بغیر بلائے مولوی کوثر نیازی کی سفارش پر فیصلہ دوسرے امیدوار کے حق میں کرا دیا گیا تھا۔ یہ فیصلہ واقعتاً بے حد غلط فیصلہ تھا۔

بابا فاضل رشیدی کو یہ فیصلہ بہت شاق گزرا تھا۔ اس کے ساتھ پہلے بھی بہت ناانصافی ہوتی رہی تھی مگر اس بار اس کا پیمانہ صبر چھلک گیا تھا۔ وہ پارٹی چھوڑنے کی بات کر رہا تھا۔ میں نے اس کو حوصلہ دیا اور اس کو کہا کہ آؤ میں تمہیں بھٹو صاحب کے پاس لے کر جاتا ہوں۔ کم از کم تمہارے ساتھ کی گئی زیادتی کو ان کے علم میں لانا چاہئے۔ وہ کبھی بابا فاضل رشیدی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس طرح بابا فاضل رشیدی کو کچھ حوصلہ ہوا۔ میں اس کو ساتھ لے کر کوٹھی کے اندر

گیا۔ پیر صاحب کے خادم خاص کو کہا کہ میں پیر صفی الدین صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ کچھ ہی منٹ کے بعد پیر صفی الدین صاحب تشریف لے آئے۔ پیر صاحب بہت حلیم انسان تھے۔ میں نے ان سے گزارش کی صرف دو منٹ کے لئے قائد عوام سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ اندر گئے اور جلد ہی باہر آ کر مجھے اور فاضل رشیدی کو اپنے ساتھ کمرے کے اندر لے گئے۔ بھٹو صاحب مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے۔ تمہیں تو ٹکٹ دے دیا گیا ہے۔ میں نے گزارش کی کہ سر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ بابا فاضل رشیدی کے لئے کچھ عرض کرنا ہے۔ بھٹو صاحب فاضل رشیدی کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ کہو فاضل کیا بات ہے۔ فاضل رشیدی تقریباً رونے ہی لگ گیا۔ اس نے کہا۔ قائد عوام میں بابائے شہر ہوں، صدر ہوں اور مجھے ہی ٹکٹ نہیں دیا جارہا ہے۔ ایک نئے آدمی کو ٹکٹ دے دیا گیا۔ قائد عوام نے فاضل رشیدی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا کہ کمیٹی نے یہ فیصلہ کروا دیا ہے۔ اب تو فیصلہ ہو چکا ہے۔ اجلاس بھی ختم ہو گیا ہے۔ آپ اس معاملے کو آخری معاملہ نہ سمجھیں حالات اچھے ہونے پر میں آپ کو خود بلاؤں گا۔ تم فکر مت کرو، جاؤ جا کر پارٹی کو سنبھالو۔ مجھے پرانے دوستوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ ''او کے۔'' اس طرح میں بابا فاضل رشیدی کی دل شکنی کا ازالہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ بابا فاضل رشیدی بھٹو صاحب کی باتوں سے بہت خوش ہوا۔ وہ اپنی پہلوانی کی روائتی چال چلتے ہوئے مجھے ہی کہے جارہا تھا اسلم گورداسپوری تم نے دیکھا ہے قائد عوام فاضل رشیدی کی کتنی عزت کرتا ہے۔ میں ٹکٹوں کو کیا سمجھتا ہوں مجھے قائد کی محبت چاہئے۔

اس طرح وہ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گکھڑ تک اپنے گھر تک آئے۔ میں ان سے اجازت لے کر آگے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے بہت خوشی تھی کہ میری ذرا سی ہمت سے پارٹی کے ایک مخلص انسان کے دل و دماغ کی کیفیت تبدیل ہو گئی تھی اور اس کے دل سے مایوسی کے بادل چھٹ گئے تھے۔ فاضل رشیدی کے دو شعر ملاحظہ کریں۔

ہم سے عجب مطالبہ اہلِ وفا کا ہے
سنگ باریوں کے عہد میں شیشہ گری کریں
مجھے اسی نے پیام بھیجا ہے بخششوں کا عنائتوں کا
جو تم کو کہتا ہے شیخ صاحب عذاب دوں گا، عذاب دوں گا

وزیراعظم بھٹو کو قتل کے مقدمے میں گرفتار کر لیا گیا

پاکستان پیپلز پارٹی کے انتخابات کے ٹکٹوں کے فیصلے 20- اگست 1977ء کو مکمل ہوئے تھے۔ 18- اکتوبر 1977ء انتخابات کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ ابھی میں نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی ہی جمع کروائے تھے کہ 3- ستمبر 1977ء کو وزیراعظم بھٹو کو کراچی 70- کلفٹن سے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ گرفتاری محمد احمد خان کے قتل کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت نے جس انداز میں فخرِ ایشیا ذوالفقار علی بھٹو جو عالمِ اسلام کے پہلے منتخب چیئرمین بھی تھے گرفتار کیا تھا۔ فوجی جنتا کا وہ انداز بھٹو صاحب کے مستقبل کو سمجھنے کے لئے بے حد کافی تھا۔ اس طریقے سے کبھی کسی سمگلر اور ڈاکو کو بھی کبھی گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ ان کو گرفتار نہیں کیا گیا تھا وہ تو مسلح فوجی دستوں کا 70- کلفٹن پر حملہ تھا۔ صرف پاکستان ائیر فورس کی خدمات ہی حاصل نہیں کی گئیں تھیں۔ ان کی گرفتاری کا انداز انتہائی شرمناک اور ذلت آمیز تھا۔ 70- کلفٹن میں آدھی رات کو بیگم بھٹو اور محترمہ بےنظیر بھٹو کو محترمہ صنم بھٹو کو میر مرتضیٰ بھٹو کو اور شاہنواز بھٹو کو دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کو اگر زندہ رکھنا ہوتا تو ان کو اس آہنت آمیز فوجی طریقے سے ہرگز گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کی گرفتاری کا یہ جنگی طریقہ اور یہ انداز ہی اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ فخرِ ایشیا کو کسی قیمت پر فوجی جنتا زندہ نہیں چھوڑے گا۔

ان کی اس شرمناک انداز کی قتل کے مقدمے میں گرفتاری کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں ضمانت کی درخواست دی گئی، اور ان کی ضمانت کی درخواست کی سماعت لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی کی عدالت میں ہوئی۔ لہٰذا 13- ستمبر 1977ء کو بھٹو صاحب کو ضمانت پر رہا کرایا گیا۔

جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی

انصاف، دیانت داری، باکرداری، اصول اور طاقت کا انحصار انسانی جسم کے ہرکلیس ہونے پر نہیں ہوتا۔ قانون پرستی اور عدل گستری کے لئے کسی شہ زوری کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی منصف کے لئے پچاس انچ چوڑی چھاتی اور چھ فٹ چار انچ قد کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہادری، شجاعت اور جرأت کے لئے صرف انسان کا باضمیر ہونا ہی بہت کافی ہوتا ہے۔ جس کی جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی ایک مجسم تصویر تھے۔

جسٹس کے۔ایم۔صمدانی منحنی وجود کے دُبلے پتلے لاغر جسم کے انسان تھے۔ دیکھنے میں صحت کے معاملے میں بہت کمزور دیکھائی دیتے تھے۔ وزیراعظم بھٹو کی ضمانت کی درخواست کی سماعت ان کی عدالت میں حکومت کا بھیجنا ایک گہری چال تھی۔ مولوی مشتاق بھٹو صاحب کو ہر قیمت پر مجرم ثابت کرنا چاہتا تھا۔ مولوی مشتاق کی اور بھٹو صاحب کی مخاصمت بڑی واضح اور نمایاں تھی۔ بھٹو صاحب نے اس کسائی کے پلّے کو ہائی کورٹ کا چیف جسٹس نہیں بنایا تھا۔ مولوی مشتاق پاگل پن کی حد تک بھٹو دشمنی میں مبتلا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کا ایک طرح کا ذاتی دشمن تھا۔ وہ بالکل ایسا ہی تھا جس طرح کسی مقتول کا مقدمہ اس کے قاتل کی عدالت میں لگا دیا جائے۔ مولوی اپنی قاتلانہ جلادی فطرت پر پردہ ڈالنے کے لئے جسٹس کے۔ایم۔صمدانی کی لارڈ شپ اور اس کی عدل گستری اور قانون پسندی کی شہرت کو اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔

بھٹو صاحب کی ضمانت کے فیصلے سے پہلے مولوی مشتاق نے جسٹس کے۔ایم۔صمدانی کو اپنے چیمبر میں بلایا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بھٹو صاحب کی ضمانت کی درخواست کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان کو کہنے لگا کہ میں نے یہ تاریخی مقدمہ آپ کی عدالت کو مارک کیا ہے۔ تمام شواہدات تو آپ کو معلوم ہی ہیں کہ بھٹو احمد رضا قصوری کا کس قدر دشمن تھا۔ وہ اس کو قتل کرانا چاہتا تھا کہ اتفاق سے قتل اس کا باپ ہوگیا۔ لیکن قتل تو قتل ہی ہوتا ہے وہ بیٹے کا ہو یا باپ کا ہو۔ اس مقدمے میں کسی شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بطور چیف جسٹس اسی لئے بلایا تھا کہ یہ حقائق آپ کے علم میں لاؤں۔ یہ باتیں سن کر جسٹس کے۔ایم۔صمدانی اٹھ کھڑے ہوئے اور لفظ شکریہ مولوی کو کہہ کر اپنے چیمبر میں آ گئے۔ مولوی کو جسٹس کے۔ایم۔صمدانی کے رویّے سے کھٹک گئی کہ وہ اس کی باتوں کو پسند نہیں کر رہا اور ان کا اس طرح واک آؤٹ کے انداز میں مولوی کے چیمبر سے جانا مولوی کی توہین کے مترادف تھا۔ مولوی نے اپنے دو ایک پٹھو قسم ججوں کو صمدانی صاحب کے پاس بھیجا۔ وہ ایک طرح کی دھمکی پلانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

ان کی دھمکی تھی کہ جنرل ضیاءالحق اور اس کے ساتھی ہر قیمت پر بھٹو کو جیل میں رکھنا چاہتے

ہیں۔ ہم لوگوں کو ان کی لڑائی کے درمیان نہیں آنا چاہئے۔

مولوی کی خواہش تھی کہ کسی طریقے سے جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی بھٹو صاحب کی ضمانت کی درخواست نامنظور کر دے۔ جسٹس صمدانی جو اپنی انصاف پسندی میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ وہ اگر بھٹو صاحب کے خلاف فیصلہ دے دیتا تو مولوی کا بھٹو صاحب سے انتقام لینا بے حد آسان ہو جاتا تھا۔ پھر لوگ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ مولوی نے بھٹو صاحب سے انتقام لیا ہے۔ اس صورت میں مولوی کا انتقام انصاف بن جاتا۔

مگر قدرت کو ایسا منظور نہیں تھا۔ قدرت کے اپنے اصول اور اپنے قانون ہیں۔ قدرت نے اپنے قانون کی عملداری کے لئے نحیف ونزار انسان جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی کو شاید اسی دن کے لئے پیدا کیا تھا۔ وہ مولوی مشتاق جیسے خبیث اور دیوس انسان کی خواہش اور اس کے انتقام کے راستے میں ہمالیہ پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے وزیر اعظم بھٹو کی ضمانت کی درخواست کو منظور کر کے بھٹو صاحب کی رہائی کا حکم دے کر مولوی مشتاق کے سفاک عزائم کو خاک بہ سر کر دیا۔ اور انسانی انصاف کی تاریخ میں اپنے فولادی پیکر کے انصاف کا باب رقم کر دیا۔ عام حالات میں قتل کے مقدمہ میں جس شخص کی ضمانت ہو جائے وہ ہمیشہ بے گناہ ثابت ہوا کرتا ہے۔ اس کی ضمانت ہی اس کی بے گناہی کا سب سے بڑا ثبوت ہوتی ہے۔ مگر افسوس کہ شہید بابا کو اپنے مقدمہ میں نہ تو جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی کی لی گئی ضمانت کا فائدہ پہنچا اور نہ ہی ان کو اپنے مقدمے میں شک کا فائدہ حاصل ہوا۔ جو اس طرح کے مقدمات میں روز دیکھنے میں آتا ہے۔

مگر شہید بھٹو کے معاملے میں بقول شاعر اسلم گورداسپوری لوگ فرعون بن گئے تھے۔

میری قسمت کے سارے فیصلے تھے ان کی مرضی کے
خداوندِ زمیں اسلم خدا سے بھی بڑے نکلے

بھٹو صاحب کا مقدمہ اور لاہور ہائی کورٹ

وزیر اعظم بھٹو ضمانت پر رہائی کے بعد عید کا تہوار منانے کے لئے اپنی روایات کے مطابق لاڑکانہ چلے گئے۔ اور عید سے دوسرے دن کراچی آئے ہی تھے کہ ان کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ لاہور میں کچھ دن ان کو چھاؤنی کے علاقے میں قید رکھا گیا۔ ایک فوجی بیرک کو ان کے

لئے قید خانہ بنادیا گیا۔

لاہور چھاؤنی میں ہی ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں ان کو پیش کر کے ان کا ابتدائی بیان حاصل کرلیا گیا۔ اوران کوایک نامزد ملزم بنا کر قتل کے مقدمے میں فوجی زبان میں بڑا ملزم بنادیا گیا۔ اس مقدمے کے چالان کورسمی طور پر سیشن کورٹ کی ایک عدالت میں برائے نام بھیج کر فوری طور پر مولوی مشتاق کے حکم پر مقدمے کولاہور ہائی کورٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس تمام سکھاشاہی کی غیر قانونی کارروائی میں صرف ایک بات ہی ظاہر ہو رہی ہے کہ مولوی مشتاق کووزیراعظم بھٹوکواپنی عدالت میں ایک ملزم کی حیثیت سے کھڑا کرنے میں کس قدر جلدی تھی۔

شیکسپیئر نے کہا تھا کہ بدی اس قدر طاقت ور ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی تقدیر بن جاتی ہے۔ میں مولوی مشتاق کو بھٹو صاحب کے معاملے میں بالکل ایسا ہی دیکھتا ہوں۔

مولوی کی عدالت میں بھٹو صاحب کوانتقاماً روزانہ 8 بجے صبح لایا جاتا تھا اور دوپہر کو تین چار بجے ان کو واپس جیل میں لے جایا جاتا تھا۔ مولوی کی عدالت میں ان تمام لوگوں کو بھٹو صاحب کے سامنے سب سے آگے بٹھایا جاتا تھا جن لوگوں کے ساتھ بھٹو صاحب کی کسی حوالے سے کبھی کوئی پرخاش رہی تھی یا ناراضگی رہی تھی۔ عدالت میں میاں محمود علی قصوری، اعجاز بٹالوی، احمد سعید کرمانی، چوہدری ظہور الٰہی، احمد رضا قصوری وغیرہ کو خاص طور پر آگے بٹھایا جاتا تھا۔ میاں افتخار تاری اور بابو وارث جیسے کئی ایسے ناپسندیدہ لوگوں کو بھٹو صاحب کے سامنے بٹھایا جاتا تھا جو عدالت میں بیٹھ کر بھٹو صاحب کو مسلسل گھورتے رہتے تھے۔ کسی نے کیا خوب کہا تھا کہ شیر پنجرے میں بند ہو تو عورتیں بھی اپنے بچوں کے ساتھ اس کو دیکھنے آجایا کرتی ہیں۔

بدخصلت مولوی مشتاق نے بھٹو صاحب کے لئے اپنی عدالت کو تھانہ بنا رکھا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کے حرف حرف پر گرفت کرتا تھا، یہاں تک کہ ان کے بیٹھنے کے انداز پر بھی معترض رہتا تھا۔ بھٹو صاحب کی وکلاء کے ساتھ بات کرنے پر بھی برہم ہو جاتا تھا۔ وہ عدالت ہرگز نہیں تھی وہ تو ایک رومن اکھاڑہ تھی۔ جنگل کے درندوں کا احاطہ تھی۔ ایک غیر انسانی ماحول کی عدالت تھی۔ جس کو ملاں مشتاق نے بھٹو صاحب کے لئے ایک عذاب گاہ اور عتاب گاہ بنا دیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو جن کو پورے عالمِ اسلام کے سربراہوں نے اپنا چیئرمین منتخب کر رکھا تھا۔ پاکستان کے عوام جن کو فخرِ ایشیا اور قائدِ عوام کہا کرتے تھے۔ ان کو اپنی عدالت میں ایک پنجرہ نما کٹہرے میں بٹھاتا تھا۔ جہاں

www.bhutto.org

بیٹھ کر وہ اپنے وکلاء سے بھی بات نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مقدمے کی کارروائی ہرگز نہیں تھی وہ وزیراعظم بھٹو جیسے شاہین صفت انسان کی توہین کا سامان تھی۔ انسانی ناقدری کا کھلا مظاہرہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے جب بھٹو صاحب کو اس تنگ و تاریک آہنی پنجرے میں بیٹھا دیکھا تھا تو مجھے حافظ شیرازی کا شعر یاد آیا تھا۔

بال بکشا و سفیر شجرِ طوبیٰ زن
حیف باشد چوں آں مرغ کہ اسیر قفسی

شجرِ طوبیٰ جنت کے سب سے اونچے درخت کو کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد آسمان ہے۔ حافظ کہتا ہے کہ تو وہ پرندہ ہے جس کو آسمانوں کی بلندیوں کا سفیر ہونا چاہئے تھا۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ تمہیں قفس میں اسیر کر دیا گیا ہے۔

مولوی بدذات وزیراعظم بھٹو کے ساتھ باقاعدہ بدتمیزی کرتا تھا۔ ان کے ساتھ انتہائی بدترین روّیہ اختیار کرتا تھا۔ ان کے مقام اور مرتبے سے کم تر سلوک ان کے ساتھ روا رکھتا تھا، اور مولوی کے اس بازاری پن کے مظاہرے کو امریکن خاص طور پر عدالت میں دیکھنے آتے تھے۔ سوائے چند گنتی کے وکلاء کے مولوی کی عدالت میں پیپلز پارٹی کے کسی دوسرے شخص کو عدالت میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ مولوی مشتاق اور فوجی جنتا نے ایک مکمل سازش کے تحت بھٹو صاحب کو تنہا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ان کے ساتھ عدالت میں اور جیل میں انتہائی شرمناک سلوک کیا جاتا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت کی فوجی دہشت گردی نے اور مولوی مشتاق کی عدالتی دہشت گردی نے پوری قوم کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔

آج میں سوچتا ہوں کہ انسان جب سفا کی پر اترتا ہے تو وہ فرعون اور نمرود اور شداد بن جاتا ہے۔ ضیاء الحق اور مولوی مشتاق بن جاتا ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور دوسرے درجے کی قیادت کا کردار

پاکستان پیپلز پارٹی کے اندر چیئرمین بھٹو شہید کی سیاست کی ابتدا میں اور خاص طور پر 1977ء کے انتخابات میں اسٹیبلشمنٹ کے ایجنٹ بھاری تعداد میں پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔

ان میں کچھ تو ایسے لوگ تھے جو پشت در پشت اور نسل در نسل اسٹیبلشمنٹ کی سیاست کا کردار سرانجام دیتے چلے آرہے تھے۔ جن کا تعلق بڑے جاگیردار خاندانوں سے تھا۔ ان لوگوں میں نمایاں ناموں میں نواب صادق حسین قریشی، حامد رضا گیلانی، غلام مصطفےٰ جتوئی، رفیع رضا، محمد خان ٹمن، یوسف بچ، ملک خدا بخش بچہ، فاروق لغاری یہ تو وہ نام تھے جن لوگوں کے خاندان انگریزوں کے عہد سے اسٹیبلشمنٹ کی سیاست کرتے چلے آرہے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ جو بھٹو صاحب کی ٹیم میں بڑے اہم عہدوں پر فائض تھے جن میں مولانا کوثر نیازی، سعید احمد خان، افضل سعید، کمال افسر، مسعود محمود وغیرہ تھے۔ ان لوگوں کو شروع دن سے ہی بھٹو صاحب کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ مولانا کوثر نیازی جو 1970ء کے انتخابات سے کچھ ہی عرصہ پہلے بھٹو صاحب کے بدترین سیاسی نظریاتی دشمنوں میں سے ایک تھا۔ جس نے پارٹی کے قیام کے بعد بھٹو صاحب پر اور پیپلز پارٹی پر سوشلزم کے حوالے سے پہلا کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ جس کو پیپلز پارٹی میں شامل ہونے سے پہلے جنرل یحییٰ خان کی اخباری مہم کے لئے اس کی مقبولیت میں اضافہ کرنے کے لئے سرکاری اخراجات پر انگلستان بھیجا گیا تھا۔ اس کو ایجنسیوں نے کمال طریقے کے ساتھ پیپلز پارٹی میں شامل کروادیا تھا اور وہ بھٹو صاحب کے اہم ترین سیاسی رفقاء میں تصور کیا جاتا تھا۔ سرکاری ملازمین میں سے سعید احمد خان، افضل سعید، مسعود محمود کو ایجنسیوں نے بھٹو صاحب کی حکومت کے تمام نظام کا انچارج بنوا رکھا تھا۔ بھٹو صاحب کی حکومت کا تمام دارومدار ان لوگوں پر تھا۔ جس کی وجہ سے جنرل ضیاء الحق اور اس کے ساتھی جرنلوں کو بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ نے بڑی تیاری کے ساتھ بھٹو صاحب کا تختہ الٹایا تھا۔ ان کے علم میں تھا کہ بھٹو صاحب کے تمام اہم ترین ساتھی لیڈر ان کی مٹھی میں ہیں۔ لہٰذا بھٹو صاحب کی گرفتاری کے بعد ان کو پیپلز پارٹی کی طرف سے کسی احتجاج اور تحریک کا کوئی خطرہ دیکھائی نہیں دیتا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ کی سازش تھی کہ بھٹو صاحب کے بعد کوثر نیازی کی طرح کے لوگ پارٹی کے لیڈر بن جائیں گے جو ان کے اپنے آدمی ہیں۔ لہٰذا وزیراعظم بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کو آسانی سے ختم کر کے اپنا راستہ صاف کر لے گی۔ یہی وجہ تھی کہ جنرل ضیاء الحق نے مولوی کوثر نیازی کی شہرت میں اضافہ کرنے کے لئے اس کو ہیرو بنانے کے لئے 28- اگست 1977ء کو جنرل چشتی کے ساتھ اخباری نمائندوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے اچانک مولوی کوثر نیازی کے

بارے میں بڑے سخت الفاظ استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اس شخص کو چھوڑوں گا نہیں اس کو معاف نہیں کروں گا۔ یہ شخص حکومت کے خلاف جنگ کرنا چاہتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے ان الفاظ سے سادہ دل لوگوں کے دل میں مولوی کے لئے بڑی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ ضیاء الحق دراصل مولوی کا پیپلز پارٹی پر قبضہ کرانا چاہتا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کے بعد مولوی کوثر نیازی کو پاکستان پیپلز پارٹی کا چیئرمین بنانا چاہتا تھا۔

نواب صادق حسین قریشی کوثر نیازی کو چیئرمین بنانے کی تحریک چلا رہا تھا۔ وہ ہر شخص کے سامنے مولوی کوثر نیازی کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا۔ لاہور میں نواب صادق حسین قریشی کے گھر بھٹو صاحب کی گرفتاری کے بعد پہلی سینٹر کمیٹی کی میٹنگ کا موقعہ تھا۔ بیگم نصرت بھٹو بھی موجود تھیں۔ اجلاس کے اختتام پر ہم کارکنوں کی بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ نواب صادق قریشی اور مولوی کوثر نیازی بیگم صاحبہ کے ساتھ تھے۔ ورکروں نے بیگم صاحبہ سے بھٹو صاحب کی رہائی کے لئے کوئی جلسہ جلوس کرنے کی بات کا ابھی آغاز ہی کیا تھا کہ نواب صادق قریشی بول پڑا کہ آپ لوگ بھی مولانا کی طرح انتہا پسندی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مولانا بھی آپ لوگوں کی طرح بڑی ہارڈ لائن کی بات کرتے ہیں۔

نواب صادق کی یہ بات خاص طور پر میرے لئے بڑی حیران کن تھی۔ سینٹر کمیٹی کے اجلاس کے بعد وہاں پر پاکستان اور پاکستان کے باہر کا پریس موجود تھا۔ مولوی کوثر نیازی نے اخبار نویسوں کو خطاب کرنا شروع کر دیا۔ اس کا خطاب تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کسی قسم کی تحریک اور احتجاج وغیرہ نہیں کرے گی۔ ہم اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ ہم حکومت سے پرامن مذاکرات چاہتے ہیں۔ بھٹو صاحب کے قتل کا مقدمہ عدالت میں چل رہا ہے۔ ہم عدالت پر مکمل اعتماد کرتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے عدالت انصاف کرے گی۔ اور وہ بھٹو صاحب کو جلد بے گناہ قرار دے کر آزاد کرے گی۔ ہم سیاسی صورت حال خراب نہیں کرنا چاہتے۔ ہم قانون کی جنگ قانون کے مطابق لڑنا چاہتے ہیں۔

ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق ملک میں انتخابات کرائے۔ تاکہ ملک میں جمہوری حکومت قائم ہو جائے۔ ہم جنرل ضیاء الحق سے اس کے وعدے کی تکمیل چاہتے ہیں۔ ہم جنرل سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ انتخابات کرانے کی تاریخ کا جلد اعلان کرے۔

www.bhutto.org

نوٹ: مولوی کوثر نیازی کی پریس کانفرنس نواب صادق کے تھوڑی دیر بیان کیے گئے موقف کے بالکل الٹ تھی۔ جس میں اس نے مولوی کو انتہا پسند کہا تھا۔ ہارڈ لائنز کہا تھا۔

قارئین کتاب آپ ذرا صورتِ حال ملاحظہ کریں۔ وزیر اعظم بھٹو پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔ ان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ پولیس ان کو روزانہ عدالت میں لاتی ہے۔ وہ خاموشی سے جیل سے آتے ہیں اور جیل واپس چلے جاتے ہیں۔ ملک میں تمام سیاسی سرگرمیاں ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ جلسہ جلوس پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ سینکڑوں پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو کوڑے مار کر جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ ملک میں مکمل طور پر فوجی حکمرانوں نے خوف و دہشت کی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اور پاکستان پیپلز پارٹی کی سینٹر کمیٹی کا اہم رکن اور ترجمان مولوی کوثر نیازی صورتِ حال کو کس قدر سہل لیتے ہوئے۔ عام حالات کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک کسی قسم کا بھٹو صاحب کو خطرہ ہی نہیں تھا۔ وہ حکومت پر بھی اعتماد کا اظہار کر رہا تھا اور عدالت پر بھی اعتماد کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ کارکنوں کو پیغام دے رہا تھا کہ وہ کسی قسم کی تحریک اور احتجاج کی بات نہ کریں۔ حکومت کے خلاف کوئی نعرہ بازی نہ کریں۔ بھٹو صاحب کی رہائی کا نعرہ نہ لگائیں۔ خاموش رہیں۔ کوئی جلسہ جلوس نہ کریں اور صبر و تحمل کے ساتھ جنرل ضیاء الحق کے دوبارہ انتخابات کے اعلان کا انتظار کریں۔

مولوی کی ان باتوں کو بیگم نصرت بھٹو جو پہلے خاموشی سے سنتی چلی آ رہی تھیں۔ ان سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے اخبار نویسوں کے ساتھ خود خطاب کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ قوم کے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔ قوم کو بے قیادت کر دیا گیا ہے۔ قیادت کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ انتخابات کے وعدے سے جنرل بھاگ چکا ہے۔ وہ کبھی انتخابات نہیں کرائے گا۔ ملک پر مارشل لاء مسلط کر دیا گیا ہے۔ بھٹو صاحب کو قتل کرنے کی سازش ہو چکی ہے۔ ان کو عدالت کے ذریعے قتل کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا گیا ہے۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اخبارات پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ پارٹی کارکنوں کو کوڑے مارے جا رہے ہیں۔ پارٹی کے کارکنوں کو جیلوں میں ڈالا جا رہا ہے۔ میں اس حکومت پر عدم اعتماد کا اعلان کرتی ہوں۔ میں عدالتوں پر بھی عدم اعتماد کا اعلان کرتی ہوں۔ ہم پاکستان کو اور بھٹو کو جدوجہد سے ہی بچا سکتے ہیں۔ عوام کی مدد سے ہی بچا سکتے ہیں۔ جس کے لئے کارکنوں کو تیار رہنا ہوگا۔

بیگم نصرت بھٹو کا یہ خطاب جہاں جنرل ضیاء الحق کی حکومت پر عدم اعتماد کا اعلان تھا وہاں یہ نواب صادق حسین قریشی اور مولوی کوثر نیازی کے خلاف بھی عدم اعتماد کا کھلا اعلان تھا۔ بیگم صاحبہ کا یہ پہلا اعلان تھا جس سے کوثر نیازی اور صادق قریشی وغیرہ کے راستے علیحدہ ہونے شروع ہو گئے تھے۔

مولوی کوثر نیازی کو چیئرمین بنانے کا مطالبہ

دیکھتے ہی دیکھتے آناً فاناً مولوی کوثر نیازی کو چیئرمین پیپلز پارٹی بنانے کی باتیں سننے میں آنے لگ گئیں۔ مولوی کو چیئرمین بنانے کی بات کا آغاز بھٹو صاحب کی سینٹرل کمیٹی کے ایک رکن کمال افسر کے بیان سے ہوا تھا۔ کچھ سینٹرل کمیٹی کے لوگ درپردہ اس مطالبے کے حامی تھے۔ مثال کے طور پر ملک معراج خالد صاحب زادہ فاروق آف ملتان، نواب صادق حسین قریشی اس تجویز کی حمایت کرتے پائے گئے تھے۔ اس طریقے سے پاکستان پیپلز پارٹی کے اندر فوجی حکومت کی مداخلت کھلی نظر آ رہی تھی۔ فوجی حکمرانوں کی سازش یہ تھی کہ پیپلز پارٹی کی قیادت کو بھٹو خاندان سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اس پر مولوی کوثر نیازی کی طرح فوجی ٹاؤٹوں کا قبضہ کروا دیا جائے۔ یہ مسئلہ ایک طرح کی بحث کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ پارٹی کے سینئر وائس چیئرمین بابا سوشلزم شیخ محمد رشید ان دنوں جیل میں تھے۔ اکثریت کی رائے یہ تھی کہ اگر کسی کو قائم مقام چیئرمین بنانا ہی ہے تو شیخ محمد رشید کو بنا دیا جائے۔ مگر ان کے بارے میں مشکل یہ تھی کہ وہ گرفتار تھے۔ اس عہدے کے فرائض کے مطابق اور وقت کی ضرورت کے مطابق کوئی فعال کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا اس وقت ہر اعتبار سے بیگم نصرت بھٹو ہی اس عہدے کے لئے موزوں ترین شخصیت تھیں۔ جن کا قد کاٹھ اس قابل تھا کہ قائد عوام کی عدم موجودگی میں قیادت کے اس خلا کو پوری کر سکتی تھیں۔ وہ ایک موثر ترین انتخاب تھیں جو پارٹی کو دستیاب تھیں۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ پارٹی کے اندر فوجی حکمرانوں کی مداخلت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ مولوی کوثر نیازی جیسے ٹاؤٹ کو آگے لانے پر زور دیا جا رہا تھا۔

ایک دن صبح اخبار میں مولوی کوثر نیازی کا بیان پڑھنے میں آیا۔ جس بیان میں مولوی نے اخبار نویسوں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ پیپلز پارٹی ایک انقلابی پارٹی ہے اس میں قیادت کا مسئلہ کوئی خاندانی مسئلہ نہیں ہے۔

اخبار نویسوں کا سوال تھا کہ کیا پارٹی کی قیادت بھٹو خاندان تک محدود رہے گی۔ ظاہر ہے یہ سوال حکومت کی شہ پر اخبار نویسوں نے کیا تھا۔ مولوی بڑا عیار آدمی تھا اس نے پیپلز پارٹی کو انقلابی پارٹی کہہ کر ایک طرح سے قیادت کی تبدیلی کو ایک اصولی تبدیلی بنانے کی چال چلی تھی۔ یعنی ایک انقلابی پارٹی میں قیادت خاوند کے بعد بیوی یا باپ کے بعد اولاد کو منتقل نہیں ہوا کرتی۔ اس طریقے کے ساتھ وہ بیگم بھٹو صاحبہ کو اصولی اور اخلاقی طور پر اس عہدے کو قبول نہ کرنے کا پابند بنا رہا تھا۔ یہ بیان مولوی کے مافی الضمیر اور ضیاء الحق کی چال کو سمجھنے کے لئے بہت کافی تھا۔

میں نے بیگم صاحبہ سے اس بیان کا ذکر کیا کہ مولوی کو اس طرح کی بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مولوی کو صاف کہنا چاہئے تھا کہ بھٹو صاحب کی عدم موجودگی میں بیگم صاحبہ موجود ہیں۔ اس طرح پارٹی کے اندر قیادت کے خلاء کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بیگم صاحبہ فرمانے لگیں کہ نواب صادق قریشی کہتا ہے کہ مولوی کا یہ بیان ایک سیاسی بیان ہے۔ لوگ پیپلز پارٹی کو بھٹو خاندان کی پارٹی خیال کرتے ہیں۔ جبکہ یہ ایک عوام کی جماعت ہے۔ مولوی نے لوگوں کے اس تاثر کو ختم کرنے کے لئے یہ ڈپلومیٹ بیان دیا ہے۔ میں ابھی بیگم صاحبہ کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ راولپنڈی کے قیوم بٹ صاحب اور کچھ دوسرے دوست وہاں تشریف لائے انہوں نے بڑی شدت کے ساتھ مولوی کے بیان کی شکایت کی اور کہا کہ مولوی ضیاء الحق کا ایجنٹ ہے۔ وہ اسلام آباد میں بڑی معنی خیز باتیں کر رہا ہے۔ بیگم صاحبہ نے ان کو بھی صادق قریشی والی ہی بات کہہ کر خاموش کرا دیا۔

بیگم صاحبہ نے پورے پنجاب سے پارٹی کے ضلعی عہدہ داروں کو بلا رکھا تھا۔ وہ پارٹی کے کمزور امیدواروں کی کچھ مالی امداد الیکشن میں کرنا چاہتی تھیں۔

بیگم نصرت بھٹو اور وزیراعظم بھٹو غیر لالچی سیاست دان تھے

میں وزیراعظم بھٹو کے اقتدار کے بہت پہلے سے سیاست میں ان کا شریک سفر تھا۔ میں نے بھٹو صاحب میں روپے پیسے کا کبھی کوئی لالچ نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے تمام اخراجات ہمیشہ خود برداشت کرتے تھے۔ پاکستان میں ان کے پانچ سالہ دور اقتدار میں ان کا بدترین کمینہ اور

پاجی دشمن جنرل ضیاء الحق بھی ان پر ایک پائی کی بددیانتی کا الزام عائد نہیں کر سکا تھا۔ میرے نزدیک شہید کا یہ اعزاز پاکستان کے تمام سیاسی لیڈروں کے لئے ایک مشعلِ راہ ہے۔ بس ثابت ہوا کہ قوموں کی قیادت کے لئے ذوالفقار علی بھٹو جیسے بے لوث قائد کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے اپنی سیاسی زندگی میں وہی جھلک بیگم نصرت بھٹو کی شخصیت میں عملی طور پر دیکھی تھی۔ صرف ایک بار نہیں بار بار دیکھی تھی۔ بیگم صاحبہ اس وقت چونکہ پارٹی کی چیئر مین تھیں۔ پارٹی نے انتخابات کے لئے ٹکٹ حاصل کرنے والے امیدواروں سے چندہ حاصل کیا تھا۔ صوبائی امیدوار کی درخواست کے لئے پانچ سو روپیہ تھا اور قومی امیدوار کے لئے ایک ہزار روپے تھا۔ اس طریقے سے پارٹی کے پاس اچھا خاصا سرمایہ جمع تھا۔ چونکہ ٹکٹ کے لئے درخواست کی رقم زیادہ نہیں تھی جس کی وجہ سے لاکھوں لوگوں نے ٹکٹ کے لئے اپنی درخواست کے ساتھ یہ رقم پارٹی کے فنڈ کے لئے ارسال کر دی تھی۔ پارٹی ٹکٹ کی درخواست کے ساتھ کم پیسے کی شرط رکھنا ایک اچھا سیاسی عمل تھا۔ اس عمل سے ملک میں بھاری اکثریت میں لوگ ٹکٹ کی درخواست کی شکل میں پارٹی کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے دور میں وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے اس رقم کو بڑھا کر 5 ہزار اور 10 ہزار کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ عمل ایک کاروبار کی طرح کا بن گیا تھا۔ جس کی وجہ سے پہلا نقصان تو یہ ہوا تھا کہ لوگ پارٹی کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرنے کے قابل نہ ہو سکے تھے۔ صرف سرمایہ دار لوگوں نے ٹکٹ کے لئے درخواستیں دیں تھیں۔ اس طرح یہ عوامی عمل غیر عوامی بن گیا تھا۔ بات بیگم صاحبہ کی ہو رہی تھی۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ تمام رقم جو ٹکٹوں کی درخواستوں کے ساتھ پارٹی کو موصول ہوئی تھی اس کو تمام امیدواروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مگر اس معاملے میں بیگم صاحبہ کی زبانی ہم لوگوں کو علم ہوا کہ نواب صادق قریشی اور مولوی کوثر نیازی اس بات کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس رقم کو تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اور قیوم بٹ نے اور کچھ دوسرے لوگوں نے نواب صادق حسین قریشی سے ان کے اس اختلاف کی وجہ دریافت کی۔ ان کے منہ سے نکل گیا کہ کل کلاں اگر انتخابات نہ ہوئے تو پارٹی کی یہ سخاوت تو بے کار چلی جائے گی۔ یہ وہ جملہ تھا جو صادق قریشی نے ادا کیا تھا۔ گویا اس کو انتخابات کے نہ ہونے کا علم تھا۔ خیر ہم لوگوں نے ان کے ساتھ اس بات پر سخت اختلاف کیا۔ ہمارا موقف تھا کہ اس سے پارٹی کے امیدوار ورکروں کی حوصلہ افزائی ہو گی۔

اور ایک سیاسی پارٹی کی ملک میں ایک اچھی روایت دیکھنے میں آئے گی۔ ویسے بھی یہ رقم کارکنوں کی ہی بھیجی ہوئی تھی۔ بڑی تلخ بحث کے بعد نواب صادق قریشی بادل نخواستہ ہمارے موقف کے ساتھ متفق ہونے پر تیار ہوا۔ بیگم صاحبہ ہمارے موقف کی کامیابی پر بہت خوش ہوئیں۔ دراصل نواب صادق حسین قریشی اور مولوی کوثر نیازی بیگم صاحبہ کو ایسا کوئی کام نہیں کرنے دینا چاہتے تھے جس سے پیپلز پارٹی میں یکجہتی پیدا ہو اور کارکنوں میں قیادت کے اعتماد میں اضافہ ہو۔ یہ سب کچھ وہ فوجی حکومت کے منصوبے کے مطابق کر رہے تھے۔ صادق قریشی کے گھر سے بیگم صاحبہ کی لمحہ لمحہ کی رپورٹ حکومت کو مل رہی تھی۔ وائے قسمت کے ہماری قیادت کس قدر مخلص اور سادہ تھی یا مجبور تھی کہ وہ جن پر تکیہ کئے ہوئے تھی جس گھر کو جائے پناہ مہمان خانہ تصور کئے ہوئے تھیں جاسوسی کی ایک شکارگاہ تھی۔ وہ گھر اس وقت نام کا صادق قریشی کا گھر تھا۔ وگرنہ وہ اصل میں بیگم نصرت بھٹو کے لئے خفیہ اعتبار سے ایک فوجی کیمپ تھا۔ بیگم صاحبہ اس گھر میں ایک طرح کی فوج کی تحویل میں ہی تھیں اور ان کے ہر کام پر فوج نظر رکھے ہوئے تھی۔

نواب صادق قریشی کے گھر بیگم نصرت بھٹو پر ڈاکہ ڈال دیا گیا

جنرل ضیاء الحق اور اس کے ساتھی جنرل چاہتے تھے کہ بیگم نصرت بھٹو کو خوفزدہ کر دیا جائے۔ ان کو ڈرا دھمکا کر سیاست سے علیحدہ کر دیا جائے۔ تاکہ پاکستان پیپلز پارٹی کو ایک مردہ لاش بنا دیا جائے۔ فوجی حکومت اپنے ان بد مقاصد کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کر رہی تھی۔ فوجی حکومت بیگم صاحبہ پر ثابت کرنا چاہتی تھی کہ وہ کسی جگہ کسی مقام پر بھی محفوظ نہیں ہیں۔ بیگم صاحبہ صادق قریشی کے گھر کو اپنے لئے ایک محفوظ جگہ خیال کرتی تھیں۔ ویسے بھی وزیراعظم بھٹو کے صادق قریشی کے خاندان پر اس قدر احسانات تھے کہ بیگم صاحبہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ صادق قریشی کے گھر ان پر ڈاکہ پڑ جائے گا۔

میں نے اوپر ذکر کیا تھا کہ بیگم صاحبہ نے پارٹی فنڈ کو الیکشن کے امیدواروں میں ان کی مدد کے لئے تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے اس بات کا علم نہیں ہے کہ بیگم صاحبہ تمام امیدواروں کو اپنے فیصلے کے مطابق رقم تقسیم کر چکی تھیں یا نہیں مجھے اتنا علم ہے کہ لاہور کے تمام امیدواروں کو وہ امدادی رقم مل چکی تھی ان میں میں بھی شامل تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو کہا تھا کہ مجھے فنڈ کی ضرورت نہیں ہے

مگر انہوں نے کہا تھا کہ انہوں نے سب کو یہ امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے تمہارے لئے اس میں تخصیص کی کوئی بات نہیں ہے۔ مگر میری اس بات کے دوسرے دن نواب صادق حسین قریشی کے گھر بیگم صاحبہ کا وہ نوٹوں سے بھرا ہوا بڑے سائز کا اٹیچی کیس بیگم صاحبہ کے کمرے سے غائب کر دیا گیا۔

مجھے مساوات اخبار میں اس چوری کی خبر ملی۔ میں فوری طور پر صادق قریشی کے گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ بیگم نصرت بھٹو ایک لٹے پٹے کارواں کے مسافر کی طرح اپنے اس کمرے میں بیٹھی ہیں جہاں سے وہ بکس چوری ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہنا شروع کر دیا کہ بیگم صاحبہ یہ سوٹ کیس نواب صادق قریشی نے خود چوری کرایا ہے۔ وگرنہ آپ کے کمرے میں تو کوئی آتا جاتا ہے ہی نہیں ہے۔ یہاں سے سوٹ کیس کیسے چوری ہوسکتا ہے۔ بیگم صاحبہ بڑی عظیم خاتون ہیں۔ انہوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے بات نہ کرنے کے لئے کہا۔ اسی دوران یحیٰی بختیار اور نواب صادق قریشی کمرے میں آ گئے۔ یحیٰی بختیار نے بھی سوٹ کیس کے گم ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے صادق قریشی سے پوچھا۔ قریشی صاحب آپ کے خیال میں یہاں سے سوٹ کیس کون لے جا سکتا ہے۔ صادق قریشی نے کہا کہ کچھ نوکروں کو پکڑ رکھا ہے۔ ان سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ ہم نہیں چاہتے یہ خبر حکومت تک پہنچے۔ حکومت کو تو ان باتوں سے خوشی حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ حکومت بیگم صاحبہ کے خلاف پروپیگنڈہ بھی کرے گی کہ بیگم صاحبہ لوگوں میں روپے تقسیم کر رہی ہیں۔ حکومت پہلے ہی ہم پر مالی بدعنوانی کے بڑے الزامات لگا رہی ہے۔ میں درمیان میں بول پڑا۔ میں نے کہا کہ یہ رقم تو ہمارے ٹکٹوں کے فنڈ کی ہے اس میں مالی بدعنوانی والی کونسی بات ہے۔ میں نے کہا کہ صاف بات ہے نواب صاحب سوٹ کیس یہاں سے اٹھوایا گیا ہے۔ نواب صادق جٹ سے کہنے لگا کہ پھر تو شاعر صاحب میں ہی چور ہوں آپ یہی کہنا چاہتے ہیں۔ میں یہ رقم اپنے پلے سے دینے کو تیار ہوں۔ بیگم صاحبہ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ اس بات کا ذکر نہ کیا جائے۔ قریشی صاحب ٹھیک کہتے ہیں حکومت اس سے بہت خوش ہوگی۔ اس واقعے کے بعد دو ایک بار نواب صادق قریشی کے ساتھ میرا آمنا سامنا ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کر دوسری طرف کسی کے ساتھ باتیں کرنا شروع کر دیتے تھے۔ خود میں نے بھی ان سے سلام دعا ترک کر دی تھی۔ فوجی حکومت بیگم صاحبہ کو ہر طریقے سے نپٹا کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان کو مالی طور پر بھی پریشان کرنا چاہتی تھی۔ نواب صادق قریشی حکومت کی مرضی کے خلاف دم نہیں مار سکتا تھا۔ بیگم صاحبہ کا روپوں

www.bhutto.org

والا سوٹ کیس نواب صادق قریشی نے اپنے آدمیوں سے اُٹھوا کر فوجی حکومت کو اپنی وفاداری کا ثبوت فراہم کیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ اس واقعے کے بعد بیگم صاحبہ دوبارہ نواب صادق قریشی کے گھر کبھی نہیں ٹھہری تھیں۔ ویسے بھی سوٹ کیس چوری کرنے کی واردات کا مقصد بیگم صاحبہ کو اپنے گھر سے نکالنے کا ایک بدترین اور شرمناک طریقہ تھا جو نواب صادق قریشی نے اختیار کیا تھا۔

1977ء کے انتخابات کے خاتمے کا اعلان

پاکستان پیپلز پارٹی نے بڑی شدومد کے ساتھ الیکشن کی مہم کا آغاز کر دیا۔ میں نے اور ایس۔ایم۔مسعود نے اپنے حلقے میں کارنر میٹنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ورکروں کے ساتھ رابطے کے ساتھ ساتھ کھلے عوامی جلسوں سے خطاب کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ ہم کو صرف 9 دن کے لئے انتخابی کمپین چلانے کا موقعہ ہاتھ آیا تھا۔ ہم نے ان 9 دنوں میں اپنے اس حلقے میں پانچ کھلے جلسے کئے تھے۔ میرے انتخابی حلقے کا آخری جلسہ چٹرہ منڈی کا جلسہ تھا۔ اس جلسے میں لوگوں کی حاضری دیکھ کر میرے دل میں وہم پیدا ہو گیا تھا کہ جلسوں کا یہ عالم فوجی حکومت کو خوفزدہ کر دے گا۔ میرے جلسوں کی وجہ سے میری تقریروں کی دھوم مچ گئی تھی۔ اس جلسے سے دوسرے دن انتخابات ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

بریگیڈ میجر نے مجھے طلب کیا

انتخابات کے التواء کے بعد لاہور میں میں واحد سیاسی کارکن تھا جس کو بذریعہ پولیس بریگیڈ میجر جس کا نام ظفر شاہ تھا یا مظفر شاہ تھا جس کا تعلق جہلم کے علاقے سے تھا اس نے مجھے طلب کر لیا۔ یوں تو وہ کچھ شریف آدمی تھا مگر فوجی تھا۔ اس نے مجھے میری تقریر کی کیسٹ سنائی۔ میری تقریر کے بعد چند ہی جملوں بعد اس نے کیسٹ بند کر دی اور بڑی فکرمندی کے انداز میں مجھے کہا کہ آپ تو بڑے خطرناک مقرر ہیں۔ بڑی خوفناک تقریر کرتے ہیں۔

کیا ملا ہے آپ کو پیپلز پارٹی سے کیا دیا ہے تمہیں بھٹو نے۔ ہمارے پاس آپ کی فائل موجود ہے۔ تم تو ان لوگوں میں سرِ فہرست ہو جن کو بھٹو نے نظرانداز کر دیا تھا۔ نہ تمہارے پاس

www.bhutto.org

کوئی پلاٹ ہے نہ بنک بیلنس ہے نہ اپنا مکان ہے نہ اپنی گاڑی ہے۔تم کس وجہ سے اتنے باغی بن رہے ہو۔وہ کہاں ہیں آج جن کو بھٹو نے وزارتیں دی تھیں۔ پلاٹ دیئے تھے۔وہ تو سب بھاگ گئے ہیں تم پاگلوں کی طرح تقریریں کر رہے ہو۔ وقت بدل چکا ہے۔ وقت کو پہچانو۔ آنے والے حالات بہت سخت ہوں گے۔ میں نے ان کو کہا کہ میجر صاحب یہ تو الیکشن کی تقریریں ہیں۔ یہ تقریریں تو تمام امیدوار کر رہے تھے۔مگر آپ نے تنہا مجھے ہی طلب کر رکھا ہے۔ بریگیڈ میجر نے مجھے مشورہ دینے کے انداز میں کہا کہ تم شاعر آدمی ہو۔شعر و شاعری کی طرف دھیان دو۔ سیاست وغیرہ ختم ہو چکی ہے۔ کسی کو بھی چھوڑا نہیں جائے گا۔تمہارے بارے میں رپورٹ اچھی نہیں تھی۔ بہتر ہے تم اپنا خیال کرو۔آج آپ کو صرف اتنا ہی کہنا تھا۔ تم اس بارے میں کیا کہنا چاہو گے۔

میں نے کہا کہ میں ایک جمہوریت پرست انسان ہوں۔ میں مارشل لاء کی حمایت کبھی نہیں کروں گا۔میری اس بات پر بریگیڈ میجر نے کہا۔او کے آپ جا سکتے ہیں۔ بریگیڈ میجر کی طلبی سے اور اس کی گفتگو سے مجھے حالات کا اندازہ ہونا شروع ہو گیا۔آنے والے وقت کی سنگینی کا احساس ہونا شروع ہوا۔

میں لاہور ہائی کورٹ میں ایس۔ایم۔مسعود ایڈووکیٹ اور پارٹی کے دوسرے وکلاء کے پاس گیا اور ان کو جا کر یہ معاملہ سنایا۔ان سب کا خیال تھا کہ تمہیں وارننگ دی گئی ہے۔

فوجی حکومت کے عزائم صاف دیکھائی دے رہے تھے کہ وہ پیپلز پارٹی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتی ہے۔ پارٹی کے بڑے اہم عہدہ دار غیر متحرک ہو چکے تھے۔ باقی جن پر حکومت کو متحرک ہونے کا شک تھا ان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔صورتِ حال یہ تھی کہ پنجاب پیپلز پارٹی کا نہ تو کوئی صدر باقی تھا نہ جنرل سیکرٹری اور نہ ہی کوئی اطلاعات سیکرٹری تھا۔

میاں منیر، پیر ناظم حسین شاہ اور قیوم نظامی کے کوڑے

لغاری ہاؤس میں فیصلہ کیا گیا کہ وزیر اعظم بھٹو کی ہائی کورٹ آمد پر کارکنوں کی گرفتاریاں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا جائے۔اس لئے کہ یہ بات شرمناک تھی کہ قائد عوام کی طرح کے بین الاقوامی شہرت کے حامل قائد کو عدالت میں لایا جائے اور عوام میں کسی قسم کا احتجاج دیکھنے نہ

آ ئے۔ پہلے دن 10 اکتوبر 1977ء کو گرفتاری کے لئے محترم قیوم نظامی اور پیر سید ناظم حسین شاہ نے اپنے نام پیش کئے۔ مساوات میں ان کی گرفتاریوں کی خبر دے دی گئی۔ دوسرے دن کافی تعداد میں پارٹی کارکن اور عام لوگ دیال سنگھ مینشن جس میں پرانا شیزان ہوٹل واقع تھا کے سامنے مال روڈ پر جمع ہو گئے۔ مال روڈ کی اس بلڈنگ کے اوپر راشد بٹ مرحوم کے دفتر میں ناظم حسین شاہ اور قیوم نظامی صاحب پہنچ گئے ان کے علاوہ میاں منیر احمد اچھرے والے بھی وہاں پہنچ گئے۔ قیوم نظامی کی رائے تھی کہ لوگ کچھ کم ہیں۔ لوگ دراصل ادھر ادھر چھپے کھڑے تھے جو نظامی کو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس صورت میں ان کا فیصلہ تھا کہ ابھی گرفتاری نہ دی جائے۔ اسی تکرار میں یہ تینوں جوان سڑک پر آ گئے۔ نظامی صاحب ہائی کورٹ کی جانب چلے گئے۔ میاں منیر اور ناظم حسین شاہ ریگل چوک کی جانب چلنا شروع ہو گئے۔ لوگ دراصل ریگل چوک کی طرف زیادہ کھڑے تھے۔ لوگوں نے خصوصاً پارٹی ورکروں نے میاں منیر احمد اور ناظم حسین شاہ کو آتے دیکھا تو انہوں نے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ جواب میں ان دونوں جیالوں نے بھی نعرے لگائے۔ پولیس جو بھاری تعداد میں وہاں موجود تھی اس نے فوری طور پر میاں منیر احمد اور ناظم حسین شاہ کو گاڑی میں ڈالا اور ان کو تھانے لے گئے۔ 10 اکتوبر کو ان کو گرفتار کیا گیا اسی روز ان کو ملٹری کورٹ میں پیش کیا گیا اسی روز ان کو ایک سال قید با مشقت اور دس دس کوڑوں کی سزا سنا دی گئی اور 16 اکتوبر 1977ء کی صبح کو کوٹ لکھپت جیل میں ان جوانوں کو کوڑے لگا دیئے گئے۔ اس صورت میں لاہور میں سیاسی کارکنوں کو مارے جانے والے کوڑوں میں یہ سب سے پہلے کوڑے تھے۔ جو فوجی حکمرانوں نے لوگوں کو ڈرانے کے لئے اور سیاسی کارکنوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے لگائے تھے۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا بڑا حوصلہ تھا کہ وہ فوج کے کوڑوں سے خوفزدہ نہ ہوئے۔ دوسرے دن قیوم نظامی اور سید اشتیاق حسین بخاری اور جاوید اور طارق مزنگ والے نے اسی مقام پر گرفتاری پیش کی۔ اشتیاق حسین بخاری کو چھوڑ کر قیوم نظامی اور کارکن جاوید اور طارق کو 18 - اکتوبر کی صبح کو کوٹ لکھپت جیل میں کوڑے لگا دیئے جوان بہادر کارکنوں نے بہادری سے اپنی پیٹھ پر کھا کر پیپلز پارٹی کی تاریخ کو اپنے خون سے رقم کر دیا تھا۔ ان دوستوں کے کوڑوں کے بعد تو ہر دن سینکڑوں سیاسی کارکنوں کو پاکستان کی ہر جیل میں کوڑے مارنے کا سلسلہ فوج نے شروع کر دیا۔ پاکستان میں تقریباً 8 ہزار سیاسی کارکنوں کو کوڑے مارے گئے تھے۔ میں ان کوڑے کھانے والے تمام عظیم

www.bhutto.org

کارکنوں سے معذرت چاہتا ہوں جن کے نام مجھے معلوم نہیں ہیں۔ میں ان کو سلام پیش کرتا ہوں۔ کاش کہ پیپلز پارٹی اقتدار میں آنے کے بعد کوڑے کھانے والے اور جیلوں میں جانے والے تمام لوگوں کی قربانیوں کی تاریخ مرتب کرتی، اور ان بے مثال لوگوں کو خراجِ تحسین پیش کرتی ان کو تمغہء جمہوریت عطا کرتی۔ ان کے علاوہ پھانسی کی سزائیں پانے والے کارکنوں کی جدوجہد کو تاریخ میں محفوظ کرتی۔ افسوس کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت نے نہ تو اپنی عظیم قیادت کی کوئی مستند تاریخ شائع کی اور نہ ہی پارٹی کے کارکنوں کی جدوجہد کی کوئی تاریخ مرتب کی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی تاریخ کے معاملے میں میری یہ کتاب پہلی کتاب ہوگی جس کو پارٹی کی تاریخ کہا جائے گا۔

بیگم بھٹو کی پہلی تنظیم سازی ایس۔ ایم۔ مسعود صدر پنجاب، چوہدری محمد افضل سندھو سیکرٹری جنرل پنجاب بنا دیئے گئے

وزیراعظم بھٹو کے عہد میں بیگم صاحبہ نے کبھی پارٹی کی تنظیم سازی کا کام نہیں کیا تھا۔ وہ خواتین کی حد تک تو پارٹی سیاست میں متحرک رہا کرتی تھیں۔ مگر مردوں کی تنظیم سازی میں ان کا یہ پہلا مرحلہ تھا۔ بیگم صاحبہ نے پنجاب کی تنظیم کا اعلان کیا۔ پنجاب کا قائم مقام صدر ایس۔ ایم۔ مسعود کو بنایا گیا۔ سیکرٹری جنرل محمد افضل سندھو کو بنایا گیا اور سیکرٹری اطلاعات مجھے بنا دیا گیا۔ ہماری تنظیم کا اعلان ہی ہوا تھا کہ حکومت نے ہم تینوں کو گرفتار کر کے پندرہ دن کے لئے کوٹ لکھپت میں نظر بند کر دیا۔ ہماری گرفتاری کے ساتھ ہی لاہور کے تمام نمایاں کارکنوں کو گرفتار کر کے کوٹ لکھپت جیل میں ہمارے ساتھ نظر بند کر دیا گیا۔ جہانگیر بدر جو ہم سے پہلے ہی کوٹ لکھپت جیل میں موجود تھے۔ ان کے ساتھ میاں ارشد مرحوم بھی قید تھا۔ جہانگیر بدر کے ساتھ ان کے سیاسی مخالفین کو خواہ کتنے بھی اختلافات ہوں مگر ان کا کوئی مخالف بھی جہانگیر بدر کی خداداد قسم کی صلاحیتوں کا انکار نہیں کر سکتا۔ جیل میں تمام سیاسی کارکنوں کے ساتھ ان کا رابطہ تھا۔ یہاں تک کہ وزیراعظم بھٹو کے ساتھ بھی ان کی پیغام رسانی رہتی تھی۔ لاہور شہر کے تمام کن ٹٹے جوان دنوں غنڈہ ایکٹ میں جیل میں تھے سب کے سب بدر کے مداح تھے۔ ہم لوگ پندرہ دن نظر بند رہے تھے۔ جیل میں جہانگیر بدر نے ہماری بڑی مہمان نوازی کی۔ پندرہ دن بعد حکومت نے ہماری نظر بندی میں توسیع نہ کی اور ہم رہا ہو گئے۔

www.bhutto.org

محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ پہلی ملاقات

یوں تو صادق حسین قریشی کے گھر اور لاہور ہائی کورٹ میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ مگر اس اتفاق کو ملاقات نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں جب جیل سے رہا ہوا تو اس وقت بیگم نصرت بھٹو صاحبہ اور محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ صادق قریشی کا گھر چھوڑ کر گلبرگ میں کھگا ہاؤس میں ایک طرح کی مستقل قسم کی رہائش اختیار کر چکی تھیں۔ اور یہ گھر مکمل طور پر ان کی تحویل میں تھا۔ وہاں پر بیگم صاحبہ اور محترمہ بے نظیر پارٹی کے لوگوں کے ساتھ ملاقات کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھٹو صاحب کے مقدمے کی تیاری کا کام بھی اسی گھر میں کیا جاتا تھا۔ مسٹر یحییٰ بختیار جو بھٹو صاحب کے پرنسپل کونسل تھے وہ بھی اسی گھر میں مقیم تھے۔ میں نے فون کر کے محترمہ سے وقت حاصل کیا اور وہاں پہنچ گیا۔ ابھی ہماری گفتگو کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ ملازم نے آ کر کہا کہ ایک درویش آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

محترمہ نے اس کو اندر لانے کا کہہ دیا۔ ایک دراز قد کا لمبا چوڑا فقیر کمرے کے اندر آ گیا۔ جس کی بڑی بڑی زلفیں تھیں، بڑے زرّی کے ہار اس نے اپنے گلے میں ڈالے ہوئے تھے۔ اس نے آتے ہی محترمہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں کرنا شروع کر دیں۔ وہ عربی میں بلند آواز سے دعا کر رہا تھا۔ کوئی آیت پڑھ رہا تھا ساتھ ہی ساتھ کمرے کی ہر چیز کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ اس نے مجھے بھی بڑے غور سے دیکھا۔ اپنی دعا ختم کی اور ایک مالا محترمہ کو دے دی۔ محترمہ نے کچھ روپے دیئے اور وہ واپس چلا گیا۔ جب وہ کمرے سے باہر گیا تو میں نے محترمہ سے کہا کہ یہ سی۔ آئی۔ ڈی کا فقیر ہے۔ محترمہ کو میری یہ بات اچھی نہ لگی۔ وہ فرمانے لگیں کہ ایک اللہ لوک کو سی۔ آئی۔ ڈی کا کہنا کہاں کی اچھی بات ہے۔ اس طرح اس پہلی ملاقات میں بات چیت کا آغاز میری بیوقوفی نما عقل مندی سے ہوا۔ اس کے بعد ضیاء الحق کے عزائم پر بات شروع ہو گئی۔ اس ملاقات کی بات چیت سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ محترمہ میرا سیاسی امتحان کر رہی ہیں۔ وہ خود سوال کرتی تھیں میں اپنی دانست کے مطابق جواب دیتا جا رہا تھا۔ محترمہ کا آخری سوال تھا کہ اگر جنرل ضیاء الحق ریفرنڈم کرائے گا تو کیا نتیجہ رہے گا۔ میرا جواب تھا کہ وہ لومڑی کی طرح چالاک آدمی ہے وہ ایسا کیسے کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس نے ایسا کر دیا تو کیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ بی بی ایسا وہ نہیں کرے

www.bhutto.org

گا۔ انہوں نے فرمایا۔ فرض کرو اگر وہ ایسا کرتا ہے تو پھر کیا ہو گا۔ اگر میں چالاک انسان ہوتا یا سیاست دان ہوتا تو الٹا ان سے پوچھ لیتا کہ ہاں بی بی اگر ایسا ہو جاتا ہے تو آپ کے خیال میں کیا ہو گا۔ مگر میں سیدھا سادہ شاعر تھا اپنے موقف پر اڑا رہا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ میرا یقین ہے کہ ان کو ان کے کسی حکومتی سورس نے یہ بتایا ہو گا کہ ضیاء ریفرنڈم کرا رہا ہے۔ ان کے سوال سے میرا متفق نہ ہونے سے ان کو شبہ گذرا کہ میں ضیاء الحق کی ریفرنڈم کی سازش پر پردہ ڈال رہا ہوں۔ یا اس پر بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔ بہر صورت میرے علم میں ریفرنڈم کے بارے میں اس وقت کوئی بات نہیں تھی۔ لہٰذا ان کو بے حد غصہ آ گیا۔ انہوں نے بڑے غصے سے کہا کہ اگر وہ ریفرنڈم کا اعلان کرتا ہے تو ہم کو کیا کرنا ہو گا۔ میں نے کہا کہ بی بی وہ تو اس کے ریفرنڈم کے اعلان پر ہی ہم سوچ سکیں گے۔

پہلے ہم کو معلوم تو ہو کہ وہ ریفرنڈم کس مقصد کے لئے کرانا چاہتا ہے۔ میری اس بات پر وہ کچھ شانت ہوئیں۔ میں نے ان سے ملاقات کرنے کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے لاہور ہائی کورٹ آ گیا۔ میں محترمہ کی تلخی کو محسوس کر رہا تھا کہ ان کو اپنے پاپا کی محبت نے بے حد ستا رکھا ہے۔ ان سے بھٹو صاحب جیسے انسان کی جیل کی حالت دیکھنا ناقابلِ برداشت تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ہر دوسرے انسان کی بات کو شک کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ ویسے بھی حکومت نے ان کے اردگرد اتنے لوگ لگا رکھے تھے کہ سچے اور جھوٹے کی پہچان کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے لاہور ہائی کورٹ میں اس ملاقات کے بارے میں قائم مقام سیکرٹری جنرل پنجاب چوہدری افضل سندھو سے ذکر کیا اور کہا کہ بھائی صاحب میری تو محترمہ بے نظیر صاحبہ نے خوب خبر لی ہے۔

چوہدری افضل سندھو بہت ہنسا۔ قہقہے لگا کر ہنسا۔ مجھے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا۔ فکر نہ کرو یہ سب کچھ تم سے پہلے میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ میں بھی تمہاری طرح ان پر اپنا علم جھاڑنے گیا تھا۔ میرے ساتھ بھی تمہارے جیسی ہی ہوئی تھی۔

مولوی کوثر نیازی کی غداری

بیگم نصرت بھٹو نے اور محترمہ بے نظیر بھٹو نے کھگا ہاؤس میں بیٹھ کر 1977ء کے خونی بحران کی قیادت کا کام سرانجام دینا شروع کر دیا۔ اب پارٹی کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ دونوں ماں بیٹی صبح سے لے کر رات گئے تک پارٹی کے عہدہ داروں، لیڈروں، وکلاء اور کارکنوں

www.bhutto.org

کے ساتھ براہِ راست ملاقات کرتی تھیں۔ کارکنوں کو ان کے ساتھ ملنے کا موقعہ ملتا تھا جس کی وجہ سے پارٹی کے کارکنوں کا مورال بہت ہائی تھا۔ کارکنوں کو پہلی مرتبہ ایسا موقعہ میسر آیا تھا کہ وہ اپنی قیادت کو پارٹی کے اور ملک کے صحیح حالات سے آگاہ کرتے تھے۔ پارٹی کے اندر ہونے والی سازشوں سے اور سازشیں کرنے والے سازشیوں سے قیادت کو خبردار کرتے تھے۔ فوجی حکومت کی منصوبہ بندی کی ان کو اطلاعات دیتے تھے۔ میں نے دیکھا تھا کہ 1978ء کے ابتدائی مہینوں میں پاکستان پیپلز پارٹی ایک مکمل انقلابی پارٹی کی شکل اختیار کرتی دیکھائی دے رہی تھی۔ پارٹی کے اندر کے تمام موقعہ پرست پارٹی کی اگلی صفوں سے فوجی حکومت کے خوف کی وجہ سے پیچھے سرک گئے تھے اور پارٹی کی اگلی صفوں میں پارٹی کا اصل سرمایہ پارٹی کے جوشیلے، دیانت دار، بہادر کارکن اُبھر کر سامنے آ گئے تھے۔ ان کا جوش و جذبہ سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ میں اس بات کا شاہد ہوں کہ اس وقت ہر کارکن کوڑے کھانا جیل جانا ایمان کا حصہ تصور کرتا تھا۔ ہر کارکن وزیر اعظم بھٹو کو جیل سے اُٹھالانے کا جذبہ رکھتا تھا۔ کارکن ایک انقلابی مشن کے تحت ہر روز مال روڈ پر گرفتاریاں پیش کرتے تھے اور اسی شام کو ان کو کوٹ لکھپت جیل میں کوڑے مار دیئے جاتے تھے۔

کوڑوں کے معاملے میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت بات یہ تھی۔ جیل میں جس بیرک میں وزیر اعظم بھٹو کو قید کیا گیا تھا۔ کوڑے اس بیرک کے سامنے ایک کھلی جگہ پر کارکنوں کو لگائے جاتے تھے۔ پارٹی کے کارکن کوڑے کھا کر بھی بھٹو زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ وزیر اعظم بھٹو کے اپنے قول کے مطابق جو انہوں نے اپنی کتاب اگر مجھے قتل کر دیا گیا میں تحریر کیا تھا کہ میری زندگی کی سب سے بڑی اذیت میرے ان کارکنوں کی چیخیں اور نعرے تھے جو کوڑے کھانے کے دوران مجھ تک پہنچتے تھے۔

ہر چند کوڑوں کی اذیت اور ان کا خوف لوگوں کے ذہنوں پر بری طرح مسلط تھا۔ مگر میں سلام کرتا ہوں پیپلز پارٹی کے سیاسی کارکنوں کو جو اس وقت کوڑوں کو اپنی تقدیر خیال کر کے قبول کر رہے تھے۔ فوجی حکمرانوں کا خوف اور ریاستی اداروں یعنی پولیس اور فوج کی دہشت بھی ان کی حریتِ فکر کو پسپا نہیں کر سکی تھی۔ فوجی حکمران اپنے تمام جبر واستبداد کے باوجود کارکنوں کو سڑکوں پر آ کر گرفتاری دینے سے روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ بہت جلد فوجی حکمرانوں کو اپنے ظلم کی ناکامی کے اسباب کا احساس ہونا شروع ہو گیا۔ فوجی حکمران اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ جب تک پیپلز

www.bhutto.org

پارٹی کی قیادت کو ان دونوں ماں اور بیٹی کے ہاتھ سے چھینا نہیں جاتا یا جب تک ان دونوں کو پارٹی کی قیادت کے مقام سے ہٹایا نہیں جاتا پیپلز پارٹی کے کارکنوں پر قابو پانا مشکل ہے۔فوجی حکمرانوں نے اپنی اس سازش پر عملدرآمد کرنے کے لئے مولوی کوثر نیازی کو میدان میں اتار دیا۔

نوٹ:''واضح رہے کہ آج 2001ء کی فوجی حکومت کی روش بھی وہی ہے جو اس وقت کی فوجی حکومت کی تھی۔آج کے فوجی حکمران بھی ایک ہی بات کئے جا رہے ہیں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو قیادت سے ہٹا دیا جائے ان کے علاوہ ہر آدمی ان کو قبول ہے۔''

مولوی کوثر نیازی کی غداری کی ابتداء

مولوی کوثر نیازی نے اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس میں بیان جاری کر دیا کہ پیپلز پارٹی کا قائد ذوالفقار علی بھٹو ایک جمہوری انسان تھا وہ بادشاہ نہیں تھا کہ ان کے بعد ان کے خاندان کو پارٹی کی قیادت پر بٹھا دیا جائے۔پیپلز پارٹی ایک عوامی جماعت ہے اور ایک انقلابی پروگرام کی جدید نظریات کی حامل جماعت ہے۔پیپلز پارٹی کی قیادت کے لئے عنقریب سینٹرل کمیٹی کا اجلاس بلایا جائے گا جس میں پارٹی کی قیادت کا فیصلہ کیا جائے گا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کے بارے میں مولوی کوثر نیازی کے بیان کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں تھی۔بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو بھی وزیراعظم بھٹو کی زندگی کے لئے اس جذبے سے کام کر رہی تھیں جس جذبے کے ساتھ پارٹی کے دوسرے کارکن کام کر رہے تھے۔ان کا بھی پارٹی پر اتنا ہی حق تھا جتنا دوسروں کا تھا۔پارٹی کے کچھ بڑے لیڈر مصلحتوں کا شکار ہو کر میدان چھوڑتے چلے جا رہے تھے۔اس وقت تو قیادت کا کوئی جھگڑا ہی نہیں تھا۔کوڑے کھانے والی بات تھی۔خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو کی طرح سر پر لاٹھی کھانے والی بات تھی۔اس وقت قیادت کا جھگڑا کھڑا کر نا مدینے کے منافق عبداللہ بن ابی کا کردار ادا کرنے والی بات تھی جو اس نے جنگ اُحد کے وقت ادا کیا تھا۔ایک تو عبداللہ بن ابی خود اپنے ساتھیوں سمیت مسلمانوں کے لشکر سے علیحدہ ہو گیا تھا۔اس کے علاوہ وہ عام مسلمانوں کو بھی رسالتِ مآب کے ساتھ جانے سے منع کرتا تھا۔افسوس کہ انسانی تاریخ میں مخبروں اور منافقوں کے کردار نے قوموں کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔

مولوی کے اس بلاوجہ بیان پر پارٹی کے ہر کارکن کو تشویش لاحق ہو گئی۔مولوی کوثر نیازی

www.bhutto.org

جس کا کردار پہلے سے ہی لوگوں کے لئے مشکوک ہو چکا تھا اس بیان سے اور بھی مشکوک ہو گیا۔ کارکنوں نے اخبارات میں بیان دینے شروع کر دیئے کہ ہم سوائے بھٹو خاندان کی قیادت کے اور کسی دوسرے انسان کی قیادت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنی رہبر اور رہنما خیال کرتے ہیں۔

فوجی حکمرانوں کے حکومتی اخباروں نے اور ان کے درباری قلمکاروں نے مولوی کوثر نیازی کے حق میں آسمان سر پر اٹھا لیا کہ مولوی ایک جمہوریت پسند انسان ہے۔ وہ پیپلز پارٹی پر بھٹو خاندان کی بادشاہت مسلط نہیں دیکھنا چاہتا۔ پیپلز پارٹی ایک آمریت پسند جماعت ہے۔ پہلے بھٹو کی آمریت پارٹی پر مسلط تھی اب اس کی بیوی اور اس کی بیٹی کی آمریت پارٹی پر مسلط کی جا رہی ہے۔ پارٹی کے کارکن پارٹی پر آمریت مسلط نہیں ہونے دیں گے۔

یہ تمام باتیں سرکاری اخباروں میں اس وقت کی جا رہی ہیں جب بھٹو خاندان کی یہ دونوں خواتین انتہائی عذاب میں مبتلا تھیں۔ جن کو حکومت کے تشدد اور جبر اور ہر طرح کے ناروا سلوک کی وجہ سے نہ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام تھا۔ حکومت نے ان کا گھیرا تنگ کر رکھا تھا۔ وہ بظاہر کھگا ہاؤس میں رہائش پذیر تھیں مگر اصل میں وہ ایک طرح کی اسی گھر میں محصور تھیں ایک طرح کی قید میں تھیں۔ حکومت کے گھیرے میں تھیں۔ تمام ریاستی ادارے ان کے درپے آزار تھے۔ تمام مفادات پسند طبقے ان کے مخالف تھے۔ فوجی حکمران ان کی جان کے پیاسے تھے۔ تمام شکست خوردہ سیاست دان ان کی جان کے دشمن تھے۔ ان کے ساتھ اس وقت صرف اور صرف خدا کی ذات تھی اور اس کے علاوہ پیپلز پارٹی کے کارکن اور پاکستان کے غریب عوام تھے۔ اس طرح کی صورت حال میں ان پر مولوی کا موروثیت کا طعنہ دینا اور وراثت کا مسئلہ کھڑا کرنا کہاں کی شرافت تھی۔ وہ دونوں ماں بیٹی تو اہلِ بیت کے قافلے کی طرح لحہ بہ لحہ جبر کی قوتوں کے نرغے میں چلی جا رہی تھیں۔ لوگ دل سے ان کے ساتھ تھے مگر خوف اسے ان سے دور ہٹتے چلے جا رہے تھے۔ اس عالم میں پارٹی کے اندر انتشار پیدا کرنے کی چال مولوی کوثر نیازی ہی چل سکتا تھا۔ لہٰذا کوثر نیازی جس مقصد کے لئے بھٹو صاحب کے ساتھ نتھی کیا گیا تھا اس کے کردار ادا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ پارٹی کے اندر ملک معراج خالد جیسے فلسفی بھی دبے الفاظ میں قیادت اور وراثت کی باتیں کرنے لگ گئے تھے۔ کچھ نصیحت پیشہ سے ہوتے جا رہے تھے۔ پارٹی کے اندر جو لوگ میری طرح کے دلفگار تھے۔ وہ بڑی اذیت میں تھے۔

افسوس ناک بات تو یہ تھی کہ ملک معراج خالد اور ان کے ساتھی کوڑے کھانے والے ورکروں پر بھی تنقید کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ کارکن صورت حال کو خراب کر رہے ہیں۔

بیا اے عشق رسواء جہانم کن کہ یک چندے

نصیحت ہائے بے درداں شنیدم آرزو دارم

ترجمہ: آ اے عشق مجھے زمانے میں رسواء کر میرے جذبوں کی تحقیر کر۔ مجھے کچھ بے دردوں کی نصیحتیں سننے کی خواہش ہے۔ میں سننا چاہتا ہوں کہ یہ ہدایت پیشہ لوگ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ میرے عشق میں کیا خرابی نکالتے ہیں۔ یہ جاننے کی مجھے حسرت ہے۔

مولوی کوثر نیازی کے مقابلے میں پارٹی کے صحیح الفہم عہدے دار لیڈروں اور کارکنوں نے مساوات میں ایک مشترکہ بیان جاری کیا کہ ہم پارٹی کے ذمہ دار کارکن اعلان کرتے ہیں کہ بیگم نصرت بھٹو کو اپنی قیادت تسلیم کرتے ہیں۔ اگر ان کو گرفتار کیا گیا تو ان کے بعد ہم محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنی قیادت تسلیم کریں گے۔ پارٹی کے عہدہ داروں کے اس اعلامیے سے کوثر نیازی اور بھی کھل کر سامنے آ گیا۔ اس کا بیان تھا کہ بیگم نصرت بھٹو کی حد تک تو قیادت کی تسلیم کی جا سکتی ہے مگر بے نظیر کی حد تک قیادت کی بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ماں کے بعد بیٹی کی قیادت کو تسلیم کرنا پارٹی کے اندر قیادت کو وراثت میں تبدیل کرنا ہو جائے گا۔ جس کی جمہوریت ہم کو اجازت نہیں دیتی۔

مولوی سے کوئی پوچھے ملک پر مارشل لاء مسلط تھا۔ وہ جمہوریت کے اصولوں کی بات کر رہا ہے۔ کارکنوں کے کوڑے کھانے کی مخالفت کر رہا ہے۔ کارکنوں کی گرفتاریوں کو سیاست کی فضا خراب کرنے کی بات کہہ رہا ہے۔ پاکستان کے عوام اور پارٹی کے کارکن مارشل لاء ہٹاؤ تحریک چلا رہے تھے۔ وہ ماں اور بیٹی کی قیادت ختم کرنے کی بات کر رہا تھا۔ اس کا کام صرف پارٹی کے اندر انتشار پیدا کرنا دکھائی دے رہا تھا۔

مولوی کوثر نیازی اس سازش میں اکیلا نہیں تھا۔ اس کی اس حکومتی سازش میں اور بھی کئی لیڈر پارٹی کے اندر موجود تھے۔ جو مولوی کے موقف کی کئی ایک انداز میں حمایت کر رہے تھے۔ وہ مولوی کی طرح کھل کر بات تو نہیں کرتے تھے۔ مگر اپنے حلقے کے لوگوں میں اس کی حمایت کی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے جس طرح کہ اوپر میں نے ملک معراج خالد کا ذکر کیا ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی صفوں میں ایک طرح کا ابہام پیدا ہوتا جارہا تھا۔ حکومت اس ابہام اور کنفیوژن کو پیدا کرنے میں بڑی کامیاب ہوتی چلی جارہی تھی۔ یہ مسئلہ ایک طرح کی بحث بنتا جارہا تھا کہ کارکنوں کو گرفتاریاں نہیں دینی چاہئیں یا دینی چاہئیں۔ اس ابہام اور انتشار سے کارکنوں میں بداعتمادی پیدا کردی گئی۔ پارٹی کے اندر سی۔ آئی۔ ڈی کا کام اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ ہر کارکن دوسرے کارکن کی بات پر شک کرنے لگ گیا تھا۔ کوثر نیازی اور اس کے پارٹی کے اندر بااثر ساتھی کارکنوں کا ذہن خراب کررہے تھے۔ جس کی وجہ سے ایک وہ وقت آ گیا کہ کارکن یہ فیصلہ ہی نہیں کرپارہے تھے کہ ان کو گرفتاری دینی چاہئے یا نہیں دینی چاہئے۔

شیخ محمد رشید جوان دنوں جیل میں تھے ان کے پیغام کارکنوں کو آرہے تھے کہ وہ گرفتاریاں پیش کریں۔ ان کے مقابلے میں کوثر نیازی، ملک معراج خالد، صادق قریشی، صاحبزادہ فاروق اور کمال افسر کی طرح کے لوگ کارکنوں کو گرفتاریاں دینے سے منع کررہے تھے۔ کچھ پارٹی کے نمایاں کارکن طارق وحید بٹ کی قیادت میں فوجی حکمرانوں کے ساتھ مل کر پارٹی کارکنوں کو گرفتار کرانے کی مہم چلائے ہوئے تھے۔ کارکنوں کو ان کے گھروں سے گرفتار کیا جارہا تھا۔ اس طرح کے خوف و دہشت کی فضا میں کارکنوں کی گرفتاریاں دینے کا سلسلہ وقتی طور پر معدوم ہوگیا۔ جو پارٹی کے لئے اور خصوصاً بھٹو صاحب کی ذات کے لئے بڑا نقصان دہ تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جو کارکن بیگم نصرت بھٹو کو یا محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ ملاقات کرنے کھگا ہاؤس جاتا اس کو باہر نکلتے ہی پولیس گرفتار کرلیتی تھی۔ اس صورت میں بھٹو صاحب کی رہائی کی تحریک ایک طرح سے رک سی گئی تھی۔ نہ تو کوئی جلسہ ہوسکتا تھا کہ بیگم صاحبہ یا محترمہ بے نظیر اس میں لوگوں سے خطاب کرتیں اور نہ جلوس نکالنا ممکن تھا کہ جس سے رہائی کی تحریک اور جمہوریت کی تحریک کو چلانا ممکن ہوسکتا تھا۔ اس طرح ایک طرح کا ڈیڈلاک پیدا ہو چکا تھا کہ خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو نے اپنی ذات اور اپنی قیادت کا امتحان دینے کا فیصلہ کرلیا۔

لاہور میں کرکٹ میچ اور بیگم نصرت بھٹو محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت کا عظیم مظاہرہ

پاکستان کی طرح کے دنیا کے تمام پسماندہ ممالک جن پر آمریت مسلط رہتی ہے۔ ان ممالک میں آمرانہ شخصی حکومت کوئی کام بھی عوام کی سچی خوشی کے لئے سرانجام نہیں دیتی۔ ان کے

www.bhutto.org

ہر کام میں اپنے مفادات پنہاں ہوتے ہیں۔ یہاں تک کے وہ عوامی تہواروں اور قومی کھیلوں کو بھی اپنے سیاسی مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان میں کرکٹ کو جنرل ضیاء الحق نے ہمیشہ اپنے سیاسی مفادات کے لئے استعمال کیا تھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے دوستی کے سلسلے میں کرکٹ ڈپلومیسی کی اختراع بھی ضیاء الحق نے ہی ایجاد کی تھی۔ 1978ء میں جب پاکستان کی فضا قائد عوام کی جیل کی وجہ سے بے حد سوگوار تھی۔ ضیاء الحق نے لوگوں کی توجہ بھٹو صاحب سے ہٹانے کے لئے پاکستان میں کرکٹ میچ کرانے شروع کر دیئے۔

اس سلسلے میں لاہور میں کرکٹ کا پہلا میچ تھا۔ جو قذافی سٹیڈیم میں ہونا تھا۔ بیگم صاحبہ کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ قذافی سٹیڈیم سے زیادہ لوگ ان کو اس وقت کہیں بھی دستیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کے ذہن میں تھا کہ ان کی قربانی سے لوگ جلوسوں کی شکل میں سڑک پر آجائیں گے۔ سٹیڈیم میں دنیا بھر کا پریس ہوگا اور سٹیڈیم میں جلوس نکلنے کی خبریں پوری دنیا میں پہنچ جائیں گی۔ پوری دنیا میں وزیر اعظم بھٹو کو جیل میں رکھنے کی کہانی پھیل جائے گی۔ اور دنیا کے تمام جمہوریت پسند ممالک میں فوجی حکمرانوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔ یہ بات اپنی جگہ ایک معمہ ہے کہ حکومت کو شاید کسی مخبر سے بیگم بھٹو کے سٹیڈیم میں آنے کی بھنک پڑ چکی تھی۔ جس کی وجہ سے سٹیڈیم میں ہر انکلوژر میں بھاری تعداد میں پولیس کھڑی کر دی گئی تھی۔

دنیا بھر کے تمام ماہر بشریات کا کہنا ہے کہ عورت دنیا کی سب سے بہادر مخلوق ہوتی ہے۔ وقت پڑنے پر خواتین مردوں سے کہیں زیادہ بہادر ثابت ہوتی ہیں۔ ماہرین بشریات کا یہ مقولہ میں نے خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو اور ان کی بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو کی جرأت میں عملی شکل میں دیکھا تھا۔ خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو ایک پیکر شجاعت بن کر ایک عزم و استقلال کا مینار بن کر قذافی سٹیڈیم لاہور پہنچ گئیں۔ پارٹی کے کارکن بھی بھاری تعداد میں اسٹیڈیم میں پہنچ گئے تھے۔ بیگم صاحبہ جیسے ہی وی۔ آئی۔ پی لاؤنج میں پہنچیں کارکنوں نے ان کو دیکھتے ہی نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ فخرِ ایشیا زندہ باد ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد بیگم بھٹو زندہ باد۔ ضیاء کتا ہائے ہائے۔ فوجی راج ہائے ہائے۔ جنرل ضیاء مردہ باد۔ پولیس چونکہ پہلے ہی ہر انکلوژر میں چوکس کھڑی تھی۔ وہ کارکنوں کے نعرے سن کر بیگم صاحبہ کے اردگرد جمع ہونا شروع ہوگئی۔ چند ہی منٹ میں ایک ڈی۔ آئی۔ جی

www.bhutto.org

پولیس بیگم صاحبہ کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی پولیس کو کارکنوں پر اور اس ہجوم پر جو بیگم صاحبہ کے قریب جمع تھا اس پر لاٹھی چارج کرنے کا حکم دے دیا۔

اخبار کے فوٹو گرافروں نے اس تمام منظر کی تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی پولیس نے ایک لاٹھی بردار سپاہی کو بیگم صاحبہ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس کے سر پر لاٹھی مارو۔ سپاہی نے پورے زور سے لاٹھی کو فضا میں بلند کر کے بیگم صاحبہ کے سر پر دے مارا۔ بیگم صاحبہ کے سر پر لاٹھی مارنے والے منظر کو مساوات اخبار کے کیمرہ مین نے اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیا تھا۔ بیگم صاحبہ کے سر پر لاٹھی کا وہ حصہ جا لگا جس حصے پر لوہا چڑھا ہوا تھا۔ لاٹھی بیگم صاحبہ کے سر پر لگتے ہی بیگم صاحبہ کا چہرہ لہولہان ہو گیا اور بیگم صاحبہ اس اچانک سر کی کاری ضرب سے سٹیڈیم کی کرسیوں کے درمیان گر گئیں۔ تقریباً نیم بیہوش سی ہو گئیں مگر یہ عالم کچھ زیادہ دیر تک بیگم صاحبہ پر حاوی نہ رہا جو چند ہی سیکنڈ میں دوبارہ کھڑی ہو گئیں۔ اس وقت تک پولیس کارکنوں کو اور کچھ شہریوں کو جو بیگم صاحبہ کے قریب ہجوم کئے کھڑے تھے۔ ان کو گرفتار کر چکی تھی۔ بیگم صاحبہ اور محترمہ بے نظیر صاحبہ کو پولیس اپنے حصار میں لے چکی تھی۔ کرکٹ کا کھیل بند ہو چکا تھا۔ تمام سٹیڈیم کا ہجوم بیگم صاحبہ کے انکلوژر کی طرف اُمڈ چکا تھا۔ سٹیڈیم میں ایک طرح ہنگامہ برپا ہو چکا تھا۔ لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ پولیس نے بیگم بھٹو کو گرفتار کر لیا ہے۔ یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ بیگم بھٹو شدید زخمی کر دی گئی ہیں ان کی جان کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس طرح کی افواہوں سے لوگ مشتعل ہو گئے۔ لوگوں نے سٹیڈیم کی کرسیاں توڑنا شروع کر دیں۔ قالین جلانا شروع کر دیئے۔ ہر طرف جنرل ضیاء مردہ باد کے نعرے لگنے لگ گئے۔ پولیس مردہ باد کے نعرے لگنے لگ گئے۔ پولیس ہر طرف لاٹھی چارج کرتی جا رہی تھی۔ بے شمار لوگ زخمی ہو گئے تھے۔ سٹیڈیم میں ایک طرح کا جنگ کا نقشہ دیکھائی دے رہا تھا۔ لوگ پولیس پر اینٹیں اور بوتلیں پھینک رہے تھے۔ پولیس نے ہوائی فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ جس کے خوف سے لوگوں نے سٹیڈیم سے باہر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

اس طرح کے جنگ و جدل کے عالم میں پولیس بیگم صاحبہ اور محترمہ بے نظیر صاحبہ کو سٹیڈیم سے باہر لائی اور ان کو ایک سرکاری گاڑی پر سوار کرا کر ان کو گلبرگ یو۔ سی۔ ایچ ہسپتال لے گئی۔ بیگم صاحبہ چونکہ بہت شدید گھائل ہو چکی تھیں۔ ان کے سر پر بہت گہرا زخم آیا تھا۔ ان کو ہسپتال کے

ڈاکٹروں نے فوری طور پر ہسپتال میں داخل کر کے ان کے زخم پر مرہم پٹی کا کام شروع کر دیا۔ اور پولیس ان دونوں کو ہسپتال میں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ بیگم نصرت بھٹو کے اس مظاہرے میں جن پارٹی کارکنوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان میں حافظ محی الدین اور احسان بٹ کے نام مجھے یاد ہیں ان کو فوری طور پر ملٹری کورٹ سے ایک سال قید اور 10 کوڑوں کی سزا سنادی گئی تھی اور ان کو کوٹ لکھپت جیل میں کوڑے لگا دیئے گئے تھے۔

خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو کے اس جگر دار قسم کے مظاہرے میں ان کے شدید زخمی ہونے کے واقعے سے جس میں ان کے سر پر تقریباً گیارہ ٹانکے لگائے گئے تھے۔ ہر انسان کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ وزیراعظم بھٹو کو جیل میں ڈال کر فوجی حکمران کس قدر جنگل کے بھیڑیئے بنے ہوئے تھے۔ جن کے خوف کی وجہ سے پیپلز پارٹی کے کچھ پہلی صف کے لیڈر جن کا سرغنہ مولوی کوثر نیازی تھا وہ بھٹو صاحب کی رہائی کے لئے کسی قسم کی کوئی ہل جل نہیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ بیگم صاحبہ کی اور کارکنوں کی جدوجہد کو انتہا پسندی قرار دے رہے تھے اور صورت حالات کو بگاڑنے کا الزام لگا رہے تھے۔ بیگم صاحبہ کے زخمی ہونے کے بعد سب سے زیادہ افسوس ناک اور شرمناک بات کوثر نیازی کا بیان تھا کہ بیگم صاحبہ نے سینٹر کمیٹی کے مشورے کے بغیر یہ اقدام لیا ہے۔ اگر وہ ہمارے ساتھ مشورہ کرتیں تو ہم ان کو سٹیڈیم میں ہرگز نہ جانے دیتے۔

پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کا ہنگامی اجلاس

یہ ایک اتفاق کی بات تھی کہ ہم جو پنجاب کے قائم مقام عہدے دار بنائے گئے تھے ہم نے پنجاب کے تمام اضلاع کے صدروں اور سیکرٹریوں کا ہنگامی اجلاس بلا رکھا تھا۔ یہ اجلاس بیگم صاحبہ کے زخمی ہونے کے ایک دن بعد منعقد ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ کے زخمی ہو جانے کی وجہ سے اس اجلاس کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اجلاس میں لوگوں کی حاضری ہماری توقع سے کہیں زیادہ ہوئی تھی۔ اس اجلاس میں ہر ضلع سے آنے والے عہدہ داروں کو خطاب کا وقت دیا گیا۔ اور آخر میں اس اجلاس سے فاروق احمد لغاری، مختار اعوان، شمیم احمد خان اور قائم مقام سیکرٹری جنرل افضل سندھو اور قائمقام صدر پنجاب ایس۔ ایم۔ مسعود اور میں نے تقریریں کیں۔ اجلاس کے اختتام پر تقریباً 10 قراردادیں متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔ ان میں سب سے پہلی

www.bhutto.org

قرارداد میں تو بیگم بھٹو کے ساتھ فوجی حکمرانوں کے کیے گئے تشدد اوران پر کیے گئے قاتلانہ حملے کی مذمت کی گئی تھی۔ دوسری قرارداد میں چیئر مین بھٹو کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تیسری قرارداد میں کارکنوں کو کوڑے مارنے کی مذمت کی گئی تھی۔ فوجی حکمرانوں کے اس نظام حکومت کو عہدِ غلامی کا نظام قرار دیا گیا تھا۔ جبر اور بربریت کے دور سے تعبیر کیا گیا تھا اور تمام کارکنوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اور ایک قرارداد کے ذریعے پاکستان میں فوری طور پر انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ اجلاس ہم نے پارٹی پنجاب کے دفتر جو جیل روڈ پر ایک کوٹھی میں قائم تھا وہاں پر کیا تھا اور یہ دفتر ہمارے اس اجلاس کے بعد حکومت نے ختم کروا دیا تھا۔ جس جاگیردار نے یہ دفتر پارٹی کے اقتدار میں پارٹی کو پیش کیا تھا۔ اس نے فوجی حکمرانوں کے کہنے پر اپنی کوٹھی کے دروازے پر تالا ڈال دیا تھا۔

اس اجلاس کا ایک اہم واقعہ

جیسا کہ میں نے پہلے تحریر کیا ہے کہ اس اجلاس کا پس منظر مولوی کوثر نیازی کی غداری تھا۔ پارٹی کی جانب سے پالیسی تقریر مجھے ہی کرنا تھی۔ میں نے جب مولوی کوثر نیازی کے کردار کو خوب ننگا کیا۔ جب میں نے اپنی تقریر ختم کی تو ایک دم سرگودھا شہر کے میاں جمیل اختر ایڈووکیٹ جو میری نظر میں پارٹی کا بہت اہم ورکر نما لیڈر تھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ تم لوگ کوثر نیازی کو گالیاں دے رہے ہو۔ مارشل لاء والوں کو کچھ نہیں کہہ رہے ہو۔ تم لوگ بھٹو کے لئے سڑکوں پر نہیں نکلتے ہو۔ چلو آج ہی جلوس نکالو۔ آؤ سڑکوں پر چلیں فوجی گاڑیاں جلائیں فوجیوں کی گردنیں اڑائیں اور بھٹو کو چھڑائیں۔ آگ لگے تمہارے عہدوں کو تمہاری کرسیوں کو جن پر تم لوگ بیٹھے ہو۔ سیاسی کارکنوں کو یاد رکھنا ہو گا کہ انتہا کا نعرہ دینے والے لوگ تمام ایماندارانہ جدوجہد کرنے والے لوگوں کو مشکل میں ڈال دیا کرتے ہیں۔ اس وقت فوج کی کوشش تھی کہ پارٹی کے ورکروں کو زیادہ سے زیادہ پکڑ کر جیل میں ڈال دے۔ جمیل اختر کی تقریر نے مجھے بے حد مشکل میں ڈال دیا۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ کیا یہ کام تم نے سرگودھا میں کیا ہے۔ وہاں تم نے جلوس نکالا ہے۔ اس کا جواب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ میری اس بات سے اجلاس میں جمع لوگوں کے جذبات میں کچھ کمی آ گئی جو بے حد مشتعل ہو گئے تھے۔ اس اجلاس

کے کچھ ہی عرصہ بعد یہی میاں جمیل اختر ایڈووکیٹ ضیاء حمایت تحریک سرگودھا کا ایک بڑا اہم عہدہ دار ثابت ہوا تھا۔

اجلاس کے بعد ہم پنجاب کے ایک نمائندہ پیپلز پارٹی کے وفد کی شکل میں بیگم صاحبہ کی مزاج پرسی کے لئے یو۔سی۔ایچ گئے۔ہم نے دیکھا کہ ان کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔مگر ان کا حوصلہ پہاڑ کی طرح قائم تھا۔وہ ہمارے اجلاس کی وجہ سے بہت خوش تھیں۔

پنجاب پارٹی کے ضلعی عہدہ داروں سے مل کر وہ بہت خوش ہوئیں۔خصوصاً ہماری قراردادوں کو پڑھ کر ان کو بہت خوشی ہوئی۔ان کو علم تھا کہ یہ تمام قراردادیں میں نے ہی تحریر کی ہوں گی۔اس لئے اکثر اپنے بیانات بیگم صاحبہ مجھ سے تحریر کروایا کرتی تھیں۔ان قراردادوں میں ایک لفظ زبان کے لحاظ سے غلط تحریر تھا۔وہ لفظ تھا''جاوے''معاملہ یوں ہوا تھا کہ میں نے جلدی جلدی میں قراردادیں تحریر کر کے چوہدری افضل سندھو کو دے دیں تھیں۔انہوں نے ان قراردادوں کو اپنے خط سے دوبارہ نمایاں انداز میں تحریر کیا تھا۔جہاں قرارداد کے آخر میں میں نے فوجی حکومت سے مطالبے کے انداز میں لکھا تھا کہ بھٹو صاحب کو رہا کیا جائے۔کارکنوں کو رہا کیا جائے۔کوڑوں کو ختم کیا جائے۔الیکشن کا اعلان کیا جائے۔بیگم صاحبہ پر حملہ کرنے والے پولیس کے غنڈوں کو گرفتار کیا جائے۔چوہدری افضل سندھو نے لفظ جائے کو بدل کر اپنی ڈکشن کے انداز میں جاوے تحریر کر دیا تھا۔بیگم صاحبہ جائے کو پنجابی انداز میں تحریر کئے گئے جاوے لفظ کو پڑھتے ہی مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔اب تم زبان کی غلطیاں بھی کرنے لگ گئے ہو شاعر۔میں خود بھی اس غلطی کو جان چکا تھا۔میں نے بیگم صاحبہ کو کہا کہ یہ جاوے افضل سندھو صاحب کی تخلیق ہے۔میرا اتنا کہنے پر وہ ہنس پڑیں اور انہوں نے ہر جگہ جاوے کو اپنے قلم سے جائے کر دیا۔مجھے افضل سندھو کی اس بات سے خوشی ہوئی تھی کہ انہوں نے بیگم صاحبہ کو کہا کہ یہ میں نے جاوے تحریر کیا ہے۔

بیگم صاحبہ کچھ تحریر کرنا چاہتی تھیں انہوں نے ہم سے قلم مانگا۔قلم ایس۔ایم۔مسعود کے پاس تھا۔وہ بیگم صاحبہ کو دیا گیا۔لکھ چکنے کے بعد بیگم صاحبہ نے قلم کی تعریف کی۔ان کو شاید قلم پسند آیا تھا۔میرا خیال تھا کہ مسعود شاہ کہے گا کہ یہ قلم آپ تحفہ سمجھ کر رکھ لیں۔مگر شاہ کا حوصلہ اتنا کہاں تھا کہ وہ ایسا کرتا۔اس نے شکریہ کہہ کر قلم ان کے ہاتھ سے واپس لے لیا۔

www.bhutto.org

مجھ پر مقدمہ تھا کہ میں نے کوثر نیازی کو دھمکیاں دی ہیں

پنجاب پیپلز پارٹی کا جو ہنگامی اجلاس جیل روڈ پر ہوا تھا۔ وہ اجلاس اصل میں مولوی کوثر نیازی کے قیادت کا جھگڑا پیدا کرنے کے خلاف بلایا گیا تھا۔ مولوی کوثر نیازی مسلسل بیان دیئے جا رہا تھا کہ پیپلز پارٹی ایک وراثتی پارٹی نہیں ہے کہ باپ کے بعد بیٹی کو پارٹی کی چیئرمین بنا دیا جائے۔ پارٹی کے چیئرمین کا فیصلہ سینٹر کمیٹی کرے گی۔ سینٹر کمیٹی کی اکثریت فوج کے ساتھ مل چکی تھی۔ جو پارٹی کے موقف کے ساتھ تھے وہ جیل میں ڈال دیئے گئے تھے۔ جیل سے باہر صادق حسین قریشی، حامد رضا گیلانی، کمال اظفر، حیات محمد ٹمن، غلام مصطفےٰ جتوئی اور ایک صاحب کوئی نون تھا وہ اور عبدالحفیظ پیرزادہ وغیرہ رہ گئے تھے۔ ان سب کا مولوی کوثر نیازی کے موقف کے ساتھ اتفاق تھا۔ اور مولوی کا موقف وہ تھا جو ضیاءالحق کا موقف تھا، فوج کا موقف تھا کہ پارٹی کی قیادت کو فوجی حکمرانوں کے ٹاؤٹوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اور بھٹو خاندان جن پر عوام اعتماد کرتے ہیں ان کو سیاست سے باہر کر دیا جائے۔ اور پاکستان پیپلز پارٹی کو ایک ناکارہ پارٹی بنا دیا جائے۔ اس کی انقلابی روح کو مسخ کر دیا جائے۔ کارکنوں کو جیلوں میں ڈال کر مایوس کر دیا جائے۔ تاکہ فوجی حکمرانوں کے لئے کوئی مشکل باقی نہ رہے۔

میں ان لوگوں میں سرفہرست تھا جو بھٹو خاندان کو پارٹی کی قیادت کے لئے ناگزیر تصور کرتا تھا۔ میں بیگم نصرت بھٹو کو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو پاکستان پیپلز پارٹی کی روح خیال کرتا تھا۔ اسی طرح میری طرح پارٹی کے دوسرے تمام صحیح اور سچے لوگ بھی صرف بیگم صاحبہ اور بی بی بے نظیر صاحبہ کو ہی پارٹی کی صحیح قیادت خیال کرتے تھے۔ لہٰذا پنجاب پارٹی کا یہ اجلاس تقریباً ان دونوں ماں بیٹی کی قیادت کو پارٹی کے لئے مسلمہ بنانے کے اعلان کرنے کے مترادف تھا۔ جس میں پارٹی کے باہر موجود تمام سینئر لوگوں نے شرکت کی تھی اور پارٹی کی متفقہ قرارداد بیگم صاحبہ اور محترمہ بے نظیر صاحبہ کی قیادت کے حق میں منظور کی گئی تھی۔

مجھے چونکہ اس اجلاس میں مرکزی تقریر کرنا تھی لہٰذا میری تقریر کا مرکزی نکتہ ہی مولوی کوثر نیازی کی غداری تھا۔

اس اجلاس سے پہلے میں نے مساوات میں مولوی کے خلاف ایک نظم نما غزل شائع کی

تھی۔غزل کے چند شعر ملاحظہ کریں۔واضح رہے کہ اس غزل کا مرکزی نکتہ محترمہ بے نظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو تھیں۔

یہ مصلحت نہیں خواہش دل و نظر کی ہے
ہمیں پسند قیادت ہی اس کے گھر کی ہے
میں اس کو کیوں نہ کہوں فخرِ انقلاب و جہاد
وہ جس نے اپنی ردا اپنے خوں سے تر کی ہے
دہانِ زخم سے پھوٹا ہے جن کے رنگِ شفق
انہیں نوید کہ یہ روشنی سحر کی ہے
وہ جس کا سایہ بھرے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے
یہ شاخِ گل بھی تو آخر اسی شجر کی ہے
مقامِ شوق خرد سے نہیں ہوا تسخیر
کٹا کے سر کو یہ منزل جنوں نے سر کی ہے
یہ قطرہ قطرہ کہیں سیلِ خوں نہ بن جائے
کہ زخم عشق سے حالت بری جگر کی ہے
خدا ہی جانے کہ اسکا معال کیا ہوگا
کہ ابتدا ہی بڑے خوں چکاں سفر کی ہے

ملٹری کورٹ اور میرا مقدمہ

مجھے لاہور کیمپ جیل سے لارنس روڈ ملٹری کورٹ میں پیش کیا گیا۔اتفاق سے اس دن پاکستان کے معروف و مشہور صحافی جناب سید عباس اطہر اور ہمراز احسن کو بھی اسی ملٹری کورٹ میں پیش کیا گیا تھا جہاں مجھے ٹرائل کیا جا رہا تھا۔سید عباس اطہر پر بھی اسی ملٹری کورٹ میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ملٹری کورٹ میں پولیس کا ایک سب انسپکٹر مجھ پر لگائے گئے الزامات کی تفصیل پڑھ کر ملٹری کورٹ کے میجر کو سنا رہا تھا جس کو پریذیڈنٹ آف کورٹ کہا جاتا تھا۔میرے خلاف بنائے گئے مقدمے میں درج تھا کہ میں نے مولوی کوثر نیازی کو راس پوٹین کہا ہے۔دلال کہا ہے۔

www.bhutto.org

آستین کا سانپ کہا ہے۔ بدزبان اور بدلگام کہا ہے۔ میں نے کوثر نیازی کو دھمکی دی ہے کہ تمہاری داڑھی نوچ لی جائے گی۔ تمہاری زبان کھینچ لی جائے گی۔ اس کی آنکھیں نکال لی جائیں گی۔ اس کو شیطان، مکار اور عبداللہ بن ابی کہا ہے۔ دوکوڑی کا مُلاں کہاں ہے۔ مخبر اور ٹاؤٹ کہا ہے۔ امریکہ کا اور سامراج کا ایجنٹ کہا ہے۔ میں نے اجلاس میں اس پر بے شمار لعنت کے نعرے لگوائے ہیں اور بیگم نصرت بھٹو کو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو پارٹی کی قیادت قرار دیا ہے اور مُلاں نیازی نامنظور کہا ہے وغیرہ وغیرہ۔

جب پولیس کا سب انسپکٹر میرے خلاف لگائی گئی چارج شیٹ ختم کر چکا تو اس کے بعد ملٹری کورٹ کے جج میجر نے مجھے کہا کہ تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا کہ بالکل میں اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ پولیس افسر نے کہا تھا کہ یہ تمام باتیں اس نے خود اپنے کانوں سے سنی تھیں۔ اس لئے کہ وہ خود اس اجلاس میں سفید کپڑوں میں موجود تھا۔ میں نے پولیس کے اس سب انسپکٹر کو کہا کہ تم نے کہا ہے کہ تم خود اس اجلاس میں موجود تھے۔ اس نے کہا کہ ہاں میں خود اس اجلاس میں موجود تھا۔ میں نے کہا کہ اجلاس کی تمام رپورٹ بھی تم نے خود لکھی تھی۔ اس نے کہا کہ ہاں میں نے خود لکھی تھی۔ میں نے سوال کیا کہ اس ایف۔آئی۔آر یا چارج شیٹ میں تم نے جو کچھ لکھا ہے یہ تم نے خود لکھا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے خود لکھا ہے۔ میں نے سوال کیا کہ اس کے علاوہ میرے خلاف اور کوئی بات ہے یا یہی کچھ ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ بس یہی کچھ ہے جو میں نے بیان کر دیا ہے۔

میں نے میجر کو کہا کہ یہ لکھ لیا جائے کہ اس چارج شیٹ کے علاوہ مجھ پر اور کوئی الزام نہیں ہے۔ میں نے سب انسپکٹر سے سوال کیا کہ کیا مولوی کوثر نیازی پاکستان کی بری فوج کا جرنیل ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ جرنیل نہیں ہے۔ میں نے سوال کیا کہ بریگیڈیئر ہے یا کرنل ہے یا میجر ہے یا کیپٹن ہے۔ اس کا جواب تھا کہ نہیں وہ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے سوال کیا کہ کیا وہ پاکستان کی ہوائی فورس کا ہوائی فوج کا ایئر چیف ہے یا سکواڈرن لیڈر ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ہوائی فوج کا بھی کوئی افسر وغیرہ نہیں ہے۔ میں نے سوال کیا کہ کیا وہ پاکستان کی نیوی کا ایڈمرل ہے یا کمانڈر ہے۔ اس نے کہا کہ وہ نیوی کا کچھ افسر نہیں ہے۔ اس کا فوج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے سوال کیا کہ مولوی کوثر نیازی پھر کون ہے۔ انسپکٹر خاموش ہو کر میجر کی طرف

دیکھنے لگ گیا۔ میجر نے مجھ پر رعب ڈالتے ہوئے کہا کہ تم کو نہیں پتہ کہ مولوی کون ہے۔ میں ابھی میجر کی اس بات کا جواب دینے ہی والا تھا کہ سید عباس اطہر اپنی روایتی جرأت سے بول پڑا۔ انہوں نے میجر کو کہا۔ تم جج بنے ہوئے ہو تو عدالت چلانے کا طریقہ بھی سیکھو۔ اس نے تمہارے سرکاری گواہ کی ہر بات کا جواب دیا ہے۔ اب اس کو بھی گواہ سے پوچھنے کا حق دو۔ جب تک اس بات کا فیصلہ نہ ہو جائے کہ مولوی کون ہے۔ آپ اسلم گورداسپوری پر کس طرح مقدمہ چلا سکتے ہیں۔ اس مقدمے میں اگر آپ اس کو سزا دیں گے تو تمہارا مخبر کوثر نیازی ننگا ہو جائے گا۔ وہ پھر تمہارے کام کا نہیں رہے گا۔

سید عباس اطہر کی جرأت مندانہ مداخلت پر میجر کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ وہ کچھ نرم پڑ گیا۔ میں نے اپنا سوال پھر دہرایا کہ بتاؤ تھانے دار صاحب مولوی کوثر نیازی کون ہے۔ کہنے لگا کہ وہ ایک لیڈر ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کس پارٹی کا لیڈر ہے۔ کہنے لگا کہ پیپلز پارٹی کا لیڈر ہے۔ میں نے سوال کیا کہ جس اجلاس کی رپورٹ آپ نے پیش کی ہے وہ کس پارٹی کا اجلاس تھا۔ کہنے لگا پیپلز پارٹی کا اجلاس تھا۔ میں نے سوال کیا کہ میرا کس پارٹی کے ساتھ تعلق ہے۔ کہنے لگا پیپلز پارٹی کے ساتھ۔ میں نے میجر کو کہا کہ میجر صاحب یہ تو ہماری پارٹی کا مسئلہ ہے۔ میں اپنی پارٹی کے کسی لیڈر کے خلاف اگر بات کرتا ہوں تو اس کا نوٹس تو میری پارٹی کو لینا چاہئے۔ اگر کوثر نیازی کو میں نے گالیاں دی ہیں تو اس کا ایکشن پیپلز پارٹی کو لینا چاہئے۔ اس کا ایکشن آپ کیوں لے رہے ہیں۔ نہ تو کوثر نیازی فوج سے تعلق رکھتا ہے اور نہ ہی پولیس سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ کو میرے خلاف مقدمہ چلانے کا کیا حق ہے۔ میں نے آپ کے تو کسی افسر کے خلاف کچھ کہا ہی نہیں ہے۔ آپ خود کہہ چکے ہیں کہ کوثر نیازی کا فوج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے میجر کو کہا کہ کیا کوثر نیازی نے آپ کی عدالت میں درخواست دی ہے کہ میں نے اس کو دھمکیاں دی ہیں۔ میجر نے کہا کہ کوئی درخواست نہیں دی۔ میں نے کہا پھر آپ نے مجھ پر مقدمہ کیوں بنایا ہے۔ میجر نے کہا کہ اس مقدمے کا فیصلہ اگلی تاریخ کو کیا جائے گا۔ جب میں ملٹری کورٹ سے باہر آیا تو سید عباس اطہر نے مجھے گلے ملتے ہوئے کہا کہ تم نے آج مُلاں کی کمر سے کپڑا اٹھا دیا ہے۔ یہ تمہیں سزا نہیں دیں گے۔ اگر تمہیں سزا دیں گے تو یہ ننگے ہو جائیں گے۔ ان کا تمام کام خراب ہو جائے گا جو یہ پارٹی کے اندر کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے دن مساوات اخبار نے یہ تمام کارروائی حرف بہ حرف جلی حروف

میں شائع کردی۔ جیل کے اندر اور جیل سے باہر ہر شخص کی زبان پر ایک ہی مذاق نما بات تھی یا سوال تھا کہ کیا مولوی کوثر نیازی بری فوج کا کمانڈر انچیف ہے۔ ہوائی فوج کا کمانڈر ہے یا نیوی کا کمانڈر ہے۔ میرا مقدمہ ایک طرح کا مذاق بن گیا تھا۔ میں سید عباس اطہر کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس وقت ملٹری کورٹ میں میرا حوصلہ بڑھایا تھا۔ وگرنہ اس وقت تو لوگ فوج کے خوف سے دم نہیں مارتے تھے۔

نوٹ: مجھے اس وقت بے حد صدمہ پہنچا تھا جب محترمہ بے نظیر بھٹو نے کوثر نیازی کو نو ڈیرو بلا کر اس سے بھٹو صاحب کے بارے میں تقریر کروائی تھی۔ میں نے بڑے دکھ بھرے انداز میں نظم تحریر کی تھی۔ جس کے آغاز کا بند ہی آج مجھے یاد آرہا ہے۔ میں نے محترمہ بے نظیر کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

مان جا سانپ ہے
اس سے نہ بڑھا
رسم وفا
یہ تری
روح کو ڈس لے گا
اسے پیار نہ کر

(شاید یہ باتیں 1997ء کی ہیں)

ملک معراج خالد کا جیل سے گورنر کو خط

ملٹری کورٹ کے باہر مجھے چوہدری انور عزیز ملا۔ انہوں نے مجھے دھمکی آمیز لہجے میں ملک معراج خالد کے لئے پیغام دیا۔ ملک معراج خالد کا نام بگاڑتے ہوئے پنجابی میں کہا۔ ماجے نوں کیہ دئیں گورنر سوار خان نال گل ہوگئی اے تے بندہ بن جائے۔ چوہدری انور عزیز گجر تھے اور سوار خان بھی گجر تھا۔ چوہدری صاحب کے ان کے ساتھ بہت تعلقات تھے۔ میں نے چوہدری انور عزیز کا پیغام ملک معراج خالد کو پہنچا دیا۔ صرف اتنا کہا کہ گورنر سے بات ہوگئی ہے۔ بندہ بن جانے والی بات حذف کردی۔ اس پیغام سے پہلے ملک صاحب کئی دن سے گورنر کو خط تحریر کرنے

www.bhutto.org

کی بات کیا کرتے تھے۔ جس کو جیل میں موجود ہمارے دوست پسند نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر ماڈل ٹاؤن کے سردار مظہر خان اس بات کے سخت خلاف تھے۔ مگر ملک صاحب کا کہنا تھا کہ پولیس پارٹی ورکروں پر باہر تشدد کر رہی ہے۔ جیلوں میں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جا رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا انہوں نے ایک شکایت نما خط گورنر کو تحریر کر کے سپرنٹنڈنٹ جیل کو دے دیا۔ جس کی وجہ سے جیل کے اندر دوستوں میں خط کے بارے میں اچھا تاثر پیدا نہ ہوا۔ جیل میں اس وقت ملک شاہ محمد محسن مرحوم، ڈاکٹر یعقوب، ڈاکٹر انور سجاد جیل کے ہسپتال میں داخل تھے۔

کیمپ جیل لاہور ان دنوں پیپلز پارٹی لاہور کے لیڈروں اور ورکروں سے بھری پڑی تھی۔ ہم تمام لوگ جیل کی ایک وسیع ترین بیرک میں قید تھے جس کی دو منزلیں تھیں ان گرفتار شدگان میں میری یادداشت کے مطابق ایس۔ ایم۔ مسعود، پروفیسر مبارک حیدر، چوہدری ظفر اقبال، ملک سعید حسن، شیخ رفیق احمد، میاں احسان، چوہدری غلام قادر مرحوم، سردار مظہر علی خان، شیخ رشید صاحب کے بیٹے شیخ اشفاق احمد، مرزا اکرم بیگ، ملک شاہ محمد محسن ان کا بیٹا شوکت علی، شیخ ظفر لنڈے والا، شیخ تاجدین، روف خان، ملک عارف اعوان، ملک مشتاق اعوان اور لاہور کے صحافی حضرات میں بابا ظہیر کاشمیری، بدرالدین بنگالی، سید عباس اطہر، ہمراز احسن اور خالد چوہدری قید تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ دوست ہوں گے مگر اس وقت مجھے ان کے نام یاد نہیں آرہے۔

حکومتی آرڈر تھا بھٹو صاحب کو سزا سنائی جانے والی ہے

ہم تمام کو فوجی حکومت نے جب گرفتار کیا تو ہماری گرفتاری کے وارنٹ پر حکومت پنجاب کی طرف سے تحریر کیا گیا تھا کہ چونکہ لاہور ہائی کورٹ سے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی جانے والی ہے۔ ان تمام لوگوں پر حکومت کو شک ہے کہ یہ اس سزا کے خلاف کوئی ہنگامہ وغیرہ برپا کریں گے یعنی نقصِ امن پیدا کریں گے۔ لہٰذا ان لوگوں کو تین ماہ کے لئے نظر بند کیا جاتا ہے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ کا یہ حکم اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ وزیراعظم بھٹو کی سزا کے معاملے میں عدالت محض ایک ڈھونگ کے طور پر کام کر رہی تھی وگرنہ بھٹو صاحب کی سزا کا فیصلہ عدالت سے باہر فوجی حکمران کر چکے تھے۔ مولوی مشتاق تو اس سزا کو عدالتی رنگ دینے کا کام کر رہا تھا۔ حکومت کے اس حکم سے جنرل ضیاء الحق اور اس

www.bhutto.org

کے ساتھی جنرلوں کے عزائم کھل کر پوری دنیا کے سامنے آ گئے تھے۔ لاہور ہائی کورٹ میں ابھی بھٹو صاحب کے مقدمے کا فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا کہ انتظامیہ نے اعلان کر دیا تھا کہ بھٹو صاحب کو سزا ہونے والی ہے۔ بیگم نصرت بھٹو نے حکومت کے ان احکامات کو پوری دنیا کے اخبارات میں نشر کروا دیا۔ انہوں نے لاہور میں پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں کو حکومت کی اس سازش سے آگاہ کیا۔ مساوات اخبار نے حکومت کا یہ حکم نامہ پہلے صفحے پر شائع کر کے بھٹو صاحب کے معاملے میں حکومت کے انصاف کے ڈھول کا پول کھول دیا تھا۔ پوری دنیا پر حکومت کی بدنیتی واضح ہو گئی تھی۔

بیگم نصرت بھٹو نے عدالتِ اعظمیٰ میں درخواست دے کر اپنے موقف کی وضاحت کی کہ عدالت نے ابھی مقدمے کا فیصلہ ہی نہیں کیا اور فوجی حکومت نے اپنے حکم کے ذریعے فیصلے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کے بعد عدالت کا کوئی تقدس باقی نہیں رہ جاتا۔

بیگم صاحبہ کی عدالتی کارروائی اور اخبارات میں اس مسئلے کی تشہیر سے حکومت کا پوری دنیا میں منہ کالا ہو گیا تھا۔ مگر فوجی حکومت جو ضیاء الحق جیسے بے شرم انسانوں کی حکومت تھی۔ اس نے اپنے اس حکم کو تبدیل کر کے ہم تمام قیدیوں کے گرفتاری کے نئے احکامات جاری کر دیئے۔ اب ان نئے احکامات کو ہم سے وصول کراتا تھا۔ لہٰذا ان احکامات کو ہم گرفتار شدگان کو دینے کا بے حد شرمناک طریقہ اختیار کیا گیا۔ وہ طریقہ سراسر ایک طرح کی دہشت گردی کا طریقہ تھا۔ فوجی حکمرانی کے فاشزم کا طریقہ تھا۔ جس کو آپ آگے ملاحظہ کریں گے۔

ملک سعید حسن کے ساتھ دلچسپ گفتگو

جیل انتظامیہ نے پولیس کمانڈوز کی موجودگی میں ہم تمام گرفتار شدگان کیمپ جیل کو رات تین بجے ہماری جیل کوٹھڑیوں سے ہم کو جگا کر سیدھے قطار میں کھڑے ہو جانے کا حکم دے دیا۔ ہم سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ اور یہ سب کچھ مسلح طریقے کے ساتھ ہم سے کرایا گیا۔ ہم سے کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس طریقے سے جیل میں بڑی خوف و ہراس کی صورتِ حال پیدا کی گئی اور ہم تمام قیدیوں کو پریڈ کے انداز میں ڈیوڑھی کی جانب چلنے کو کہہ دیا گیا، اور سپاہی بندوقیں تان کر ہمارے ساتھ چلنے لگ گئے۔ میرے آگے ریٹائرڈ جسٹس ملک سعید حسن چل رہے تھے۔

اس وقت ان کا جیل میں آنے کا شاید یہ پہلا تجربہ تھا۔ کچھ ہی دن پہلے وہ لاہور ہائی کورٹ کے آنرایبل جج تھے اور اس رات وہ صرف ایک قیدی تھے۔ ملک صاحب بے حد دلچسپ انسان ہیں اور بے حد سادہ آدمی ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ اسلم گورداسپوری بائی داوے یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کہاں کی شرافت ہے فوجی حکمرانوں کی کہ آدھی رات کو ہم کو جنگی قیدیوں کی طرح قطار میں چلایا جارہا ہے۔ آخر یہ لوگ ہم سے کرنا کیا چاہتے ہیں۔ ملک صاحب جب یہ الفاظ کہہ رہے تھے اس وقت ہم جیل کی ڈیوڑھی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے ملک صاحب سے مذاق کرنے کے انداز میں جواب دیا کہ یہ لوگ ہم سے وہی کچھ کرنا چاہتے ہیں جو فوجی حکومت انقلابی لوگوں کے ساتھ کیا کرتی ہیں۔ ملک صاحب فرمانے لگے۔ بائی داوے کیا کیا کرتی ہیں۔ میں نے کہا فریڈم فائٹرز کو گولی مار دیا کرتی ہیں۔ ان پر الزام لگا دیا جاتا ہے کہ یہ جیل توڑ کر بھاگنا چاہتے تھے۔ میری یہ بات کہنا تھی کہ ملک صاحب نے بلند آواز سے کہنا شروع کر دیا۔ شاعر صاحب ملک سعید حسن ایک جمہوریت پسند انسان ہے۔ آئین پسند انسان ہے۔ میرا انقلاب وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ انقلاب شنقلاب کا معاملہ تم لوگوں کا ہے۔

ملک صاحب کی باتوں سے تمام لوگ ہنسنے لگ گئے۔ ماحول کی وہ تمام پُراسرار خاموشی ختم ہوگئی۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے ملک صاحب کو ڈیوڑھی کے اندر چلنے کا کہا اور ان کو بتایا کہ ملک صاحب ہم نے صرف پہلے آرڈر کو تبدیل کر کے آپ لوگوں کی نئے احکامات کے تحت گرفتاری ڈالنی ہے۔ اس طرح حکومت نے ہمارے پہلے گرفتاری کے احکامات منسوخ کر کے ہم سب کو نئے احکامات کے تحت جیل کی ڈیوڑھی میں ہی گرفتار کر کے دوبارہ واپس ہماری بیرک میں لاکر ہم کو قید کر دیا۔

ملک سعید حسن کا ذکر آیا ہے تو ان کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ملک صاحب وہ واحد انسان تھے جنہوں نے وزیراعظم بھٹو کے مقدمے کے خلاف اور ان کے ساتھ کی جانے والی ریاستی دہشت گردی کے خلاف عملی طور پر احتجاج کرتے ہوئے لاہور ہائی کورٹ کی جج شپ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس طرح کے کردار کا مظاہرہ ہمارے معاشرے میں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ملک سعید حسن اپنے اس عمل سے قومی تاریخ میں اعلیٰ انسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔

جیل میں مجھ پر خونی بواسیر کا حملہ

خونی بواسیر ایک ایسا موذی مرض ہے کہ اس کا تمام تر حملہ انسان کے عالمِ شباب میں ہوتا ہے۔ انسان کے جسم میں خون میں جتنی طاقت اور شدت ہوگی اس کا حملہ اتنا ہی شدید ہوگا۔ میں چونکہ بچپن سے ہی ورزش کرنے کا عادی تھا۔ میری جوانی میں میری بڑی مثالی صحت ہوا کرتی تھی۔ میرا اشمار ہمیشہ صحت مند لوگوں میں ہوتا رہا ہے۔ ان دنوں مجھ پر دو طرح کے تفکرات کا غلبہ تھا۔ ایک تو بھٹو صاحب سے مجھے دلی محبت تھی۔ مجھ سے ان کی وہ حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مکمل بے بسی کا عالم تھا۔ میں چونکہ بے حد حساس انسان تھا۔ میری حساسیت میرے اس مرض کی اُٹھان کے لئے بڑی معاون ثابت ہو رہی تھی۔ دوسری بات جو اس بیماری میں اضافہ کر رہی تھی میرے نکاح اور شادی کا مسئلہ تھا۔ میری بے وقت گرفتاری کی وجہ سے کئی لوگ تکلیف میں مبتلا تھے۔ خاص طور پر میرے سسرال والوں کی حالت میری وجہ سے زیادہ ہی پریشان کن تھی۔ لہٰذا اس معاملے کا بھی میرے ذہن پر بہت بوجھ تھا۔ خونی بواسیر کا موذی مرض ذہنی پریشانی کے عالم میں اپنے شباب پر آجاتا ہے۔ جیل میں مجھ پر اس کا اتنا شدید حملہ ہوا کہ خون ہی تھمنے کو نہیں آتا تھا۔ جیل کے ہسپتال میں ہمارے دو ڈاکٹر ساتھی ڈاکٹر یعقوب اور ڈاکٹر انور سجاد اپنے علم و فن کا ہر نسخہ آزماتے رہے۔ مگر صورتِ حال قابو میں ہی نہیں آرہی تھی۔ ملک معراج خالد صاحب بھی جیل کے ہسپتال میں اپنا علیحدہ حکمت خانہ چلائے ہوئے تھے۔ ''مگر ان سے بھی میرے درد کا درماں نہ ہوسکا'' ابھی یہ ہمارے ڈاکٹر اور طبیب مجھ سے ہی فارغ نہیں ہوئے تھے کہ آدھی رات کو ایک اور مریض خوش خوراک کی جیل کے ہسپتال میں آمد ہوگئی۔

مریض خوش خوراک شیخ رفیق احمد صاحب

شیخ صاحب انتہا کے خوش خوراک تھے۔ ان کے کھانے کی کوئی لمٹ نہیں تھی وہ جتنا چاہیں کھا سکتے تھے۔ سیاسی جیلیں جہاں ہم سیاسی قیدیوں کے لئے ایک اذیت کا باعث ہوتی ہیں وہاں اگر قیدیوں کی تعداد زیادہ ہو تو وہ ایک میلے کا یا پکنک کا سماں بن جاتا ہے۔ ایسے عالم میں ہمارے کھانے پینے میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو جاتا۔ کھانے پینے میں اضافہ ہونے کی وجہ کھانے کی

www.bhutto.org

بہتات بن جاتی ہے۔ ہر قیدی کے گھر سے کھانا آ جاتا ہے۔ خاص طور پر جیل میں جو ملاقات کا دن ہوتا ہے وہ دن تو ایک طرح کی دعوتِ شیراز کا دن ہوتا ہے۔ اس دن ہر سیاسی قیدی کے گھر سے بہتر کھانا آ جاتا ہے اور اگر سیاسی کارکنوں کی قسمت اچھی ہو ان کے ساتھ اگر کوئی بڑا لیڈر ہو یا کوئی سرمایہ دار قسم کا سیاست دان قید ہو تو جیل کا ماحول کھانے پینے کے معاملے میں نعمت کدہ کا ماحول بن جاتا ہے۔ جس رات شیخ صاحب ہسپتال باقاعدہ اُٹھا کر پہنچائے گئے تھے وہ دن ملاقات کا دن تھا۔ ہمارے کسی ساتھی کے گھر سے کوفتوں کا بڑے سائز کا دیگ نما دیگچہ آ گیا تھا۔ کوفتوں کے علاوہ بھی کھانا وافر مقدار میں آ گیا تھا۔ رائے عامہ نے فیصلہ کیا کہ کوفتے کل صبح کھائے جائیں گے تاکہ دوسرے کھانے کو ختم کیا جا سکے۔ لہٰذا کوفتوں کا دیگچہ شیخ صاحب کے سیل میں ان کی چارپائی کے قریب رکھوا دیا گیا۔ یا رکھوا لیا گیا۔ سب لوگ تو کھانا کھا کر سو گئے۔ مگر شیخ صاحب کوفتوں کا بار بار امتحان کرتے رہے۔ وہ کوفتے بڑے گوشت کے قیمے کے تھے۔ ایک کوفتے کا وزن تقریباً آدھ پاؤ کے برابر تھا۔ شیخ صاحب رات گیارہ بجے تک ان کی اپنی گنتی کے مطابق 16 عدد کوفتے چکھنے کے طور پر کھا چکے تھے۔ اس طرح وہ تقریباً پانچ چھ کلو بڑا قیمہ کھا گئے۔ اس کے علاوہ دوسرا کھانا بھی اپنی بساط کے مطابق انہوں نے کھایا ہوا تھا۔ لہٰذا اس بسیار خوری کے تصادم نے رات گیارہ بجے کے قریب ان کی حالت خراب کر دی۔ آدھی رات کو وہ جیل کے ہسپتال میں ہمارے پاس پہنچا دیئے گئے۔ وہاں دو ڈاکٹروں نے اور ایک طبیب ملک معراج خالد نے ان کا علاج شروع کر دیا۔ ان کا معدہ اس قدر فولادی تھا کہ کوئی دوائی ان پر اثر نہیں کر رہی تھی۔ ملک معراج خالد نے بقول ان کے شیخ صاحب کو جس مقدار میں پودینے کی چٹنی بنا کر کھلائی تھی ان کا کہنا تھا کہ اتنی مقدار ایک سنڈے کی موک بند کر سکتی ہے۔ بے شمار دوائیوں اور اَن گنت ٹوٹکوں کے علاج سے شیخ صاحب کو تقریباً تین بجے رات کے قریب جا کر افاقہ ہوا۔ ان کو نیند آ گئی اور ہم لوگ بھی سو گئے۔

میرا اپریشن

میری حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ میں خود چل کر جیل کی ڈیوڑھی میں کھڑی پولیس کی گاڑی تک نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے شاہیا پہلوان کا بیٹا چھبی اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر آیا۔ میو ہسپتال

www.bhutto.org

میں مجھے داخل کرا دیا گیا۔ یہاں پولیس کے غیر انسانی رویے کے ساتھ ہسپتال کے عملے اور ڈاکٹروں کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ پولیس والے مصر تھے کہ مجھے بیماری کے بیڈ پر ہتھکڑی لگا کر بیٹھیں گے مگر عملے نے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا بلکہ ان کو وارڈ سے باہر بیٹھنے کے لئے کہا۔ پہلی رات یہ سمجھوتا ہو گیا کہ یہ پلنگ کے ساتھ میری کڑی کو مقفل کر دیں اور خود وارڈ کے دروازے سے باہر بیٹھیں۔ اس طرح مجھے پلنگ کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ میری پلنگ کے ساتھ بندھے کی تصویر مساوات میں شائع ہوگئی۔ لوگ مجھے اس حالت میں دیکھنے کے لئے ہسپتال آنا شروع ہو گئے۔ اخباروں میں میری رہائی کے لئے بیانات آنا شروع ہو گئے۔ ملٹری کورٹ میں میرا مقدمہ ویسے بھی مارشل لاء کے کسی ضابطے میں نہیں آتا تھا۔ لہٰذا ملٹری کورٹ نے میری بیماری کی وجہ سے میرا مقدمہ ختم کر دیا اور مجھے آزاد کر دیا گیا۔

میرے اپریشن کے دوران میرے ڈاکٹر پروفیسر گردیزی سرجن جب میرا اپریشن کر رہے تھے تو انہوں نے مجھے کہا کہ آپ لوگ شعر کس طرح کہتے ہیں۔ اپریشن کے دوران میرا نیچے والا جسم کا حصہ سن کر دیا گیا تھا باقی مجھے ہر طرح کا ہوش تھا۔ میں نے سرجن گردیزی کے لئے فی البدیہہ شعر کہا جس کو انہوں نے بہت پسند کیا اور لکھوا کر اپنے کمرے میں دیوار پر لگا دیا۔ شعر تھا۔

ان کی تکلیف میں ہو کیوں تیزی
ہوں معالج ہی جن کے گردیزی

میری وقتی طور پر خوش قسمتی تھی کہ مجھ پر بنائے گئے مقدمہ میں جیسا کہ پہلے کہا گیا کوثر نیازی کو گالیاں اور دھمکیاں دینے کا الزام تھا۔ جس پر مارشل لاء کی کوئی دفعہ نہیں لگ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ہسپتال کی رپورٹ بھی ملٹری کورٹ میں پہنچ گئی تھی جس کے مطابق مجھے تین ماہ کے لئے مکمل طور پر صاحب فراش رہنا تحریر تھا۔ جس کی وجہ سے میرے مقدمے کو خارج کر کے مجھے رہا کر دیا گیا۔ میری آزادی کے بعد مجھ پر لگائی گئی پولیس ہسپتال سے چلی گئی اور میں ایک آزاد شہری کی طرح اپنا علاج کرانے میں مصروف ہو گیا۔

19 مارچ 1978ء کو بھٹو صاحب کو سزا سنا دی گئی

میں ابھی میو ہسپتال میں زیرِ علاج ہی تھا کہ 19 مارچ کو بھٹو صاحب کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ بھٹو صاحب کی اس سزا کی قلعی تو پہلے ہی کھل چکی تھی جب پنجاب حکومت کی انتظامیہ نے

www.bhutto.org

پیپلز پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں کی گرفتاری وارنٹ پر تحریر کر دیا تھا کہ ان لوگوں کو اس لئے گرفتار کیا جا رہا ہے کہ ان سے بھٹو صاحب کو سنائے جانے والی سزا کے خلاف احتجاج کا خطرہ ہے۔لہٰذا اس مقدمہ میں عدالت تو ایک ڈھونگ اور دیکھاوا تھی۔سزائے موت کا فیصلہ تو فوجی جنتا کا تھا۔عدالتی کارروائی تو صرف وزیراعظم بھٹو کو ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچانے کے لئے اور ان کی توہین اور تضحیک کرنے کے لئے کی گئی تھی۔جو تضحیک اور توہین تاریخ میں عدالتوں میں ہر بڑے انسان کے ساتھ کی گئی ملتی ہے۔مگر مولوی مشتاق کی عدالت کا فیصلہ ایک انتقامی فیصلہ تھا۔

اس سزا کے خلاف پاکستان کے تمام شہروں میں غریب سیاسی کارکنوں نے سڑکوں پر نکل کر احتجاج کیا۔فوج نے ہر شہر کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ہر شہر کی سڑکوں پر فوج گشت کر رہی تھی۔فوجی گاڑیوں پر بندوقوں سے لے کر چھوٹی توپیں تک نصب تھیں۔جس کے منہ عوام کی جانب تھے۔اس کے علاوہ پولیس ہر شہر میں ہر بڑی شاہراہ پر چوکس کھڑی کر دی گئی تھی۔لوگوں کو اس قدر خوفزدہ کر دیا گیا تھا کہ لوگ بڑی سڑکوں پر سے گذرنے میں کتراتے تھے۔

ہسپتال میں چھوٹے درجے کے ملازمین مجھے بتاتے تھے کہ شہر میں خوف و دہشت تاری ہے۔اس تمام فوج کشی کے باوجود پیپلز پارٹی سیاسی کارکنوں نے ہر شہر میں اپنے قائد کے خلاف کی گئی سازش کے خلاف جلوس نکالے۔جنرل ضیاءالحق کا ماتم کیا۔اس کو کتا کہا اور مارشل لاء اور ہائی کورٹ مردہ باد کے نعرے لگائے۔پاکستان کے تمام شہروں میں ان تمام کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا جو سڑکوں پر نکلے تھے اور پورے ملک میں ان کارکنوں کی پشت پر جیلوں میں جیلوں کے پالتو پہلوان کوڑے مار جلادوں سے 10 کوڑے فی کارکن مروائے گئے اور ان تمام کارکنوں کو ایک سال سزا با مشقت سنا دی گئی۔اس طریقے کے ساتھ بھٹو صاحب کی سزا کے بعد ورکروں کی سطح پر تقریباً تمام پیپلز پارٹی جیل میں ڈال دی گئی تھی۔

فوجی حکمرانوں کی دہشت گردی کی انتہا

جنرل ضیاءالحق کی بربریت سے پاکستان کی حالت ایک جنگل کی سی بن گئی۔جنرل ضیاء الحق ایک آدم خور درندے کی طرح ہر اس انسان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا جو وزیراعظم بھٹو کی رہائی کی بات کرتا تھا۔یا جو پاکستان میں جمہوریت کی بحالی اور صحافت کی آزادی کی بات کرتا

تھا۔کوئی عدالت کوئی آئین کوئی قانون جنرل ضیاء الحق کی وحشت ناکی اور اس کے ظلم و جبر کی راہ میں حائل نہیں تھا۔ضیاء الحق کی حکمرانی مکمل طور پر ایک دہشت گردی کی حکمرانی تھی۔ پاکستان میں کوئی طاقت اس کا ہاتھ روکنے والی موجود نہیں تھی۔امریکی سامراج اپنے اس کرائے کے قاتل کی پشت پناہ تھی۔ جس کی وجہ سے وہ پاکستان میں ننگا ہو کر ناچ رہا تھا۔فوجی درندے کی اس بربریت کے مقابل پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے۔جن کو جنرل ضیاء الحق کوڑے مار مار کر ہلکان ہو چکا تھا۔پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے بعد جنرل ضیاء الحق کو پاکستان کی صحافی برادری کی بے مثال قوت کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکستان کی یونین آف جرنلسٹ کے قائدین منہاج برنا، نثار عثمانی اور یونین کے عہدہ داروں اور صحافیوں نے جنرل ضیاء الحق جیسے ڈریکولا کے اپنی جدوجہد سے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔

صحافیوں کو الٹا لٹکا دوں

جنرل ضیاء الحق نے نثار عثمانی سے مخاطب ہو کر جرنلسٹوں کے ساتھ ایک ملاقات میں کہا کہ میرا بس چلے تو میں صحافیوں کو الٹا لٹکا دوں۔

نثار عثمانی کا جواب

نثار عثمانی جو یونین آف جرنلسٹ کے سیکرٹری جنرل تھے بہت مہین اور کمزور جسامت کے انسان دیکھنے میں دیکھائی دیتے تھے۔مگر اندر سے فولاد کا جگر رکھتے تھے۔انہوں نے جنرل ضیاء الحق کو جواب میں کہا کہ ہمارا بس چلے تو ہم جرنیلوں کو الٹا لٹکا دیں۔ جنرل ضیاء الحق اس غیر متوقع جواب پر ہکا بکا رہ گیا تھا۔

خالد چوہدری پر بم کیس بنا دیا گیا

ضیاء الحق کی دہشت گردی کی صحافیوں کے ساتھ چلائی گئی مہم کا پہلا شکار پیپلز پارٹی کے بانی کارکن اور پنجاب یونین آف جرنلسٹ مساوات یونٹ کے صدر کو بنایا گیا۔ خالد چوہدری پر 6 اپریل 1978ء کو بم کیس بنا دیا گیا۔خالد چوہدری پر بم کیس بنانے کا مقصد صحافت کی صنعت

کے کارکنوں اور صحافی برادری کے عہدہ داروں اور لیڈروں کو خوفزدہ کرنا تھا۔ ان کی آزادی صحافت کی تحریک کو ناکام بنانا تھا۔ خالد چوہدری کو شاہی قلعہ لاہور میں رکھا گیا تھا۔

خالد چوہدری کے خلاف بم کیس اعلیٰ سطح پر سازش کے تحت قائم کیا گیا

دھماکہ خیز مادہ فراہم کرنے والا

پولیس کا اپنا آدمی تھا

[illegible]

غیر قانونی ہے، وکیل صفائی کے دلائل

لاہور ۲۰ جون (اسٹاف رپورٹر) لاہور ہائیکورٹ کے مسٹر جسٹس گلباز خان نے روزنامہ مساوات کے اسٹاف رپورٹر اور پنجاب یونین آف جرنلسٹس مساوات یونٹ کے صدر مسٹر خالد رشید چوہدری کی نظر بندی کے خلاف رٹ درخواست کی سماعت کل تک ملتوی کر دی۔ آج درخواست دہندہ مسز الزبتھ چوہدری کے کونسل چوہدری اعتزاز احسن نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ نظر بند کے خلاف بم کیس پولیس نے اعلیٰ سطح پر ایک سازش کے تحت قائم کیا ہے کیونکہ جس شخص نے نظر بند کو لارڈز ہوٹل کے باہر پولیس کی موجودگی میں دھماکہ خیز مادہ

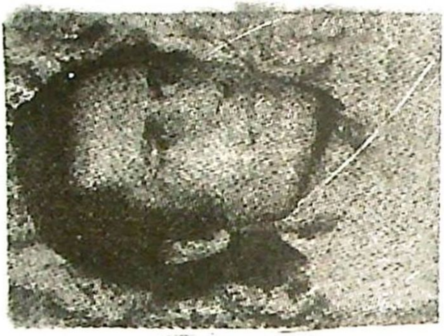

خالد چوہدری کے خلاف بم کیس اخباری عکس

www.bhutto.org

کوڑوں کی سزا کوڑے مارنے والوں کے لئے تازیانے ہیں

پی۔ ایف۔ یو۔ جے کے سیکرٹری جنرل نثار عثمانی نے ایمپلائز یونین آف جرنلسٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی کارکنوں اور صحافیوں کو کوڑے مارنا ایک شرمناک عمل ہے۔ فوجی حکمران جانوروں سے بدتر سلوک انسانوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ پی۔ ایف۔ یو۔ جے کے صدر منہاج برنا نے اپنے خطاب میں کہا فوجی جرنیل پاکستان کے عوام سے اپنی ڈھاکہ کی شکست کا انتقام لے رہے ہیں۔ واضح رہے کہ 12- جون کو نثار عثمانی اور منہاج برنا نے صحافیوں سے خطاب کیا تھا اور ان دونوں حضرات کو گرفتار کر لیا گیا۔

بزرگ صحافی منہاج برنا پر شراب کا مقدمہ

پی۔ ایف۔ یو۔ جے کے صدر منہاج برنا کو نہ صرف گرفتار کیا گیا بلکہ ان پر شراب کا مقدمہ بھی بنا دیا گیا۔ یاد رہے کہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں شراب پینے والے پر حدود کیس بنایا جاتا تھا۔ جس میں ایک تو کوڑوں کی سزا دی جاتی تھی دوسرا یہ مقدمہ ناقابلِ ضمانت ہوتا تھا۔ منہاج برنا پر شراب کا مقدمہ بنانا پاکستان کی صحافی برادری کی توہین کرنا تھا، اور منہاج برنا کو بدنام کرنا تھا، اور ایک بزرگ صحافی کی عزت سے کھیلنا مقصود تھا۔ یہ ایک انتہائی شرمناک حرکت تھی جو ضیاء الحق کی طرح کا کمینہ آدمی ہی کر سکتا تھا۔

منہاج برنا کے خلاف مقدمہ

گواہ سب انسپکٹر نے اپنے تحریری بیان کی صحت سے انکار کر دیا

مجھے شراب نوشی کا صرف شبہ تھا، یقین نہیں تھا

~~کراچی [illegible] (نمائندہ مساوات) اپیک اور پی~~ ایف یو جے کے سربراہ جناب منہاج برنا کے خلاف صدر تھانہ میں درج مبینہ شراب نوشی کے الزام میں درج مقدمہ کی سماعت کے دوران پولیس کے سب انسپکٹر قربان حسین نے آج عدالت میں پیش کردہ اپنے ہی تحریری بیان کے مندرجات کی صحت سے انکار کر دیا۔ صحافیوں اور وکلاء کی ایک بہت بڑی تعداد جن میں دوسری عدالت کے مجسٹریٹ بھی شامل تھے

منہاج برنا کے خلاف مقدمہ کا اخباری عکس

www.bhutto.org

خاور نعیم ہاشمی کو کوڑے لگائے گئے

اگر کوئی کہتا ہے کہ بھٹو صاحب کے خلاف بنائے گئے جھوٹے قتل کے مقدمے کے خلاف کوئی تحریک نہ چلی تو وہ غلط کہتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات درست نہیں ہوگی۔ بھٹو صاحب کی رہائی کے لئے زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے اداروں اور لوگوں نے بھرپور احتجاج کیا تھا۔ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹ اور آل پاکستان نیوز پیپر ایمپلائی یونین کی جانب سے مارشل لاء کے خلاف کھلا احتجاج کیا گیا تھا جس میں مساوات کے خاور نعیم ہاشمی، مسعود اللہ خان، الفتح کے ناصر زیدی، سن اخبار کے اقبال جعفری نے بہادری کے ساتھ گرفتاریاں پیش کی تھیں۔ ان تمام صحافی دوستوں پر 13 مئی 1978ء کی شام ملٹری کورٹ میں مقدمہ چلایا گیا۔ شام سات بجے ان کو دس کوڑے ایک سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی اور سزا سے ایک گھنٹہ بعد ان کو کوٹ لکھپت جیل لے جا کر رات 8 بجے کوڑے مار دیئے گئے۔ کوڑے مارتے وقت ان لوگوں کی پیٹھ پر کوئی کپڑا بھی نہیں باندھا گیا تھا۔

اس وقت جنرل ضیاء الحق اور اس کے ساتھی جرنیل ہر طرح کی احتجاجی تحریک سے بے حد خوفزدہ تھے۔ جنرل سوار خان بے حد بزدل آدمی تھا وہ چھوٹا سا جلسہ جلوس بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ان صحافیوں کا سڑک پر نکلنا اس کے لئے بہت خوفناک عمل تھا۔ لہٰذا بزدل فوجی جنتا لوگوں کو ڈرانے کے لئے انتہائی بربریت اور وحشت خیزی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ خاور نعیم ہاشمی اور ان کے ساتھی جرنلسٹوں کو بھٹو صاحب کے سیل کے احاطے کے ساتھ بنائے گئے کوڑے مارنے والے میدان میں کوڑے مارے گئے تھے۔ کوڑے کھانے والے دوستوں کے نعرے بھٹو صاحب تک صاف پہنچ رہے تھے۔ جس کی وجہ سے بھٹو صاحب رات بھر سو نہیں سکے تھے۔ صبح اٹھتے ہی انہوں نے اپنے مشقتی کو خاور نعیم ہاشمی، مسعود اللہ خان اور دوسرے ان کے ساتھیوں کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔ ان لوگوں کی بہادری پر ان کو مبارکباد کہی اور ان دوستوں کو کہا کہ ان کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔

جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ قائد عوام فخرِ ایشیا وزیراعظم بھٹو کے لئے ہر شعبۂ زندگی کے لوگوں نے احتجاج کیا تھا۔ جس کی بنا پر وکلاء کو کوڑے مارے گئے۔ صحافیوں کو کوڑے مارے گئے۔ مزدور لیڈروں کو کوڑے مارے گئے۔ طالب علم لیڈروں کو کوڑے مارے گئے۔ سیاسی کارکنوں کو کوڑے مارے

گئے۔ عام شہریوں کو کوڑے مارے گئے۔ وزیر اعظم بھٹو دشمن فوجی جنتا دنیا کی بدترین فوجی جنتا تھا۔ جس کی ذہنیت عہد غلامی کے سفاک قاتلوں سے ملتی تھی۔ جس کا طریقہ اقتدار قدیم رومن حکمرانوں کی طرح کا تھا۔ جو انسانی جسموں کو جلادوں اور خوں خوار بھیڑیوں سے چیر پھاڑ کروایا کرتے تھے۔

ملٹری کورٹ سے کوڑے کھانے والوں کے نام

جہانگیر بدر، میاں منیر احمد، پیر سید ناظم حسین شاہ، قیوم نظامی، حافظ غلام محی الدین، حاجی محمد طارق، محمد جاوید، احسان بٹ، چاچا غلام رسول، آغا مسعود قزلباش، مسعود کونسلر، محمد امین بھٹی لیبر لیڈر، روشن علی اور مزدور لیڈر الطاف حسین۔

بیگم صاحبہ اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی جدوجہد

وزیر اعظم بھٹو کی سزا کے بعد فوجی حکمرانوں نے ملک پر خوف و دہشت کا غلبہ طاری کر دیا تھا۔ اخبارات پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ مارشل لاء کے خلاف ایک حرف بھی تحریر کرنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ ہم کو مساوات کے صفحے خالی شائع کرنے پڑتے تھے۔ اس طرح کے ہو کے عالم میں بیگم صاحبہ نے چند لوگوں کو بلا کر مشورہ کیا کہ بھٹو صاحب کی صورت حال کو حالات کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہیئے کچھ نہ کچھ تھوڑا یا زیادہ ضرور کرنا چاہیئے اور مارشل لاء کی خلاف ورزی کر کے لوگوں کا خوف توڑنا چاہیئے تا کہ لوگ باہر نکل سکیں۔ فیصلہ کیا گیا کہ اندرون لاہور کسی مقام پر بھٹو صاحب کی سزا کے خلاف مذمتی جلسہ کرنا چاہیئے۔ اس معاملے میں بابا سوشلزم شیخ محمد رشید کی رائے بہت زیادہ شامل تھی۔ انہوں نے جیل سے پیغام بھیجا تھا کہ بھٹو صاحب کی رہائی کے مطالبے کو ایک تحریک بنا دینا چاہیئے۔ اندرون شہر پانی والا تالاب کے قریب شیخ رشید صاحب کے جیالے مرزا اکرم بیگ کے گھر جلسہ کرنا طے پا گیا۔ سیکرٹری جنرل پاکستان پیپلز پارٹی جنرل ٹکا خان کو مہمانِ خصوصی بنا کر جلسہ کر دیا گیا۔ مرزا اکرم بیگ کے گھر کے ہر طرف پولیس ہی پولیس جمع کر دی گئی۔ بہت تنگ بازار کے اندر مرزا کا گھر تھا۔ لاہور کے تمام بچے کھچے کارکن وہاں پہنچ گئے۔ کارکنوں کے دل میں بلا کا اشتعال تھا۔ وہاں پر تقریریں کی گئیں۔ میں نے بھی وہاں بڑے مشتعل انداز میں تقریر کی تھی۔ تقریریں کیا تھیں اعلانِ جنگ تھا۔ جنرل ضیاء الحق کا ماتم تھا سیا پا تھا۔

www.bhutto.org

حکومت نے جلسے کے بعد ٹکا خان کو چھوڑ کر باقی تمام مقرروں پر مقدمہ بنا دیا۔ جن پر مقدمہ بنایا گیا ان میں اسلم گورداسپوری، عارف اقبال حسین بھٹی، مرزا اکرم بیگ، خواجہ ناہید قمر، شیخ عبدالغفور، مرزا اکرم بیگ اور ان کا ایک معذور قسم کا بیٹا شامل تھا۔

مجھے اور مرزا اکرم بیگ کو گرفتار کر لیا گیا۔ باقی تمام لوگوں نے ہائی کورٹ سے قبل از گرفتاری اپنی ضمانتیں کرا لیں۔ تقریباً تین مہینوں کے بعد مجھے بھی ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ میں جب جیل سے باہر آیا تو میری سیاسی مصروفیات میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ مجھے زیادہ سے زیادہ مساوات کے لئے کام کرنا پڑ گیا تھا۔ انہی دنوں خان عبدالولی خان کا ایک انتہائی قابلِ مذمت بیان شائع ہوا۔ اس کا بیان تھا کہ صرف بھٹو کو ہی نہیں بلکہ ہم کو بھٹوازم کو بھی ختم کرنا ہے۔ یہ بیان جنرل ضیاء الحق کی دلالی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک طرح کا بھٹو صاحب کے قتل میں شریک ہونے والی بات تھی۔ مجھے بیگم بھٹو صاحبہ نے کہا کہ اس کا جواب تم دو۔ میں نے اس کے بیان کے جواب میں ''بھٹوازم'' کے عنوان سے نظم کہی جس کو مساوات کے پہلے صفحے پر شائع کیا گیا۔ اس نظم کو بھٹو صاحب نے بہت پسند کیا تھا۔ انہوں نے یحییٰ بختیار کی زبانی مجھے شاباش کہی تھی۔

''بھٹوازم''

بتاؤ اہلِ ستم کو کہ بھٹو ازم ہے کیا
بتاؤ ان کو کہ یہ ازم ہے شعورِ عوام
بتاؤ ان کو کہ اس ازم سے اُبھرتا ہے
جہانِ نو کا تصوّر اور ارتقاء کا نظام

○

یہ ازم وہ ہے کہ اس ازم نے زمانے میں
بلند و پست کی تفریق کو کیا پامال
یہ ازم وہ ہے کہ جس ازم کی صداقت سے
لرز رہا ہے وطن میں نظامِ استحصال

○

www.bhutto.org

یہ ازم دیتا ہے قوموں کو درس آزادی
یہ ازم نام ہے ناموسِ آدمیت کا
یہ ازم تابہ ابد جبر و ظلم کا ہے حریف
ازل سے دشمنِ جاں ہے یہ بربریت کا

○

یہ ازم گیت ہے نغمہ ہے اک ترانہ ہے
یہ عزم جذبہ ہے جرأت ہے عزم و ہمت ہے
یہ عزم دیتا ہے محنت کشوں کو اذنِ جہاد
یہ عزم نعرۂ تکبیر ہے بغاوت ہے

○

ہزار راہ میں دار و رسن کی ہو دیوار
شعور دار پہ مصلوب ہو نہیں سکتا
ہزار جبر و تشدد سے جسم و جاں ہوں ہلاک
یہ ازم وہ ہے جو مغلوب ہو نہیں سکتا

○

سحر قریب ہے شب خوب مارنے والو
سُلگتے خوں کے دہکتے الاؤ بھڑکیں گے
وہ غُل پڑے گا قفس ٹوٹ ٹوٹ جائیں گے
ذرا جو اور پرندے قفس میں پھڑکیں گے

○

مشیر ٹینک ہوں منصف جہاں ہوں بندوقیں
سنائی دے گی وہاں کس کو درد کی آواز
سمجھ پڑے گا جو رسمِ ستم ذرا کم ہو
ابھی تو درد سے تھرآ رہا ہے پردۂ ساز

○

www.bhutto.org

تمہیں یہ زعم کہ خاموش ہیں گذر گاہیں
تم اس پہ خوش ہو کہ ماتم نہ چیخ ہے نہ پکار
تم اس پہ خوش ہو کہ عہدِ جفاؤ وحشت ہیں
تمہارے خوف سے سہمے ہوئے ہیں سینہ فگار

○

یہ خاموشی ہی قیامت کا صور پھونکے گی
بنیں گی حشر کا میدان سب گذر گاہیں
اُٹھیں گے غیض و غضب سے جو دل کے سینہ فگار
نہ مل سکیں گی تمہیں پھر پناہ کی راہیں

○

یہ ازم تیشہ و تلوار ہے بدستِ عوام
جو اس کے سامنے آئیگا بچ نہ پائے گا
اگرچہ ظلمتِ شب ہے ہمارے سر پہ محیط
یہ صُبح نو کے اُجالے کو لے کے آئیگا

○

26 ستمبر 1978ء کو جب میں جیل سے باہر آیا تو پارٹی کا کام کرنے والے خال خال دکھائی دیتے تھے۔ اکثریت جیل میں جا چکی تھی۔ بہت کم لوگ تھے جو پارٹی کا کام چلائے ہوئے تھے۔ مگر حقیقت میں پارٹی کو اس وقت بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو چلائے ہوئے تھیں۔ یہ دونوں ماں بیٹی اپنی جدو جہد میں دن رات ایک کئے ہوئے تھیں۔ اگر میں یہ بات کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ اس وقت یہ ماں بیٹی ہی پاکستان پیپلز پارٹی تھیں۔ ان کا نام ہی پارٹی تھا۔ اس وقت پارٹی کا عہدہ لینے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک جانب تو یہ دونوں ماں اور بیٹی بھٹو صاحب کے لئے قانون کی جنگ لڑ رہی تھیں دوسری طرف ان کی رہائی کے لئے سیاسی محاذ بھی چلائے ہوئے تھیں۔ بہ خدا بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو دونوں غیر معمولی خواتین کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں نے آخری دم تک سیاسی جدو جہد کا لوہا گرم رکھا اور پاکستان پیپلز پارٹی کو میدانِ عمل میں قائم رکھا۔ اگر یہ دونوں ماں بیٹی

www.bhutto.org

پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت نہ سنبھالتیں تو فوج پاکستان پیپلز پارٹی کو ختم کر چکی ہوتی۔

ملتان میں بیگم نادرا خاکوانی کے گھر جلسہء عام اور راشد ناگی اور عبدالوحید قریشی کی خودسوزی

بیگم نصرت بھٹو کی کوشش تھی کہ بھٹو صاحب کی رہائی کے لئے پنجاب کے ہر شہر میں لوگوں کو متحرک کیا جائے۔ انہوں نے بیگم نادرا خاکوانی کو ملتان میں اپنے گھر میں جلسہء عام کرنے کا مشورہ دیا۔ جس مشورے پر اس بہادر خاتون نے کمال ہمت اور جرأت سے عمل کرتے ہوئے اپنے گھر کی گراؤنڈ میں جلسہء عام کا اعلان کر دیا۔ یکم اکتوبر کو میں ممتاز کاہلوں اور رانا شوکت محمود بیگم خاکوانی کے گھر پہنچ گئے۔ 2 اکتوبر کو جلسہ ہونا تھا کہ شام کو خبر ملی کہ راولپنڈی کے شہید چوک میں گوجرانوالہ کے پارٹی کے دو کارکنوں نے جن کا نام راشد ناگی جو شاعر تھا اور عبدالوحید قریشی نے بھٹو صاحب کے مقدمے کے خلاف اور ان کو دی گئی پھانسی کی سزا کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے جسموں کو تیل چھڑک کر آگ لگا دی اور جس سے وہ دونوں جیالے شہید ہو کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اپنے طرز کے اس انوکھے احتجاج کی شدت سے پورے ملک میں سناٹا چھا گیا۔ فوجی حکمرانوں کے بھٹو کے عاشقوں کی جاں سوزی سے چھکے چھوٹ گئے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کو ہر شہر میں دہشت زدہ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ ممتاز کاہلوں اور رانا شوکت محمود دونوں کو بیگم نادرا خاکوانی کے گھر پر رات کو سونا تھا۔ میں اپنے ایک دوست کے گھر جا کر سو گیا۔ صبح جب میں خاکوانی ہاؤس پہنچا تو معلوم ہوا کہ رات گرفتاریوں کا خطرہ تھا جس کی وجہ سے رانا شوکت محمود اور ممتاز کاہلوں دونوں وہاں سے کسی محفوظ جگہ چلے گئے تھے۔ جلسہ کا وقت ہو چکا تھا۔ لوگ فوج کی تمام دہشت گردی کے باوجود بھاری تعداد میں کوٹھی کے لان میں جمع ہو گئے تھے۔ جلسہ میں میرے ساتھ صرف سردار فاروق لغاری موجود تھا۔ فاروق لغاری نے مجھے کہا کہ رانا شوکت محمود اور ممتاز کاہلوں کہاں ہیں۔ میں نے ان کو کچھ جواب نہ دیا۔ جلسہ شروع ہونے سے چند منٹ پہلے ڈاکٹر غلام حسین جو اس وقت پارٹی کے سیکرٹری جنرل تھے وہ جھنگ کی خاتون رہنما کے ساتھ وہاں تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب دو دن پہلے جیل سے رہا کئے گئے تھے۔ خاکوانی ہاؤس کو پولیس نے ہر طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ مگر لوگ بڑی جرأت کے ساتھ کوٹھی کے اندر

داخل ہوتے جا رہے تھے۔ فاروق لغاری نے ڈاکٹر غلام حسین کو کہنا شروع کر دیا کہ ہم تو کوئی بڑے مقرر نہیں ہیں۔ اصل تقریر تو آج اسلم گورداسپوری کرے گا۔ اس طرح کی باتیں کر کے جلسہ شروع کر دیا گیا۔ فاروق لغاری نے چند تعارفی کلمات کہہ کر تقریر ختم کر دی۔ اس کے بعد ڈاکٹر غلام حسین نے بڑی ڈھیلی قسم کی تقریر کی جس کو حاضرینِ جلسہ کا مشتعل مزاج پسند نہیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر غلام حسین کی تقریر اصل در پیش موضوع سے ہٹ کر تقریر تھی۔ وہ محض تقریر کی خانہ پُری کرنے والی بات تھی مگر اس کے باوجود ان کو گرفتار کر لیا گیا یعنی بندگی میں بھی ان کا بھلا نہ ہو سکا۔ سب سے حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ ممتاز کاہلوں اور رانا شوکت محمود جو مجھے اپنے ساتھ ملتان لے کر گئے تھے۔ وہ خود ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ آخر میں مجھے تقریر کا کہا گیا۔ میں نے بھٹو کے عشق میں جل کر راکھ ہو جانے والے پروانوں کے ذکر سے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ تقریر کا انت میں نے اس بات پر کیا کہ لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ حسینؓ جیسے برگزیدہ انسان کو یزید کی فوجوں نے کس طرح شہید کر دیا تھا اسی طرح شہید کر دیا تھا جس طرح آج ذوالفقار علی بھٹو کو ضیاء الحق کی فوج جیل میں ڈالے ہوئے اور اس کو پھانسی پر لٹکانا چاہتی ہے۔ لوگو اگر تم میں کچھ دم ہے تو اپنے فخرِ ایشیا کو چھڑا لو۔ میں نے تقریر ختم کی میں نے دیکھا کہ لوگوں نے پولیس پر اینٹیں پھینکنا شروع کر دیں۔ پولیس نے فائر کھول دیا۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ پولیس کوٹھی کے اندر داخل ہو گئی۔ میں کوٹھی کے پیچھے ایک دوسری کوٹھی کے اندر کود گیا اور وہاں تقریباً ایک گھنٹہ تک کھڑا ہو کر پولیس کو دیکھتا رہا۔ پولیس فاروق لغاری اور ڈاکٹر غلام حسین کو گرفتار کر کے لے گئی۔ مجھے تلاش کرتی رہی مگر میں ان کے ہاتھ نہ آ سکا، اور واپس لاہور آ گیا۔

دنیا کی تاریخ کا عجیب احتجاج

2 اکتوبر 1978ء کو لاہور بھاٹی گیٹ چوک میں یعقوب پرویز مسیح اور عبدالرشید عاجز نے عشقِ قائدِ عوام میں خود کو نذرِ آتش کر کے شہادت کا درجہ پالیا۔ ان مجاہدوں کی خودسوزی سے ایک دن پہلے راولپنڈی میں کارکنوں کی جاں سوزی کا واقعہ ہو چکا تھا۔ فوجی حکمرانوں نے راولپنڈی کی طرح لاہور شہر میں بھی ایک طرح کا کرفیو لگا دیا تھا۔ لاہور شہر کے لوگ ان کارکنوں کی جاں سوزی سے بے حد افسردہ تھے۔ لاہور ہائی کورٹ بار میں وکلاء حضرات نے کارکنوں کی اس عظیم قربانی کی روشنی

www.bhutto.org

میں باقاعدہ قرارداد منظور کر کے اخبارات کو جاری کی۔ جس میں کہا گیا کہ فوجی حکومت کے خلاف عوام نفرت کی آگ میں جل رہے ہیں۔ لوگ مارشل لاء سے اس قدر نفرت کر رہے ہیں کہ اپنے جسموں کو نذرِ آتش کر رہے ہیں۔ ان کا مطالبہ تھا کہ وزیراعظم بھٹو کو فوری طور پر رہا کیا جائے۔ ملک میں آئین کو بحال کیا جائے اور ملک میں عام انتخابات کروا کر اقتدار عوام کے نمائندوں کو دیا جائے اور فوج اپنے مقام پر واپس چلی جائے۔ اس سے اگلے دن فوٹوگرافر عزیز ملک نے راولپنڈی میں خود کو آگ لگا کر اپنی ذات کو لافانی بنالیا۔ ان شہیدوں کے بعد اوکاڑہ کے منور حسین اور سکھر کے عبدالعزیز نے شہید بابا پر اپنی جانیں قربان کر کے شہادت کا مقام حاصل کر لیا۔

مقامِ شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں دراز

لاہور میں رانا شوکت محمود اور میں بیگم بھٹو کو ملنے گئے۔ بیگم بھٹو نے اسلام آباد جتوئی ہاؤس میں سینٹر کمیٹی کا اجلاس بلانے کا اعلان کیا تھا۔ ان کے ساتھ ملاقات کرنے پر معلوم ہوا کہ سینٹر کمیٹی کے ممبران سے رابطہ ہونا مشکل ہو چکا ہے۔ حالات بے حد خراب ہو چکے تھے۔ بیگم صاحبہ نے مجھے اور رانا شوکت محمود کو اجلاس میں شریک ہونے کا حکم دیا۔ سینٹر کمیٹی کا یہ اجلاس 10 اکتوبر 1978ء کو اسلام میں آباد ہونا تھا۔ ہم لوگ مقررہ تاریخ کو جتوئی ہاؤس اسلام آباد پہنچ گئے۔ اس روز بھٹو صاحب کے ساتھ ایک خصوصی ملاقات کی وجہ سے بیگم صاحبہ اجلاس میں تشریف نہ لاسکیں۔ سینٹر کمیٹی کے اجلاس کی حالت بھی بڑی پتلی تھی۔ صرف چھ سات آدمی جتوئی ہاؤس میں موجود تھے سب سے اہم آدمی اس اجلاس میں غلام مصطفیٰ جتوئی اور حامد رضا گیلانی تھے۔ ان کے علاوہ احمد وحید اختر موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ملک دوست محمد اعوان جو بھٹو صاحب کے وکیل تھے وہ تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ بھٹو صاحب نے کچھ قراردادیں تجویز کر کے بھیجی تھیں۔ جن قراردادوں کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اس اجلاس میں چونکہ بیگم صاحبہ تشریف نہیں لائیں تھیں جس کی وجہ سے کہا گیا کہ سینٹر کمیٹی کا دوبارہ اجلاس بلایا جائے گا۔

سینٹر کمیٹی میں ہماری انقلابی تجویز

میں نے اور احمد وحید اختر نے اجلاس میں تجویز پیش کی کہ حالات چونکہ انتہائی غیر معمولی ہو

www.bhutto.org

چکے ہیں جس کی وجہ سے سینٹر کمیٹی کا اجلاس ہفتے میں ایک بار ضرور ہونا چاہئے۔ ہماری اس تجویز پر حامد رضا گیلانی اور جتوئی کو کچھ تشویش سی لاحق ہو گئی۔ ہماری تجویز یہ تھی کہ پارٹی کے تنظیمی عہدوں کا ڈھانچہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ہم نے خاص طور پر پنجاب کے حوالے سے بات کی تھی۔ پنجاب میں نہ پارٹی کا کوئی صدر باہر تھا نہ جنرل سیکرٹری۔ ایسا کوئی موثر فورم موجود نہیں تھا جس پر بھٹو صاحب کی رہائی کے لئے بات کی جا سکتی تھی۔ اس وقت صرف سینٹر کمیٹی کے ہی کچھ سینئر ترین لوگ باہر موجود تھے۔ لہٰذا موجودہ صورت حالات میں سینٹر کمیٹی ہی ایک اہم ترین دستیاب فورم باقی ہے۔ لہٰذا اس اہم ترین فورم کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہئے۔ بھٹو کے وکیل یحییٰ بختیار اور دوست محمد اعوان اور سندھ سے بھی کچھ وکلاء حضرات کو سینٹر کمیٹی کے ممبران ہونے کا درجہ حاصل تھا۔ ہماری رائے تھی کہ حالات خواہ کتنے بھی سنگین بنا دیئے جائیں سینٹر کمیٹی کے کچھ نہ کچھ اراکین وکلاء کی شکل میں ہر صورت پارٹی کی ترجمانی کے لئے موجود رہیں گے۔ مارشل لاء حکومت خواہ ساری سینٹر کمیٹی کو گرفتار کر لے مگر بھٹو صاحب کے وکلاء کو گرفتار نہیں کر سکتی۔ لہٰذا سینٹر کمیٹی کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے اور سینٹر کمیٹی میں پنجاب اور سندھ اور سرحد اور بلوچستان کے کچھ وکلاء کو شامل کیا جائے۔

حامد رضا گیلانی کا اعتراض تھا کہ سینٹر کمیٹی تو انتہائی اہم نوعیت کے معاملات پر ہی بات کر سکتی ہے۔ ملک کی عام قسم کی سیاسی صورت حال پر تو پارٹی کے دوسرے تنظیمی فورمز کو بات کرنی چاہئے۔ اس کے علاوہ ان کا اعتراض تھا کہ سینٹر کمیٹی میں عام بھرتی نہیں کی جا سکتی۔ یہ پارٹی کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس میں ہنگامی طور پر لوگوں کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری رائے تھی کہ یہ ایک انقلابی سینٹر کمیٹی ہے اور یہ انقلابی سینٹر کمیٹی مشکل اوقات میں تنظیمی درجات کے کلٹ کا شکار نہیں ہو سکتی۔ ہنگامی حالات میں بنیادی یونٹ اور سینٹر کمیٹی ایک برابر ہوتے ہیں۔ اس وقت چونکہ ملک میں مارشل لاء ہے۔ پارٹی ہنگامی حالات کا شکار ہو چکی ہے۔ اس وقت صوبے اور سینٹر کے درجات اور اختیارات کی تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے دلائل چونکہ بہت مضبوط اور برمحل تھے کسی سیاسی اصول کے مطابق ہماری رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا یہ طے پا لیا گیا کہ سینٹر کمیٹی کا اجلاس ہفتے میں ایک بار ضرور ہو گا اور اس میں وکلاء کو شامل بھی کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پا گیا کہ کسی بھی ہنگامی نوعیت کے واقعے پر اجلاس فوری طور پر بھی بلایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی طے پایا کہ خواہ دو رکن ہی باہر رہ جائیں وہ دو رکن ہی سینٹر کمیٹی تصور کیے جائیں گے۔

سینٹر کمیٹی کی اس تمام کارروائی کو احاطہ قلم میں لا کر اس کو حتمی منظوری کے لئے بیگم نصرت بھٹو کے علم میں اس کارروائی کو لانا میری ذمہ داری قرار دے دیا گیا۔

سینٹر کمیٹی کے اصل جاگیردار اراکین حامد رضا گیلانی اور غلام مصطفےٰ جتوئی کے لئے ہم کارکنوں کی سینٹر کمیٹی میں موجودگی کچھ خوشی کا باعث نہیں تھی۔ ہماری موجودگی میں وہ دونوں خود کو اَن ایزی محسوس کر رہے تھے وہ ہم کو عام لوگ خیال کرتے تھے مگر وہ زبان سے اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کے چہروں پر ان کے دل کی کیفیت صاف عیاں تھی۔ اجلاس میں تجویز کیا گیا کہ پنجاب کے صدر کے لئے کوئی نام دیا جائے۔ اسی طرح جنرل ٹکہ خان کے نظر بند ہو جانے کی وجہ سے پارٹی کے سیکرٹری جنرل کا بھی عہدہ خالی تھا اس کے لئے بھی کوئی نام تجویز کیا جائے۔

ایک دو دن میں یہ نام ملک دوست محمد اعوان کے پاس پہنچ جانا چاہئے۔ تاکہ ان ناموں کی بھٹو صاحب سے جیل سے منظوری حاصل کر لی جائے۔ یہ کام رانا شوکت محمود کے ذمہ لگایا گیا تھا۔ رانا صاحب لاہور آ کر کئی لوگوں سے پنجاب کا صدر مقرر ہونے کی بات کرتے رہے مگر کوئی شخص بھی ان مخدوش حالات میں پارٹی کا عہدہ دار بننے کے لئے تیار نہیں تھا۔

میں نے اپنی ذمہ داری کے مطابق اجلاس کی کارروائی کو قراردادوں کی شکل میں تحریر کر کے لاہور میں بیگم صاحبہ کو پیش کر دیں۔ بیگم صاحبہ نے ان تمام تجاویز سے اتفاق کیا۔ خاص طور پر سینٹر کمیٹی کو ایک انقلابی سینٹر کمیٹی کہنے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ہمارے سینٹر کمیٹی میں طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم لوگ دوبارہ سینٹر کمیٹی کے اجلاس میں جانے کی تیاری کرنے لگ گئے۔ مگر بے حد افسوس کی بات یہ تھی کہ کوئی ڈھنگ کا آدمی پنجاب کی صدارت کے لئے دستیاب نہیں ہو رہا تھا۔

رانا شوکت محمود نے مجھے مشورہ دیا کہ اس مشکل وقت میں تم سے زیادہ پارٹی کے لئے ذمہ دار عہدہ دار اور کون ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ صدارت کے لئے تمہارا نام دے دیا جائے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا میں سیاسی طور پر تو پارٹی کے ہر عہدے کے لئے موزوں انسان تھا۔ مگر میں اپنی سیاسی زندگی میں اقتصادی اعتبار سے ہمیشہ کمزور رہا ہوں۔ میری بھاگ دوڑ میں تو کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر اس بھاگ دوڑ کے لئے جن ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے وہ ذرائع میرے پاس حسب ضرورت کم تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پارٹی کے اقتدار کے زمانے میں مجھے بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا میں تو کمٹ منٹ کے تحت پارٹی کے ساتھ چلتا چلا آ رہا تھا۔

www.bhutto.org

1977ء میں پارٹی پر افتاد آ پڑی۔ وہ تمام جاگیردار جن کو ان کے نسب کے اعتبار سے پارٹی کے اقتدار کا حصہ دار تصور کیا جاتا تھا۔ وہ تمام پہلے دن ہی دم دبا کر بھاگ گئے تھے۔ یہاں تک کہ جب ضیاء الحق نے پارٹی کی حکومت کا تختہ الٹایا تو اس وقت کے پارٹی کے سیکرٹری جنرل جاگیردار ناصر رضوی نے ڈانس کرنا شروع کر دیا تھا۔ تاکہ فوجی حکومت پر اس کی وفاداری آشکارا ہو جائے۔ اور جو جاگیردار حامد رضا گیلانی اور غلام مصطفیٰ جتوئی کی شکل میں پارٹی کے ساتھ چل رہے تھے ان کی حالت بھی دستِ تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا کے مصداق تھی۔ اس لئے کہ یہ لوگ اس طرح کی سیاست کے عادی ہی نہیں تھے۔

مگر چونکہ ان لوگوں کی پارٹی کے اندر بڑی حیثیت بنی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے ہم جیسے سیاسی کارکن ان کے سامنے کچھ حیثیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ خود بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو بھی ان کے فیصلوں کو تسلیم کرنے پر مجبور تھیں۔ قصہ مختصر یہ تھا کہ پیپلز پارٹی پنجاب کا صدر نامزد ہونے کی وجہ سے میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنی مالی کمزوری کی بنا پر وہ کچھ نہ کر سکوں جس کی بھٹو صاحب کو ضرورت درپیش ہے۔ یہ خود میری اپنی جینوین سوچ بچار تھی۔ میرا اپنا اخلاص ہی میری سوچ کا منبع تھا۔ میں نے رانا صاحب کو صاف انکار کر دیا۔ میں نے ان کو کہا کہ آپ اس کام کے لئے کسی مقتدر انسان کو تجویز کریں۔ میں بغیر کسی عہدے کے بھی پارٹی کے لئے ہر طرح حاضر ہوں۔ مگر صورت حال اصل یہ تھی کہ کوئی دوسرا آدمی اس وقت پارٹی کا عہدہ دار بننے کا خواہش مند ہی نہیں تھا۔

لہٰذا سینٹر کمیٹی کے اجلاس میں رانا شوکت محمود نے پارٹی کے سیکرٹری جنرل کے لئے خود اپنا نام پیش کیا اور پنجاب کی صدارت کے لئے میرا نام تجویز کر دیا۔ اجلاس میں ملک دوست محمد اعوان ایڈووکیٹ کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ وہ شام تک وزیر اعظم بھٹو سے ہمارے ناموں کی منظوری حاصل کر کے ہم کو اس کی اطلاع کر دیں۔

13 اکتوبر 1978ء کو مجھے پیپلز پارٹی پنجاب کا صدر بنا دیا گیا اور رانا شوکت محمود کا نام نامنظور کر دیا گیا

جب اجلاس میں یہ کہا گیا کہ میرے نام کی منظوری بھٹو صاحب سے حاصل کی جائے گی تو میرا

www.bhutto.org

ذہن ماضی کی طرف منتقل ہو گیا۔ ماضی میں اچھے حالات میں ایک مرتبہ میں نے ملک غلام مصطفیٰ کھر جو اس وقت گورنر تھے ان کی موجودگی میں بھٹو صاحب کو کہا کہ سر مجھے لاہور پیپلز پارٹی کا صدر بنا دیں۔ یہاں پر بھٹو صاحب کے جواب سے پہلے ایک بات بتا تا چلوں کہ پارٹی کے شروع کے زمانے میں میرا بھٹو صاحب کے ساتھ بہت زیادہ رہنا ہوتا تھا۔ وہ زمانہ میری جوانی کے آغاز کا تھا یعنی ایک شاعر کے شباب کا زمانہ تھا۔ میں ایک شاعر کی حیثیت سے کئی معنوں میں بے اعتدال تھا۔ گویا وہ میرے جنون کا زمانہ تھا۔ میں کم ہی کسی کو خاطر میں لایا کرتا تھا۔ بھٹو صاحب اکثر مجھے پاگل کہا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ تمام باتیں بھٹو صاحب کے ذہن میں تھیں۔ میں نے جب ان سے کہا کہ مجھے لاہور کا صدر بنا دیں تو انہوں نے اپنے مخصوص معمولی سے قہقہے کے ساتھ فوراً فرمایا کہ ہاں تمہیں لاہور کا صدر بنا دوں تاکہ تو رات کو دو ٹکا کر مجھے ہی پارٹی سے نکال دے۔ حالانکہ یہ ایک بھٹو صاحب کا میرے ساتھ خوبصورت مذاق تھا اور مذاق کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ مگر مجھ پر خوف طاری ہو گیا کہ بھٹو صاحب کیا سوچیں گے۔ شاید میں پنجاب کا صدر بننے کے لئے اپنا نام ان کو بھیج رہا ہوں۔ مجھے بلاوجہ یہ معاملہ ہانٹ کر رہا تھا۔ میں نے ملک دوست محمد اعوان کو ایک طرف کر کے کہا کہ ملک صاحب میں ہرگز پنجاب کا صدر نہیں بننا چاہتا۔ میرا نام بہ امر مجبوری دیا جا رہا ہے۔ براہِ کرم یہ بات بھٹو صاحب پر واضح کر دی جائے۔ ملک دوست محمد اعوان بڑی حیرانی سے مجھے کہنے لگے۔ بھائی دوسرا آدمی تو کوئی صدر بننے کے لئے تیار ہی نہیں ہے، میں خود کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں۔ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں میں یہ بات بھٹو صاحب کے علم میں لانے کا آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔

اجلاس کے بعد ہم لوگ واپس لاہور آ گئے۔ دوسرے دن مجھے اطلاع کی گئی کہ تمہیں پنجاب کا صدر بنا دیا گیا ہے۔ اس خبر کو اخبار میں بھی دے دیا گیا۔ مگر میرے لئے جو سب سے زیادہ حیران کن بات تھی وہ یہ تھی کہ رانا شوکت محمود کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل نہیں بنایا گیا۔ بلکہ مجھے کہا گیا کہ میں لاہور میں مقیم شوکت مزاری سے رابطہ کروں۔ بھٹو صاحب نے اس کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل بنانے کا کہا ہے اور رانا شوکت کا نام انہوں نے نامنظور کر دیا ہے۔

میں شوکت مزاری کو زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میں نے ملک دوست محمد اعوان کو فون پر کہہ دیا کہ آپ خود ہی اس کے ساتھ رابطہ کریں۔ میں تو ان کا اتہ پتہ کچھ نہیں جانتا۔ مجھے فوری طور پر اسلام آباد بلا لیا گیا۔ میں فلش مین ہوٹل گیا جہاں پر بھٹو صاحب کے تمام وکلاء ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں پر ملک

دوست محمد اعوان بھی موجود تھے۔انہوں نے مجھے بڑی مبارک باد دی کہ بھٹو صاحب نے بڑی خوشی کے ساتھ تمہارا نام منظور کیا تھا۔دوست محمد اعوان نے مجھے بتایا کہ میں نے تمہاری بات ان کے گوش گذار کردی تھی۔مگر انہوں نے آپ کے بارے میں بڑی اچھی رائے کا اظہار کیا۔انہوں نے کہا کہ اس وقت دوست محمد اعوان ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو مارشل لاء کے سامنے کھڑے رہیں مگر اس کے ساتھ ہی ملک دوست محمد اعوان نے کہا کہ انہوں نے رانا شوکت محمود کی منظوری نہیں دی۔ میں نے یحییٰ بختیار کو کہا کہ آپ کو رانا شوکت محمود کی سفارش کرنی چاہئے تھی۔ان کا جواب تھا کہ ایک تو میں رانا شوکت کو مشکوک آدمی سمجھتا ہوں، دوسرا میں بھٹو صاحب کو صرف ان کے مقدمہ کے بارے میں مشورہ دیتا ہوں۔پارٹی کے بارے میں ان کو مشورہ نہیں دیا کرتا۔ملک دوست محمد اعوان نے مجھے کہا کہ شوکت مزاری کے بارے میں آپ کو کیا اعتراض ہے۔میں نے کہا کہ مجھے تو کچھ اعتراض نہیں ہے۔مگر وہ موجودہ حالات میں کبھی بھی پارٹی کا سیاسی عہدہ قبول نہیں کرے گا۔یہ ایک عجیب بات تھی کہ اس وقت بھی ایک جاگیردار کو ہی پارٹی کا سب سے بڑا عہدہ دینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ جو بے حد ناتجربہ کار اور غیر سیاسی نوجوان تھا۔مگر میری بات سچی ثابت ہوئی اس نوجوان جاگیردار شوکت مزاری نے پارٹی کا سیکرٹری جنرل بننے سے انکار کردیا تھا۔

ریٹائرڈ جسٹس ملک سعید حسن کو سیکرٹری جنرل بنادیا گیا

ملک سعید حسن کا میں پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ ان کی ججی کی قربانی کی وجہ سے پارٹی کے اندر اور پارٹی کے باہران کے کردار کا گراف بہت بلند تھا۔ ہر شخص اُن کو تحسین کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ان کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل نامزد کردیا گیا۔میرے خیال میں ملک سعید حسن کا فیصلہ ان حالات میں بے حد موزوں اور بے حد مناسب فیصلہ تھا۔جس طرح وزیراعظم بھٹو خوبصورت سمارٹ اور دیدہ زیب شخصیت کے مالک تھے ملک سعید حسن بھی اپنی قد و قامت میں دلکش انسان تھے۔ پارٹی کے اتنے بڑے عہدے پر ان کی تقرری کو پسند کیا گیا تھا۔ملک صاحب اپنی تمام علمی قابلیت کے باوجود پارٹی کے تنظیمی امور کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔لہٰذا بہ حیثیت صدر پنجاب میں نے ان کو مشورہ دیا کہ ایک سیکرٹری جنرل کو متحرک رہنا چاہئے۔لہٰذا سب سے پہلے پروگرام بنایا گیا کہ ملک صاحب کو سیاسی قیدیوں کے گھروں میں ان کے اہلِ خانہ کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے

جانا چاہئے۔لہٰذا لاہور میں جتنے بھی پارٹی کے کارکن جیلوں میں تھے میں ملک سعید حسن کو ان کے گھروں میں لے کر گیا۔

بیگم صاحبہ کی صدارت میں سینٹر کمیٹی کا اجلاس

اسلام آباد میں سینٹر کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا۔اجلاس کی صدارت خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو نے کی۔سیکرٹری جنرل ملک سعید حسن نے ریزولوشن پیش کئے۔ملک صاحب ریزولوشن پڑھتے ہوئے ایک لائن چھوڑ گئے تو بیگم صاحبہ نے ان کو ٹوکا کہ آپ ایک لائن چھوڑ گئے ہیں۔ملک سعید حسن نے جواب میں بڑی دلچسپ بات کہی۔کہنے لگے کہ ایسا میں نے آپ لوگوں کی توجہ کو چیک کرنے کے لئے کیا ہے۔اجلاس کے اختتام پر بیگم صاحبہ کے ساتھ میری اور ملک سعید حسن کی خصوصی ملاقات ہوئی۔جس میں انہوں نے حکم دیا کہ تم لوگوں کو کسی صورت میں گرفتار نہیں ہونا۔تم لوگوں کو باہر رہنا ہے۔اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ پارٹی کے عہدہ دار موجود ہیں۔اور لوگوں کو بھٹو صاحب کی لمحہ لمحہ کی خبر پہنچائیں۔اور لوگوں کو متحرک کرنے کی کوشش کریں۔

میرے لئے مشکل یہ تھی کہ نہ تو پارٹی کا کوئی پنجاب کا دفتر تھا اور نہ لاہور کا ہی کوئی دفتر تھا۔جین مندر لاہور کے اندر ایک عارف اقبال حسین بھٹی کا زون کا دفتر تھا۔لہٰذا میں نے اسی دفتر میں بیٹھ کر پارٹی کا کام کرنا شروع کر دیا۔اس دفتر کا دروازہ وغیرہ کچھ نہیں تھا مندر کے ساتھ بنی ہوئی ایک تکون سی تھی اس میں میں چند کرسیاں رکھ کر پنجاب بھر کے لوگوں کے ساتھ رابطہ کرتا تھا۔وہاں پر سی۔آئی۔ڈی کے کارندوں کی ہر وقت آمد و رفت رہتی تھی۔

سیاسی پارٹی کا دفتر ہونا لازمی ہے

میرے سیاسی تجربے کے مطابق ایک سیاسی جماعت کے لئے پارٹی کا دفتر ہونا پارٹی کی اولین ضرورت اور ذمہ داری ہوتا ہے۔پاکستان پیپلز پارٹی 5 سال تک ملک کے سیاہ و سفید کی مالک رہی مگر پارٹی کا دفتر قائم نہ کر سکی۔تمام وزراء اور اسمبلی کے اراکین کو پلاٹ دیئے گئے۔باقی بھی تمام سیاسی کارکنوں کو پلاٹ دیئے گئے۔مگر کسی گورنر کسی وزیر کو اس بات کا خیال نہ آیا کہ ایک پلاٹ پارٹی دفتر کے لئے وقف کر دیا جائے۔اس ایک بات سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پارٹی

کے لیڈر پارٹی کو کتنا اہم تصور کرتے تھے۔ افسوس کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد پارٹی کے لیڈروں کا کردار ہی تبدیل ہو گیا تھا۔

پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل مبشر حسن سے ایک سوال

پارٹی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر مبشر حسن جن کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ وہ اصولوں کی سیاست کرتے ہیں۔ ان سے میرا سوال ہے کہ وہ پورے 5 سال تک پاکستان کے سیاہ وسفید کے مالک رہے۔ پارٹی کی سیاست میں وہ اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیا کرتے تھے۔ ان سے میرا یہ سوال ہے کہ انہوں نے پارٹی کا ایک اپنا ملکیتی دفتر کیوں نہ بنایا۔ کیا وہ یہ تصور کرتے تھے کہ پیپلز پارٹی ہمیشہ اقتدار میں رہے گی۔ انہوں نے اپنا دوسرا لاہور کا دفتر ٹمپل روڈ والے دفتر کے بعد فری میسن کلب مال روڈ کی پُر اسرار سرکاری عمارت میں کیوں بنایا تھا۔ کیا عوامی پارٹی کی عوامی سیاست کو یہ زیب دیتا تھا کہ وہ ایک سرکاری عمارت میں اپنا دفتر بنائے۔ یہ تو بالکل بیوروکریٹک انداز تھا۔ پیپلز پارٹی کا دفتر عوامی نقطہ نظر سے قائم کیا جانا چاہئے تھا۔ کاش کہ 4۔ مزنگ والی بلڈنگ کو خرید لیا جاتا۔ تاکہ پارٹی کا دفتر عوام کی پہنچ کے مطابق رہ سکتا۔ مگر افسوس کہ پیپلز پارٹی کے ان بقراط نما لیڈروں نے پارٹی کے دفتر کی طرف کبھی دھیان نہ دیا۔ اور جب پارٹی پر مشکل بن گئی تو یہ بیوروکریٹ سیاست دان اپنا کوئی عذر لنگ رکھ کر پارٹی کے جہاز سے باہر چھلانگ لگا کر ہر معاملے سے سبکدوش ہو گئے اور پھانسی چڑھنے کے لئے شہید بھٹو کو اکیلا چھوڑ گئے۔

اصغر چوہدری اور غیاث الدین جاں باز کی شرارت

میں ایک سیاسی کارکن کی طرح کھلے عام بیٹھ کر اپنے تنظیمی فرائض سر انجام دیتا تھا۔ میں پورے پنجاب کے بڑے شہروں کا ہنگامی دورہ کرنے کا پروگرام مرتب کر رہا تھا۔ ہر ضلع سے تنظیمی عہدہ داروں کو بلا کر ان سے دورے کی تاریخ طے کر رہا تھا۔ اس دوران میں اصغر چوہدری ایڈووکیٹ اور غیاث الدین جاں باز اینڈ کمپنی نے بیگم صاحبہ کے پاس جا کر میری شکایت کر دی۔
میں شروع دن سے ہی اصغر چوہدری اور غیاث الدین جاں باز اینڈ کمپنی کی سیاست سے متفق نہیں تھا۔ یہ لوگ بڑی انتہا پسندی کی باتیں کیا کرتے تھے ہر وقت بموں اور توپوں کی باتیں کیا

www.bhutto.org

کرتے تھے۔غیاث الدین جاں باز کو تو لوگ بم باز کہنے لگ گئے تھے۔میرا غیاث الدین جاں باز اینڈ کمپنی کے ساتھ اختلاف یہ تھا کہ میں ان کو کہتا تھا کہ تم لوگ اپنے ضلع فیصل آباد جاکر پارٹی کو متحرک کرو۔تم لوگوں کا لاہور میں کیا کام ہے۔مگر ان کو پارٹی کے مرکزی رہنما بننے کا شوق تھا۔وہ کسی چھوٹے اسٹیشن پر ٹھہرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔لاہور کے ورکر ان لوگوں پر شک کرتے تھے۔وہ ان کو سی۔آئی۔ڈی کے آدمی خیال کرتے تھے۔لہٰذا پارٹی کے اندر میں کچھ اسی قسم کی سیاسی کشمکش سے دوچار تھا۔ابھی میں اپنے دورے کا کوئی پروگرام متعین ہی نہیں کر پایا تھا کہ ان لوگوں نے کھگا ہاؤس میں جاکر بیگم صاحبہ کو کہا کہ یہ شخص تو پارٹی کو غیر متحرک رکھنا چاہتا ہے۔کوئی کام نہیں کر رہا۔اصل صورت حال یہ تھی کہ میں پارٹی کے تنظیمی دوروں کے لئے عہدے داروں کے ساتھ رات کو خفیہ ملاقات رکھتا تھا۔ان لوگوں کی موجودگی میں کسی قسم کے پروگرام کی بات نہیں کرتا تھا۔

جین مندر میں میں صرف ورکروں سے رابطے کا کام کرتا تھا اور اخبار نویسوں سے ملتا تھا پریس کانفرنس کرتا تھا۔باقی کام رات کو بڑی راز داری کے ساتھ کرتا تھا۔یہ معاملات ان لوگوں کے علم میں ہی نہیں تھے۔اصغر چوہدری ایڈووکیٹ ان دنوں بیگم صاحبہ کے مقدمے میں ان کا وکیل تھا۔بیگم صاحبہ ان پر بڑا اعتماد رکھتی تھیں۔انہوں نے اصغر چوہدری اور غیاث الدین اینڈ کمپنی کی باتوں کو سچ جانا اور مجھے کھگا ہاؤس طلب کر لیا۔میں جب بیگم صاحبہ کے پاس گیا تو اس وقت میاں سلیم جہانگیر ایڈووکیٹ اور مزدور کسان پارٹی کے چیئرمین میجر اسحاق محمد ان کے ساتھ ملاقات کر رہے تھے۔میں ان لوگوں سے سلام دعا کر کے ایک طرف کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔اور میجر اسحاق صاحب کی ملاقات ختم ہونے کا انتظار کرنے لگ گیا۔قدرتی طور پر ایک دن پہلے میں میاں سلیم جہانگیر کے ساتھ میجر اسحاق صاحب کے ساتھ ملاقات کر چکا تھا۔ان کے ساتھ ملاقات کرنا بھی میرے اس پروگرام کا حصہ تھا جو میں مختلف شہروں میں جانے کے لئے بنا رہا تھا۔میں نے میجر صاحب سے کہا تھا کہ آپ اپنے کارکنوں کو کہیں کہ وہ ہماری تحریک میں شریک ہوں اور بھٹو صاحب کی رہائی کے لئے بیان جاری کریں۔

مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ بیگم صاحبہ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔میں نے اس ملاقات کو اس لئے غنیمت جانا تھا کہ میں اپنے پروگرام کے بارے میں بیگم صاحبہ کو بتاؤں گا اور ان عہدہ داروں کے نام بتاؤں گا جن کے ساتھ میں دورے کا پروگرام بنا چکا تھا۔مگر بیگم صاحبہ نے مجھے کچھ بھی بات

کرنے کا موقعہ نہ دیا وہ مجھ پر برس پڑیں۔ انہوں نے کہا کہ تم دن بھر مندر میں بیٹھے رہتے ہو۔ تحریک چلانے کی بات تک نہیں کرتے ہو۔ ہم نے تو تمہیں پارٹی کا بنیادی رکن سمجھ کر صدر بنایا تھا۔ ہمارے دل میں تھا کہ تم ہمارے قریب ترین لوگوں میں سے ہو۔ تم کو ہمارے ساتھ سب سے زیادہ ہمدردی ہوگی۔ سیاسی ورکر کا کام ہمت اور بہادری ہوتا ہے۔ بیگم صاحبہ کے اس قسم کے احساسات کا اظہار ایک قدرتی بات تھی۔ وہ ایک سچی خاتون ہیں۔ بھٹو صاحب کے ساتھ ان کی محبت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ وہ بے حد وفا شعار خاتون ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا وہ بھٹو صاحب کی رہائی کے لئے کوئی بہت بڑی تحریک پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ وہ بھٹو صاحب کے معاملے میں بے حد حساس اور جذباتی تھیں۔

بیگم صاحبہ جب اپنے جذبات کا اظہار کر چکیں تو میں نے اپنے مخصوص مودب انداز میں ان سے اپنی کوتاہی پر معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کوئی شک کی بات نہیں ہے۔ ان حالات میں جو کچھ مجھے کرنا چاہئے وہ مجھ سے نہیں ہو پا رہا۔ مگر میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں میں کسی عہدے کے لئے آپ کو دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ اگر میں کام نہ کر سکا تو آپ کو صاف بتا دوں گا کہ میں کام نہیں کر سکتا۔ مجھے سب سے زیادہ شرم میاں سلیم جہانگیر اور میجر اسحاق کی وجہ سے آ رہی تھی۔ وہ مہمانوں کی حیثیت سے وہاں بیٹھ کر میری گت بنتی دیکھ رہے تھے۔ میں نے بیگم صاحبہ سے گذارش کی کہ میرا قصور کیا ہے۔ انہوں نے اصغر چوہدری کی شکایات کا ذکر کیا جو اس وقت وہاں موجود تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ دوسرے جن لوگوں کو میں اپنی جدوجہد کے سلسلے میں ملا ہوں ان میں سے تو یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔ مگر میجر اسحاق صاحب اور میاں سلیم جہانگیر تو اتفاق سے یہاں موجود ہیں۔ آپ میری بھاگ دوڑ کی صداقت کی ان سے تصدیق کر سکتی ہیں۔ میجر اسحاق صاحب بڑے منجھے ہوئے انسان تھے وہ پارٹی کے لوگوں کی اس شرارت کو فوراً بھانپ گئے۔ انہوں نے بیگم صاحبہ کو بتایا کہ یہ شخص رات ایک بجے میرے پاس آیا تھا۔ جو باتیں میں نے آپ کے ساتھ کی ہیں وہ ہم دونوں پہلے سے طے کر چکے ہیں۔ گورداسپوری نیک نیت انسان ہے۔ حالات ہی فوج نے اس قدر سنگین بنا دیئے ہیں کہ کسی کا بس نہیں چل رہا ہے۔ ان حالات میں بے اعتمادی پیدا ہونے کا بڑا خطرہ ہوتا ہے۔ میجر صاحب کی بات سے بیگم صاحبہ کا غصہ جاتا رہا۔ وہ کہنے لگیں کہ یہ لوگ تو کہتے ہیں مندر میں بیٹھ کر لوگوں کو

www.bhutto.org

چاے پلاتا رہتا ہے۔ میں نے بیگم صاحبہ کو کہا کہ اس وقت فوجی حکومت پارٹی پر تخریب کاری کا الزام لگا رہی ہے۔ میں کھلے عام بیٹھ کر پارٹی کا کام اس لئے کرتا ہوں کہ وہ پارٹی پر اس قسم کا الزام نہ لگا سکے۔ میں پارٹی کو اور کارکنوں کو اس الزام سے بچانا چاہتا ہوں۔ مگر میں تو آپ کا ایک کارکن ہوں اور کارکن رہوں گا۔ مجھے کسی عہدے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں عہدے کے بغیر بھی یہی کچھ کروں گا جو عہدے کے ساتھ کر رہا ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر چوہدری اصغر علی کو پنجاب کا صدر بنا دیں۔ چوہدری اصغر علی نے بیگم صاحبہ کے کچھ کہنے کے بغیر ہی کہنا شروع کر دیا کہ میں تو آپ کے مقدمے لڑ رہا ہوں میں صدر نہیں بن سکتا۔

بیگم صاحبہ مسکرا کر مجھے کہنے لگیں کہ ایسی باتیں مت کرو۔ فلاں کو صدر بنا دو وغیرہ۔ میری غلط فہمی ختم ہو چکی ہے۔ بیگم صاحبہ نے مجھے کہا کہ جاں باز کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ میں نے کہا کہ وہ فیصل آباد کا کارکن ہے۔ وہاں لوگوں کو جانتا پہچانتا ہے۔ میری رائے ہے کہ وہ فیصل آباد میں بہتر کام کر سکتا ہے۔ بیگم صاحبہ فرمانے لگیں کہ اس وقت لوگوں کی ضرورت ہے جیسے بھی کام کر رہے ہیں کرنے دینا چاہئے۔ میں نے پنجاب کے دورے کی تیاری کا ان کو شیڈول پیش کیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کا پہلا تنظیمی اجلاس

پارٹی چیئرمین بیگم نصرت بھٹو نے مجھے خاص طور پر پنجاب کا تنظیمی اجلاس بلانے کا کہا۔ ان کا کہنا تھا کہ پیپلز پارٹی پنجاب لوگوں کو زندہ نظر آنی چاہئے۔ اجلاس میں خواہ چند لوگ ہی آئیں تم جلد از جلد اجلاس منعقد کرو۔ میں پنجاب کے تمام ضلعی صدروں کو خطوط تحریر کر کے کچھ کارکنوں کو ان کے شہروں میں بھیجا۔ ان صدروں کو میرا پیغام تھا کہ وہ مقررہ تاریخ کو پارٹی کے قائم مقام سیکرٹری جنرل ملک سعید حسن کے دفتر جو ہائی کورٹ کے قریب واقع ہے وہاں پہنچ جائیں۔ میں اجلاس کی اصل جگہ خط میں تحریر کرنا خلاف مصلحت خیال کیا تھا۔ ہر شہر میں تنظیمی عہدہ دار فوجی عدالتوں کے خوف سے روپوشی اختیار کئے ہوئے تھے۔ بڑی مشکلوں کے ساتھ ان لوگوں کے ساتھ رابطہ پیدا کیا گیا تھا۔ ہر طرف فوجی حکمرانوں اور انتظامیہ نے خوف و ہراس مسلط کر رکھا تھا اس کے باوجود بڑی بھاری تعداد میں پارٹی کے عہدہ دار اور نمایاں قسم کے کارکن مقررہ تاریخ کو ملک سعید حسن کے دفتر

آنا شروع ہو گئے۔ میں نے اجلاس رحمان پورہ اچھرے کے ایک بوسیدہ مکان میں کرنا طے پایا تھا۔ وہ شکستہ قسم کا بے آباد گھر پارٹی کے ایک ہمدرد کارکن میاں احمد کا تھا۔

طریقہ یہ اختیار کیا گیا تھا۔ ہمارے کارکن تنظیمی عہدے داروں کو گاڑیوں میں بڑے رزادارانہ طریقے سے سوار کرا کر رحمان پورے لے جاتے تھے۔ اس طریقے کے ساتھ تمام عہدے داروں کو اجلاس گاہ پہنچا دیا گیا اور دوپہر بارہ بجے کے قریب اجلاس کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ راولپنڈی سے قاضی سلطان محمود اور کچھ دوسرے لوگوں نے اجلاس میں شرکت کی تھی۔ اس لئے کہ وہاں کے تمام بڑے عہدہ دار گرفتار ہو چکے تھے۔ قاضی سلطان محمود آجکل پارٹی کی سینٹر کمیٹی کے رکن ہیں بڑے بہادر انسان ہیں۔ ہمارا یہ اجلاس ایک طرح انڈر گراؤنڈ سرگرمی کی طرح کا تھا۔ جس کو خفیہ اجلاس بھی کہا جا سکتا ہے۔ کارکنوں کی گرفتاری کا انتہائی خوف لاحق تھا۔ جس کی وجہ سے زیادہ تقریر بازی سے پرہیز کیا گیا تھا۔ مجھے بیگم صاحبہ کا حکم تھا کہ جلدی جلدی قراردادیں منظور کروا کر اجلاس کو رازداری کے ساتھ ختم کر دیا جائے۔ کوئی عہدہ دار یا کارکن گرفتار نہ ہونے پائے۔ ان کی تاکید تھی کہ حکومت کو اجلاس کے بعد اجلاس کی خبر ہونی چاہئے۔ میں نے پروگرام کے مطابق تمام قراردادوں کی اجلاس سے منظوری حاصل کی۔ اس سے پہلے بہت مختصر خطاب ملک سعید حسن اور میں نے کیا، اور کارکنوں کو مختصر انداز میں اپنی تجاویز پیش کرنے کی دعوت دی۔ ان سے پوچھا گیا کہ ہم کس طریقے سے وزیراعظم بھٹو کو جیل سے رہا کرا سکتے ہیں۔ ہمارے اجلاس کا یہ سلسلہ بڑے رازدارانہ طریقے سے جاری تھا کہ وہاں بھی ایک شخص میاں جمیل اختر کی طرح اٹھ کر شور شرابا کرنے لگ گیا۔ اس کا نام دریاب یوسف تھا جو مزدوروں میں کام کیا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ باہر نکلو چھپ کر کیوں اجلاس کرتے ہو۔ سڑکوں پر آؤ۔

جیل کو توڑو۔ پولیس کی اور فوج کی گاڑیاں جلاؤ وغیرہ وغیرہ۔ اس کی باتوں سے تمام لوگ حیران اور خوفزدہ ہو گئے۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ کو کس نے بلایا ہے۔ میں نے تو آپ کو بلایا ہی نہیں ہے۔ میری اس بات سے وہ صاحب بلند آواز سے یہ کہہ کر واک آؤٹ کر گئے کہ میں اس خفیہ اجلاس میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔ ہم نے اس کے جانے کے ساتھ ہی اجلاس ختم کر دیا۔ تمام عہدے دار پیدل ہی اِدھر اُدھر نکل گئے۔ بے آباد مکان خالی کر دیا

گیا۔ ہمارے وہاں سے نکلنے کے فوراً بعد بڑی بھاری تعداد میں وہاں پولیس گاڑیوں میں پہنچ گئی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ دوسرے دن پیپلز پارٹی کے لوگوں کو ڈرانے کے لئے حکومت کے لوگوں نے اخباروں میں خبریں شائع کروا دیں کہ لاہور میں پیپلز پارٹی تخریب کاری کرنے کے لئے خفیہ اجلاس بلا رہی ہے۔ پولیس تمام لاہور میں تخریب کاروں کو گرفتار کرنے کے لئے چھاپے مار رہی ہے۔

ہمارا مقصد اس اجلاس سے پورا ہو چکا تھا۔ ہم نے اجلاس کی تمام کارروائی اخباروں کو بھیج دی۔ مساوات اخبار میں ہماری قراردادوں کے مکمل متن شائع ہو گئے۔ ان حالات میں یہ ایک بڑا کامیاب اجلاس تھا۔ جس پر بیگم صاحبہ اور بھٹو صاحب بہت خوش ہوئے تھے۔

آج میں سوچتا ہوں کہ بھٹو صاحب جیسے عظیم انسان کس طرح بے چارگی کے عالم میں تھے کہ وہ ہماری اس معمولی سی جدوجہد پر شاباش بھیج رہے تھے۔

پیٹریاٹ ڈیموکریٹک لائیرز الائنس کا قیام

اس کے ساتھ ہی میں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ میاں سلیم جہانگیر اور میجر صاحب اتفاق سے یہاں موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے ساتھ آپ کی موجودگی میں کچھ باتیں طے پا لی جائیں۔ بیگم صاحبہ ہم تینوں کو کھگا ہاؤس کے اندر کے کمرے میں لے گئیں۔ میجر صاحب کے ساتھ میاں سلیم جہانگیر کی رائے کے مطابق طے پایا تھا کہ پنجاب کی سطح پر تمام جمہوریت پسند وکلاء کا پلیٹ فارم بنایا جائے۔ جس کی صدارت پیپلز پارٹی کو نہ دی جائے۔ تاکہ حکومت اس تنظیم پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس تنظیم کا نام پیٹریاٹ ڈیموکریٹک لائیرز الائنس رکھا گیا تھا۔ جس کا صدر میاں سلیم جہانگیر کو بنایا گیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ میں نے بیگم صاحبہ سے عرض کیا کہ پارٹی کے اندر سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگ آپ کو اس تنظیم کے خلاف صرف ایک بات کہیں گے کہ پیپلز پارٹی کے آدمی کو صدر نہیں بنایا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ نیک نیتی کے ساتھ بھی یہ اعتراض کریں گے۔ بیگم صاحبہ نے کہا۔ آپ لوگ جلد از جلد اس تنظیم کا اعلان کریں اور کام شروع کر دیں۔ مجھے حکم کیا گیا کہ میں میاں سلیم جہانگیر کے ساتھ رابطہ رکھوں اور تمام پیپلز پارٹی کے وکلاء کو ان کا ساتھ دینے کا کہوں۔ اس تنظیم کے منظرِ عام پر آنے سے پیپلز پارٹی

www.bhutto.org

کو سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا تھا کہ اس وکلاء الائنس میں تمام ترقی پسند سیاسی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے وکلاء حضرات بھی شامل ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے وزیر اعظم بھٹو کی رہائی کی تحریک میں بڑا وزن پیدا ہو گیا تھا۔

اس تنظیم کی تحریک کی وجہ سے اب یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ بھٹو صاحب کی رہائی کے لئے صرف پاکستان پیپلز پارٹی کے وکلاء ہی جدوجہد کر رہے ہیں۔ بلکہ یوں نظر آنے لگ گیا تھا کہ پاکستان کے تمام وکلاء بھٹو صاحب کی رہائی کی جدوجہد میں شریک ہو گئے ہیں۔ لاہور بار میں صرف جماعت اسلامی کے وکلاء مسلم لیگ اور تحریکِ استقلال اور نیشنل عوامی پارٹی اور پی۔ ڈی۔ پی کے وکلاء ہماری جدوجہد کے خلاف تھے۔ جن کی سیاسی طور پر عوام میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ریٹائرڈ جسٹس شیخ شوکت علی کی بھی پیپلز پارٹی میں آمد اسی وکلاء تحریک کی ہی ایک کڑی تھی۔ ان خطرناک حالات میں شیخ شوکت علی کو پارٹی میں شامل کرنا پارٹی کی قوت اور مقبولیت کو ثابت کرنا مقصود تھا۔ اس وقت عوامی سطح پر جلسہ جلوس کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ مگر وکلاء کا پلیٹ فارم ایک بہت موثر پلیٹ فارم تھا اور پیٹریاٹ ڈیموکریٹک لائیرز الائنس کی وجہ سے یہ پلیٹ فارم بڑی شہرت اختیار کر گیا تھا۔ خصوصی طور پر میاں سلیم جہانگیر جیسے انقلابی دانش ور کی صدارت کی وجہ سے وکلاء بہت فعال ہو گئے تھے۔ ان وکلاء حضرات میں ملک سعید حسن ایڈووکیٹ، ریحانہ سرور ایڈووکیٹ، طلعت یعقوب ایڈووکیٹ، چوہدری لیاقت حسین وڑائچ، اسلم خان ایڈووکیٹ جواب جج بن چکے ہیں۔ ملک مسعود ایڈووکیٹ، راجہ ذوالقرنین ایڈووکیٹ، نسیم کاشمیری ایڈووکیٹ، چوہدری محمد اشرف ایڈووکیٹ، اشرف خاں ایڈووکیٹ، ملک منصور ایڈووکیٹ، ایس۔ ایم۔ مسعود ایڈووکیٹ، میاں عبدالستار نجم ایڈووکیٹ، عارف اقبال حسین بھٹی ایڈووکیٹ، ملک غلام رسول ایڈووکیٹ، لطیف ایاز ایڈووکیٹ، جاوید بشر جو جج بن چکے ہیں، ملک منظور ایڈووکیٹ، ملک محمد حسین، رانا ارشد، افتخار شاہد ایڈووکیٹ، ارشد بٹ ایڈووکیٹ یہ تمام لوگ پیٹریاٹ ڈیموکریٹک لائیرز الائنس کے روحِ رواں تھے۔

میری 60 سالہ بڑی بہن سرور بیگم اور میری بھانجی فردوس کی گرفتاری

وزیر اعظم بھٹو راولپنڈی جیل میں قید تھے۔ ہماری خواہش اور کوشش تھی کہ راولپنڈی میں

www.bhutto.org

عوامی مظاہرے ہر صورت ہوتے رہنے چاہئیں۔ مگر جب راولپنڈی میں شاعر راشد ناگی اور عبدالوحید قریشی نے اپنے جسموں کو نذرِ آتش کر کے خود کو قائدِ عوام پر قربان کر دیا تو مارشل لاء حکومت نے راولپنڈی کو مکمل طور پر فوج اور پولیس کے گھیرے میں محصور کر دیا۔ ہر چوراہے پر فوج اور پولیس کھڑی کر دی۔ ماحول اس قدر خوف و ہراس کا شکار بنا دیا گیا کہ سڑکوں پر لوگوں کا چلنا پھرنا مشکل بنا دیا گیا۔ جہاں کچھ لوگوں کو سڑک پر پولیس کھڑا دیکھتی تھی ان کو فوراً وہاں سے چلے جانے کا حکم دے دیتی تھی۔ پارٹی کارکن خوف و دہشت کے مارے پنڈی شہر ہی چھوڑ کر اِدھر اُدھر چلے گئے تھے۔ لاہور میں میں نے بیگم صاحبہ کو اس معاملے میں بڑا متفکر پایا۔ وہ بھٹو صاحب سے پنڈی جیل میں مل کر آئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بھٹو صاحب کہتے ہیں کہ پنڈی شہر میں جبکہ وہ پھانسی کوٹھڑی میں قید ہیں یہاں کم از کم تھوڑی بہت تحریک جاری رہنی چاہئے۔ مارشل لاء حکام کو ان کو سزا دینے کے لئے کھلا ہاتھ نہیں دینا چاہئے۔ بیگم صاحبہ کی یہ بات بے حد درست تھی۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس وقت کوئی کارکن میسر ہی نہیں تھا جس کو مظاہرے کے لئے کہا جائے۔ میں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ آپ اگر اجازت دیں تو میں خود پنڈی جا کر مظاہرہ کرنے اور گرفتاری دینے کے لئے تیار ہوں۔ بیگم صاحبہ اور محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ نے مجھے سختی سے منع کیا کہ تم نے کسی قیمت پر گرفتاری نہیں دینی۔ پارٹی کے صدر کا عہدہ خالی نہیں ہونا چاہئے۔ خواہ حالات کچھ بھی ہو جائیں تم گرفتاری مت دینا۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ جو لوگ گرفتار ہو کر جیل چلے جاتے ہیں وہ غلط کر رہے ہیں۔ لوگوں کے باہر رہنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جب کبھی اصل وقت آئے تو پارٹی کا کوئی شخص باہر ہی نہ ہو اور حکومت آسانی کے ساتھ جو چاہے وہ کرتی چلی جائے۔ لہٰذا مجھے حکم ہوا کہ راولپنڈی میں مظاہرہ ضرور ہونا چاہئے۔ ہمارا فیصلہ ہوا کہ خواتین سے مظاہرہ کرایا جائے۔ خواتین کے مظاہرے کی شکل میں دنیا پر زیادہ اثر ہوگا۔ مارشل لاء حکومت زیادہ بدنام ہوگی۔ خواتین کو اگر گرفتار کیا جائے گا تو دنیا میں مارشل لاء حکومت کی بربریت کھل کر سامنے آجائے گی اور ضیاء الحق کی چادر اور چار دیواری اور اسلام پسندی کا بھانڈہ چوراہے پر پھوٹ جائے گا۔

میری سب سے بڑی ہمشیرہ سرور بیگم اور ان کی بیٹی فردوس بی بی کے ذریعے میں مختلف لوگوں کے ساتھ اپنا رابطہ پیدا کرتا تھا۔ میں نے ان سے پارٹی کی خواتین ورکروں کو تلاش کرنے کا

کہا۔وہ دن بھر کوشش کرتی رہیں مگر ان کو کوئی ایسی خواتین ورکر نہ مل سکی جو مظاہرے کے لئے خود کو پیش کرنے کی خواہش ظاہر کرتی۔

سپریم کورٹ میں بھٹو صاحب کے مقدمے کی سماعت جاری تھی۔ ہماری خواہش تھی کہ سپریم کورٹ کی سماعت کے دوران راولپنڈی میں عوامی احتجاج کا مظاہرہ ضرور جاری رہنا چاہئے۔ راولپنڈی میں اس وقت دنیا بھر کے اخبار نویس جمع تھے اس احتجاج سے ایک تو پوری دنیا تک بھٹو صاحب کی خبر پہنچنا آسان تھی دوسرا سپریم کورٹ کے ججوں پر بھی عوامی خواہشات کا اظہار پہنچانا ضروری تھا۔ججوں کے دماغوں کو عوامی ردعمل سے متاثر کرنا ضروری تھا۔

میری ہمشیرہ سرور بیگم بہت بہادر خاتون ہیں اور بڑی معاملہ فہم بھی ہیں۔انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اس وقت خواتین مظاہرہ کرنے سے بے حد خوف کھا رہی ہیں۔اگر ایک آدھ مظاہرہ کر دیا جائے تو ان کا خوف دور ہو سکتا ہے۔میں ساٹھ سالہ بوڑھی عورت ہوں۔میں زیادہ بھاگ دوڑ بھی نہیں کر سکتی ہوں۔میرے لئے مظاہرہ کرنا زیادہ آسان ہے۔تمہارے رابطے کے کام کے نئے کچھ دوسری خواتین ورکر بھی موجود ہیں مگر مارشل لاء کا خوف لوگوں کے دلوں سے دور کرنا انتہائی ضروری ہے۔اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اپنے قائد کی جان بچانے کے لئے کوئی کسر باقی نہ چھوڑو۔ جب تمہارے گھر سے جدوجہد اور قربانی کی مثال قائم ہو گی تو لوگوں کے دلوں میں تحریک کے بارے میں یقین اور حوصلہ پیدا ہو گا۔لوگ اس کام کے لئے خود آگے آنا شروع ہو جائیں گے۔

مجھے اسلام آباد میں ملک دوست محمد اعوان کے ساتھ رابطہ پیدا کرنا تھا۔ مجھے پارٹی کی طرف سے ہدایت تھی کہ ان کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھوں۔ میں اپنی بڑی ہمشیرہ سرور بیگم اور اپنی بھانجی فردوس بیگم کے ساتھ اسلام آباد پہنچ گیا۔اسلام آباد میں عوامی مظاہرہ کے سلسلے کا تمام نظام راجہ انور اور کچھ دوسرے لوگوں نے پیپلز ایکشن کمیٹی کے نام پر اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔راولپنڈی میں ہماری خاتون ایم۔پی۔اے ناصرہ کھوکھر خواتین کے مظاہروں کی انچارج تھیں۔ملک دوست محمد اعوان نے مجھے ناصرہ کھوکھر کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کا کہا۔ناصرہ کھوکھر کے ساتھ ملاقات پر راولپنڈی کی اصل صورت حال کا پتہ چلا۔لوگ راولپنڈی میں راجہ انور اینڈ کمپنی سے بری طرح خوف زدہ تھے۔ناصرہ کھوکھر کے گھر پر ملنے والے کارکنوں نے مجھے بتایا کہ یہاں لوگ راجہ انور کی

www.bhutto.org

وجہ سے ڈر چکے ہیں۔ راجہ انور ہر کارکن کو کہتا ہے کہ تم مٹی کا تیل چھڑک کر اپنے جسم کو آگ لگاؤ تمہیں فوری طور پر کمبل ڈال کر بچا لیا جائے گا۔ اس کی اس قسم کی باتوں نے کارکنوں کو خوفزدہ کر دیا ہے۔ حالت یہ ہو چکی ہے کہ کل کے مظاہرے کا اعلان کر دیا گیا ہے اور مظاہرہ کرنے کے لئے کوئی کارکن دستیاب نہیں ہو رہا۔ میرے لئے یہ صورتِ حال بڑی پریشان کن تھی۔ راجہ انور کے ایک ساتھی کارکن سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے راجہ انور کے ساتھ ملاقات کرانے کی بات کی۔ وہ کارکن دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے ایسا گیا کہ واپس ہی نہ لوٹا۔

ناصرہ کھوکھر کے مطابق طے پا گیا کہ کل صبح 10 بجے کے قریب صدر بازار کے چوک میں مظاہرہ ہوگا۔ ہم لوگ دائیں بائیں کھڑے ہو کر ورکروں کی حوصلہ افزائی کریں۔ اس طرح ہم تینوں بہن بھائی اور بھانجی بھی صدر بازار کے چوک میں صبح جا کر کھڑے ہو گئے۔ گیارہ بج گئے کوئی مظاہرہ دیکھنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ مساوات اخبار کا فوٹو گرافر اور دو ایک اخباری رپورٹر مجھے وہاں مل گئے۔ ان کے ساتھ کھڑے ہو کر ہم لوگ مظاہرہ کرنے والے کارکنوں کا انتظار کرتے رہے۔ مگر کوئی بھی مظاہرے کے لئے اس مقام پر نہ آیا۔ لوگ کافی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ اخباری کارکن بھی وہاں موجود تھے۔ بیرون دنیا کے فوٹو گرافر بھی وہاں موجود تھے۔ جب مظاہرے میں تاخیر ہونے لگ گئی تو اخبار نویسوں میں مایوسی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ مساوات کا فوٹو گرافر میرے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ لوگ پارٹی سے بڑے مایوس ہو رہے ہیں۔ مظاہرے کی باقاعدہ خبر شائع کی جا چکی تھی۔ مگر اب تک مظاہرے کے لئے کوئی یہاں نہیں پہنچا۔ ہر اخبار نویس کو کہا گیا تھا کہ خواتین کارکن احتجاجی مظاہرہ کریں گئیں۔ مگر کوئی خاتون کارکن سیاسی مظاہرے کے لئے دکھائی نہیں دے رہی ہے۔

فوٹو گرافر کی ان تمام باتوں کو سننے کے بعد میری ہمشیرہ صاحبہ نے مجھے کہا کہ اگر آج احتجاجی مظاہرہ کرنا ضروری ہے تو میں خود احتجاجی مظاہرہ کرنے جاتی ہوں۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی فردوس نے بھی ضد کی کہ میں امی کو اکیلے نہیں جانے دوں گی۔ میں خود بھی ان کے ساتھ مظاہرے میں شریک ہوں گی۔ ہم دونوں ماں بیٹی اکٹھے احتجاج کریں گی۔ اس مقام پر احتجاجی مظاہرے میں بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ لوگ بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ اگر چند منٹ اور تاخیر کی جاتی تو اخبار نویس بھی وہاں سے چلے جاتے۔

مجھے میری ہمشیرہ سرور بیگم نے اور بھانجی فردوس بیگم نے خدا حافظ کہا اور وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ چوک کی طرف چلنے لگ گئیں۔ چوک کے قریب پہنچ کر ان دونوں ماں بیٹی نے اپنی چادروں کے اندر چھپائے ہوئے پارٹی کے پرچم بلند کر کے جئے بھٹو کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ان دو ماں بیٹیوں کے جئے بھٹو کے نعرے یوں لگے کہ جیسے کسی نے قیامت کا صُور پھونک دیا ہو۔ ماحول کا تمام سناٹا چھٹ گیا۔ ایک دم ہنگامہ برپا ہو گیا۔

پولیس نے ان دونوں ماں بیٹی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ فوٹو گرافروں نے ان کی تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ زنانہ پولیس نے ان دونوں ماں بیٹی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر یہ دونوں ان کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتی رہیں۔ پولیس نے لوگوں پر لاٹھی چارج کرنا شروع کر دیا۔ آنسو گیس کے گولوں کا استعمال شروع ہو گیا۔ لوگوں نے ہر طرف جئے بھٹو کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ پولیس نے لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔

ان دونوں ماں بیٹی کے مظاہرے سے پورا صدر جام ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے جس جگہ سناٹا ہی سناٹا تھا وہاں پر اب کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں کچھ دور فاصلے پر کھڑا ہو کر یہ تمام منظر آخری لمحے تک دیکھتا رہا۔ پولیس ان دونوں ماں بیٹی کو گرفتار کر کے تھانہ صدر لے گئی۔ میں پروگرام کے مطابق مال پر مساوات کے دفتر پہنچ گیا۔ وہاں پر میں نے اخبار نویسوں کے ساتھ پریس کانفرنس کی۔ مارشل لاء حکومت کی غنڈہ گردی کی مذمت کی اور کہا کہ فوجی حکومت بھٹو دشمنی میں اندھی ہو چکی ہے۔ وہ خواتین کا بھی احترام نہیں کر رہی ہے۔ ان دونوں ماں بیٹی پر پولیس کے تشدد کی مذمت کی گئی۔ میں نے اخبار کے رپورٹر کے ذریعے تھانہ صدر میں ان دونوں ماں بیٹی کو کچھ ضروری سامان بھیجا۔ شام کو ان کا دو دن کا ریمانڈ فوجی عدالت سے پولیس لے آئی۔ ان سے پوچھا جاتا تھا کہ تم دونوں کو کس نے بھیجا ہے۔

ان دونوں ماں بیٹی کو دو دن تک تھانے میں یہ ترغیب دی جاتی رہی کہ تم بیان دے دو کہ تمہیں بیگم نصرت بھٹو نے گرفتاری دینے کے لئے بھیجا ہے۔ سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ پولیس راجہ انور وغیرہ کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ حکومت کی کوشش تھی کہ خود سوزی کرنے والوں اور گرفتاری دینے والوں کی تمام ذمہ داری بیگم نصرت بھٹو پر ڈال دی جائے۔

ہمشیرہ صاحبہ نے کہا کہ میں تو خود پارٹی کی لیڈر ہوں۔ یہ میری بیٹی ہے۔ مجھے کون گرفتاری

www.bhutto.org

دینے کے لئے بھیج سکتا ہے۔ ہم کو کسی نے نہیں بھیجا۔ ہم قایدِ عوام کی رہائی چاہتی ہیں۔ ہم نے ان کی رہائی کے نعرے لگائے ہیں۔ نعرے لگانا تو کوئی جرم نہیں ہے۔ دو دن بعد فوجی عدالت میں ان سے پوچھا گیا کہ تم دونوں نے نعرے لگائے تھے جئے بھٹو۔ میری ہمشیرہ میجر کو کہنے لگیں کہ آپ خود بھی تو جئے بھٹو کہہ رہے ہیں۔ اگر یہ جرم ہے تو پھر آپ کو بھی گرفتار کر لینا چاہئے۔ میجر مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ اور ان دونوں ماں بیٹی کو ایک ایک سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔ اور ان کو پہلے گجرات جیل بھیج دیا گیا اور کچھ دن بعد ان کو ملتان جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں پر ان دونوں ماں بیٹی نے اپنی قید کی معیاد پوری کی تھی۔ ہمشیرہ کو چونکہ پارٹی کی دوسری قیدی خواتین نے اپنی لیڈر بنالیا تھا۔ جس کی وجہ سے جیل میں اکثر انتظامیہ کے ساتھ ان کی جنگ رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے ہمشیرہ صاحبہ کی قید میں باری باری دو دو ماہ کا اضافہ کیا گیا۔ جس کی وجہ سے ان کو ان کی بیٹی اور دوسری پارٹی کی قیدی خواتین کے چار ماہ بعد رہا کیا گیا تھا۔

پوچھو ہو کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی خاک کے خس و خاشاک ہو گئے

شہیدِ عشقِ عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کے سات پروانے جل کر راکھ ہو گئے۔ دنیا کی تاریخ کا یہ انوکھا احتجاج تھا۔ جس کو چشمِ آدم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کتنا عظیم مقصد تھا ان دیوانوں اور فرزانوں کے پیشِ نظر۔ وہ اپنی جان قربان کر کے سفاک دل جنرل ضیاء الحق اور اس کے سیاہ دل ساتھی جنرلوں کی آنکھیں کھولنا چاہتے تھے کہ وہ دنیا کے ایک عظیم انسان کی قدر و منزلت کو پہچانیں۔ اپنے دنیاوی اقتدار کی ہوس پر قابو پائیں اور وزیر اعظم بھٹو کا سیاسی قتل کر کے انسانیت کا نقصان نہ کریں۔ اس لئے کہ بھٹو جیسے انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

اتنے ناداں تو نہ تھے جاں سے گذرنے والے
ناصح پند گرو راہ گذر تو دیکھو

مگر ظلم جب سر اٹھاتا ہے تو وہ عقل و خرد سے عاری ہوتا ہے۔ کفر جب سر اٹھاتا ہے تو ایمان اس کا سب سے پہلا ہدف ہوتا ہے۔ بدی جب سر اٹھاتی ہے تو نیکی اس کا سب سے پہلا شکار ہوتی ہے۔ جو لوگ قومیں فروخت کرتے ہیں اور وطن بیچتے ہیں ان کے نزدیک قومی رہنماؤں اور وطن پرستوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ تمام حکایتیں اپنی جگہ درست ہیں یہ تمام ضرب المثال

www.bhutto.org

اپنی جگہ صحیح ہیں مگر انسان اپنے اعلیٰ مقاصد کی جدوجہد کو ہرگز ہرگز ختم نہیں کر سکتے۔ انسانی تاریخ کا کمال ہی یہ ہے کہ اس کے ہر عہد میں نیکی بدی سے نبرد آزما رہی ہے۔ حق باطل سے ٹکراتا رہا ہے۔ آزادی غلامی کے خلاف بغاوت کرتی رہی ہے۔ انسان ظلم کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔ ظلم کے خلاف احتجاج کرتے رہے ہیں۔ جس طرح کہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا بہ امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

میں ان سات فرزندانِ جمہوریت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ جنہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر ہمارے لئے آزادی کی شمع کو روشن کیا۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ کچھ لوگ شہیدوں کے کفن بھی بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔ شہیدوں کے خون کا سودا کرتے ہیں۔ ان کی قربانیوں کی تجارت کرنے لگ جاتے ہیں۔ راجہ انور اینڈ کمپنی نے اس وقت کچھ اسی طرح کا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ جو لوگوں کی سمجھ سے ہی باہر تھا۔

راجہ انور اینڈ کمپنی کی سیاست

جہاں تک پارٹی کے ان سات جاں نثاروں کا تعلق تھا۔ ان لوگوں نے شہید بابا کے عشق اور ان کی محبت کی انتہا کے جذبے سے مغلوب ہو کر اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ انہوں نے کسی کے کہنے پر اپنے جسموں کو آگ نہیں لگائی تھی۔ ان میں سے کچھ جاں سوز اور جاں گداز کئی روز تک بسترِ مرگ پر نیم بسمل کی طرح تڑپ تڑپ کر دم توڑتے رہے تھے۔

فوجی حکومت ان سے ہر طریقے کے ساتھ پوچھتی رہی تھی کہ تم لوگوں نے کس کے کہنے پر خودسوزی کی ہے مگر وہ سچے پروانے تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ ان کو کسی نے بہلا پھسلا کر اس اقدام کے لئے تیار کیا تھا۔ ان کا بیان تھا کہ ہمارا کوئی نام نہیں۔ ہمارا نام ذوالفقار علی بھٹو ہے۔ بے شک ان کا نام ذوالفقار علی بھٹو ہی تھا۔ کیا ان کے لئے کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان لوگوں نے کسی کے کہنے سے ایسا کیا تھا۔ ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ ان لوگوں نے قربان گاہ تک جانے کی کچھ لوگوں سے ضرور بات کی تھی تا کہ کچھ پارٹی کے لوگ ان کی آتش بجانی اور خوں فشانی کے گواہ رہیں۔

www.bhutto.org

ہوا یوں کہ جب یہ پروانے جل کر خاک بن گئے تو راجہ انور نے بیان دیا کہ یہ تو ٹریلر ہے ابھی تو پوری فلم باقی ہے۔ اب عام لوگوں کے لئے یہ راجہ انور کی بات بڑی معنی رکھتی تھی۔ راجہ انور پارٹی کے اقتدار کے دور میں مرکزی حکومت کا او۔ ایس۔ ڈی رہا تھا۔ پارٹی کے اقتدار کے ختم ہو جانے کے باوجود وہ بہت اہم آدمی تھا۔ راجہ انور کے اوپر والے بیان نے پارٹی کی تنظیم اور پارٹی کے ورکروں کے احتجاجی مظاہروں کی تحریک کو ایک طرح کی بے معنی تحریک بنا دیا۔ کارکن اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ اگر راجہ انور کا ٹریلر یہ ہے تو اس ہدایت کار کی فلم کیا ہوگی۔ راجہ انور اس وقت لوگوں کے سیاسی تحریک کے سسپنس کا ہالی ووڈ کا ڈائریکٹر الفرڈ ہچکاک بن گیا تھا۔ مگر اس خوفناک بیان دینے کے باوجود راجہ انور کو گرفتار نہیں کیا جا رہا تھا۔ وہ اسلام آباد سے لاہور کھلے عام آتا جاتا تھا لوگوں سے ملتا تھا۔ اور ان کو ایک ہی بات کہتا تھا کہ اگلا ٹریلر دیکھنے والا ہوگا۔ پہلے تو یہ بات ہی اور یہ ترکیب ہی غلط تھی کہ معصوم سیاسی کارکن اپنے قائد پر اپنی جانیں نثار کر رہے ہیں اور یہ اہم شخص ان کی قربانی کو ٹریلر کہہ رہا تھا۔ کیا دنیا کی کوئی عقلمندی یا انسانیت یا شرافت اس بات کو جائز قرار دے سکتی تھی کہ ان لوگوں کی بھسم شدہ لاشوں کو ٹریلر کہا جاتا۔ لہٰذا پہلے تو یہ محاورہ ہی غلط تھا غیر انسانی تھا غیر سیاسی تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس الفرڈ ہچکاک راجہ انور کی سنسنی خیزی کی اصل فلم کو کب چلنا تھا اور کیسے چلنا تھا اور کہاں چلنا تھا۔ لہٰذا راجہ انور کے اس بیان نے ان مسکینوں کی خودسوزی کی قربانی کو بھی ماند کر دیا۔ عام کارکنوں کی تحریک کی تو بات ہی کچھ نہ رہی۔ عوام کی توقعات کا مدار بہت بلند ہو گیا۔ ہر شخص یہ بات کر رہا تھا کہ کوئی ایسا حادثہ ہوگا کہ جس سے کوئی قیامت برپا ہو جائے گی۔ لہٰذا اس کے اس بیان نے لوگوں کو ساکت و جامد کر دیا۔ لوگ اس سے آگے سوچنے کی قوت ہی نہیں رکھتے تھے۔ لوگ خود کو کمزور تصور کرنے لگ گئے۔ لوگ راجہ انور کی بڑ جو بڑا اس نے ٹریلر سے ہانکی تھی اس کی زد میں آ گئے۔ لوگ اس کی بڑک سے ڈر گئے۔ لوگ جلسہ جلوس کی حد تک سوچتے تھے۔ راجہ انور نے معاملے کو خودسوزی سے بھی آگے پہنچا دیا تھا۔ اتنا آگے کہ جو ان کی سوچ سے ہی باہر تھا۔ ان کی طاقت سے باہر تھا۔

اس طرح کے بیان سے ان جان پر کھیلنے والوں کے بھائی بہنوں پر کیا گذری ہوگی۔ گویا اُن غریبوں کی موت راجہ انور کا ٹریلر تھی۔ گویا ''کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری والی بات تھی۔''

www.bhutto.org

رائے حفیظ اللہ کا سیکرٹری جنرل بن جانا

غیاث الدین جاں باز جس کا کلیم تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ راجہ انور کے کہنے پر کر رہا ہے اور راجہ انور کے ساتھ اس کا ہر وقت رابطہ رہتا ہے۔ وہ رائے حفیظ اللہ خان کو بیگم نصرت بھٹو صاحبہ کے پاس لے کر گیا اور ان سے رائے حفیظ اللہ کو پنجاب کا سیکرٹری جنرل بنانے کا کہا۔ انہوں نے رائے صاحب کو سیکرٹری جنرل بنا دیا۔ رائے صاحب لاہور میرے پاس جاں باز کے ساتھ آئے۔ میں رائے صاحب کو جانتا تھا کہ وہ بہت عالی ظرف انسان ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ رائے صاحب اب میرے ساتھ شریکِ سیاست ہو گئے ہیں۔ مگر رائے صاحب بھی راجہ انور اور جاں باز کی باتوں سے بہت متاثر تھے۔

میری مشکلات میں اور اضافہ ہو گیا

راجہ انور کے کچھ لوگ اور رائے صاحب میرے پاس آئے۔ مجھے کہنے لگے کہ کچھ ایسے کارکن دو جو خود کو آگ لگانے کو تیار ہوں۔ یہ راجہ انور کا حکم ہے۔ میں نے رائے حفیظ اللہ سیکرٹری جنرل کو ان سے علیحدہ کر کے ان سے کہا کہ رائے صاحب اگر میرا بس چلے تو میں ضیاء الحق کو زندہ جلا ڈالوں۔ مگر میں اتنی طاقت نہیں رکھتا۔ میں تو ایک سیاسی کارکن ہوں سیاسی تحریک چلانے کی بات کر سکتا ہوں۔ میں کسی کو آگ لگانے کی یا لگوانے کی بات نہیں کر سکتا۔ میرے پاس ایسا کوئی کارکن نہیں ہے جو خود کو آگ لگانے کے لئے تیار ہو سکتا ہو۔ کیا آپ کوئی ایسے کارکن دے سکتے ہیں جو خود کو آگ لگانے کے لئے تیار ہوں۔ جہاں تک راجہ انور اور اس کے ساتھیوں کے جذبے کی بات ہے اس کی قدر کی جا سکتی ہے۔ مگر جہاں تک ''معروضی'' حقیقت پسندی کی بات ہے ان کا یہ جذبہ نا قابلِ عمل جذبہ ہے۔ اس سے لوگ ڈر جائیں گے۔ فائدے کی جگہ الٹا نقصان ہو گا۔

رائے حفیظ اللہ کچھ سوچ کر بولے کہ بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمارے پاس تو ایسا کوئی کارکن نہیں ہے جو ان کو اس مقصد کے لئے دیا جائے۔ میں نے جاں باز کو کہا کہ آپ تو جلنے جلانے پر یقین رکھتے ہیں آپ خود اپنے آپ کو آگ لگانے کے لئے پیش کیوں نہیں کرتے۔ کیا آپ بھٹو

www.bhutto.org

صاحب سے محبت نہیں کرتے۔ جاں باز کہنے لگا کہ لیڈر نیں جلدے ہندے۔ ورکر جلدے ہوندے نیں۔ اس طریقے سے رائے حفیظ اللہ میری باتوں سے متفق ہو گئے۔ ہم نے راجہ انور کے لوگوں کو صاف صاف کہہ دیا کہ ہم تمہاری اس ایکشن کمیٹی کے تابع نہیں ہیں۔ ہم وہی کچھ کریں گے جس کا ہم کو پارٹی کی قیادت بیگم نصرت بھٹو حکم کریں گی۔ اگر وہ ہم کو حکم کریں گی تو ہم خود خودسوزی کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔

لیکن راجہ انور کے ساتھی صفدر ہمدانی وغیرہ ہماری باتوں سے بے حد ناخوش ہوئے۔ ان لوگوں نے لوگوں کو کہنا شروع کر دیا کہ یہ لوگ لوگوں کو آگ لگانے سے منع کر رہے ہیں۔ کچھ پارٹی کے جذباتی ورکر ان کی باتوں کو سچ بھی خیال کرتے ہوں گے۔ مگر ورکروں کی اکثریت ان لوگوں کے کردار اور عمل پر شک کرتی تھی۔ وہ راجہ انور کو مشکوک آدمی خیال کرتی تھی۔

سیاسی کارکنوں کے لئے ایک مشورہ

میں چونکہ خود جدوجہد کی بھٹی سے گذرا ہوں۔ میں اپنے تجربے کے مطابق سیاسی کارکنوں کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ مشورے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر سیاسی کارکن کا ذہن اپنے مقاصد اور نظریات کے حوالے سے پاک صاف ہونا چاہئے۔ اس کو علم ہونا چاہئے کہ وہ کس بات کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر سیاسی کارکن کو اپنی محدودات کے مطابق جدوجہد کا بوجھ اٹھانا چاہئے۔ اپنی طاقت اور بساط کے مطابق کام کرنا چاہئے۔ تیسری بات یہ ہے کہ کسی بھی سیاسی کارکن کو نہ تو بلاوجہ بہادر بننا چاہئے اور نہ بلاوجہ بزدلی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ حالات کے مطابق کام کرتے رہنا چاہئے۔ بلاوجہ کے ایڈونچرازم سے گریز کرنا چاہئے۔

سیاسی جدوجہد میں جو شخص بھی ایڈونچرازم کی بات کرے، انتہا پسندی کا نعرہ مارے اس شخص سے بے حد محتاط رہا جائے۔ اس کے کردار کا بغور جائزہ لیا جائے۔ اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ کیا یہ شخص اپنی بے وقوفی یا حماقت سے ایسے نعرے مار رہا ہے یا حکومت کی جانب سے پلانٹیڈ آدمی ہے۔ جو ورکروں کو اکسا کر غلط اقدام پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔

یہ بات یاد رکھی جائے کہ ہر ناجائز فوجی حکومت سیاسی جماعتوں کی تحریکوں کو غلط راہ پر ڈالنے کے لئے اپنے مخبروں اور ٹاؤٹوں سے ورکروں سے ایسے غلط کام کروایا کرتی ہے۔ جس سے سیاسی

جماعت پر فوجی حکومت کو ہاتھ ڈالنے کا موقعہ ہاتھ آجایا کرتا ہے۔ کارکنوں سے توڑ پھوڑ اور تشدد کے واقعات کروا دیئے جاتے ہیں۔ بعد میں فوجی حکمران لاء اینڈ آرڈر کے نام پر سیاسی کارکنوں کو لاٹھیاں اور کوڑے مارنے کا جواز پیدا کیا کرتی ہے۔

بلکہ طیارے تک خود اغواء کرایا کرتی ہے۔ جس طرح گنگا طیارہ ہندوستان کی حکومت نے 1970ء میں خود اغواء کرا کر لاہور بھیجا تھا تا کہ ہندوستان کو پاکستان پر فوجی کارروائی کرنے کا جواز ہاتھ آسکے۔ جس طرح جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت نے کراچی کے الذوالفقار تنظیم کے نام پر پاکستان کا مسافر جہاز اغواء کرا کے کابل بھیجا تھا جس میں راجہ انور بھی شریک تھا۔ تا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو ایک دہشت گرد پارٹی ثابت کیا جائے، اور اس پر پابندی لگائی جا سکے، اور اس کے لیڈروں پر غداری اور قتل کے مقدمے بنا دیئے جائیں اور اس کے ورکروں کو جیلوں میں ڈال دیا جائے اور پارٹی کو ختم کر دیا جائے۔ یہ تو پارٹی کی قیادت بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بےنظیر بھٹو اور پارٹی کے کارکنوں کی ہمت تھی کہ جنرل ضیاء الحق اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی جدوجہد کی تاریخ کے حوالے سے آج ہر چیز منظرِ عام پر آچکی ہے۔ میر مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ کابل جانے والے تقریباً تمام سیاسی کارکنوں کو ضیاء الحق کی حکومت نے پھانسی پر چڑھا دیا تھا جو زندہ بچے تھے ان کو شاہی قلعے اور جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ ان میں سے کچھ آج تک جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر راجہ انور پاکستان میں زندہ سلامت ہے اور اسلام آباد میں عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہا ہے اور آج میاں شہباز شریف کے معاونِ خصوصی کے طور پر کام کر رہا ہے۔

فیصل آباد کے غیاث الدین جاں باز، ممتاز کاہلوں، امان اللہ خان، فضل حسین راہی جو انتہا پسندی میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے فوج کے اشارے پر محترمہ بےنظیر بھٹو کی قیادت کے خلاف بغاوت کی۔ پہلے شہید بھٹو کے نام پر رانا شوکت محمود کے ساتھ مل کر (ش۔ب) ایک فرضی پارٹی بنائی بعد میں فوج کے ایجنٹ فاروق لغاری جیسے غدار کے ساتھ مل کر انتخابات میں حصہ لیا۔

ان حقائق کو بیان کرنے کا ایک ہی مقصد ہے کہ سیاسی کارکنوں کو غلط اور صحیح کی تمیز کرنے کا اہل ہونا چاہئے اور کسی قیمت پر کسی ایجنٹ پرووکیٹر کی سازش کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ جو شخص سب سے تیز نعرہ مارے اس پر کڑی نظر رکھنی چاہئے۔

www.bhutto.org

بیگم بھٹو سے آخری ملاقات اور راولپنڈی کے اردگرد رہنے کا منصوبہ

میرے پاس نہ تو کوئی تنظیم تھی اور نہ ہی ذرائع تھے۔ حالات اس قدر مخدوش تھے کہ کہیں پیغام رسانی کے لئے کوئی کارکن دستیاب نہیں تھا۔ ہر انسان کے پاس مجھے خود ہی پہنچنا پڑتا تھا۔ چند ایک راجہ انور اینڈ کمپنی کے کارکن ہر طرف منڈلاتے پھرتے تھے ان پر لوگ اعتبار نہیں کرتے تھے۔ میری آخری ملاقات فروری 1978ء کے آغاز میں بیگم صاحبہ کے ساتھ اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ رائے حفیظ اللہ بھی میرے ساتھ تھے۔ بیگم صاحبہ نے مجھے کہا کہ میں تمہاری کچھ مالی مدد کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے بیگم صاحبہ کو کہا کہ مہربانی کر کے آپ میری مالی مدد نہ کریں۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کر رہا ہوں جس کے لئے مجھے رقم کی ضرورت ہو۔ میں تو بسوں اور ویگنوں میں بیٹھ کر ایک شہر سے دوسرے شہر جاتا ہوں۔ کچھ زیادہ خرچ بھی نہیں آتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ سی۔ آئی۔ ڈی کو بھی علم نہیں ہو پاتا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے کہا کہ تم ایک تنہا ایسے کارکن ہو جو روپے پیسے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہو۔ ورنہ ہمارے پاس تو جو بھی آتا ہے۔ وہ پہلی بات فنڈز کی ہی کرتا ہے۔ میں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ اس وقت حالات سنگین سے سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں۔ حکومت کی کوشش ہے کہ ہر متحرک کارکن کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا جائے۔ حکومت صرف دو نمبر کے سیاسی کارکنوں کو باہر رکھنا چاہتی ہے۔ میں نے ان کو کہا کہ مجھے یقین ہے۔ حکومت بہت جلد آپ کو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو نظر بند کر کے کسی ایک جگہ پر کسی مکان میں نظر بند کر دے گی۔ آپ کے ساتھ کسی کارکن کا ملنا جلنا باقی نہیں رہے گا۔ میری تجویز یہ ہے کہ ہم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ راولپنڈی میں رہنا چاہئے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں راولپنڈی ضلع کا دورہ کروں۔ زیادہ سے زیادہ اس ضلع کو متحرک کروں تا کہ قائد عوام کے حالات سے باخبر رہوں۔ بیگم صاحبہ نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ میں نے مستقل طور پر پنڈی میں ڈیرہ جما لیا ہے۔ البتہ محترمہ بے نظیر کو متحرک رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بہتر ہے کہ تم سب سے پہلے ضلع راولپنڈی کا ہی دورہ کرو اور کارکنوں کے ذہنوں سے اس غلط ہی کو دور کرو جو کچھ لوگ اپنی بزدلی کی بناء پر ان کے ذہنوں میں ڈال رہے ہیں کہ بہت جلد قائد عوام ان کے درمیان موجود ہوں گے۔ اس طرح کا بیان ان دنوں غالباً غلام مصطفیٰ جتوئی اور عبدالحفیظ پیرزادہ وغیرہ کی طرف سے اخباروں میں پڑھنے کو آیا تھا۔ ان کا مجھے

مشورہ تھا کہ کارکن زیادہ سے زیادہ جیل سے باہر رہیں اور راولپنڈی میں موجود رہیں۔ تاکہ اگر کبھی بھی ان کی ضرورت پڑے تو وہ پارٹی کو دستیاب ہوسکیں۔ خود میری یہ کوشش تھی کہ اگر سپریم کورٹ بھٹو صاحب کے خلاف فیصلہ دے تو راولپنڈی میں اس غلط فیصلے کے خلاف ایک بہت بڑا جلوس نکال دیا جائے اور اس جلوس کا رخ پنڈی جیل کی طرف کر دیا جائے۔ تاکہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف عوام اپنے فیصلے کا اعلان کرسکیں۔ میرا منصوبہ جیل کے باہر جلسہ کرنے کا تھا۔

بیگم صاحبہ نے میری تجویز کو بہت پسند کیا۔ میں نے اور رائے حفیظ اللہ نے جہلم شہر اور ٹیکسلا شہر کے دورے کا بندوبست کیا۔ دونوں شہروں کے ذمہ دار لوگوں کے ساتھ ہماری بات ہوگئی۔ ہم نے جہلم اور ٹیکسلا ضلع کی تنظیموں کے ساتھ باقاعدہ رابطے کر کے تنظیمی دورے کی تاریخ کا اعلان کیا۔ اس اعلان میں پہلے جہلم اور دوسرے دن ٹیکسلا جانا قرار پایا گیا۔

جہلم میں راجہ انور اینڈ کمپنی کی ہمارے خلاف بغاوت

رائے حفیظ اللہ چونکہ جاں باز وغیرہ کی وجہ سے راجہ انور اینڈ کمپنی کی ایکشن کمیٹی سے بہت متاثر تھا۔ رائے کا مجھے کہنا تھا کہ ایکشن کمیٹی کے لوگوں کے ساتھ رابطہ کر کے تنظیمی دورے پر جانا چاہئے اور دورے کا تمام انتظام ایکشن کمیٹی کے سپرد کر دینا چاہئے۔ میں نے رائے حفیظ اللہ سے سخت اختلاف کیا۔ میں نے رائے صاحب کو کہا کہ جس طرح کی شتر بے مہار سیاست راجہ انور کی ایکشن کمیٹی کر رہی ہے اس کی ذمہ داری میں اور آپ کس طرح اپنے سر لے سکتے ہیں۔ اس بات کا فیصلہ بیگم صاحبہ کے ساتھ ہو چکا ہے کہ ایکشن کمیٹی اپنا کام کرے گی اور تنظیم اپنا علیحدہ سیاسی سفر جاری رکھے گی۔ میں بہ حیثیت صدر آپ کی بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرا فیصلہ ہے کہ ہم ایکشن کمیٹی کے لوگوں سے علیحدہ رہ کر پارٹی کے ساتھ اپنے رابطہ پیدا کریں گے۔ اور آپ کو بطور سیکرٹری جنرل پنجاب میری بات کو تسلیم کرنا ہوگا۔ رائے صاحب نے نیم دلی کے ساتھ میری بات کو تسلیم کر لیا۔ میری بات کی صداقت کا احساس رائے صاحب کو جہلم جا کر ہوا۔ جہاں پر پارٹی کے سنجیدہ کارکنوں نے راجہ انور کے لوگوں کو میٹنگ سے نکل جانے کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

ہم جب جہلم پہنچے تو پارٹی کے بھاری تعداد میں کارکنوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ان کارکنوں

www.bhutto.org

میں اکثریت جہلم اور پنڈ دادن خان کے وکلاء کی تھی۔ جہلم میں اس روز سخت بارش تھی جس مکان میں ہم نے پارٹی کا اجلاس کیا اس کی چھت بری طرح ٹپک رہی تھی۔ یقیناً وہ ایک غریب سیاسی کارکن کا گھر تھا۔ اجلاس کی کارروائی کے شروع ہونے کے ساتھ ہی لوگوں نے ایکشن کمیٹی کے بارے میں مجھ سے سوال کرنے شروع کر دیئے کہ پارٹی کا صدر ہم کو بتائے کہ اس ایکشن کمیٹی کی کیا حیثیت ہے۔ ایک کارکن جو غالباً وکیل تھا جس کا نام ملک ممتاز تھا یا راجہ ممتاز تھا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ ایکشن کمیٹی لوگوں کو بے حد پریشان کئے ہوئے ہے۔ اس کے کارندے لوگوں کے پاس جاتے ہیں ان کو آگ لگانے کے لئے کہتے ہیں۔ لوگوں کو باقاعدہ خوف زدہ کر دیتے ہیں۔ جب لوگ آگ لگانے سے جواب دے دیتے ہیں تب یہ ان کو فنڈ دینے کا کہتے ہیں۔ لوگ ان کو نقد فنڈ دے کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تقریر پر ایکشن کمیٹی کے ایک دو کارندوں نے آگے سے جواب دینے کی کوشش کی جس کو تمام حاضرین اجلاس نے ناپسند کیا اور ان کو اجلاس سے باہر نکل جانے کو کہا۔ میں نے کارکنوں کی نعرہ بازی میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ آپ ان لوگوں کے طریقہء کار سے اختلاف رکھتے ہیں۔ جس کا آپ نے اظہار کر دیا ہے۔ مہربانی کر کے ان لوگوں کو اجلاس سے باہر نکل جانے کا مت کہیں۔ مگر ان دو یا تین ایکشن کمیٹی کے کارندوں کے اپنے پاؤں ہی نہیں تھے وہ وہاں سے بائیکاٹ کا کہہ کر خود ہی باہر چلے گئے۔

رائے حفیظ اللہ جو میری بات سے دل سے اتفاق نہیں کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو ایکشن کمیٹی سے علیحدہ رہنا چاہیئے۔ اس اجلاس میں کارکنوں کی باتوں سے ان کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ کارکنوں نے تقریروں میں بتایا کہ یہ لوگ فنڈ مانگتے اور کہتے ہیں کہ اسلحہ خریدنا ہے، بندوقیں خریدنی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ رائے حفیظ اللہ کارکنوں کے انکشافات سے بہت پریشان ہوئے۔ کہنے لگے کہ یہ تو بڑی خطرناک باتیں کرتے ہیں۔ آپ سچ کہتے ہیں کہ ان سے دور رہنا چاہیئے۔

میں نے اجلاس میں موجود وکلاء اور کارکنوں کو کہا کہ بہت جلد راولپنڈی میں پیپلز پارٹی کا ایک بڑا کنونشن کیا جائے گا۔ آپ سب کو اس میں دعوت دی جائے گی۔ آپ اس کنونشن میں شرکت کے لئے تیار رہیں۔ آپ کو جلد اطلاع کر دی جائے گی۔ جہلم شہر پنڈی کے قریب ہے۔ یہاں سے زیادہ سے زیادہ لوگ کنونشن میں آنے چاہئیں۔ بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کنونشن سے خطاب کریں گئیں، وغیرہ۔

ہر چند فوجی حکومت کے جبر و استبداد سے حالات انتہائی مخدوش تھے۔ مگر میں کارکنوں کا خوف دور کرنے کے لئے بڑی نارمل باتیں کرتا تھا۔ وگرنہ اس وقت اسلام آباد میں کسی کنونشن کا ہونا ناممکن تھا۔ میں ثابت کرنا چاہتا تھا کہ بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو ملک میں جمہوریت کی سیاست کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کسی قسم کی مسلح جدوجہد نہیں کرنا چاہتیں۔

ٹیکسلا شہر کا اجلاس اور میری مہم جوئی

جہلم کے کامیاب اجلاس کے دو دن بعد میں اور رائے حفیظ اللہ خان بذریعہ ویگن ٹیکسلا پہنچ گئے۔ کارکنوں نے شہر سے باہر ایک کوٹھی میں اجلاس رکھا ہوا تھا۔ یہ گھر ایک نیا تعمیر شدہ گھر تھا۔ جس کے ارد گرد دور تا حدِ نظر تک گندم اُگی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے صحن میں جلسے کی طرز کا اجلاس تھا۔ تلاوت کے بعد ایک نابینے شاعر نے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا اپنا کلام سنایا۔ اس کی آواز بڑی پُرسوز اور اس کا ترنم بڑا دلگداز تھا اور اس کا کلام بھی بڑا برمحل اور بامعنی تھا۔ اس کی غزل کے چند شعر مجھے آج تک یاد ہیں۔ ملاحظہ کریں۔ اس کا شعر تھا۔

دونوں صبحوں کا عالم لوگ خود سمجھتے ہیں
کس قدر اندھیرا ہے کس قدر اُجالا ہے
ایک رات گذری ہے ایک رات آئی ہے
آپ تو یہ کہتے تھے دن نکلنے والا ہے

اجلاس میں کارکنوں نے بڑی تند و تیز تقریریں کیں۔ کارکنوں اور عہدہ داروں کی تقریروں کے بعد رائے حفیظ اللہ نے اور میں نے خطاب کیا۔ میں نے اپنے صدارتی خطاب میں کارکنوں کو راولپنڈی میں کنونشن کے لئے تیاری کرنے کا پیغام دیا۔ کارکن بخوبی سمجھتے تھے کہ میں کنونشن کا تو بس ایک مجبوری کی وجہ سے نام لے رہا ہوں۔ اصل میں پنڈی میں جلسہ کرنا مقصود ہے۔ جب میں تقریر کر رہا تھا تو باہر سڑک پر پولیس کی گاڑیاں جمع ہوتی صاف دیکھ رہا تھا۔ تقریر کے بعد کوٹھی کے ایک حصے میں چائے کا پروگرام تھا۔ ہم لوگوں کو میزبانوں نے کہا کہ آپ لوگوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ اہلِ خانہ نے مجھے کہا کہ پولیس نے مجھے بلا کر کہا ہے کہ ان دونوں لیڈروں کو ان کے سپرد کر دیا جائے۔ میزبان کا مجھے نام یاد نہیں رہ گیا۔ اس نے کہا کہ میں نے ڈی۔ ایس۔ پی کو کہا ہے کہ

چائے کے بعد جب وہ لوگ میرے گھر سے باہر آئیں گے تو آپ ان کو گرفتار کرلیں۔ میں نے میزبان کی بات سن کر رائے حفیظ اللہ کو کہا کہ رائے صاحب میں کسی قیمت پر گرفتاری نہیں دوں گا۔ اس نے مجھے کہا کہ آپ کس طرح یہاں سے گرفتاری سے بچیں گے۔ یہ باتیں ہم کوٹھی کے پچھلے حصے میں کھڑے ہو کر کر رہے تھے۔ جہاں پولیس ہم کو دیکھ نہیں سکتی تھی۔ میں نے کوٹھی کی چھوٹی سی عقب کی دیوار سے اوپر اٹھ کر دیکھا تو دور دور تک کھیت ہی کھیت تھے۔ میں نے رائے کو کہا کہ میں دیوار سے کود کر ان کھیتوں میں چل کر یہاں سے دور سڑک پر نکل جانا چاہتا ہوں۔ اس طرف سے پولیس بالکل بے خبر ہے۔

رائے حفیظ اللہ ہر چند میرے مقابلے میں بوڑھا انسان تھا۔ اس نے فوراً کہا کہ میں بھی تمہارے ساتھ یہاں سے جاؤں گا۔ میں بھی بیگم صاحبہ کے ساتھ کیا گیا وعدہ نبھاؤں گا۔ اس طرح بہت ہی مختصر سے وقت میں یعنی چند ہی منٹوں میں فیصلہ کر کے ہم دیوار سے باہر گندم کے کھیت میں نیچے اتر گئے۔ یہ بارانی زمین تھی۔ جس میں آسانی کے ساتھ پیدل چلا جا سکتا تھا۔ ہم دونوں فصلوں کے درمیان تقریباً دو گھنٹے پیدل چلتے رہے اور بالآخر سڑک پر پہنچ گئے۔ سڑک پر ایک ویگن کھڑی تھی۔ وہ ویگن ہم کو واہ کینٹ جانے والی سڑک کے سٹاپ پر لے آئی۔ ہم ابھی سڑک پر کھڑے ہی تھے کہ پیپلز پارٹی کے ایک ایم۔ این۔ اے کا بھائی کار میں وہاں سے گذر رہا تھا۔ وہ ہم لوگوں کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا نام تو یاد نہیں آ رہا۔ اس کے نام کے ساتھ سردار لگتا تھا۔ وہ ہمارے اس اجلاس میں موجود تھا۔ اس نے فوراً کار روک کر ہم کو کار میں بٹھا لیا۔ کار میں بیٹھتے ہی ایک فل بدیہہ شعر ہوا۔ رائے حفیظ اللہ بہت شعر فہم انسان تھا۔ میں نے یہ شعر اس کو سنایا۔ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ہر سمت ہی جب ہم پہ بہت تنگ تھیں راہیں

دیتے رہے ہم کو در و دیوار پناہیں

غالباً یہ کار والا شخص جس کے نام کے آغاز میں سردار آتا تھا ہمارے اس وقت کے سابق ایم۔ این۔ اے ملک اسلم شمس آبادی کا کوئی رشتہ دار تھا۔

کار والے کی زبانی ہم کو علم ہوا کہ پولیس نے گھر کی تلاشی لی۔ گھر کے مالک کو گرفتار کرلیا۔ گھر کے مالک نے بیان دیا کہ جب بہت سارے لوگ کوٹھی سے باہر نکلے تھے وہ دونوں اس ہجوم کے ساتھ ہی باہر نکل گئے تھے۔ وہ کدھر گئے ہیں اس کا مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ اس واقعے کے

دوسرے دن اخباروں میں خبر چھپی تھی کہ ڈی۔ ایس۔ پی واہ کینٹ جس کو ہماری گرفتاری کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اس کو معطل کر دیا گیا تھا۔

عالمِ نفسانفسی کا آغاز

اسلام آباد میں رائے حفیظ اللہ اور میں نے فیصلہ کیا کہ بہ یک وقت ہم دونوں ایک ساتھ سفر نہ کریں۔ تاکہ اگر ہم میں سے کسی ایک کو گرفتار کر لیا جائے تو دوسرا باہر جدوجہد کو جاری رکھ سکے۔ میں نے رائے حفیظ اللہ کو مشورہ دیا کہ وہ فیصل آباد ڈویژن جو پیپلز پارٹی کا گڑھ ہے اس کا تین دن کا دورہ کریں اور تین دن بعد لاہور میں اکٹھے ہونے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

رائے حفیظ اللہ کے جانے کے بعد میں فلش مین ہوٹل میں جا کر یحییٰ بختیار صاحب اور ملک دوست محمد اعوان سے ملا۔ ان کی زبانی علم ہوا کہ بیگم صاحبہ کو اسلام آباد والے گھر میں نظر بند کر دیا گیا ہے۔ ان سے اب کسی کی ملاقات ممکن نہیں رہی۔ میں رات کے وقت ہوٹل پہنچا تھا۔ ملک دوست محمد اعوان نے مجھے کہا کہ یہاں سی۔ آئی۔ ڈی کا سخت پہرہ ہے۔ وہ مجھے ہوٹل کے پچھلے حصے میں لے گئے۔ جہاں کسی کا بھی آنا جانا نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ سپریم کورٹ بہت جلد بھٹو صاحب کا فیصلہ سنانے والا ہے۔ فیصلے کی دونوں صورتوں میں آپ تیاری کریں۔ فیصلہ حق میں بھی ہو سکتا ہے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔

دوسرے دن سب سے پہلے میں منڈی بہاؤالدین پہنچا دو ایک وکیلوں کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ شہر کے تمام نامور ورکر پولیس گرفتار کر چکی تھی۔ باقی ورکروں کو میں نے روپوش رہنے کا کہا۔ اس کے بعد میں گجرات پہنچ گیا۔ گجرات میں ورکروں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ ان لوگوں کو گرفتار نہ ہونے کا کہہ کر میں دوسرے دن گوجرانوالہ پہنچ گیا۔ میری بدقسمتی کہ سب سے پہلے مجھے علی احمد دھاری وال مل گیا۔ علی احمد دھاری وال کو صرف گوجرانوالہ کے ہی پرانے پارٹی کارکن جانتے ہیں۔ وہی میری بات کا لطف اٹھائیں گے۔ ایک زمانے میں وہ گوجرانوالہ کے ضمنی الیکشن میں ایم۔ این۔ اے بھی ہو گیا تھا۔ جس کے بارے میں بھٹو صاحب نے اس کی بے وقوفی سے تنگ آ کر کہا تھا ''تم میری سب سے بڑی غلطی ہو۔''

معاملہ یوں ہوا تھا کہ بھٹو صاحب گوجرانوالہ میں پارٹی کارکنوں سے خطاب فرما رہے تھے۔

جہاں ضلع کی انتظامیہ بھی موجود تھی۔ علی احمد دھاری وال وزیراعظم کے خطاب کے دوران اٹھ کھڑا ہوا اور وزیراعظم سے کہنے لگا کہ جناب میں آپ کا ایم این اے بھی ہوں اور کارکن بھی ہوں اور علاقے کا بدّو بھی ہوں۔ مجھے اجازت دی جائے کہ میں ڈی۔سی اور ایس۔پی کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکوں۔ اس کی اس بے معنی بات پر بھٹو صاحب کو بہت غصہ آیا۔ جس پر انہوں نے اوپر والا فقرہ کہا تھا۔

لہٰذا سب سے پہلے وہ مجھے مل گیا۔ وہ اکیلا ہی سوا لاکھ تھا۔ با قاعدہ خالصا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی دوسرے سے مجھے ملنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ سارا شہر اس کے قبضہء قدرت میں ہے۔ وقت آنے پر دو لاکھ آدمی راولپنڈی لاؤں گا۔ میرے پاس خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ بڑی مشکل کے ساتھ صدرِ شہر بابا فاضل رشیدی اور لالہ فاضل کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے جلدی میں اچھے خاصے کارکن جمع کر دیئے۔ بڑی رازداری کے ساتھ لالہ فاضل مجھے راشد ناگی کے گھر لے کر گیا۔ افسوس کے اس کے چھوٹے سے تنگ گلی کے گھر پر اس وقت تالا پڑا ہوا تھا۔ رات کو میں بس میں بیٹھ کر لاہور آ گیا۔ لاہور کا یہ عالم تھا کہ جیسے شہر میں جن پھر گیا ہو۔ کوئی کارکن جیل سے باہر نہیں تھا۔ باقی بے چارے روپوش تھے۔ بڑی مشکل کے ساتھ مجھے شیخ صفدر علی کا بیٹا مل گیا۔ قیوم نظامی اس کے گھر روپوش تھا۔ اس کی وساطت سے قیوم نظامی کے ساتھ رابطے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ دوسرے دن فوجی حکومت کی جانب سے اخباروں میں خبر شائع کرائی گئی کہ حکومت کو مختلف مقدموں میں قیوم نظامی، اسلم گورداسپوری، رائے حفیظ اللہ وغیرہ مطلوب ہیں ان کی گرفتاری کے احکام جاری ہو چکے ہیں۔ پولیس ان کو بہت جلد گرفتار کر لے گی۔ یہ خبر پڑھ کر رائے حفیظ اللہ بھی اپنی ٹیم کے ساتھ لاہور پہنچ گئے۔ ان کی ٹیم میں اس وقت جاں باز اور امان اللہ خان شامل تھے۔ میرے ایک رشتے دار کا گھر پکی ٹھٹھی میں زیرِ تعمیر تھا۔ میں نے ان سب کا اس گھر میں رہنے کا انتظام کر دیا۔ میں جہاں بے حد محتاط تھا وہاں رائے صاحب کی ٹیم کے کھلاڑی بے حد غیر محتاط تھے۔ وہ کھلے بندوں شہر میں آتے جاتے تھے ان کو کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔

پیٹریاٹ ڈیموکریٹک لائیرز ایسوسی ایشن کا کارنامہ

وزیراعظم بھٹو کے مقدمے کے دفاع کے لئے اور پاکستان پیپلز پارٹی کی اس وقت کی

مشکل ترین سیاست کے وسیع تر مفادات کے لئے میجر اسحاق محمد اور میاں سلیم جہانگیر نے بڑی مثالی جدوجہد کی تھی۔ وہ وقت بڑا کٹھن وقت تھا۔ میاں سلیم جہانگیر پیٹریاٹ لائیرز ایسوسی ایشن کے کنوینیر مقرر ہوئے تھے اور راجہ ذوالقرنین کو سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا تھا۔ راجہ ذوالقرنین ان دنوں بے حد جوشیلا نوجوان تھا۔ بطور کنوینیر پیٹریاٹ لائیرز ایسوسی ایشن میاں سلیم جہانگیر نے جو کردار ادا کیا تھا وہ واقعتا ایک انقلابی کا کردار تھا۔ میاں سلیم جہانگیر کے مزاج میں ایک انقلابی ہونے کی تمام خوبیاں شامل تھیں۔ وہ پنجابی کے اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ فطری اعتبار سے ایک ادیب تھے اور انقلابوں کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ بڑے وسیع مطالعے کے انسان تھے۔ افسوس کہ ان کو زندگی نے زیادہ مہلت نہ دی اور وہ بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بلا کے بذلہ سنج تھے اور بڑے فقرہ باز انسان تھے۔ میرے اچھے دوست تھے۔ میں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ لاہور ہائی کورٹ میں پیٹریاٹ لائیرز کا کنونشن بلا کر وزیراعظم بھٹو کے حق میں ایک متفقہ قرارداد منظور کرائیں۔ جس قرارداد میں بھٹو صاحب کو پاکستان کا آئینی وزیراعظم قرار دیا جائے۔ ان کے خلاف بنایا گیا اور چلایا گیا قتل کا مقدمہ ایک سازش اور غداری قرار دیا جائے۔ اور بھٹو صاحب کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا جائے۔ لہٰذا کنونشن کا اعلان کر دیا گیا۔

جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے حواری وکلاء اس کنونشن کے سخت خلاف تھے۔ لاہور ہائی کورٹ کے صدر کے حکم پر ہائی کورٹ بار کے تمام ہال بند کر دیئے گئے۔ ان کو مقفل کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے میاں سلیم جہانگیر کو وکلاء کا یہ کنونشن لاہور ہائی کورٹ کے برگد کے درخت کے نیچے زمین پر دریاں بچھا کر کرنا پڑا تھا۔ میاں سلیم جہانگیر کا وہ ایک انقلابی روپ اس دن دیکھنے میں آیا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ میں فوجی حکومت نے بہت خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ تمام عدالتیں بند کر دی گئی تھیں۔ تمام ملازمین کو ہائی کورٹ سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ کو پولیس نے ہر جانب سے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اس عالمِ خوف و دہشت میں وہ کنونشن کفر گاہ میں اذان کی طرح کا سا تھا۔ وکلاء حضرات نے فوجی حکمرانوں کی دہشت گردی کے خلاف بڑی دھواں دھار تقریریں کیں اور حکومت کی مذمت کی قراردادیں منظور کیں۔ اس وکلاء کنونشن کی مرکزی قرارداد جو وزیراعظم بھٹو کی رہائی کے حق میں منظور کی گئی تھی وہ قرارداد پورے پاکستان کی

www.bhutto.org

بار ایسوسی ایشن کے لئے ایک راہِ عمل بن گئی تھی۔ لاہور میں اس قرارداد کی منظوری کے بعد پورے پاکستان کی وکلاء کی باروں میں اس قرارداد کی تقلید میں وکلاء برادری نے قراردادیں منظور کر کے اخبارات میں دینا شروع کر دیں۔ جن کی رو سے بھٹو صاحب پر چلایا گیا مقدمہ ایک بے معنی مقدمہ بن کر رہ گیا تھا۔

بھٹو صاحب کے بارے میں منظور کی گئی قرارداد کا متن یوں تھا کہ پنجاب پیٹریاٹ ڈیموکریٹک لائیرز ایسوسی ایشن کا یہ نمائندہ اجلاس متفقہ طور پر وزیراعظم بھٹو کے خلاف چلائے گئے قتل کے جھوٹے مقدمے کی مذمت کرتا ہے۔ اس مقدمے کو پاکستان کے خلاف ایک سازش قرار دیتا ہے۔ پاکستان کا فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق وزیراعظم بھٹو پر قتل کا مقدمہ چلا کر امریکہ کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر کی اس دھمکی کو عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ جس دھمکی میں کسنجر نے مسٹر بھٹو کو کہا تھا کہ اگر اس نے پاکستان کا ایٹمی پلانٹ کا منصوبہ ترک نہ کیا تو اس کو پوری دنیا کے لئے عبرت کی مثال بنا دیا جائے گا۔ وزیراعظم بھٹو ایک بین الاقوامی شہرت کے حامل سیاست دان اور ایک عالمی مدبر ہیں اور تیسری دنیا کے مظلوم عوام کی آواز ہیں اور ملک وقوم کا اثاثہ ہیں۔ ان پر قتل کا مقدمہ چلا کر فوجی ڈکٹیٹر ایک شرمناک حرکت کر رہا ہے۔ ہائی کورٹ کے وکلاء کا یہ اجلاس لاہور ہائی کورٹ کے اس فیصلے کی مذمت کرتا ہے جس فیصلے میں بھٹو صاحب کو سزائے موت دی گئی ہے اور سپریم کورٹ سے توقع کرتا ہے کہ وہ حق و انصاف پر مبنی فیصلہ دے کر انصاف کے تقاضے پورے کرے گا۔ پیٹریاٹ لائیرز کے اس کنونشن نے فوجی حکومت کے بھٹو صاحب پر بنائے گئے مقدمے کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ بلاشبہ اس وقت یہ کنونشن ایک بہت بڑے معرکے کی حیثیت کا حامل تھا۔ ایک بڑا کارنامہ تھا۔

فوجی حکومت وکلاء کا تو کچھ نہیں کر سکتی تھی مگر حکومت اپنا سارا غصہ مجھے گرفتار کر کے نکالنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے ہر طریقے سے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ میرے رشتہ داروں کے گھروں پر جانا شروع کر دیا۔ ان کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ مگر پولیس مجھے پکڑنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ میں نے پیچھے ذکر کیا تھا کہ شیخ شاہد ایک روز پہلے مجھے ملا تھا۔ اس کے ساتھ قیوم نظامی کے ساتھ رابطے کی بات ہوئی تھی۔ لاہور ہائی کورٹ کے اجلاس میں شاہد موجود تھا۔ میں نے اس کو کچی کوٹھی کے مکان کا پتہ بتا دیا کہ وہ نظامی صاحب کو وہاں پر لے کر آ جائے۔ شیخ شاہد اکیلا ہی اس مکان پر

آ گیا۔ کہنے لگا کہ نظامی صاحب نے لاہور سے باہر جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ یہاں نہیں آ سکتا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کہنے لگا۔ مجھے شک گذرا ہے ایک آدمی میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک میرے پیچھے آیا ہے۔ میں نے اس کو جلد ہی وہاں سے چلے جانے کا کہا۔ وہ وہاں سے گیا۔ میرے دل میں کچھ شک سا پیدا ہو گیا۔ شیخ شاہد جس طریقے سے کھلے عام اس مکان پر آیا تھا۔ اس کا پیچھا کیا جاسکتا تھا۔ اس گھر سے تھوڑے فاصلے پر میرے بہنوئی ملک صدیق کا مکان تھا۔ میں نے رائے حفیظ اللہ کو کہا کہ احتیاط کے طور پر آج رات میرے بہنوئی کے گھر چلے جاتے ہیں۔ اس طرح ہم دونوں وہاں سے دوسرے گھر چلے گئے۔ رات آٹھ بجے کے قریب پہلے والے مکان کا چوکیدار آیا اور اس نے آ کر بتایا کہ وہاں پولیس آئی تھی وہ پوچھتی تھی کہ یہاں کون لوگ آئے تھے۔ میں نے کہا کہ ابھی تو یہ مکان بن رہا ہے۔ یہاں پر کئی گاہک مکان خریدنے کی بات کرنے روز آتے ہیں۔ آج بھی کچھ لوگ مکان خریدنے کی بات کرنے آئے تھے اور وہ چلے گئے۔ پولیس کا جو مخبر شاہد کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس نے پولیس کو صرف اتنی ہی خبر دی ہوگی کہ وہ اس مکان پر آیا تھا۔ اس کو یہ خبر نہیں تھی کہ اس مکان میں وہ کن کو ملنے آیا تھا۔ پولیس نے اس مخبر کو اس کے پیچھے قیوم نظامی کو پکڑنے کے لئے لگا رکھا تھا۔ لہٰذا اس طرح ہم لوگ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ پولیس یہی سمجھی ہوگی کہ وہ نظامی کو ملنے آیا تھا۔ مکان چونکہ زیرِ تعمیر تھا ابھی اس کا کوئی دروازہ وغیرہ بھی نہ تھا۔ صرف دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہاں پر کسی کے رہنے کا شک نہیں ہو سکتا تھا۔

میں اسی رات رائے حفیظ اللہ کو اپنی بڑی ہمشیرہ کے گھر لے گیا جن کو ایک سال قید با مشقت ہو چکی تھی۔ ان کا گھر خالی پڑا تھا۔ میں نے رائے صاحب کو کہا کہ اس جگہ پر ہم کو بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ یہاں پر کسی کو ہرگز ہرگز نہ بلایا جائے۔

رائے صاحب نے کہا کہ سوائے غیاث الدین جاں باز، امان اللہ خان اور شاعر حبیب اللہ قمر کے اور کسی کو نہیں بلایا جائے گا۔

مجھ پر بم کیس بنا دیا گیا

فوجی حکومت جب ہم لوگوں کو گرفتار نہ کر سکی تو اس نے ایک تو اپنی خفت مٹانے کے لئے دوسرے ہم لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے اس نے ہم پر بم کیس بنا دیا۔ صبح جب ہم سو کر اٹھے تو

www.bhutto.org

ہر اخبار کے پہلے صفحے پر موٹی سرخی لگی ہوئی تھی کہ اسلم گورداسپوری، قیوم نظامی، رائے حفیظ اللہ، غیاث الدین جاں باز پر بم کیس بنا دیا گیا ہے۔ ہم پر الزام لگایا گیا تھا کہ ہم لوگوں نے لاہور شہر میں بم دھماکے کرانے کا پروگرام بنایا ہے۔ ہم نے الفلاح سینما میں بم دھماکہ کرایا ہے۔ جس میں کسی انسان کے ہلاک ہونے کی خبر تو نہیں تھی مگر سینما کی عمارت اور فرنیچر کو نقصان پہنچانے کی خبر تھی۔ ہم لوگوں کو خطرناک مجرم قرار دیا گیا تھا۔ حکومت کے خلاف تخریب کاری کرنے کے جرم میں ہم پر مقدمہ بنا دیا گیا تھا۔ اخباروں میں تھا کہ اس مقدمے کی رو سے ہم کو سزائے موت بھی ہو سکتی تھی اور عمر قید کی سزا بھی ہو سکتی تھی۔ یہ مقدمہ نا قابل ضمانت مقدمہ تھا۔

بم کیس کا سب سے بڑا نقصان

بم کیس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ لوگ ہم سے خوفزدہ ہو گئے۔ میرے پاس لوگوں کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے اور اخبار کو خبر بھیجنے کے لئے لاہور کے کچھ فون نمبر تھے۔ ان کے علاوہ پنجاب کے دوسرے شہروں میں پیغام رسانی کے لئے کچھ فون نمبر تھے۔ لہٰذا جن لوگوں کے یہ فون نمبر تھے۔ انہوں نے جب بم کیس کی بھیانک قسم کی خبر پڑھی اور اس کی سزا کا پڑھا کہ سزائے موت بھی ہو سکتی ہے تو ان لوگوں کی جان نکل گئی۔ وہ بیچارے سیاسی جلسہ جلوس تک تو میرا ساتھ دینے کو تیار تھے۔ مگر جب انہوں نے میرا بم چلانے کا کارنامہ پڑھا تو وہ ڈر گئے۔ میں جس گھر میں فون کرتا تھا۔ وہ ایک ہی بات کہتے تھے کہ یہاں اس نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ میرے بہنوئی نے مجھے فون پر کہا کہ بھائی صاحب ہم بم وغیرہ کے معاملے میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ میں نے اپنے بہنوئی کو بڑی مشکل کے ساتھ اس بات کا یقین دلایا کہ میرا کسی بم دھماکے کے ساتھ کچھ تعلق نہیں ہے۔ حکومت لوگوں کو مجھ سے خوف زدہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ مگر باقی دوسرے لوگوں کو ان باتوں کا یقین دلانا مشکل تھا۔ حالت یہ ہو گئی کہ ایک ہی دن میں میرا تمام رابطے کے نمبروں کے ساتھ رابطے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ کوئی انسان مجھ سے بات کرنے کو تیار نہ تھا۔

مفرور کو سانپ کی طرح گم ہونا چاہیے

میں ایک دفعہ 1969ء میں کوٹ لکھپت جیل میں قید تھا۔ ایوب خان کی حکومت نے مجھے

www.bhutto.org

پکڑ کر جیل میں ڈال رکھا تھا۔ میں سی کلاس کا قیدی تھا اور مجھے جیل کی لمبی بیرک میں عام قیدیوں کے ساتھ رہنا ہوتا تھا۔ ایک رات کو ایک بوڑھا قیدی اپنے ساتھ والے قیدی سے باتیں کر رہا تھا۔ رات کو ان قیدیوں کی باتیں بڑی دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔ یہ لوگ اپنے اپنے ایڈونچرز بیان کیا کرتے تھے۔ اپنے تجربات بتایا کرتے تھے۔ بوڑھا قیدی دوسرے قیدی کے ساتھ مفروری کے موضوع پر بات کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک مفرور کو سانپ کی طرح گم ہو جانا چاہئے۔ تاکہ پولیس اس کو ڈھونڈنے کا خیال چھوڑ دے۔ دوسرے قیدی نے کہا کہ کیسے گم ہو جانا چاہئے۔ اس نے جواب دیا کہ کسی ایک جگہ پر چھپ کر بیٹھ جانا چاہئے، اور باہر کے ہر آدمی سے اپنا رابطہ ختم کر لینا چاہئے۔ اپنی مفروری کے ایام میں بوڑھے کا وہ جملہ مجھے یاد آیا۔

میں نے رائے حفیظ اللہ کو بوڑھے قیدی کی یہ بات سنائی۔ میں نے رائے صاحب کو کہا کہ ہم لوگوں کو چند دن کے لئے لاہور شہر سے کہیں دور نکل جانا چاہئے۔ بالکل گم ہو جانا چاہئے۔ چند دن تک ہمارے بم کے مقدمہ کی گونج ختم ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر کئی دوسرے حادثے اور واقعے لوگوں کے ذہنوں پر چھا جائیں گے۔ ایک تو پولیس ہماری جانب سے غافل ہو جائے گی۔ دوسرا پارٹی کے لوگوں کا خوف بھی دور ہو جائے گا۔ اور ہمارے لئے دوبارہ کام کرنا آسان ہو جائے گا۔ بشرطیکہ ہم اس بوڑھے کی بات پر عمل کر کے کچھ دن اپنے آپ کو چھپائے رکھیں اور کسی کے ساتھ رابطہ نہ کریں۔ رائے صاحب میری بات سے اتفاق کر گئے۔ پہلے ہم دو تھے اب ہم پانچ ہو چکے تھے۔ اب ہمارے ساتھ جاں باز، امان اللہ خان اور شاعر حبیب اللہ قمر بھی اس مکان میں پناہ گزیں ہو چکے تھے۔

مجھے بے حد افسوس ہوتا تھا کہ جاں باز اور امان اللہ خان یہ دونوں بے دھڑک باہر چلے جاتے تھے۔ میں اس بات کی رائے حفیظ اللہ سے بڑی شکایت کرتا تھا۔ مگر وہ میری اس شکایت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ایک دن رائے صاحب مجھے کہنے لگے کہ آپ تو بہت ڈرتے ہیں جبکہ انقلابی بہت بہادر ہوتے ہیں۔ رائے صاحب کی اس بات کے بعد میں نے ان سے اس معاملے میں بات کرنا ہی ترک کر دی۔ مگر روپوشی کے ان دنوں میں ایک دن تو رائے حفیظ اللہ خان اور جاں باز اور امان اللہ خان اینڈ کمپنی نے اپنی انقلابی بہادری کی انتہا کر دی۔

www.bhutto.org

بم کیس کے مجرم ایس۔ ایس۔ پی زمان کے گھر چلے گئے

میں نے اپنی سہولت کے لئے اپنے بھانجے انوار اللہ خان کو میرے ساتھ مستقل رابطہ رکھنے کا کہہ رکھا تھا۔ انوار اللہ خان آجکل تو بہت بڑا کاروباری انسان بن چکا ہے۔ وہ آجکل لاہور میں سٹی رڈلو کیپ اور سٹی ٹریک لمیٹڈ کار کمپنی کا مالک ہے۔ جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں ان دنوں وہ بیس سال کا نوجوان بچہ تھا۔ وہ بڑا حوصلہ مند تھا میری بھاگ دوڑ میں میرا بہت مددگار تھا۔

رائے حفیظ اللہ، جاں باز اور امان اللہ خان صبح صبح کہیں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں ہر چند ان کے باہر جانے پر معترض تھا۔ مگر ان کی یہ باہر جانے کی تیاری با جماعت تھی۔ میں نے ان کو ٹوکنا مناسب خیال نہ کیا۔ عین اس وقت انوار اللہ خان گاڑی لے کر آ گیا بلکہ ناشتہ لے کر آ گیا۔ رائے وغیرہ انوار کے ساتھ میرے رشتے کو نہیں جانتے تھے۔ ان دوستوں نے مجھے کہا کہ اس بچے کو کہیں کہ یہ ہمیں ہمارے ایک دوست کے گھر تک چھوڑ دے۔ میرا بھانجہ ان کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد میرا بھانجہ واپس میرے پاس بڑی حیرانی کی صورت میں آیا۔ مجھے کہنے لگا کہ آپ تو انڈر گراؤنڈ ہوئے بیٹھے ہیں مگر آپ کی پیپلز پارٹی الیون کے وہ تمام کھلاڑی جو آپ نے میرے ساتھ روانہ کئے تھے وہ ایس۔ ایس۔ پی لاہور زمان خان کے گھر بیٹھے ہیں۔ اس کی ماں کی فاتحہ خوانی فرما رہے ہیں۔ ان لوگوں نے سرکاری کوٹھیوں کے پاس جا کر مجھے رک جانے کا کہا اور وہ وہاں اتر گئے۔ جہاں وہ اترے تھے وہاں سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر ٹینٹ لگے ہوئے تھے اور کافی لوگ وہاں آ جا رہے تھے۔ یہ لوگ بھی اس ٹینٹ کی طرف چلے گئے۔ میرے بھانجے نے کہا کہ میرے دیکھتے دیکھتے یہ لوگ ٹینٹ والی کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ جب میں گاڑی چلا کر اس کوٹھی کے برابر پہنچا تو اس کوٹھی پر ایس۔ ایس۔ پی زمان کا نام تحریر تھا۔ اس روز ایس۔ ایس۔ پی زمان کی والدہ کی قل خوانی تھی۔ رائے حفیظ اللہ، جاں باز اور امان اللہ خان ایس۔ ایس۔ پی کی والدہ کی قل خوانی میں شریک ہو گئے۔ میں ان لوگوں کو وہاں چھوڑ کر واپس آ گیا ہوں۔

میرے لئے میرے بھانجے کی باتیں بڑی پریشان کن تھیں۔ اس خبر سے میرے تن بدن سے جان نکل گئی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ رائے حفیظ اللہ اور جاں باز دونوں پر بھی بم کیس تھا۔ حالات اس قدر خطرناک تھے کہ لوگ ہمارا نام سن کر فون بند کر دیتے تھے۔ اور یہ لوگ خود چل کر

www.bhutto.org

ایس۔ایس۔پی کے گھر چلے گئے تھے۔ ایس۔ایس۔پی زمان اس قدر نوکری زدہ انسان تھا کہ ضیاء الحق اگر اس کو اس کی ماں کو پکڑنے کا کہتا تو وہ اپنی ماں کو بھی پکڑنے سے گریز نہ کرتا۔ مگر ان لوگوں کے معاملے میں وہ بڑا مختلف ثابت ہوا تھا۔

مجھے خدا گواہ وزیراعظم بھٹو کی قسمت پر بے حد افسوس ہوا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ ان لوگوں سے علیحدہ ہو جانا چاہئے۔ میں نے کچھ دن کے لئے لاہور چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ میں ان لوگوں سے بہت دور چلے جانا چاہتا تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں کوئٹہ چلے جانے کا خیال آیا۔ شام کو جب یہ لوگ تشریف لائے تو میں نے ان سے لاہور سے باہر چلے جانے کی بات کی۔

میں نے ان لوگوں سے بڑے شائستہ انداز میں گلے کی شکل میں پوچھا کہ آپ لوگوں نے تو کمال کر دیا۔ آپ لوگ لاہور کے ایس۔ایس۔پی کی ماں کی فاتحہ خوانی پر پہنچ گئے۔ باخدا اس وقت ان شریف لوگوں کی شکلیں دیکھنے والی تھیں۔ رائے حفیظ اللہ خاموش رہے مگر جاں باز پٹاک سے بولا کہ اس کے ساتھ ہمارے سوشل تعلقات تھے۔ میں نے خود ہی موضوع بدل دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ کچھ دن کے بعد میں لاہور آکر آپ سے خود ہی رابطہ پیدا کرلوں گا۔

قدرت کی گواہی

''آج جبکہ 12 اگست 2006ء کو میں اپنی آپ بیتی میں غیاث الدین جاں باز اور امان اللہ خان کا کچھ بری یادوں کے طور پر ذکر کر رہا ہوں۔ آج کے اخبار میں ہی خبر شائع ہوئی ہے کہ ان دونوں صاحبان نے ایم۔کیو۔ایم میں شمولیت اختیار کرلی ہے۔ سیاست میں کچھ سیاسی کارکن اور سیاسی لیڈر بھی کچھ صحافیوں کی طرح کے ہوتے ہیں جن کی تقرریاں اور تبادلے ہوتے رہا کرتے ہیں۔''

ان دنوں میں پولیس کی مسلسل پوچھ گچھ سے بے حد پریشان تھا۔ پولیس میرے تمام رشتہ داروں، دوستوں، واقفوں کے گھروں میں مجھے تلاش کرتی پھرتی تھی۔ پولیس کی کوشش تھی کہ کسی طرح وہ میری بیوی کو گرفتار کرلے۔ وہ جس گھر میں بھی جاتی تھی میرے ساتھ میری بیوی کا بھی پوچھتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی بیوی کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دوں۔ ان دنوں وہ اُمید سے تھیں میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ پولیس کی دہشت کا مستقل شکار رہیں۔ میں تو ابھی بیوی کی پریشانی سے ہی دوچار تھا کہ اوپر سے یہ فیصل آبادی ٹولا ایس۔ایس۔پی کے گھر چلا گیا۔ ان کی اس حرکت سے

www.bhutto.org

میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی چلی جاتی تھی۔ میری سمجھ میں ساری بات آ چکی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ان لوگوں سے دور بھاگ جانا چاہئے۔ لہٰذا میں نے اپنی بیگم کو کوئٹے پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ایک رات پیشتر اپنی بیگم کو کوئٹہ کی گاڑی میں سوار کروا دیا اور دوسرے دن رات کو حبیب اللہ قمر شاعر کو ساتھ لے کر کوئٹہ کی گاڑی میں سوار ہو گیا اور کوئٹہ پہنچ گیا۔ کوئٹہ کے لمبے سفر کی وجہ سے میری بیگم کی طبیعت خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے مجھے کچھ دن کے لئے کوئٹہ رک جانا پڑا مگر میں نے حبیب اللہ قمر کو واپس لاہور بھیج دیا۔

میرے کوئٹہ پہنچنے کے چھ دن بعد سپریم کورٹ نے بھٹو صاحب کے خلاف فیصلہ سنا دیا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد میرے لئے کوئٹہ ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ میں اسلام آباد پہنچنے کے لئے کوئٹہ سے سکھر پہنچ گیا۔

اسلم گورداسپوری افغانستان چلا گیا

سکھر میں میں نے جنگ اخبار میں خبر پڑھی کہ اسلم گورداسپوری افغانستان پہنچ گیا ہے۔ یہ خبر مجھے زندہ مروا دینے والی تھی۔ حبیب اللہ قمر نے غیاث الدین جانباز وغیرہ کو میرے کوئٹہ جانے کا بتا دیا تو انہوں نے مجھے افغانستان پہنچا دیا۔ میں سکھر سے لاہور پہنچا تو اسی صبح مساوات اخبار میں خبر تھی کہ رائے حفیظ اللہ خان کو پیپلز پارٹی پنجاب کا قائمقام صدر بنا دیا گیا ہے اور غیاث الدین جانباز کو سیکرٹری جنرل پنجاب بنا دیا گیا ہے۔

یہ تمام خبریں اخبارات میں غیاث الدین جاں باز کی طرف سے لگوائی جا رہی تھیں۔ پہلے میرے بارے میں افغانستان چلے جانے کی خبر شائع کروا دی گئی اور بعد میں پنجاب پارٹی کے عہدوں کو تبدیل کر دیا گیا۔

میں جتوئی ہاؤس پہنچ گیا

میں نے اسلام آباد پہنچ کر ملک دوست محمد اعوان کے ساتھ ملنے کی کوشش کی۔ مجھے ان کے ہوٹل سے پتہ چلا کہ وہ جتوئی ہاؤس گئے ہیں۔ میں بھی گاڑی میں جتوئی ہاؤس کی طرف گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں بڑی پولیس ہو گی مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جتوئی ہاؤس کے باہر پولیس کی

ایک بھی گاڑی نہیں تھی۔ تین کاریں باہر کھڑی تھیں۔ میرا بھانجہ گاڑی لے کر جتوئی ہاؤس سے آگے نکل گیا۔ آگے جا کر میں نے اس کے ساتھ مشورہ کیا۔ وہاں ایک پارک تھا جہاں لوگ شام کے وقت چہل قدمی کر رہے تھے۔ میں نے اس کو کہا کہ میں ان لوگوں میں چہل قدمی کرنے لگ جاتا ہوں تم جا کر ملک دوست محمد اعوان یا یحییٰ بختیار یا جتوئی صاحب سے بات کر کے آؤ۔ ان کو میرا بتاؤ۔ ان سے کہو کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرا بھانجہ جتوئی ہاؤس گیا۔ جتوئی صاحب نے ان کو کہا کہ ان کو یہاں لے آؤ۔ اس طرح میں جتوئی ہاؤس کے اندر چلا گیا۔ میں نے ان کو بتایا کہ پہلے میرے افغانستان فرار ہو جانے کی خبر شائع ہو چکی ہے۔ اس کے بعد میری جگہ پر رائے حفیظ اللہ خان کا قائمقام صدر پنجاب کا اعلان ہو چکا ہے۔ اس صورت میں میرے لئے کیا حکم ہے۔ ان تینوں نے متفقہ طور پر اپنی رائے دی کہ اس وقت چونکہ رائے حفیظ اللہ کا اعلان ہو چکا ہے۔ اس وقت اگر کوئی تبدیلی کی گئی تو بڑا کنفیوژن پیدا ہو جائے گا۔ اب تم پنجاب کی صدارت سے علیحدہ کر دیئے گئے ہو۔ تمہارے لئے اب یہی بہتر ہے کہ تم انڈر گراؤنڈ چلے جاؤ۔ تمہارے افغانستان چلے جانے کی خبر تمہارے لئے بڑی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ فوجی حکومت تمہارے پکڑے جانے پر کچھ بھی تمہارے ساتھ کر سکتی ہے۔

ان دنوں مشہور یہ کیا جا رہا تھا کہ پاکستان میں الذوالفقار تنظیم بنا دی گئی ہے۔ بیرونِ پاکستان اس کی قیادت میر مرتضیٰ بھٹو کر رہے ہیں۔ اندرونِ پاکستان اس تنظیم کو راجہ انور چلا رہا ہے۔ اور اس تنظیم کا ہیڈ کوارٹر افغانستان میں ہے۔ بعد میں علم ہوا کہ اس تنظیم کی زیادہ تر خبریں فوجی حکومت کی ایجنسیاں خود پھیلایا کرتی تھیں۔ بہرصورت اس وقت اس تنظیم کو بہت خطرناک تصور کیا جاتا تھا۔ میرے بارے میں افغانستان کی خبر شائع کرانے کا صاف مطلب تھا کہ میرا تعلق الذوالفقار سے ثابت کرنا مقصود تھا۔ یہ خبر بالکل ویسی ہی تھی جس طرح فیصل آباد کے احمد سعید اعوان کو کوڑے پڑے تھے۔ کہا یہ جاتا تھا کہ جاں باز نے فیصل آباد کی ان تمام خواتین کو کہہ رکھا تھا جو خواتین بھٹو صاحب کی رہائی کے لئے احتجاجاً اپنی گرفتاریاں پیش کرتی تھیں کہ اگر تم سے فوجی عدالت میں پوچھا جائے کہ تم لوگوں کو گرفتاری دینے کا کون کہتا ہے تو تم احمد سعید اعوان کا نام لے دینا۔ وہ ان پڑھ خواتین تھیں وہ عدالت میں یہی بات کہتی رہیں کہ ہم نے احمد سعید اعوان کے کہنے پر گرفتاری دی ہے۔ فوجی حکومت نے احمد سعید اعوان کو گرفتار کر کے اس کو کوڑے مار دیئے تھے۔

www.bhutto.org

سید حامد رضا گیلانی کا افسوس

جتوئی ہاؤس میں اس وقت ملک دوست محمد اعوان، غلام مصطفےٰ جتوئی، یحییٰ بختیار اور سید حامد رضا گیلانی بیٹھے تھے۔ ایک بڑا سا کیک پڑا تھا جس کو یہ لوگ کھانے میں مصروف تھے۔ بات جنرل ضیاء الحق کی شروع ہوگئی۔ سید حامد رضا گیلانی صاحب بڑے افسوس کے ساتھ کہنے لگے کہ افسوس کہ بھٹو صاحب نے ایک غیر خاندانی انسان کو آرمی چیف بنا دیا۔ اگر انہوں نے کسی ایسے جرنیل کو آرمی چیف بنایا ہوتا جس کا تعلق کسی بڑے خاندان سے ہوتا۔ کسی زمیندار یا سرمایہ دار گھرانے سے ہوتا تو اس کے ساتھ ہم شرفاء لوگوں کی بات کرنا آسان ہو جاتی۔ ضیاء الحق جیسا تھرڈ ریٹ آدمی جس کا کوئی آگا پیچھا ہی نہیں ہے اس کے ساتھ ہماری بات ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ میں جب جتوئی ہاؤس سے باہر نکل رہا تھا تو میرے دل میں خیال آ رہا تھا کہ یہ سب لوگ تو خاندانی تھے، جاگیردار تھے۔ انہوں نے بھٹو کے لئے کیا کیا ہے۔ وزیراعظم بھٹو تختہ دار پر کھڑے ہیں اور یہ لوگ ان کی جیل سے کچھ ہی فاصلے پر مزے سے کیک کھا رہے ہیں اور افسوس کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہے۔

زنجیر جنوں کڑی نہ پڑیو

دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے

وزیراعظم بھٹو انتہائی محنتی اور انتھک نیچر کے انسان تھے وہ اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ حساب رکھتے تھے۔ وہ ایک ایسی باعمل زندگی کے انسان تھے جو اپنے عمل اور حکمت سے تاریخ سازی کرتے ہیں اور اپنے عہد کے لیجنڈ انسان ہوتے ہیں۔ ان پر علامہ اقبال کا یہ مصرع بہت صادق آتا ہے۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا

گویا صرف زندان میں ہی نہیں بلکہ پھانسی کوٹھڑی میں بھی ان کا جنوں فارغ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ دفعہ 302 کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو درخت پر لکھ دو۔ وہ درخت سوکھ جاتا ہے۔ پھانسی کوٹھڑی ایک ایسی بھیانک جگہ ہے جہاں پہنچ کر بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ لوگ پھانسی کی کال کوٹھڑی میں بظاہر زندہ ضرور دیکھائی دیا کرتے ہیں مگر اندر سے مر چکے ہوتے ہیں۔

وزیراعظم بھٹو کس دھات کے بنے ہوئے انسان تھے۔ کس مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کا زندگی کے اعلیٰ افکار و خیالات کی جدوجہد کا فولادی اور آہنی عزم پھانسی گھاٹ میں پہنچ کر بھی ختم نہ

ہوا۔ ان کی قوم پرستی اور عوام دوستی کا لوہا وہاں بھی گرم رہا، اور موت کے خوف سے سرد نہ پڑ سکا۔ دنیا کے تمام ماہر طبیعات اور انسانی جبلت و خصائل کے محقق اس معاملے میں حرفِ آخر ہیں اور ایک ہی رائے رکھتے ہیں کہ صرف کسی عام انسان کے لئے نہیں بلکہ کسی فلاسفر اور دانشور کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ اس کو تحریر و تقریر کے لئے پُرسکون اور یک سوئی کا ماحول میسر ہو۔ اس پر خوف و حراست کا کوئی پہرہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ دمِ تحریر کسی قسم کی بندش اور رکاوٹ بڑے سے بڑے مفکر کے خیالات کو متاثر کرتی ہے۔ خوف و دہشت کے ماحول میں کوئی مفکر بھی اپنا تخلیقی عمل جاری نہیں رکھ سکتا۔ یہ تو تھے عام نوعیت کے حالات و واقعات کے بارے میں مفکروں کے خیالات مگر جہاں ہر وقت ایک اکیلے تنہا شخص کو اس بات کا دھڑکا لگا رہے کہ نہ جانے زندگی کے کس دن اور کس پل اس کو تختہء دار پر کھینچ دیا جائے گا، اور اس کی زندگی کا چراغ گُل کر دیا جائے گا۔ ایسا پھانسی گھاٹ جو کہ عام پھانسی گھاٹ نہیں تھا وہ فخرِ ایشیا ذوالفقار علی بھٹو کا پھانسی گھاٹ تھا۔ جس پھانسی گھاٹ کا تارا مسیح خود ضیاء الحق بدرو بدطینت بدکار گھٹیا کمینہ اور رذیل آدمی تھا۔ جو لمحہ وزیراعظم بھٹو کا اذیتیں دینے کے سامان کرتا تھا۔ ان کی عزتِ نفس اور ان کے وقار و تشخص کو پامال اور مجروح کرتا تھا۔ ان کی توہین کرتا تھا۔ ان کو دلبرداشتہ کرنے کی حرکتیں کراتا تھا۔ ان کو ہر طرح سے ڈراتا دھمکاتا تھا۔ ان کو خوف دہشت میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔ اوپر خدا کی ذات تھی۔ نیچے زمین پر ضیاء الحق قادرِ مطلق بن کر تخت پر بیٹھا تھا اور وزیراعظم تختہء دار پر کھڑا تھا۔ حضرات قارئینِ کتاب ایسے عالم میں ایسے ماحول میں ایسے جاں گذر اور جاں سوز حالات میں کسی انسان کا اپنے عقل و ہوش ٹھکانے رکھنا اور حوصلہ مند رہنا اور جرأت و ہمت کا مظاہرہ کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ وزیراعظم بھٹو کا یہ حوصلہ اور ان کی ہمت خدا کی دین تھی۔ بقول شاعر

اللہ اگر توفیق نہ دے
انسان کے بس کی بات نہ تھی

مگر یہاں تو معاملہ صرف جرأت، ہمت اور حوصلے کے مظاہرے کا نہ تھا۔ یہاں معاملہ تختہء دار پر کھڑے ہو کر پھانسی کوٹھڑی میں بیٹھ کر تصنیف و تخلیق کرنے کے عمل کا تھا۔ جس عمل کے لئے ماہرین بشریات کی پیچھے رائے بیان کی گئی تھی کہ ایسے ماحول میں تخلیق و تصنیف ناممکن ہوتی ہے۔ وزیراعظم بھٹو نے ان ماہرینِ طبیعاتِ عالم کی رائے کے برعکس دو کتابیں تخلیق کر کے اپنے

غیر معمولی نابغہ انسان ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ جس کی انسانی تاریخ میں پہلے کہیں مثال دیکھنے کو نہیں ملتی۔ انہوں نے لاہور کوٹ لکھپت جیل میں اپنی کتاب ''اگر مجھے قتل کر دیا گیا'' تحریر کی۔ دوسری کتاب انہوں نے راولپنڈی سنٹرل جیل کی پھانسی کوٹھڑی میں تحریر کی جس کا نام ''مائی ڈیرسٹ ڈاٹر'' تھا۔ جس کتاب کو بھٹو ڈاکٹرائین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ کتاب وزیراعظم بھٹو نے اپنی زندگی میں پھانسی کوٹھڑی میں انہوں نے تحریر کی تھی اس کتاب میں جہاں انہوں نے اپنی انتہائی پیاری بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنی قیادت کے تسلسل کا مستقبل تصور کرتے ہوئے ان کو اپنی عقل و دانش اور فہم و فراست اور اپنے قومی سیاست اور اپنی حکمرانی کے زندگی بھر کے تجربات کے نچوڑ کی شکل میں اپنے مشفقانہ مشوروں سے نوازا تھا۔ وہاں اس کتاب میں انہوں نے عالمی سیاست کی باریکیوں کو بھی بیان کیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی اس کتاب میں اپنے سفاک قاتلوں کو بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ ہوش کے ناخن لیں۔ مگر ان کے قاتل جو بقول وزیراعظم بھٹو بلڈ ہاؤنڈنگ ڈاگز کی طرح ان کی زندگی کے پیچھے پڑے ہوئے تھے وہ اس کتاب کی خرد افروزی سے کب مشورہ حاصل کر سکتے تھے۔ البتہ ان کی ڈیرسٹ ڈاٹر محترمہ بے نظیر بھٹو نے باپ کے فرمودات وارشادات اور ان کے نظریات کے نقشِ قدم پر چل کر باپ ہی کی طرح پاکستان کے عوام کی بے مثال قیادت کرتے ہوئے باپ ہی کی طرح شہادت کا مرتبہ پا کر خود کو باپ کے خوابوں کی سچی تعبیر ثابت کر دیا۔ وزیراعظم بھٹو کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ان کی اس کتاب کا مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے۔

پھانسی کوٹھڑی میں عظیم بھٹو کی خرد افروزی

یونان کے مشہور زمانہ فلسفی افلاطون نے اپنی مشہور عالم کتاب (Republic) جمہوریہ کے صفحہ 473 پر تحریر کیا تھا کہ اقتدار و اختیار اور حکومت کے بارے میں سقراط کی حتمی رائے تھی کہ دنیا میں فلسفیوں کو حکمران ہونا چاہئے یا فلسفیوں کو حکمرانوں جیسے اختیار مل جائیں یا جو حکمران ہیں وہ باقاعدہ تربیت حاصل کر کے فلسفی بن جائیں تاکہ حکمرانی کی قوت اور فلسفہ کی دانش ایک ہی شخص میں جمع ہو جائیں۔ جب تک یہ نہیں ہوگا تب تک دنیا میں کبھی حقیقی امن قائم نہیں ہوگا، شہروں سے برائی کبھی مٹ نہیں سکے گی اور نہ ہی کبھی نسل انسانی سے جرائم کا خاتمہ ہو سکے گا۔

www.bhutto.org

سقراط کا کہنا تھا کہ نہ تو تاجر اور سوداگر اور صنعتکار اس قابل ہو سکتے ہیں کہ قوموں کی رہنمائی کا حق ادا کر سکیں اور فوجی جرنیلوں کی حکومت تو اسی طرح ہے جس طرح خون خوار بھیڑیوں کو انسانوں کا رکھوالہ بنا دیا جائے۔

سقراط کے قول کے مطابق ہم صرف پاکستان اور پڑوس کے ملک ہندوستان کو ہی بطور مثال پیش کرتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملک ایک ہی دن ایک ہی تاریخ کو انگریزوں کے استعمار سے آزاد ہوئے تھے۔ ہندوستان پر سیاستدانوں اور دانش وروں کی حکومت قائم ہوئی جو کہ آج تک تسلسل سے قائم چلی آ رہی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان دنیا کی نظر میں سب سے بڑی جمہوری اور آئینی ریاست کا تشخص حاصل کر کے ایک باوقار ملک بن چکا ہے۔ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان پر ابتداء میں ہی فوجی جرنیلوں کا اقتدار قائم ہو گیا جس کی وجہ سے پاکستان دنیا بھر میں ایک غیر جمہوری ملک قرار دیدیا گیا۔ بلکہ آج دنیا کی نگاہ میں پاکستان ایک فاشسٹ، انارکسٹ، دہشت گرد اور بنیاد پرست ملک کی شہرت حاصل کر گیا ہے۔ یہ تمام صورت حالات وہی ہیں جس کا سقراط نے ذکر کیا تھا۔ سقراط کے فلسفیوں کو اقتدار اور حکمران بنانے کا راز شہید ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار میں آنے کے بعد ہم پر کھلا ہے۔ شہید بھٹو نے اقتدار کے سقراط کی بات پر صداقت کی مہر ثبت کر دی تھی۔ اس شخص نے جرنیلوں کے تباہ اور دولخت کیے ہوئے شکست خوردہ ملک کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا معجزہ نما کام کر دکھایا تھا۔

مگر چونکہ پاکستان کی ریاست فوجی جرنیلوں کے اقتدار کی ریاست بن چکی تھی، طاقت کے تمام ذرائع پر فوج کا قبضہ تھا لہٰذا جرنیلوں نے بڑی آسانی کے ساتھ ایک فلسفی حکمران کو تختہ دار پر لٹکا دیا اور پاکستان پر دوبارہ سے اپنے غیر آئینی اقتدار کا تسلسل قائم کر دیا تھا۔ جرنیلوں نے شہید بھٹو کو پھانسی سے پہلے سزا کے طور پر ایک لمبے عرصے تک جیل اور پھانسی کی کوٹھڑی میں رکھا تھا تا کہ پاکستان کے دوسرے سیاستدانوں کو کان ہو جائیں۔

اس وقت کی فوجی جنتا کی اتنی بربریت، ظلم اور سفاکیت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فلسفی حکمران شہید بھٹو پھانسی کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر پاکستان کے عوام کے لئے حکمت، دانائی اور علم و دانش کی ایک نہایت مختصر کتاب تحریر کر کے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ وہی حکمران ہے جس حکمران کے بارے میں سقراط نے کہا تھا قوموں کے حکمران دانش ور اور فلسفی ہونے چاہئیں۔

میں نے لفظ کتاب تقریباً غلط کہا ہے وہ کتاب نہیں ایک خط تھا جو انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کے نام تحریر کیا تھا۔ اس خط اور کتاب کا نام ہی ''میری سب سے پیاری بیٹی'' تھا۔ شہید بھٹو نے پھانسی کی کوٹھڑی سے بینظیر بھٹو شہید کو ان کی سالگرہ کے موقع پر تہنیت کے طور پر تحریر کیے گئے خط کا آغاز اس طرح کیا تھا، ایک سزا یافتہ قیدی اپنی خوبصورت ذہین بیٹی کو کس طرح اس کے یوم پیدائش پر تہنیت کا خط لکھ سکتا ہے جبکہ وہ اور اس کی والدہ خود اسی طرح کی تکلیف میں مبتلا ہیں میرا محبت اور ہمدردی کا پیغام کس طرح ایک جیل سے دوسری جیل اور ایک زنجیر سے دوسری زنجیر تک پہنچ سکتا ہے۔

شہید بھٹو اپنے خط میں مثال دیتے ہیں کہ پنڈت نہرو نے اپنی بیٹی اندرا کو جس کو وہ محبت سے اندو کہتے تھے اس کے نام جیل میں خطوں کی شکل میں ایک بے مثال کتاب ''گلیمپسز آف ورلڈ ہسٹری'' کے نام سے تحریر کی تھی۔ پنڈت کی اس کتاب کا آغاز بھی اندرا کی سالگرہ کے تہنیتی خط سے ہوا تھا بس یہی ایک عنصر پنڈت نہرو اور میرے خط کے درمیان قدر مشترک ہے۔ اس کے علاوہ نہرو کے ساتھ میری کوئی مماثلت نہیں۔ پنڈت نہرو کو غیر ملکی حکمرانوں نے بڑی عزت اور وقار کے ساتھ جیل میں رکھا تھا۔ وہ طنزاً تحریر کرتے ہیں وہ میری طرح لاڑکانہ کے گاؤں کی کوئی غیر اہم شخصیت نہیں تھے جو حکمران ٹولہ کے ہاتھوں موت کی کوٹھڑی میں گھل سڑ رہے تھے۔ ان کو جیل میں بھی ایک عظیم لیڈر کا درجہ حاصل تھا۔ خط کا آغاز کرتے ہیں کہ پنڈت نے اپنی بیٹی کو جب خط لکھا تھا اس وقت پنڈت کی بیٹی سیاست کی آگ سے ہو کر نہیں گزری تھی مگر تمہارے گرد تو آگ کے الاؤ جلا دیئے گئے ہیں۔

پنڈت نہرو کی کتاب میں نہرو نے اپنی بیٹی کو عالمی تاریخ سے روشناس کرانے کی کوشش کی تھی جس کا تعلق تمام تر ماضی سے تھا ان کے مقابلے میں شہید بھٹو اپنے خط میں اپنی بیٹی کو دنیا کی موجودہ حکمرانی کی تاریخ کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس کو دنیا کی جبر کی استعماری قوتوں سے آگاہ کرتے ہیں ان کو سویت روس اور امریکہ کے درمیان جاری جنگ کی اصلی حقیقت بتاتے ہیں، اپنے عہد کی موجودہ دنیا کی سیاست کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ دنیا کے تمام ممالک کی سیاست معیشت، ثقافت اور اقتدار کے تجزیہ کرتے ہیں۔ دنیا کے موجودہ تمام ظالموں کے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ دنیا کے تمام مظلوم اقوام کی مظلومیت کی داستان کو بیان کرتے ہیں۔

www.bhutto.org

وہ اپنی بیٹی کو عالمی سیاست کے جنگل کے تمام خونخوار بھیڑیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ ایک ماہر سیاستدان کی طرح اپنی بیٹی کو عالمی سیاست کے قاعدے اور قانون سے آشنا کرتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کی سامراجی عالمی سیاست میں پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے کردار کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ عالمی سیاست کے سامراجی شکنجے میں پھنسی ہوئی اپنی ذات پر تبصرہ کرتے ہیں اور کھول کھول کر بیان کرتے ہیں کہ تیسری دنیا کے غریب ممالک کی قیادتوں کو عالمی قوتیں کس طرح سے اپنے بے ضمیر ایجنٹ حکمرانوں کے ہاتھوں قتل کرواتی ہیں۔ ملکوں اور قوموں کو کس طرح تباہ و برباد کرتی اور کراتی ہیں۔ وہ ایک ماہر شکاری کی طرح اپنی بیٹی کو مچھلی پکڑنے سے لے کر شیر کا شکار کرنے کے گُر سکھاتے ہیں، موت کی کالی کوٹھڑی جس میں جا کر بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے وہاں بیٹھ کر عقل و خرد کی باتیں تحریر کرنا پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر ملک و قوم کی بہتری کی باتیں کرنا عام انسانوں کا کام نہیں ہو سکتا، یہ انتہائی غیر معمولی انسانوں کا شیوہ ہوتا ہے جس طرح سقراط زہر پینے سے کچھ گھڑی پہلے تک اپنے شاگردوں کے ساتھ زندگی اور موت کے فلسفے پر تکرار کر رہا تھا، شہید بھٹو کوئی افسانوی انسان نہیں تھے وہ اپنی ناقدری، اپنی عزت اور بے عزتی کو بے حد محسوس کرتے تھے۔ ان کو اپنی تضحیک کا بے پناہ قلق تھا وہ بے حد خوددار اور غیرت مند انسان تھے۔ فرماتے ہیں کہ اس جیل کی پھانسی کوٹھڑی سے میں تمہیں کیا تحفہ دے سکتا ہوں جس کوٹھڑی میں سے میں اپنا ہاتھ باہر نہیں نکال سکتا میں تمہیں عوام کا ہاتھ تحفہ میں دیتا ہوں۔ یہاں سے وہ اپنی پنکی کی تعلیم کا سلسلہ شروع کرتے ہیں اور ایک درویش صفت باپ کی طرح کہتے ہیں تمہارے دادا نے مجھے فخر کی سیاست سکھائی تھی مگر تمہاری دادی نے مجھے غیرت کی سیاست کا سبق دیا تھا۔ پیاری بیٹی میں تمہیں صرف ایک پیغام دیتا ہوں یہ تاریخ کا پیغام ہے یہ آنے والے دن کا پیغام ہے صرف عوام پر یقین کرو اور ان کی نجات اور مساوات کے لئے کام کرو۔

''اللہ تعالیٰ کی جنت تمہاری والدہ کے قدموں تلے ہے'' اور سیاست کی جنت عوام کے قدموں کے تلے ہے، بھٹو شہید کہتے ہیں کہ جب تک تم زمین کو چومنے کے لئے تیار نہ ہو یعنی عاجزی کا رویہ اختیار نہ کرو تم زمین کا دفاع نہیں کر سکتی جب تک کہ تم زمین کی خوشبو سے واقف نہیں ہو گی زمین سے محبت نہیں کر سکو گی۔ میں زمین کی خوشبو سے واقف ہوں۔ نظریات، اصول، تحریریں، تاریخ کے دروازے سے باہر رہتی ہیں، غالب عنصر عوام کی تمنائیں ہیں اور ان کے ساتھ

www.bhutto.org

مکمل آہنگی کی ضرورت ہے'' جب اس راگ کے معنی سمجھ لیئے جاتے ہیں تو منزل کے نشان واضح ہو جاتے ہیں۔'' وہ تیسری دنیا کے لیڈر کی حیثیت سے اپنی ذات کو اور اپنی بے بسی کو افریقہ کے لوگوں سے ممیز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ افریقہ کے بارے میں فوجی رویے کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے'' بدشکل کالے آدمی'' کے فخر اور احساس کو لازمی طور پر امریکہ کو سمجھنا ہوگا۔

وہ فرماتے ہیں کہ یورپ نے کیمونزم کو برقی عمل کے ذریعے ناکارہ ضرور بنا دیا ہے لیکن اس کے انقلابی نظریے کی حیثیت کو متاثر نہیں کیا۔ وہ 1978ء جون میں کہتے ہیں مغربی یورپ میں سرمایہ داری نظام شدید قسم کے عوارض میں مبتلا ہے وہ ترقی کی حدود سے تجاوز کر چکا ہے۔ اس کے اندرونی تضادات پھٹ پڑنے کے قریب ہیں۔ واضح رہے کہ 2008ء میں وہ تضادات اپنی موت کی شکل میں ظاہر ہو چکے ہیں۔ تاریخ نے ایسی بے شمار مثالیں پیش کی ہیں کہ لوگ تباہ کرنے کے مصمم ارادے سے روانہ ہوئے لیکن تباہ کرنے کی بجائے ان سے تعمیری کام ہو گیا۔ اسی لئے صدر روزویلٹ نے کہا تھا کہ کیمونزم کا خوف کیمونزم کے مقابلے میں زیادہ مہلک ہے۔ یورپ کا یہ خوف دنیا کو نئی روشنی عطا کرے گا یا ساری روشنیاں بجھ جائیں گی۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا، لاطینی امریکہ جذباتی اور پارہ صفت لوگوں کا ایک براعظم ہے جو ڈکٹیٹروں کا براعظم بن گیا ہے لہٰذا لاطینی امریکہ کے مسئلے پر روشن خیالی کے طریق کار کا اطلاق کیا جانا چاہیۓ۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ فیڈل کاسترو اپنے سگار کے دھوئیں کے مرغولوں کو لاطینی امریکہ اور افریقہ کے اردگرد پھینکنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ امریکہ کو تیسری دنیا کے انمول وسائل پر کنٹرول اور غلبہ حاصل کرنے کی تلاش ہے۔

ہم اس کھیل میں شطرنج کے مہروں اور کھلونوں کی طرح اس وقت تک رہیں گے جب تک ہمیں کھلونے بنے رہنے کا شوق رہے گا۔ میں نے 70 کلفٹن میں کئی سال پہلے امریکن وزیر خارجہ کو کھانے کی میز پر کہا کہ چین کے بارے میں تمہاری خارجہ پالیسی غیر منطقی ہے تو وہ غصے کی حالت میں اٹھ کھڑا ہوا مگر کچھ سال بعد امریکہ کے صدر کارٹر کے قومی سلامتی کے مشیر زبگینو برزینسکی چین گئے اور دوستیانت کے فروغ کی باتیں ہونا شروع ہو گئیں۔ انگریزوں کا اپنا اصرار عجیب طریقہ ہے وہ شاذ و نادر ہی بہت زیادہ ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔ سر فرانسس ڈریک نے ہسپانوی بحری جنگی بیڑے کی آمد پر کسی شدید ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ انگلش سیاست ہے کہ بہت زیادہ

ردعمل ظاہر کرنے سے باز رہا جائے تا کہ بہت زیادہ کشت وخون کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ یہ ایک جنگی ڈپلومیسی ہے۔ جرمنوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ شکست اور ذلت کو فتح اور عزت میں تبدیل کر دیں گے۔ میں نے 1976ء میں اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ تین خوفناک قوتیں اس وقت سرگرم عمل ہیں ایک مذہب دوسری کمیونزم تیسری نیشنلزم ان میں شدت پیدا کرنے سے پرہیز کریں ان میں ہم آہنگی پیدا کریں ایسا رول ادا کریں کہ اپنا نظریہ بھی کمزور نہ ہو اور نہ ہی اپنی وفاداری میں ردوبدل یا سمجھوتہ کرنا پڑے یہ جیو اور جینے دو سے زیادہ ہوگا۔ شہید بھٹو کہتے ہیں میں عوام پر بھروسہ کرتا ہوں ان کے باطنی ردعمل پر اعتماد کرتا ہوں لوگ ہی رہنمائی کرتے ہیں ''لیڈر کو عوام کی تمناؤں کا علم ہونا چاہئے'' اور ان کی تمناؤں کی بنیاد پر عوام کو ایک جراتمندانہ جہت عطا کرنی چاہئے۔ اس معاہدے میں دھوکہ بازی سب سے مہلک ہوتی ہے۔ میں نے 18 سال پہلے کہا تھا کہ تیسری دنیا کی سربراہی کانفرنس بلائی جائے اب یہ تخفیف اسلحہ کی کانفرنس بہت تاخیر سے ہو رہی ہے۔ دنیا میں سرخ پرچم کا لہرانا ان لوگوں کو ذرا بھی خوفزدہ نہیں کرے گا جو صدیوں کی غربت کے باعث رنگ ہی کی شناخت نہیں کر سکتے۔ یہ کیا تماشہ ہے کہ دو سال کے اندر ''زائرے'' میں دوبار فوجی مداخلت کی گئی ہے ایک عجیب قسم کے ڈکٹیٹر کو بیرونی فوجی مداخلت کے ذریعے دوبارہ عوام کے انتہائی غیظ وغضب سے بچا لیا گیا ہے۔ اس کے باوجود جنرل موبوتو امریکہ کی انسانی حقوق کے بارے میں اصلاحات کی بات ماننے کو تیار نہیں ہے۔ یہ بیرونی قوتوں کے بعد جرنیلوں کے نفرت انگیز دوہرے معیار ہیں جس نے عوام کو آخری حد تک متنفر اور بے زار کر دیا ہے یہ بات فضول نہیں کہی گئی۔ ''A man know as company he keeps'' ہر شخص کے بارے میں اس کے احباب سے ہی رائے قائم کی جاتی ہے۔ جنرل موبوتو کے شابا صوبے میں غیر ملکی فوجی انقلابیوں کا قتل عام کر رہے ہیں مگر موبوتو انسانی حقوق کے دفاع اور بدعنوانی کی روک تھام کے لئے امریکہ کی رائے کو غیر ملکی مداخلت کہتا ہے اور اس کی مذمت کرتا ہے اور امریکہ کو اس کا بیان گراں بھی نہیں گزر رہا۔ ہمارے مسائل کے حل کے لئے سب سے زیادہ خوفناک خطرہ فوجی جنتاؤں سے ہے جو مارشل لاء کے کوڑے پر انحصار کرتے ہیں۔ بین الاقوامی سیاسی جنتا اور فوجی جنتا دونوں کا تعلق استحصالی قوتوں سے ہے، ہماری فوجی جنتا تو غیر تعلیم یافتہ، جاہل اور ظالم ہے۔ بین الاقوامی جنتا ذہین محتاط اور چوکس ہے۔ وہ یورپ کی مشترکہ منڈی اور مشترکہ کرنسی کی بات کر

رہی ہے۔اس وقت ہمارے لوگوں کا وفاقی شکل میں اقتدار پر اعتماد متزلزل ہو گیا ہے فوجی جنتا کے بار بار غلبے سے ذیلی قومیتوں کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔فوجی حکومت وطنیت اور قومیت کی بدترین دشمن ہے جس کی وجہ سے ذیلی قومیتوں کی انا کو سب سے زیادہ ٹھیس پہنچتی ہے۔فوجی حکومت عوام کو نمائندگی سے محروم کرتی ہے جس کی وجہ سے ذیلی قومیتیں سب سے زیادہ برگشتہ ہو چکی ہیں۔فوجی حکومت عوام کی خودمختاری کو تباہ کر دیتی ہیں جس طرح ٹڈی دل کھڑی فصلوں کو ایک ہی حملے میں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔جس کی وجہ سے ذیلی قومیتیں مشتعل ہو کر علیحدگی کی جدوجہد کا راستہ اختیار کر لیتی ہیں جس طرح مشرقی پاکستان میں ہوا تھا۔

چین اور ہندوستان نے خودمختاری کے ذریعے ذیلی قومیتوں کے مسئلے کو حل کیا تھا۔برما کے صدر نے برما کی آزادی کی جنگ لڑی تھی مگر اس نے برما کو طویل عرصے تک فوجی جنتا کے تحت رکھا تھا جس کی وجہ سے برما آج عظیم بحران سے دوچار ہو چکا ہے، آج انڈونیشیا کا جو حال فوجی جنتا نے کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔صدر سوئیکارنو نے انڈونیشیا کے عوام کو اور انڈونیشیا کو عظیم وقار عطا کیا تھا۔انہوں نے انڈونیشیا کو ایشیاء کا ایک سربرآوردہ ملک بنایا تھا۔انہوں نے مختلف جزائر کو متحد کیا اور ان کے باشندوں کو انڈونیشی قوم بنا دیا تھا۔انہوں نے عوام کو ایک مشترکہ زبان دی، خواتین کو پابندیوں سے آزاد کیا وہ بنڈونگ کانفرنس کے روحانی باپ تھے۔

سوئیکارنو کمیونسٹ نہیں تھے لیکن انہوں نے روس اور چین کے ساتھ قریبی دوستانہ تعلقات کو فروغ دیا تھا ہر چند وہ امریکہ کا بڑا احترام کرتے تھے مگر امریکہ ان کی روشن خیالی کو پسند نہیں کرتا تھا۔اس کو ان کی روس اور چین کے ساتھ تعلقات ناگوار گزرتے تھے۔اس وقت روس اور چین کو ایک گناہ خیال کیا جاتا تھا اس لئے ان کے ساتھ دوستی کرنے والوں کو گناہ کا مرتکب سمجھا جاتا تھا۔ اس گناہ کا ارتکاب کرنے والے کو لازمی طور پر سیاسی منظر سے ہٹا دینا ضروری تصور کیا جاتا تھا لہٰذا اس فادر آف نیشن کے خلاف ایک زبردست پراپیگنڈا مہم شروع کر دی گئی، اس کو کمیونسٹوں کا پٹھو کہا گیا کہ سوئیکارنو انڈونیشیا کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے، دس لاکھ لوگوں کا قتل عام کر کے جنرل سوہارتو کا فوجی مارشل لاء لگا دیا گیا۔گویا انڈونیشیا کو تباہی سے بچا لیا گیا۔فوجی جنتا نے ایک امیر ترین مسلمان ملک کو تباہ کر دیا تھا وہ کہتے ہیں سوئیکارنو میرا اور پاکستان کا بہت بڑا دوست تھا۔ انہوں نے 1965ء کی جنگ میں کھل کر پاکستان کی حمایت کی تھی۔وہ کہتے ہیں کہ فوجی جنتا اگر

www.bhutto.org

ایک امیر ترین ملک کو 12 سال میں تباہ کر سکتی ہے تو فوجی جنتا پاکستان جیسے غریب ملک کا کیا حشر کرے گی۔ شہید بھٹو کی اس وقت کی باتیں آج بالکل سچ ثابت ہو رہی ہیں۔ آج پاکستان کا حشر ہم سب کے سامنے ہے پاکستان اور انڈونیشیا کی دونوں قیادتوں کو شہرت حاصل تھی کہ یہ چین کے سوشلسٹ نظریات کے حامی ہیں۔ دونوں ہی عوام کی حالت اور ملک کی عظمت و شان پر یقین رکھتے ہیں افسوس کہ آج آٹھ سال بعد فوجی ڈکٹیٹر سوہارتو سوئیکارنو کو انڈونیشیا کا ہیرو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اسی طرح پاکستان کی فوجی جنتا مجھے اس لئے ہلاک کرنا چاہتی ہے کہ میرے مرنے کے بعد وہ مجھے ہیرو کہہ کر خراج عقیدت پیش کرے۔ ہندوستان میں فوج نے ابھی تک اپنے آپ کو سیاست میں ملوث نہیں کیا۔ بھارت کے اتحاد کا انحصار چھوٹے بڑے صوبوں کے وجود پر ہے وہاں پر مسلح افواج یا سول سروس یا اقتصادی یا سیاست پر کسی ایک صوبے کی اجارہ داری نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا کا بہت بڑا جمہوری ملک بن گیا ہے اس کے بہت سے دیوتا ایک ہی مندر کی چھت تلے یا کھلے آسمان کے نیچے رہ سکتے ہیں کیا پاکستان نسلوں اور قوموں کے اس انقلابی عمل میں ایک محرک ثابت ہوگا۔ پھانسی گھاٹ میں مجھے وقت اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ میں ''گلیمپسز آف پاکستان ہسٹری'' تحریر کرتا اگر ایسا ہوتا تو میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھ دیتا۔ میری قوم بدترین قسم کے بحران میں مبتلا کر دی گئی ہے۔ وہ بقاء اور شکست و ریخت کے درمیان سڑک کے بیچ میں کھڑی ہے اس ملک کی تخلیق کی خاطر لاکھوں جانوں کو قربان ہونا پڑا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان علامہ اقبالؒ کا خواب اور قائداعظمؒ کی تخلیق ہے کیا خواب میں کوئی غلطی ہوئی تھی، اگلے چند سالوں میں بڑا کشت و خون دیکھ رہا ہوں۔ فوجی جنتا ملک کو افسوسناک صورتحال کی جانب دھکیل رہی ہے جس میں ایسا ہونا ناگزیر ہو جائے گا کہ (آپ دیکھیں آج کل وہی کچھ ہو رہا ہے)۔ یہ فوجی جنتا بار بار ملک کی سالمیت کے ساتھ کھلواڑ کر رہی ہے۔ 1955ء اور 1956ء میں ون یونٹ قائم کر دیا گیا۔ صوبوں کی معمولی قسم کی خود مختاری بھی ختم کر دی گئی۔ اس سکیم میں مشرقی پاکستان کی عددی اکثریت کو ہی ختم کر دیا گیا۔ 1956ء کے آئین کا جنرل ایوب خان نے قلع قمع کر دیا۔ اس نے اپنا مارشل لائی 1962ء کا بنیادی جمہوریت کا آئین دیا۔ جب عوام کی تحریک نے اس کو قبول نہ کیا تو اس نے 1969ء میں اقتدار جنرل یحییٰ خان کو منتقل کر دیا۔ یحییٰ خان نے ایک حکومتی سازش کے ساتھ انتخابات کروائے اور معاملہ اس کے ہاتھ سے باہر نکل گیا۔ برسوں کے ظلم کے بعد جب

سیلاب کے دروازے کھلے تو کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں تھا اس انقلاب عظیم کے ریلے کے آگے بند باندھ سکے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے چھ نکات کے انتخابی منشور پر انتخابی مہم چلائی جس کا مطلب کنفیڈرل نوعیت کی صوبائی خودمختاری تھا۔ مشرقی پاکستان میں ان کو اکثریت حاصل ہوگئی، میری ان باتوں کو دھیان سے سننا ہوگا۔ اس لئے کہ اس مسئلے پر بڑا انتشار پیدا کیا گیا تھا۔ ہم نے مجیب الرحمٰن کو واضح طور پر کہا تھا کہ ہم آپ کی اکثریت کے سامنے حزب اختلاف کے بنچوں پر بیٹھیں گے لیکن ایسا ہم صرف وفاقی ڈھانچے میں کریں گے اگر آپ ڈھانچے کو فیڈرل سے کنفیڈریشن کا ڈھانچہ بنائیں گے تو کنفیڈریشن کے دونوں بازوؤں کو حکومت میں شرکت کرنا ہوگی۔ یہ ایک سادہ سی ناقابل تنقید تجویز تھی یہ ایک سیاسی جمہوری آئینی علاج تھا شیخ کے پیدا شدہ چھ نکاتی زلزلے کا۔ مگر شیخ مجیب الرحمٰن باوجود اس قدر دور نکل گیا تھا وہ چھ نکات سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھا وہ کسی قیمت پر فوجی جرنیلوں کے ساتھ الحاق نہیں کرنا چاہتا تھا میں نے اس کو فیڈریشن کی شکل میں سب کچھ دینے کی بات کی تھی مگر اس نے سب کچھ لینے کی بجائے سب کچھ چھوڑنے کا رویہ اختیار کیا۔ وہ مغربی پاکستان کے ساتھ کسی قسم کے الحاق کو بھی اپنی موت خیال کرتا تھا۔ اس طریقے سے مملکت کے دونوں حصوں کے درمیان ایک تعطل کی شکل میں خلاء پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ جنرل یحیٰی خان نے خیال کیا کہ یہ تعطل انہیں عمر بھر برسراقتدار رہنے کا موقع فراہم کرتا رہے گا اس نے اس سیاسی تعطل کو فوجی کارروائی سے ختم کرنے کا راستہ اختیار کیا ان کی فوجی کارروائی کو تو کسی اخلاقی اور سیاسی طریقے کے مطابق حق بجانب قرار نہیں دیا جاسکتا تھا نتیجہ جس کا پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے کی شکل میں سامنے آگیا۔

شہید بھٹو سقوط ڈھاکہ کی دلخراش کہانی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنرل یحیٰی خان ٹولہ نے اپنے ہی شہریوں پر فوجی کارروائی کر کے بھارت کو نومبر 1971ء میں مشرقی پاکستان میں بھارتی فوج کو فوجی جارحیت کا بہانہ فراہم کردیا۔ 16 دسمبر 1971ء کو ڈھاکہ بھارتی فوج کے قبضے میں چلا گیا اور پاکستان کے 90 ہزار فوجی جنگی قیدیوں کی شکل میں بھارت کی تحویل میں آگئے۔ شکست کے بعد فوجی جنتا نے میری محب الوطنی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے وہاں جانے کی درخواست کی۔

میرے اقوام متحدہ میں جانے تک کھیت جل چکا تھا۔ میں نے ایک ناممکن صورت حال کو

www.bhutto.org

بچانے کے لئے از حد کوشش کی۔ میری دیوانگی کو پوری دنیا نے دیکھا تھا۔ جب جنرل یحییٰ خان ٹولے کو اپنی شکست کا مکمل یقین ہو گیا اور امکان پیدا ہو گیا کہ کچھ واپس نہیں ہو سکتا اور جو کچھ مغربی پاکستان کی شکل میں تھوڑا بہت باقی بچا ہے وہ بھی خطرے میں ہے تو انہوں نے ایک خصوصی طیارہ مجھے پاکستان واپس لانے کے لئے بھیجا۔ جب میں صدر ہاؤس راولپنڈی پہنچا تو یحییٰ خان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور شراب کی بوتل اس کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ 20 دسمبر 1971ء کو صبح دس بجے اس نے مجھے کہا ہم بری طرح ناکام ہو گئے ہیں۔ خدا کے لئے شکست خوردہ پاکستان کا چارج سنبھال لو۔ اس وقت ایک تم ہی ایسے انسان ہو جو باقی ملک کو بچانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس طرح میں نے صدر پاکستان کی حیثیت سے ایک ٹوٹے ہوئے پاکستان کی باگ دوڑ اپنے ہاتھ میں لے کر باقی ماندہ پاکستان کو بچانے کا کردار سرانجام دینا شروع کر دیا۔

بھٹو شہید مزید کہتے ہیں کہ میں نے ایک حوصلہ مند انسان کی طرح تمام محاذوں پر بڑی سرگرمی کے ساتھ پیشرفت کی۔ جن اولین کاموں پر میں نے فوری توجہ دی ان میں آئین سازی میرا اولین کارنامہ تھا جس سے باقی ماندہ پاکستان کو ایک آئینی اور قانونی ریاست بنانا مقصود تھا۔ میں نے ملک کی اقتصادیات کو مجتمع کیا اور نیشنلائزیشن کا انقلابی اور اجتماعی قدم اٹھایا۔ اسی طرح لوگوں کو اجارہ داری کے استحصالی نظام سے آزاد کرایا۔ میں نے اہم سماجی اور اقتصادی اصلاحات کیں۔ میں نے بنگلہ دیش کا گھمبیر مسئلہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے حل کر دیا۔ میں نے بھارت کے ساتھ اپنے عہد کا تاریخی شملہ معاہدہ کیا۔ جس میں کوئی خفیہ شق نہیں تھی۔ سندھ اور پنجاب کا پانچ ہزار مربعہ میل کا علاقہ سب سے پہلے بھارت سے واپس لیا۔ 90 ہزار جنگی قیدی بھارت کی قید سے بغیر کسی شرط کے آزاد کرا کر پاکستان لایا۔ جس پر بنگالی اور بھارتی حکمران جنگی مقدمات قائم کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بلاشبہ یہ میرا شاندار کارنامہ تھے۔

لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس بلا کر عالمی تاریخ میں اور بالخصوص عالم اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا گیا۔ عالم اسلام کے بادشاہوں اور دوسرے حکمرانوں نے مجھے اپنا چیئرمین منتخب کیا تھا۔ کیا یہی مقام عبرت ہے کہ آج عالم اسلام کا منتخب چیئرمین ایک دو ٹکے کے جنرل کے ہاتھوں پھانسی کوٹھڑی میں پڑا ہے۔ میں نے اپنی مسلح افواج کو جدید بنایا۔ امریکہ کی جانب سے اسلحہ کی پابندی کو ختم کرایا تھا۔ میں نے پاکستان کو پاکستان کی تاریخ کا پہلا 1973ء کا

www.bhutto.org

قومی اور جمہوری آئین دیا۔ جو پوری قوم کا ایک متفقہ آئین تھا۔ یہ آئین چاروں صوبوں کے باشندوں اور ان کے منتخب نمائندوں کی ایک آئینی دستاویز تھا۔ جس سے چاروں صوبوں کی خودمختاری کا مسئلہ طے پا گیا تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ بلوچستان کی صوبائی اسمبلی تشکیل پائی تھی۔ میں نے نیپ اور جے یو آئی کی مشترکہ اتحادی صوبائی حکومتیں بنوائیں میری ان مخلصانہ کوششوں میں سارے خطے کا مفاد وابستہ تھا۔ یہ سب کچھ میری بلند خیالی پر مبنی تھا۔

مقام افسوس یہ تھا کہ خفیہ ہاتھوں کو پاکستان کی سالمیت عزیز نہیں تھی۔ ان خفیہ ہاتھوں نے سرحد اور بلوچستان میں محاذ آرائی کی صورت حال پیدا کر دی۔ اس محاذ آرائی سے بچنے کے لئے میری کوشش جامع قسم کی تھی۔ میں سانڈ سے لڑنے والے پہلوان کی مانند تھا۔ مفاد پرست عناصر چاہتے تھے کہ میں سانڈ کے پیٹ میں تلوار گھونپ دوں۔ مگر میں ہر بونگ یا بھاگڑ میں ایک طرف ہو جاتا تھا۔ میرے ایک دوست نے پھبتی کسی تھی کہ کیا مجھ میں چیلنج قبول کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے دوست کو محاذ آرائی کی وضاحت میں محاذ آرائی کے وسیع معنی بتائے تھے۔ میں انتہائی کوشش کر رہا تھا کہ نیپ کو ''تاریخی سمجھوتا'' کرنے کی ترغیب دوں۔ میں وہی بات کر رہا تھا۔ جو ''ایلڈ و مورو'' اٹلی میں کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ نیپ پاکستان کے اتحاد کے حلقہ میں شامل ہو جائے۔ میں کسی مبالغے سے کام نہیں لے رہا اور نہ ہی خود نمائی کر رہا ہوں جب میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے خوابیدہ بلوچستان کا ہاتھ سے پکڑا اور اسے بیسویں صدی میں چلنے کے قابل بنایا۔ میں نے بلوچستان کے غریب لوگوں کی سوچ میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ میں نے زرعی شعبہ میں بنیادی اصلاحات کیں۔ سرداری نظام کا خاتمہ کیا۔ سڑکوں اور سکولوں کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ دیہاتوں میں بجلی نہیں تھی، ٹیوب ویل لگوائے، ٹریکٹروں سے کام شروع کر دیا۔ میں نے فوج کو بلوچستان سے واپس بلوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر فوج کا سربراہ (ضیاء الحق) فوجی آپریشن کی توسیع کی سفارش کرتا تھا۔ وہ شخص لوگوں کو حیدر آباد کے مقدمے میں پھانسنے پر تلا ہوا تھا۔ دوسری جانب بلوچستان میں بموں کے دھماکے کئے گئے۔ سکول جلائے گئے، بنک لوٹے گئے۔ اسی دوران بدقسمتی سے نوجوان شیر پاؤ پشاور یونیورسٹی میں بم دھماکے سے اڑا دیئے گئے۔ اس کے باوجود حالات پر قابو پالیا گیا۔

افغانستان کے صدر محمد داؤد نے جب سرحد اور بلوچستان میں اپنے تمام طریقے آزمالئے تو

www.bhutto.org

ناکام ہو کر اس نے مجھے کابل مدعو کیا۔ وہ جان چکا تھا کہ میں نے بحران پر قابو پا لیا ہے۔ جون 1976ء کو میں نے افغانستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ کابل میں میرا بڑا استقبال کیا گیا۔ صدر داؤد چاہتا تھا کہ میں افغانستان کے ساتھ خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے نیپ کے لیڈروں کو رہا کروں۔ (نوٹ) نیپ کے لیڈروں کا رہا کرانے سے افغانستان کی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں تخریب کاری کرانے کی اور ان لیڈروں کو استعمال کرنے کی سازش کو سمجھ جانا چاہئے۔" میرا سردار داؤد سے ایک ہی مطالبہ تھا کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان ڈورنڈ لائن کو تسلیم کیا جائے۔"

شہید بھٹو کہتے ہیں اس سے زیادہ اس خط میں تحریر کرنا اچھا خیال نہیں کرتا ہوں۔ سردار داؤد کا کہنا تھا کہ لیڈروں کی رہائی سے خوشگوار ماحول پیدا ہوگا اور ڈورنڈ لائن کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ میں نے سردار داؤد کو کہا کہ خیر سگالی کے جذبات کا ایک ساتھ معاہدے کی شکل میں عمل ہوگا۔ سردار داؤد جب خیر سگالی کے طور پر 1976ء میں پاکستان تشریف لائے تو یہ طے پا گیا کہ دونوں جانب سے ایک ساتھ معاہدے کا اعلان کیا جائے گا۔ حکومت پاکستان نیپ کے لیڈروں کے غداری کے مقدمات ختم کر کے ان کو رہا کر دے گی اور کابل کی حکومت ڈورنڈ لائن کو تسلیم کرے گی۔

شہید کہتے ہیں اس کے برعکس ملاحظہ کریں جولائی 1977ء کے فوجی کوپ کے بعد ضیاء الحق نے کابل کا دورہ کیا سردار داؤد کے ساتھ ملاقات کے بعد واپس پاکستان آ کر نیپ کے حیدرآباد میں قید تمام لیڈروں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ اس کے بعد سردار داؤد پاکستان میں آیا مگر ڈورنڈ لائن کا قضیہ جوں کا توں رہ گیا۔ اس کے بارے میں دونوں حکومتوں کے درمیان بات تک نہ کی گئی۔ اس کے بعد جب سردار داؤد کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ تو حکومت پاکستان نے غیر جانب داری کی بجائے اشتعال انگیز رویہ اپنایا۔ یہ طریقہ کار احمقانہ تھا۔ حماقت فوجی حکمرانوں کی عادت ثانیہ ہوتی ہے۔ ان کی ہر منطق ان کے غیر منطقی ہونے کا مقدمہ یا دلیل ہوتی ہے۔

بھارت کی ڈپلومیسی، بھارتی وزیراعظم نے جب فوجی حکومت کی وجہ سے پاکستان میں انتشار دیکھا تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ بھارت چین کے خلاف اپنے سرحدی علاقے کے دعوے کو ترک کر دے گا۔ بھارت نے یہ رویہ افغانستان میں انقلاب آنے کے بعد چین کو اس خطے میں غیر جانب دار بنانے کے لئے کیا تھا جبکہ پاکستان کی افغانستان کے بارے میں کوئی رائے ہی نہیں تھی۔ شہید بھٹو ڈپلومیسی کے سلسلے میں انکشاف کرتے ہیں کہ بقول "صدر نکسن" اگر

اندرا گاندھی امریکہ کے صدر نکسن جیسے زیرک اور تجربہ کار سیاست دان کو پاکستان کے بارے میں بھارت کے مشرقی پاکستان کے معاملے میں رویے کے متعلق دھوکہ دے سکتی ہے۔اس کے مقابلے میں جنتا پارٹی کے متعصب لیڈر پاکستان کے ناتجربہ کار مارشل لاء حکمرانوں کی اپنی ڈپلومیسی سے کیا درگت نہیں بنائیں گے۔

ضیاء الحق کی سیاسی سرگرمیاں ختم کرنے کے بارے میں

شہید بھٹو 1978ء میں ضیاء الحق کی سیاسی سرگرمیاں ختم کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں۔سیاسی سرگرمیاں کبھی ختم نہیں ہوا کرتیں۔سیاست ایک تھیٹر ہے۔اس میں ہر حالات میں انسان اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔اگر سیاسی سرگرمیاں سطح پر نہ ہوں تو زمین دوز ہوا کرتی ہے۔

وہ مثال دیتے ہیں کہ اٹلی کے ریڈ بریگیڈ کی طرح پاکستان میں بھی کئی قسم کے ریڈ بریگیڈ پیدا ہو جائیں گے۔شہید کہتے ہیں کہ فوجی حکومت سیاسی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دے کر ملک میں دہشت گردی کی پرورش کر رہی ہے۔یہ حکومت جمہوری آزادیوں کے خلاف مذہبی عناصر کے غیر جمہوری رویوں کو تقویت دے رہی ہے۔فرقہ بازی کو ہوا دے رہی ہے۔جس کے نتیجہ میں ایسا انتشار پیدا ہو جائے گا کہ گلی گلی کشت و خون کی صورت حال پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔واضح رہے کہ یہ باتیں 1978ء میں جیل میں قید پھانسی کا ایک قیدی کر رہا ہے۔آج 2009ء میں ان کی ان باتوں کی حقیقت کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔شہید کہتے ہیں کہ کوئی فوجی مارشل لاء غیر جانبدار اور غیر نمائندہ نہیں ہوتا۔یہ قوم کی نمائندگی کی بجائے تمام قوم دشمنوں کی نمائندگی کرتا ہے۔شہید بھٹو جیل میں افسوس کر رہے ہیں کہ ''گارڈین اخبار'' نے لکھا ہے کہ پاکستان آج ایک ایسا ملک ہے جس کے پاس مسائل کا حل ہی نہیں ہے۔شہید بھٹو مارشل لاء کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مارشل لاء کسی بھی مہذب ملک کے لئے سرطان کی مانند ہے۔مارشل لاء پاکستان کے اسباب کی نفی ہے۔میں نے عوام کا خون چوسنے والے پنجاب کے اقتدار پرست ٹولے کو انتخابات میں شکست دی تھی۔اب یہ تمام ٹولا قابل نفرت فوجی آمر کے ساتھ مل گیا ہے۔شہید بھٹو متنبہ کرتے ہیں۔وہ فوجی جو بیرکوں کو خیر باد کہہ کر سرکاری محلوں میں رہتے ہیں وہ جنگیں ہار جایا کرتے ہیں اور جنگی قیدی بن جایا کرتے ہیں جیسا کہ 1971ء میں ہوا تھا۔آمریت زدہ قومیں خانہ جنگی میں

ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں۔ بدعنوانی اور رشوت ستانی کی عادی بن جاتی ہیں۔ وہ کڑے وقت کا سامنا نہیں کیا کرتیں۔فوجی ڈکٹیٹروں نے ایشیاء لاطینی امریکہ اور افریقہ کو روند ڈالا ہے۔ان کے اس اقدام کے نتیجہ میں انہوں نے مارکس اور ہیگل سے لینن اور ماؤ کی تصنیفات سے زیادہ کمیونزم کو پھیلانے کے لئے کام کیا ہے۔ یہ ڈکٹیٹر نوآبادیاتی دور کے بعد کے بدترین ظالم حکمران ہیں۔ جن کے مظالم کا توڑ صرف کمیونزم ہی ہو سکتا ہے۔شہید بھٹو کیا خوب لکھتے ہیں۔ڈکٹیٹر وہ جانور ہے جس کو پنجرے میں بند رکھنے کی ضرورت ہے۔اس نے اپنے پیشے اور اپنے آئین سے انحراف کیا ہے۔اس نے عوام سے دھوکا کیا ہے۔اس نے انسانی اقدار کو تباہ کیا ہے۔اس نے ہماری ثقافت کو تباہ کیا ہے۔اس نے نوجوانوں کو کوڑے مارے اور ان کو جیلوں میں رکھا ہے۔ یہ اپنی مرضی اور من مانی کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ یہ انسانوں کو ہلاک کرنے والا قہر ہے۔ یہ وہ جذامی یعنی کوڑھ ہے جو شخص بھی اس کو چھوتا ہے وہ جذامی ہو جاتا ہے یہ نظریہ اور اعلیٰ اصولوں سے بے بہرہ ہے۔

شہید بھٹو اس معاملے میں جیمس مارس (James Marse) کی کتاب ''فیئر ویل دی ٹرمپٹس'' (Fair Well The Trumpts) ''طبل و جنگ کو خیر باد'' کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ پاکستانی فوج کے جرنیلوں نے اسی تاریخ کو دہرانے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔جس فوجی کردار کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے۔شہید بابا کا حافظہ ملاحظہ کریں۔وہ کال کوٹھڑی میں بھی کتابوں کے ریفرنس دے رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نام نہاد پیشہ ور جرنیل جو ''سینڈھرسٹ'' کے تربیت یافتہ ہیں انہوں نے سیاسی اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے اور سیاست کو وقت گزاری کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔

انسانی حقوق

وہ کہتے ہیں کہ حالیہ برسوں میں انسانی حقوق کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ آمریت انسانی حقوق کو بھی اپنے مقصد کی خاطر اپنی پسند کے مطابق استعمال کرتی ہے۔''فوجی جنتا انسانی حقوق کی وحشیانہ نفی ہے'' لہٰذا اس سے انسانی حقوق کے احترام کی بات کرنا ایک طنز یہ صورتِ حال ہے۔

اس فوجی جنتا میں سے کسی نے بھی تاریخ میں ایک لحہ کے لئے بھی کوئی خدمت سرانجام نہیں

www.bhutto.org

دی۔ ان فوجی جرنیلوں نے، ڈکٹیٹروں نے کوئی آزادی کی جنگ نہیں لڑی، اور نہ یہ کسی زندگی کے کسی اعلیٰ مقصد اور نظریے کے پابند ہیں۔ یہ انتہائی جھوٹے اور سازشی ہیں جو یکا یک اعلیٰ طبقہ بن جاتے ہیں۔ یہ ایسے خانہ زاد چور اور رہزن ہیں جو تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ اپنے پیشے کو خیر باد کہہ کر اپنے مالک کے گھر پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ یہ وطن اور قوم فروشی کر کے غیر ملکی سفارت کاروں کے شوبوائے بن جاتے ہیں۔

افراطِ زر

ضیاء الحق حکومت کے پاکستانی کرنسی کو ڈی ویلیو کرنے کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔ افراطِ زر سے بے روزگاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں افراطِ زر اور بے روزگاری کے مصائب کو سماجی تحفظ کی اسکیموں کے ذریعے تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ جبکہ ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک میں سماجی تحفظ کی اسکیمیں نہیں ہوتیں۔ جس کی وجہ سے افراطِ زر اور بے روزگاری دونوں ہی بری چیزیں ہوتی ہیں۔ اس مسئلے پر شہید بھٹو ایک ماہرِ اقتصادیات کی طرح کہتے ہیں کہ اگر ترقی پذیر ملک کو ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو غریب ملک کو بے روزگاری کا سامنا کرنے کا انتخاب کرنا چاہئے۔ یہاں پر وہ بالکل کارل مارکس والی بات کہتے ہیں۔ کارل مارکس نے کہا تھا کہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ افراطِ زر میں کمی نہیں کی جا سکتی نہ ہی اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ایک بار روپے کی قیمت گر جائے تو واپس دوبارہ پہلے والی سطح پر نہیں لائی جا سکتی۔ یہ ایک اقتصادیات کی سائنس ہے، جو شہید بھٹو پھانسی کوٹھڑی میں بیان کر رہے ہیں۔ وہ دل سوزی سے فرماتے ہیں۔ یہ وہ سوالات ہیں جو ایک فوجی ڈکٹیٹر کے ذہن میں نہیں آ سکتے۔ ایسے شخص کے نزدیک جو چیز دولت مند ممالک کے لئے اچھی ہے وہی غریب ممالک کے لئے بھی اچھی ہے۔ یہ دولت مندوں کا آلہ کار ہے۔ دولت مندوں کے فارمولے کو قبول کرتا ہے۔ ایک ایجنٹ ہے۔ ان تمام چیزوں پر غیر ترقیاتی اخراجات کو انتہائی کم کر کے قابو پایا جا سکتا ہے۔ مگر جرنیلوں، ڈکٹیٹروں کے بجٹ پارلیمنٹ کے بجائے جی۔ ایچ۔ کیو میں بنتے ہیں اور ٹیلی ویژن اسٹوڈیو سے اس کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ جس بجٹ میں سب سے بڑا حصہ فوج کے غیر ترقیاتی سامان کا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جنرل کنڈر گارٹن کے بچوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے کھیلنے کے

لئے کھلونے چاہئیں۔ایشیاء میں دوممالک تھائی لینڈ اور پاکستان ڈکٹیٹر شپ میں بازی لے جانے کی کوشش میں مبتلا ہیں۔مگر تھائی لینڈ موروثی بادشاہت کی وجہ سے آئینی خلا سے بچ سکتا ہے۔ پاکستان ہرگز نہیں بچ سکتا۔یہ فوجی ڈکٹیٹر کسی اعلیٰ نظریہ پر عمل پیرا ہونے کے لئے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ نہیں کرتے۔یہ بڑی طاقتوں کے عالمی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے آتے ہیں۔یہ اس امر کو یقینی بنانے کے لئے آتے ہیں کہ یہ ہر حال میں نیٹو اور سینٹو کے معاہدات کے پابند رہیں گے۔ یہ آزادی کی تحریکوں کے بجائے افراطِ زر اور حقِ خودارادی کے تحفظ کے بجائے جی۔این۔پی کے تحفظ کی بات کرنے لگ جاتے ہیں۔یہ ظالم تضادات کے خالق ہیں۔یہ جب سیاسی منظر سے علیحدہ ہوتے ہیں تو اپنے پیچھے کسی زیادہ بدعنوانی اور رشوت ستانی اور زیادہ عدم استحکام چھوڑ جاتے ہیں۔یہ ملک کی سیاست اور معیشت کو انتشار کا شکار بنا کر دستور اور آئین کا ایسا گنجلک خلا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں جس کو پُر کرنا ممکن نہیں رہ جاتا۔

سیاست دانوں کو بدنام کرنا

ہر فوجی جنتا اور جرنیلوں کا ایک ہی کام ہوتا ہے۔وہ کام ہے سیاست دانوں کا مذاق اڑانا۔ ان کی کردار کشی کرنا۔ یہ تمام خرابیوں کی ذمہ داری سیاست دانوں کے کندھوں پر ڈال کر ان کی اہمیت کو کم کرنا اور ان کو ذلیل کرنا ہوتا ہے۔

ماضی کے واقعات کے بارے میں مبالغہ آمیز اور غلط توضیحات کی جاتی ہیں۔جعلی دستاویزات تیار کی جاتی ہیں۔جو سیاسی لیڈر جس قدر زیادہ مقبول ہوتا ہے۔ملک وقوم کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔اس کے خلاف اتنا زیادہ زور وشور کے ساتھ خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے،اور اس پر ظلم وستم ڈھائے جاتے ہیں۔یہ فوجی جرنیل عقل وخرد سے عاری ہوتے ہیں۔دانش وحکمت سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔قومی اور بین الاقوامی حالات کی پیچیدگیوں سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔عالمی سیاست کاری،سفارت کاری اور ڈپلومیسی ان کا شعبہ نہیں ہوتی۔

مسئلہ کشمیر

ان تمام کی کارکردگی کو کشمیر کے مسئلے کے حوالے سے دیکھا جا سکتا ہے۔انہوں نے یکے بعد

www.bhutto.org

دیگر ے اس معاملے کو نہ صرف پیچیدہ بنادیا ہے بلکہ اس کی شکل ہی بگاڑ دی ہے۔ان میں پہلے فوجی ڈکٹیٹر جنرل ایوب خان نے انتہائی غلط قسم کی فوجی منصوبہ بندی سے کشمیر میں فوجی کارروائی کر کے 1965ء میں ہندوستان کو پاکستان پر حملہ کرنے کا بہانہ عطا کر دیا۔وہ لاہور شہر کے مضافات میں پہنچ گئے ان کو خبر تک نہ ہوئی،اور معاہدہ تاشقند کر کے جان چھڑانی پڑی تھی۔

اب موجودہ ڈکٹیٹر ضیاء الحق نے جنوری 1978ء میں بھارتی وزیر خارجہ کی اسلام آباد آمد پر اظہارِ خیال کیا ہے کہ کشمیر کے معاملے میں کچھ لو کچھ دو یا کچھ دو کچھ لو کا معاملہ کرنا پڑے گا۔یہ قومی نزاعی معاملات میں ایک بھیانک قسم کا طرزِ عمل ہے۔یہ رویہ بہت خطرناک ثابت ہوگا اگر کشمیر کے مسئلے پر حق خودارادی کے تسلیم شدہ بین الاقوامی موقف اور اصول کو ترک کر دیا گیا۔تو کشمیر کے معاملے میں بہت کم اقوام ایک بڑی ریاست کے مقابلے میں ایک چھوٹی ریاست کی حمایت کریں گے۔افسوس کہ یہ جرنیل ریاستی امور سے نابلد ہوتے ہیں۔اگر ضیاء الحق فارمولا اختیار کیا گیا تو کشمیر کا تنازع ایک اخلاقی اصول سے گر کر ایک لاش رہ جائے گا جس کو قصاب کی دکان میں کاٹا جائے گا۔اس صورت میں شیر کو شیر کا حصہ ملے گا۔بڑے ملک کو بڑا حصہ ملے گا۔

سہولت کی خارجہ پالیسی

یہ فوجی جرنیل اپنی سہولت کی خارجہ پالیسی بناتے ہیں جس میں ملک وقوم کے نفع ونقصان کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔یہ بھارت جیسے ملک کی خارجہ پالیسی کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔1959ء میں جنرل ایوب خان نے پالم ائیر پورٹ پر خود ہی پہنچ کر پنڈت نہرو کو شمال کی جانب سے خطرہ کے پیشِ نظر مشترکہ دفاع کی تجویز پیش کی تھی۔ڈکٹیٹر ایوب خان کی خیر سگالی کا جواب بھارت کی طرف سے 1965ء میں لاہور پر اور پاکستان پر حملے کی شکل میں ملا تھا۔ڈکٹیٹر ایوب خان کی یہ پیش کش بہ یک وقت سویت روس اور چین جیسے امن پسند ملک کو پاکستان کا دشمن بنانے والی بات تھی۔سویت روس تو بھارت کا دوست تھا۔یہ پیش کش تو صرف چین کے ہی خلاف ہوسکتی تھی۔کوئی کہے کہ یہ کہاں کی عقل مندی تھی۔پہلے ڈکٹیٹر صاحب کے بعد دوسرے ڈکٹیٹر صاحب جنرل یحیٰ خان کی سنئے۔انہوں نے عالمِ اسلام کی پہلی کانفرنس جو 1970ء میں "رباط" میں منعقد ہوئی تھی۔اس کانفرنس میں ایک سکھ سردار یحیٰ خان کی رضامندی اور اجازت سے اسلامی لیڈروں کی کانفرنس

www.bhutto.org

میں بھارت کی نمائندگی کرنے کی غرض سے اسلامی کانفرنس میں داخل ہوگیا۔ایک سکھ کا بھارت کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنا گاندھی کے اس مشہور قول کو درست ثابت کرنا تھا کہ بھارت خود مسلمانوں کی نمائندگی کرسکتا ہے۔لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان کی کیا ضرورت ہے۔ ڈکٹیٹر یحیٰی خان کے اس اقدام نے پاکستان کے کشمیر کے روحانی موقف کو ایک دوسرا مکا رسید کیا تھا۔جب میں نے ایک سکھ کے اسلامی سربراہی کانفرنس میں مسلمانوں کی نمائندگی کرنے پر سخت احتجاج کیا،اور عالمِ اسلام کے فطری ناموافق ردِعمل سے آگاہ کیا۔تب یحیٰی خان اپنی اس حرکت سے باز آئے تھے اور اس سمجھوتے سے پھر گئے تھے۔لیکن پاکستان کو نقصان پہنچ چکا تھا۔یہ جرنیل ہندوستان کے بارے میں پہلے غلطی کر کے پھر جارحانہ بیان دینا شروع کردیتے ہیں۔جس سے صورت حال زیادہ بگڑ جاتی ہے۔ڈکٹیٹر یحیٰی خان کی خیر سگالی کا جواب بھی بھارت نے ایوب خان کی خیر سگالی کے جواب کی طرح 1971ء میں یحیٰی خان کو ڈنڈا کرا کے پاکستان ہی توڑ دیا تھا۔

شہید بھٹو اپنے خط کے صفحہ 180 پر تحریر کرتے ہیں کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ضیاء الحق کس سبب سے اپنے غیر ضمیر پیشرووں کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے،اور اسی ناکارہ پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔وہ سخت غلطی کا شکار ہے۔اگر وہ یہ خیال کرتا ہے کہ جالندھر سے اس کو بانس کے بجائے مٹھائی ملے گی۔یہاں پر شہید بھٹو بڑی خوبصورت طنز کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ڈیسائی نے ضیاء الحق کو بانس دینے کا آرڈر احمد آباد میں دے دیا ہے۔جس طرح پنڈت نہرو نے ایوب خان کو بانس دینے کا آرڈر الہ آباد میں دیا تھا۔یاد رہے کہ الہ آباد نہرو کا گھر تھا۔اسی طرح ڈیسائی احمد آباد کا رہنے والا تھا۔آخر میں کہتے ہیں پھر یہ کہیں گے وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔اس کے آگے شہید ایک عالمی دانش ور کی حیثیت سے ایک ضرب المثل قسم کی معرفت کی بات کرتے ہیں۔فرماتے ہیں اگر آزادی، جمہوریت، آئینی اور انسانی حقوق اور زندگی کی اعلیٰ اقدار کی کوئی قدر و قیمت ہے تو اس کا جواب یا حل یہی ہے کہ فوجی جرنیلوں کو مکمل طور پر انسانی آبادی سے الگ تھلگ اور سماج سے بالکل علیحدہ کردیا جائے ان کو ان کی بیرکوں میں ہی رکھا جائے۔یہاں وہ ایک تاریخی مثال پیش کرتے ہیں۔تحریر کرتے ہیں کہ اگر اسپین کے جنرل فرینکو کو جو اسپین کی خانہ جنگی کا فاتح جنرل تھا۔بیس سال سے زائد عرصے تک الگ تھلگ رکھا جاسکتا ہے تو یہ ان دیکھاوے کے جرنیلوں اور ڈکٹیٹروں کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے۔ان کو ہر اعتبار

www.bhutto.org

سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور ان کی مذمت کی جا سکتی ہے۔ ان کو سزا دی جا سکتی ہے۔ صرف اسی صورت میں جمہوریت آئینی حکومت اور انسانی حقوق اور آزادی رائے سے ملک و قوم میں آمرانہ نظام کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کی جا سکتی ہے۔

ان جرنیلوں کو ملکی معاملات اور سیاست سے دور رکھ کر ہی جمہوریت اور آئینی اور انسانی حقوق کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں میں آمرانہ نظام کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کی جا سکتی ہے۔

ایک باریک بات

شہید بھٹو اپنی بیٹی کو کمیونزم اور یورپ کے درمیان جاری جنگ کے بارے میں بڑی باریک بات کہتے ہیں۔ یورپ ان غیر کمیونسٹ ممالک کے ساتھ خوش نہیں ہے۔ جن کو مغرب روس کا یا چین کا حامی خیال کرتا ہے۔ اس کا یعنی مغرب کا امریکہ کا ہمیشہ دوہرہ معیار رہا ہے۔ صدر نکسن چین کا دورہ کرتا ہے اور ان کا وزیر خارجہ بلبلی سمجھوتا کرتا ہے۔ روس کے ساتھ سالٹ دوئم معاہدہ کرنے کا خواہش مند ہے۔ چین کو اسلحہ بھی فروخت کر رہا ہے۔

مگر اس کے برعکس غیر کمیونسٹ نیشنلسٹ مسلم ملک ''لیبیا'' کے قذافی اور مسلم ''الجیریا'' کے بومدین اور ماضی میں انڈونیشیا کے صدر سویکارنو سے اس بنیاد پر ناخوش تھا کہ ان کے دوستانہ تعلقات روس سے یا چین کے ساتھ ہیں۔ واضح ہو کہ مغرب کو مجھ سے بھی یہی شکایت تھی۔

اگر قومی کاز کے دفاع میں کوئی لیڈر امریکہ سے اختلاف رائے رکھتا ہے تو اس سویلین لیڈر کو فوجی انقلاب کے ذریعے اقتدار سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس کی جگہ ایک فوجی ڈکٹیٹر کو بٹھا دیا جاتا ہے۔ جو اس سے اختلاف رائے کی جرات ہی نہیں کر سکتا۔

اپنی طرف سے امریکہ فوجی ڈکٹیٹروں کو لا کر کمیونزم کا راستہ روکتا ہے مگر ان چھوٹو ڈکٹیٹروں کی عوام دشمن پالیسیاں کمیونزم کو پھیلانے میں زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہیں۔ جبکہ ایک سویلین قومی لیڈر کا امریکہ کے ساتھ عدم اتفاق کہیں بھی کمیونزم کے پھیلنے کا باعث نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ کمیونزم ہمیشہ وہاں آتا ہے جہاں ظلم ہو، بربریت ہو، ناداری ہو، بھوک ہو، اور آزادی رائے نہ ہو، اور انسانی حقوق نہ ہوں۔ یہ ان کے جنون کا ایک طریقہ کار ہے۔ یہ ایک کمیونسٹ لیڈر سے دوستی چاہتے ہیں اور ایک غیر کمیونسٹ لیڈر جو ترقی پسند خیالات رکھتا ہے۔ اس کے دشمن بن - -

ہیں اوراس کی جگہ فوجی ڈکٹیٹر لاتے ہیں ۔ ایشیاء میں، لاطینی امریکہ اور افریقہ میں یہ فوجی ڈکٹیٹروں سے کمیونزم کی خود ہی راہ ہموار کر رہے ہیں ۔ ان کا ویت نام اور شنگھائی اعلامیہ اور معاہدۂ سالٹ میری بات کی کھلی دلیل ہے ۔ جوان کی منطق کی وضاحت کرتا ہے ۔

قتل کی ایک مثال

شہید بھٹو اپنی اس عالمی بین الاقوامی کی دانش و حکمت کے لئے پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ایوب خان کی ایک مثال پیش کرتے ہیں ۔ جو امریکنوں کے کردار کو سمجھنے کے لئے انتہائی کافی ہے ۔ 1963ء میں امریکہ کے صدر کینڈی کے قتل سے پہلے ویت نام کے معروف ''صدر نگو ڈنگھ ڈائم'' کو امریکی سی ۔ آئی ۔ اے نے قتل کروا دیا تھا ۔

نگو ڈنگھ ڈائم

واضح رہے کہ ویتنام کا صدر نگو ڈنگھ ڈائم صدر ایوب خان کی طرح ہی امریکہ کی آنکھ کا تارا تھا، مگر ویتنام کی قومی سیاست میں ڈائم کا امریکہ سے کچھ اختلاف ہو گیا، اور امریکہ نے اس کو ایک سازش کے ذریعے قتل کروا دیا ۔ ڈائم کے قتل ہو جانے سے صدر جنرل ایوب خان کو اپنا بھی خطرہ پڑ گیا ۔ اس لئے کہ ڈائم اور صدر ایوب دونوں ہی امریکہ کے حامی تھے ۔

صدر نکسن نے اپنی کتاب کے صفحہ 256 پر ایوب خان کی گفتگو کا ذکر کیا ہے ۔ لہٰذا صدر ایوب خان نے صدر نکسن کی پاکستان آمد پر اس سے گفتگو کے دوران اس بات کا اظہار کیا کہ آپ نے یعنی امریکہ نے ایک عرصہ تک ڈائم کی حمایت کی ۔ ایشیاء میں ڈائم کی اور آپ کی دوستی کا ہر شخص کو علم تھا ۔ پھر آپ نے یکا یک ڈائم کی مدد کرنا چھوڑ دی اور ڈائم قتل ہو گیا ۔

جنرل ایوب خان اپنے اقتدار کے آخری حصے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا جس کا اس نے اپنی کتاب ''فرینڈز ناٹ ماسٹر'' میں ذکر کیا تھا وہ یوں تھا ۔ وہ کہتا ہے کہ ڈائم کا قتل بہت سے ایشیائی لیڈروں کے لئے تین معنی رکھتا ہے ۔ (1) امریکہ کا دوست ہونا خطرناک ہے ۔ (2) غیر جانب دار رہنے میں فائدہ ہے ۔ (3) بسا اوقات امریکہ کا دشمن ہونا مدد گار ثابت ہوتا ہے ۔

میں نے مغرب کی حکمتِ عملی کی توضیح کرنے کے لئے ایوب خان کا تجربہ بیان کیا ہے ۔

www.bhutto.org

میری منطق یہ ہے

اس معاملے میں میری منطق یہ ہے کہ جب ''وتیانت'' یعنی دوستی کے باعث دونوں طاقتوں کے درمیان آہنی پردہ اٹھ گیا ہے۔ مغربی لیڈر کریملن میں ''ووڈکا اور کیولیر'' کے ساتھ روسی کیمونسٹ لیڈروں کے جامِ صحت پینے لگ گئے ہیں۔ اسی طرح بعد میں ماؤزے تنگ اور چینی لیڈروں کے چین کے ''عظیم ہال'' میں جامِ صحت پینے لگ گئے ہیں۔ تو پھر کیمونسٹ لیڈروں کے دوست غیر کیمونسٹ لیڈروں کے ساتھ ان کی مغائرت اور عناد بالکل غیر مناسب ہے۔

اس سے بھی زیادہ غیر مناسب اور غیر منطقی ان مغرب نواز غیر جانب دار سیاسی لیڈروں کے بارے میں مغرب کی ناراضگی ہے۔ جو اپنے قومی تحفظ کے لئے امریکہ کے ساتھ اختلاف رائے کرنے کی جرات کرتے ہیں۔ ''ان میں سے میں بھی ایک ہوں۔''

میں اس میں ایک قدم اور آگے جانے کی جرات کروں گا کہ دیکھنے میں معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ گویا وفاقی جرمنی اور جاپان کے کیمونسٹ پولینڈ یا کیمونسٹ رومانیہ کے ساتھ زیادہ کھچاؤ اور تناؤ رکھتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ان کی عالمی مساوات درحقیقت اُلٹی ہے۔

اندوہ ناک شکایت

آخر میں فرماتے ہیں اس اندوہ ناک شکایت کو تاریخ کی منطقی توضیح کی شکل میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ 1844ء میں کارل مارکس نے کہا تھا کہ سرمایہ داری نظام خود ہی اپنی بربادی کے بیج بوتا ہے۔ دنیا کے خام مال کے واسطے آپس میں جنگ کرتا ہے۔ اس کے اپنے تضادات ہی دنیا میں تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے ہر قوم پرست لیڈر کے ساتھ اختلافات ہو جاتے ہیں۔ مغرب کی تاریخ میں دو ہی ایسے لیڈر گزرے ہیں جو بڑا وژن رکھتے تھے۔ ایک تو امریکہ کے صدر ''آئزن ہاور'' تھے، دوسرے فرانس کے صدر ڈیگال تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں ان دونوں فوجی جرنیلوں کی سیاسی بصیرت اور دانشمندی کا اعتراف کر کے خود اپنے موقف کی تردید کر رہا ہوں۔ نہیں، ایسا بالکل نہیں ہے۔ فوجی لیڈر تو بے شمار ہیں میں نے اس سے پہلے بھی ان کے

www.bhutto.org

درمیان امتیازی خط کھینچا تھا۔

دیکھئے جنرل چارلس ڈیگال ایک اعلیٰ پائے کے فوجی لیڈر تھے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ ایک سربرآوردہ سیاسی مدبر اور لیڈر بھی تھے۔ وہ دوسری جنگِ عظیم کے جہنم سے گزرے تھے۔ وہ ڈپلومیسی کی سیاست سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات آئزن ہاور اور ڈیگال دونوں ہی کو عوام نے ووٹوں کے ذریعے منتخب کیا تھا۔ وہ ایک مستحکم جمہوری ممالک کے نمائندہ صدر تھے۔ ان دونوں نے پیچھے کے دروازے سے آکر اقتدار پر قبضہ نہیں کیا تھا نہ ہی کوئی کوپ کر کے فوجی انقلاب برپا کیا تھا۔ لہٰذا ان دونوں معروف سیاسی رہنماؤں کا موازنہ غیر نظریاتی اور بی۔ این۔ پی کے دلدادہ غاصبوں جرنیلوں سے کرنا ان کی توہین ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ کے دوسرے صدور کے مقابلے میں صدر آئزن ہاور نے مصر کے صدر ناصر کی پوزیشن کو باقی فوجی لیڈروں کی نسبت بنیادی فرق کو سمجھا تھا اور انہوں نے ایک قوم پرست لیڈر صدر ناصر کی حمایت کی تھی۔ فرانس کا ڈیگال بھی عالمی حقیقی رہنماؤں کا احترام کرتا تھا۔

مگر ان دونوں کے بعد مغرب مسلسل اپنے سیاسی تضادات کا شکار چلا آرہا ہے۔ اس کے اس تضادات کے پیشِ نظر عالمی رہنما وزیراعظم چو۔ این۔ لائی نے بلا مقصد یہ بات یا بلاوجہ یہ بات امریکہ کے صدر سے نہیں کہی تھی کہ **"وہ اس پل کو نہ بھولیں جس کو پار کر کے وہ پیکنگ آئے ہیں۔"**

یہ بات انہوں نے پاکستان کے لئے کہی تھی۔ امریکہ کی اسی تضاداتی سیاست اور رویئے کو بیان کرتے ہوئے وہ برازیل کے صدر کی مثال دیتے ہیں کہ برازیل کے صدر امریکہ کے اتحادیوں میں سے ایک تھے۔ ایک وقت تک ان کو امریکہ کی سرپرستی حاصل تھی ان کا نام صدر گولرٹ تھا۔ ان سے بھی ایک ناقابل معافی گناہ سرزد ہوگیا تھا۔ انہوں نے 1964ء کو جمہوریہ چین کو تسلیم کرلیا تھا حالانکہ وہ کمیونسٹ نہیں تھے۔ ان کے اس جرم کی پاداش میں وہی مشہور زمانہ ایکشن ان کے خلاف کیا گیا۔ برازیل میں فوجی انقلاب برپا کر کے صدر گولرٹ کو برطرف کر دیا گیا۔ ان کی برطرفی کے وہی اسباب بیان گئے تھے جو ہمیشہ ہر فوجی کوپ کے بعد لگائے جاتے ہیں کہ افراطِ زر ہوگیا، بدامنی ہوگئی، بدانتظامی ہوگئی وغیرہ وغیرہ۔

15 سال تک ڈکٹیٹر راج کرتا رہا۔ اس قدر طویل عرصہ تو انسانوں کو انسانی صفات سے محروم کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ لیکن وقت اور حقائق زمانہ کی قوت ملاحظہ ہو کہ اسی صدر گولرٹ

کے ملک برازیل میں 1978ء میں بریژینسکی جمہوریہ چین کی تعریف کررہا ہے۔ اگر امریکن یہ کہیں کہ یہ وقت وقت کی بات ہے۔ تو یہ ایک انتہادرجے کی سفاکی ہوگی اور امریکنوں کی نالائقی ہوگی، اور انسانی سوچ کی توہین ہوگی۔" امریکہ کو اپنے دوستوں اور اتحادیوں کو اس لئے تو سزا نہیں دینی چاہئے کہ وہ بہتر طور پر صحیح وقت کی حس رکھتے ہیں۔ وہ آنے والے وقت کا ادراک رکھتے ہیں۔" یہاں پر شہید بھٹو شیکسپیئر کے ڈرامے سیزر کا ایک مکالمہ دہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعر دوسو کو تو لوگ برے اشعار کی وجہ سے مار دینا چاہتے تھے۔ مگر امریکی تو اچھے شعر کہنے والوں کو بھی مارتے چلے جارہے ہیں۔ شہید کہتے ہیں عیسائی مغرب لفظاً اور معناً حضرت عیسیٰ کی صرف ایک ہی ہدایت پر عمل کرے۔ وہ ہدایت یہ ہے کہ "جس بات کا تعلق سیزر سے ہے اس کا حق سیزر کو ادا کرو۔ اور جس کا تعلق اللہ سے ہے اس کا حق اللہ کو ادا کرو۔"

تیسری دنیا صرف وہی چاہتی ہے جو اس کا حق ہے اور اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں چاہتی۔

قارئین کرام کون کر سکتا ہے ایسی معرفت کی باتیں جو باتیں شہید بھٹو پھانسی کوٹھڑی میں کر رہے ہیں۔ پہلے انہوں نے امریکہ کو عالمی سیاست کے حوالے سے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد اب عیسائیت کے حوالے سے امریکہ کو اپنی بات کی صداقت کو سمجھانے کی کوشش کررہے ہیں جو امریکہ کا مذہب ہے۔ وہ فرماتے ہیں دوسو سال زائد عرصہ تک مغرب کی عیسائی تہذیب بڑی بے رحمی سے حضرت عیسیٰ کی اس ہدایت سے انحراف کررہی ہے۔ مغرب ہر وہ شے جس کا حق سیزر سے ہے وہ لے رہا ہے اور ہر وہ شے بھی لے رہا ہے جس کا تعلق اللہ سے ہے۔ "سبحان اللہ" کیا ہی شہید کا اسلوب نگارش ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ مغرب اس حصے کو منصفانہ طور پر تقسیم نہیں کررہا ہے وہ ہمیں وہ شے نہیں دے رہا ہے جس پر ہمارا حق ہے۔ اس تقسیم کا تعلق تیسری دنیا کے اقتصادی، سماجی، نسلی اور سیاسی حقوق سے ہے۔ ہمارا مقصد مواقع کے عدم مساوات کے خاتمے سے ہے۔ مطلب انسانی عظمت کے احترام سے ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا مطلب باعزت اور انصاف پر مبنی زندگی سے ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم مغرب اور مشرق دونوں دنیاؤں کی دوستی چاہتے ہیں۔ اور ہم تیسری دنیا ہی جو دونوں دنیاؤں کے درمیان پل ہو سکتی ہے۔ برادرانہ اخوت بے تکلفی اور مساوات کے حصول سے پیدا ہوتی ہے آقا اور ملازم کے تعلق سے پیدا نہیں ہوتی۔

برادرانہ اخوت آقا اور ملازم کے تعلق سے پیدا نہیں ہوتی

آقا اور ملازم کے تعلق سے اقتصادی ناہمواری اور عدم مساوات پیدا ہوتی ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں میرے پاس اس کی مثالیں موجود ہیں۔ 1954ء میں ہند چین کے بارے میں جنیوا کانفرنس میں جان ماسٹر ڈلیس جو امریکہ کا وزیر خارجہ تھا اس نے عظیم چین کے وزیر اعظم چو۔این۔لائی سے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے انتقام میں میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ پنڈت نہرو کی وفات پر ہاتھ ملانے سے گریز کیا تھا۔ اس لئے کہ ڈلیس نے ایشیاء کے ایک عظیم لیڈر کی توہین کی تھی۔ میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ہاتھ نہ ملا کر چو۔این۔لائی کی ہتک کا بدلہ لیا تھا۔ کچھ میرے ذہن میں اس شخص کے خلاف تقسیم ہندوستان کے وقت پاکستان کو نقصان پہنچانے کا تعصب بھی موجود تھا۔

دوہرا معیار

مغرب کا دوہرا معیار ملاحظہ ہو۔ جب روس کے وزیر اعظم اقوامِ متحدہ میں اپنے جوتے اتار دیتے ہیں۔ اپنے جوتوں کو اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو دکھاتے ہیں تو اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل مسکراتے ہوئے اپنے بلند پلیٹ فارم سے نیچے اتر کر روس کے وزیر اعظم کے پاس جا کر اس سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ یہ 1960ء کا واقعہ ہے۔ میں اقوامِ متحدہ میں اس وقت روس کے وزیر اعظم سے تین قطار آگے بیٹھا ہوا تھا۔

اس کے برعکس

اس کے جب ہم اپنے ملک کو بین الاقوامی برادری کا زیادہ کارآمد اور ذمہ دار بنانا چاہتے ہیں یا میں بنانا چاہتا تھا۔ تو ہماری کوششوں کو غلط سمجھا جاتا ہے اور ہمارے خلاف فوجی انقلاب کی سازش کی جاتی ہے، اور اس قسم کے فوجی انقلاب کی کامیابی کے بعد اس قسم کا بیان دیا جاتا ہے۔

وہ تو اپنی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر بات کر رہا تھا

شہید بھٹو تحریر کرتے ہیں کہ میں اپنے ملک کے جوتے کسی کے چہرے کے سامنے تو نہیں لہراتا

ہوں۔ مگر افسوس کے طاقت اور اقتدار کا نشہ امریکہ کو اس قسم کی باتیں کہنے کی ترغیب دیتا ہے کہ میں بڑھ چڑھ کر باتیں کرتا ہوں۔ کیا اپنے ملک کے حقوق کی بات کرنا اپنی حیثیت سے باہر ہونا ہوتا ہے۔

آگے مغرب کے لئے وہ بڑی فقیرانہ بات کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں براہِ کرم یہ نہ سمجھا جائے کہ پاکستان کے فوجی جنتا نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کی وجہ سے مغرب کے بارے میں بہت زیادہ سختی کے ساتھ اپنی رائے قائم کر رہا ہوں۔

مجھے تاریخ کا علم ہے

مجھے تاریخ کی کافی معلومات ہیں اور میں جانتا ہوں کہ پانسہ پلٹ جاتا ہے اور کل کے شہنشاہ آج کے فقیر بن جاتے ہیں۔

میں نپولین بونا پارٹ کا مداح ہوں

تمہیں علم ہے کہ میں نپولین بونا پارٹ کا مداح ہوں۔ فرانسیسی انقلاب اور نپولین کے ساتھ میری جذباتی وابستگی کس قدر ہے۔ انقلابیوں نے نہ صرف بادشاہ کو قتل کیا بلکہ وہ اپنے لائے ہوئے انقلاب میں خود بھی غرق ہو گئے۔ انقلابی لیڈر روبیپئر اور ڈینٹن کو پھانسی پر چڑھنا پڑا تھا۔ گویا انتقام پر انتقام لیا گیا تھا۔

فرانس انقلاب کی ماں ہے

فرانس انقلاب کی ماں ہے۔ اس نے انقلاب کے بچے کو جنم دیا تھا۔ نپولین غیر معمولی صلاحیتوں کا انسان تھا اور تہذیب کے قافلے کا مکمل کپتان تھا۔ فرانس کا انقلاب انتقام اور جوابی انتقام کی وجہ سے اپنے بنیادی مقصد سے محروم ہو گیا۔ وہ انقلاب منتقم مزاج ہو گیا اور ذاتیات پر اتر آیا تو فرانس کے عوام کا انقلاب اور انقلابیوں پر اعتماد ختم ہو گیا۔

فرانس کے انقلابی عوام نے اکثر اوقات فرانس کو انقلاب کے نطفہ سے حاملہ کیا۔ لیکن پیدائش سے پہلے ہی اسقاطِ حمل کرا دیا ''یعنی انتقامی کارروائیوں سے۔'' انقلاب کو پرانے نظام کو ختم کرنا اور نئے نظام کو تعمیر کرنا تھا۔ مگر انقلاب کے مخالفین نے اس تضاد کو غلط رخ دے دیا۔

www.bhutto.org

انقلابی لیڈر آزادی، مساوات اور برادرانہ مفاہمت کے اعلیٰ وارفع اصولوں کو سنجیدہ نوعیت کے اداروں میں مستحکم نہ کر سکے۔ لہٰذا خون خرابہ انقلاب کا عنوان بن گیا۔

انتقام کی تاریخ

پہلی مثال

شہید بھٹو امریکہ اور پاکستان کے فوجی جنتا کو انتقام کی سیاست ختم کرنے کے بارے میں تاریخ کے حوالوں سے سبق دیتے ہیں۔ وہ فرانس کی انتقامی سیاست کے بعد سویت روس کی مثال پیش کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ زار کے قتل کا روس کی تعمیر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر چیانگ کائی شیک کو زندہ فرار ہونے کا چین سے موقعہ دینا چین کی تعمیر سے تعلق رکھتا تھا۔ چینی لیڈروں نے انتقام کی طرف زور نہیں دیا۔ تعمیر کی طرف دھیان رکھا۔ چیانگ کائی شیک کو قتل نہ کیا گیا۔

دوسری مثال

دوسری مثال شہید بھٹو جمال عبدالناطر کے انقلاب کی دیتے ہیں۔ جمال عبدالناصر نے جب شاہ فاروق کی بدعنوان حکومت کا تختہ الٹا توان کے بہت سے ساتھیوں کی خواہش تھی کہ فاروق کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن ناصر نے انکار کر دیا۔ انہوں نے فاروق کو مصر سے باہر چلے جانے کی اجازت دے دی۔ جس کی وجہ سے ناصر کو مہذب دنیا کی نگاہوں میں بلند مقامِ حاصل ہو گیا تھا۔ ناصر کے انقلاب کو اس لئے نقصان نہ پہنچا تھا۔ انہوں نے انقلاب کے ساتھ رحم دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اپنی اس کتاب کے صفحہ 115 پر ہم دیکھتے ہیں کہ شہید بھٹو کس طرح عالمی مثالیں دے کر اپنے قاتلوں کو اپنے قتل سے باز کرنا چاہتے ہیں۔

تیسری مثال

شہید بھٹو انتقام کی تیسری مثال جمہوریہ اسلامی ملک ترکی کی دیتے ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ ترکی کے فوجی جنتا نے خیال کیا کہ ترکی مسائل کا ایک آسان حل اور سادہ طریقہ ''عدنان میندرس''

کو تختہ دار پر لٹکا دینا ہے۔ ستمبر 1960ء میں شہید بھٹو کو جو پاکستان کے وزیر خارجہ تھے ان کو حکومتِ پاکستان نے عدنان میندرس کو سزائے موت سے بچانے کے لئے بھیجا تھا۔ میں نے ترکی کے وزیر خارجہ سلیم کی موجودگی میں جنرل گرسل سے عدنان میندرس کی جان بچانے کے لئے طویل ملاقات کی۔ جنرل گرسل نے مجھے کہا کہ ترکی کے تمام مسائل عدنان میندرس کو پھانسی دینے سے حل ہو جائیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ جنرل صاحب ترک عوام میندرس کی پھانسی کو کئی نسلوں تک نہیں بھلا پائیں گے۔ میں نے گرسل کو کہا کہ میندرس پھانسی پا کر لافانی ہو جائے گا۔ مگر اس سانحہ کا گہرا داغ ترکی کے چہرے پر نمودار ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ترکی آج بھی اس المناک سانحے کے اثرات سے متاثر چلا آ رہا ہے۔ ترکی اب تک اس نفسیاتی صدمہ سے نجات حاصل نہیں کر سکا ہے۔

ایک بہادرانہ بات

وہ تحریر کرتے ہیں کہ حال ہی میں سردار داؤد کو اور اس کے خاندان کو افغانستان کے انقلاب میں قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ ایک انقلابی منطق کے مطابق ہوا تھا۔ دونوں جانب کی جنگ کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ قتل پہلے سے سوچے سمجھے اور بے رحمانہ طریقے سے عدالتی قتل کے ذریعے نہیں کیا گیا تھا۔ جس کا میں شکار کیا گیا ہوں۔

کسی لمحہ میں اشتعال کے باعث جو کچھ ہو جاتا ہے اور ایک گندی سازش کے درمیان جو مہینوں چلتی رہے بہت فرق ہوا کرتا ہے۔ پہلی صورت تو ایک زلزلے یا آتش فشاں پھٹنے کی طرح کی ہے۔ جبکہ دوسری صورت جو مجھے درپیش ہے آہستہ آہستہ زہر دینے کے مترادف ہے یا کسی زنجیر سے جکڑے ہوئے انسان پر سرخ چیونٹیاں چھوڑ دینے کے مترادف ہے۔ آخر کار اس انتقام کا کیا مقصد ہے۔ ایسا کرنا نہ تو فوجی جنتا کے فائدے کی چیز ہے اور نہ ملک وقوم کے لئے مفید ہے۔ ”پاکستان کے عوام اگر میرا سر چاہتے تو میں بلا پس و پیش اپنا سر ان کے سامنے جھکا دیتا“ اگر میں عوام کے اعتماد واحترام سے محروم ہو گیا تھا تو میں خود ہی زندہ رہنا پسند نہیں کرتا۔

تاریخِ عالم کا شعور

ہم دیکھتے ہیں کہ شہید بھٹو کو تاریخِ عالم کا کس قدر شعور اور اس پر عبور حاصل تھا۔ وہ اپنی زندگی کو درپیش صورتِ حال کے ساتھ مطابقت رکھنے والے تمام واقعاتِ عالم کو یکے بعد دیگرے دہرائے

www.bhutto.org

چلے جاتے ہیں اور پھانسی کوٹھڑی میں وہ ایک معمول کے دانش ور کی طرح خرد افروزی کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ جس خرد افروزی کے ساتھ فوجی جرنیلوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ فوجیوں اور غیر فوجیوں میں تمیز کرنے کے لئے رومیوں اور امریکنوں کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کہا گیا تھا کہ انگریز امریکنوں کے نزدیک ویسے ہی ہوں گے جیسے کہ یونانی رومیوں کے نزدیک تھے۔ وہ لکھتے ہیں "ایسا نہیں ہوا" اس لئے کہ امریکنوں نے انگریزوں کے ساتھ اطالوی لوگوں کی طرح برتاؤ کیا۔ اس لئے کہ فوجی جنتا کے کرتا دھرتا کمانڈر "تارل کیپونیز" یونانیوں کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔

شہید فرماتے ہیں ان وحشیوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس پر اشتعال اور ذاتی غصہ کا ہونا لازمی ہے۔ یہاں وضاحت فرماتے ہیں کہ میری مراد پاکستان کے عوام اور ہم سب ہیں۔ یعنی ہمارے دوست اور پارٹی کے وفادار لوگ۔ بلاشبہ یہ ذاتی تلخی ہے لیکن غیر ذاتی تکالیف کا احساس ذاتی جذبات پر زیادہ غالب ہے۔ انہوں نے قومی مفادات کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ یہ قوم کو 1947ء کے دور میں واپس لے گئے ہیں۔ انہوں نے قوم کو ان اعلیٰ وارفع نظریات اور اخوت سے محروم کر دیا ہے جس کا مظاہرہ اس قوم نے 1947ء میں کیا تھا۔ قومیں الٹے پاؤں واپس آیا نہیں کرتیں، یا قومیں ترقی کرتی ہیں یا پھر دھماکے کے ساتھ انحطاط کا شکار ہو جاتی ہیں۔

باخدا آج ہماری قومی حالت وہی ہے جس کی طرف شہید نے 1978ء میں اشارہ کیا تھا۔ شہید بھٹو اپنی بیٹی شہید بی بی کو مخاطب کر کے صفحہ نمبر 118-117 پر فرماتے ہیں۔ تم اپنی عمر کے موسم بہار میں ہو۔ لیکن تاریک اور مایوس کن سردی کے موسم کی دنیا میں رہ رہی ہو۔ یہ ایک گڑبڑ والی اور فتنہ انگیز دنیا ہے۔ عدم اطمینان کی دنیا ہے۔

کچھ ممالک میں تو بحران کا تدارک کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کچھ ممالک میں وہ تدارک کے مقام سے گزر گیا ہے۔ انسانیت بدترین بحران سے دوچار ہے وہ پیش گوئی کرتے ہیں تیسری جنگ عظیم شروع ہونے والی ہے۔ "میں آج کی امریکہ اور یورپ کی دہشت گردی کی جنگ کو تیسری جنگ عظیم ہی خیال کرتا ہوں۔"

میں تباہی کو آتا دیکھ رہا ہوں

شہید بھٹو اپنے قاتلوں کے بارے میں کہتے ہیں۔ میں نے مسئلے کے حل سے پہلے

www.bhutto.org

باعزت مفاہمت کی ضرورت کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خطرناک صورتِ حال سے بچنے کی آخری کوشش ہے۔ میں زیادہ پُر امید نہیں ہوں۔ میں تباہی کو آتا دیکھ رہا ہوں۔ جو ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ اپنے بچوں کی خاطر اور ساری دنیا کے بچوں کی خاطر میں مسئلے کے آخری حل سے پہلے مفاہمت کا خواہاں ہوں۔

وہ تحریر کرتے ہیں تیسری دنیا بڑے بوٹ والے فوجی ڈکٹیٹروں کے لئے فٹ بال کا میدان بن گئی ہے۔ فٹ بال کو اِدھر اُدھر لات ماری جارہی ہے مگر گول کسی کو نظر نہیں آتا۔ تیسری دنیا کے وہ خطے جہاں آگ بھڑک اٹھنے کا امکان زیادہ ہے۔ مندرجہ ذیل ہیں:

مشرقِ وسطیٰ، وسطی یورپ، جنوب مشرقی ایشیاء، شمال مشرقی ایشیاء، افریقہ۔ آپ دیکھیں کہ جنوب مشرقی ایشیاء جس میں ہم رہتے ہیں آج اس کا کیا حال ہے۔

دانش ور کون ہوتا ہے؟

دانش ور کس کو کہتے ہیں یا دانش ور کون ہوتا ہے۔ یعنی رہبر اور رہنما کس کو کہتے ہیں؟ اس کا جواب ہے کہ دانش ور وہ ہوتا ہے جو اپنے عہد سے بہت آگے کی سوچ رکھتا ہو۔ وہ فرماتے ہیں تباہی یا تو روایتی ذرائع سے یا طریقے سے یا ایٹمی ذرائع سے یا دونوں ذرائع سے آرہی ہے۔ وہ اپنی پنکی سے پوچھتے ہیں۔ ''تم اس کے لئے تیاری کس طرح کر رہی ہو؟''

تم اس تباہی سے پاکستان کو نہ تو سرمایہ دارانہ نظام اور نہ ہی کیمونزم کی طرفداری کر کے بچا سکتی ہو۔ اور نہ ہی دونوں طاقتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ ہو کر پاکستان کو بچا سکتی ہو۔ پاکستان کو تم پاکستان کے عوام کے ساتھ رابطہ کر کے ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ خود کو وابستہ کر کے بچا سکتی ہو۔

بے نظیر کو قیادت سونپ رہے ہیں

صفحہ نمبر 120 سے اوپر تحریر کی گئی عبارت کے مطابق اب وہ اپنی قیادت کی بات نہیں کرتے اب وہ بے نظیر کی قیادت کی بات کرتے ہیں۔ ان کو یقین ہو چکا ہے کہ ان کے قاتل ان کی زندگی کے سفر کو اختتام پذیر کر دیں گے۔ اب وہ مکمل طور پر اپنی بیٹی کو قیادت سونپ رہے ہیں۔ ان کو کہتے

ہیں۔ تمہیں آخر تک بنی نوع انسان کے وقار اور ذاتی احترام اور مساوات کے لئے جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔ ''ننگے پاؤں چلو'' ننگے پیر لوگوں کے نقشِ قدم پر چلو۔ ایک غریب بچے کے بالوں میں جو جوں ہے وہ تمہارا ہتھیار ہے۔

تمہارے ہتھیار کیا ہیں؟

ایک ہاری کاشت کار کی مٹی کی جھونپڑی کی گندی بدبو تمہارے ہتھیاروں کی زہریلی گیس ہے۔ عوام کی قوت کا اندازہ ہل کی بنائی ہوئی گہری لکیر سے اور کارخانے سے نکلنے والے دھوئیں سے لگا سکتی ہو۔ تمہاری سیاست کا نظریہ ایک فاقہ زدہ انسان کی چیخوں سے پیدا ہوگا۔ بھوکوں ننگوں کی آہ وزاری سے پیدا ہوگا۔ بیٹی سے کہتے ہیں براہِ کرم یہ خیال نہ کریں کہ میں سیاست کے نظریاتی رہنما اصول پیش کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ یہاں پر وہ ماؤ کی مثال دیتے ہیں۔ چیئرمین ماؤزے تنگ نے حقائق سے سچائی تلاش کرنے کا تصور دیا تھا۔ میں تمہاری رہنمائی کے لئے کہتا ہوں کہ تم ہمارے معاشرے کے تاریخی حالات کے حقائق سے سچائی کی تلاش کرو اور مسائل کی شناخت کرو۔ میری ان تقریروں سے استفادہ کرو جو میں نے پیپلز پارٹی کے قیام کے وقت کی تھیں۔ جن کو ہمارے ناقدین نے ''بھٹوازم کا نام دیا تھا''۔ میرے وہ اقتباسات اور تقریریں جدید حالات وواقعات سے عبارت ہیں جن واقعات نے دنیا کو ہلا ڈالا ہے۔ یہاں پر وہ مستقبل کی طرف دیکھنے کی ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جس مثال کو آج تک پہلے کسی دانش ور نے بیان نہیں کیا۔

پیچھے دیکھنے کی تاریخ کی انوکھی مثال

شہید بھٹو نے مستقبل کی طرف دیکھنے کی جو مثال دی ہے وہ دیکھنے میں آپ کو بڑی دیسی قسم کی مثال نظر آئے گی۔ مگر اس پر غور کرنے کے بعد آپ اس کی گہرائی کے قائل ہو جائیں گے۔

وہ فرماتے ہیں میں ایسا فرد نہیں تھا یا نہیں ہوں جو تانگہ کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہو جبکہ گھوڑا اور تانگہ آگے کی طرف جا رہا ہو، اور میں سارے سفر کے دوران پیچھے ہی کی طرف دیکھتا رہوں۔

تانگہ کی مثال

اس مثال کی گہرائی کو سمجھنے کے لئے اس مثال کی وضاحت ضروری ہے۔ وہ یوں سمجھ میں

آ جائے گی۔ تانگہ کی پچھلی نشست پر بیٹھنے والا انسان مسلسل پیچھے کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ہر چند گھوڑے کے آگے کی طرف بڑھنے سے آگے کی چیزیں پیچھے آ رہی ہوتی ہیں۔ وہ چیزیں جن کو تانگے میں آگے بیٹھ کر دیکھنے والا آگے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ویسی چیزیں پیچھے بیٹھنے والا شخص پیچھے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس طریقے سے مستقبل گھوڑے کی رفتار کے ساتھ ماضی بن رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا جو انسان آگے کی جانب دیکھنے کی قدرت رکھتا ہوتا ہے ماضی خود بخود ہی اس کے علم کے تجربے میں آ جاتا ہے۔ واہ شہید ذوالفقار علی بھٹو آپ نے کتنی آسان مثال دی ہے۔ مگر اس کے اندر زندگی کا کتنا بڑا فلسفہ موجود ہے۔ واقعہ ہی بھٹو کی طرح کے انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ شہید بھٹو کہتے ہیں ہمارے پسماندہ ممالک کے فوجی ڈکٹیٹر ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں یہ آگے دیکھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔

ہمت کا زوال

شہید بھٹو اپنی بیٹی کو درس دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ہمت کا زوال تہذیب کے زوال کی پہلی علامت ہے۔ جب تم صحیح قسم کے نظریاتی اسلحہ سے پوری طرح لیس اور مسلح ہو گی تو سب سے بڑھ کر اللہ تمہاری رہنمائی کرے گا۔ وہ کہتے ہیں اس سے پہلے میں نے تمہیں عملیت کے نظریہ کے بارے میں متنبہ کیا ہے۔ اب میں تمہیں بہت زیادہ عوامی مقبولیت کے نظریہ سے محتاط رہنے کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ ''کبھی کبھی ایک مقبول فیصلہ بالآخر عوام کے لئے مفید نہیں ہوا کرتا۔'' تو عملیت کا نظریہ اور نہ ہی عوامی مقبولیت کا نظریہ بنیادی سیاسی سماجی اور اقتصادی اصول ہیں، اور نہ ہی میں کہتا ہوں کہ تم ان کو آزماؤ۔

موت کی کوٹھڑی

میں نے اذیت کی حالت میں یہ افسردہ قسم کا تجزیہ کیا ہے۔ جیل کی فضا نے میری غیر جانبداری کو متاثر نہیں کیا ہے۔ میں دنیا کو آزاد دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں یہ نہیں دیکھنا چاہتا کہ چونکہ میں موت کی کوٹھڑی میں ہوں اس لئے ساری دنیا موت کی کوٹھڑی میں ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ لاہور ہائی کورٹ نے ساری دنیا کو موت کی سزا سنا دی ہے۔ اس لئے کہ اس نے مجھے موت کی سزا سنائی ہے۔ میں خود کو سب سے زیادہ خوش قسمت انسان تصور کروں گا۔ اگر بنی نوع انسان کے

تاریک سرد موسم میں دھوپ کی کرن پھوٹ پڑے رنگ برنگ کے پھول کھل جائیں۔

دنیا بہت خوبصورت ہے

یہاں پر شہید بھٹو انسانی زندگی اور دنیا کے تصور پر بات کرتے ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی خوشیوں اور شادمانیوں کی بات کرتے ہیں اور اس دنیا کی خوبصورتی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

وہ ایک شاعر کی طرح بات کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک خوبصورت شے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسرت و شادمانی کا باعث ہوا کرتی ہے۔ یعنی وہ حسنِ فطرت اور حسن کو ایک ابدی خوشی قرار دیتے ہیں۔ بڑی روانی کے ساتھ انگریزی شاعر ''ورڈز ورتھ'' کی طرح اس دنیا میں حسنِ فطرت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں ''بلند و بالا پہاڑوں کی خوبصورتی، ہرے بھرے میدانوں کا حسن، غیر ہموار ریگستانوں کا حسن ہے۔'' پھولوں اور جنگلات کا حسن، نیلے سمندر اور بل کھاتے دریاؤں کا حسن، طرزِ تعمیر کی شان و شوکت کا حسن، موسیقی کی شان و شوکت کا حسن، رقص کی چمک دمک کا حسن، سب سے بڑھ کر مرد اور عورت کا اپنا حسن ہے جو اللہ تعالیٰ کی مکمل تخلیق ہیں۔ سبحان اللہ انہوں نے انسانی حسن کی کتنی خوبصورت تاویل بیان کی ہے۔

شاعر شیلے کا حسن کا نظریہ

وہ لکھتے ہیں میں شاعر شیلے کے وجودیت کے نظریے کی حمایت کرتا ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ ''حسن ہر جگہ ہے'' اس دنیا کی مکمل تباہی سے بھی حسن کو ملیامیٹ کرنا ممکن نہیں ہے۔

شہید بھٹو کی طرح کا عالم فاضل انسان دوبارہ اس دنیا کو کہاں نصیب ہوگا۔ وہ شاعر شیلے کی طرح کہتے ہیں کہ حسن اس قدر زیادہ حسن ہے کہ وہ بالکل ختم نہیں ہوسکتا۔ اس قیدِ تنہائی میں زندگی کا لمحہ اپنی یاد تازہ کر رہا ہے۔ شہید کہتے ہیں کہ کسی کو قیدِ تنہائی میں اس لئے ڈالا جاتا ہے کہ وہ زندگی سے دور کر دیا جائے۔ مگر میں تو اور بھی زندگی کے قریب ہو گیا ہوں۔ سبحان اللہ کیا عظیم زندگی کی منطق کا فلسفہ ہے۔ جس کو ایک فقرے مین کہہ دیا گیا ہے۔ یہاں پر وہ اپنی زندگی کے تمام مراحل پر بات کرتے ہیں۔ وہ ''نوڈیرو'' میں گزارے ہوئے اپنے بچپن سے لے کر اپنے ممبئی کے اسکول اور برکلے اور آکسفورڈ کے زمانے کی بات کرتے ہیں۔ سری نگر، گلمرگ اور پہلگام اور

وادیءکشمیر کی بات کرتے ہیں۔ یورپ کی خوبصورتی کو یاد کرتے ہیں۔ کرائسٹ چرچ کے سبزہ زار اور کیلی فورنیا کے ساحلِ سمندر کو یاد کرتے ہیں۔

زندگی محبت کا ملہ ہے

ہم دیکھتے ہیں کہ شہید بھٹو زندگی کے بارے میں کس قدر حساس ہیں اور جب چند بلڈ ہاؤ ڈنگ ڈاگز کے ہاتھوں وہ پھانسی کوٹھڑی میں ڈال دیئے گئے تھے تو زندگی کے بارے میں ان کے احساسات کتنے شدید ہوں گے۔ جس کی گواہی ان کی تحریر کا ایک ایک حرف دے رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں زندگی محبت کا ملہ ہے۔ نیچر کی ہر خوبصورتی کے ساتھ اظہارِ عشق کیا جاتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہے کہ میرا سب سے زیادہ جذباتی عشق اور جذبات خیز یا جسم میں جھرجھری پیدا کر دینے والا رومانس عوام کے ساتھ رہا ہے۔

شہید بھٹو کا رومانس

وہ فرماتے ہیں کہ سیاست اور عوام کے درمیان میری کبھی نہ ختم ہونے والی شادی ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ریاست یا مملکت ایک تھیٹر ہے۔ میں بیس سال سے زائد ہنگامہ خیز برسوں سے اس سیاسی اسٹیج پر چھایا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے اب کوئی رول ادا کرنا ہے۔ لوگ اب بھی چاہتے ہیں کہ میں سیاست کی اسٹیج پر رہوں۔ لیکن مجھے اگر مجبوراً سیاسی اسٹیج سے علیحدہ کر دیا گیا، یا اگر مجھے قتل کر دیا گیا تو میں تمہیں اپنے احساسات کا تحفہ دیتا ہوں۔

شہید بھٹو نے یہ خط شہید بی بی بے نظیر بھٹو کی سالگرہ کے موقعے پر جیل سے تحریر کیا تھا۔ جہاں سے وہ اپنی پیاری ترین بیٹی کو کوئی سالگرہ کا تحفہ نہیں بھیج سکتے تھے۔ سالگرہ کے موقعے پر تحفہ کی روایت کو پورا کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

احساسات کا تحفہ

وہ کہتے ہیں کہ میرے احساسات کا تحفہ قبول ہو۔ اس کے بعد وہ پدرانہ شفقت سے اپنی بیٹی کو ان کے عظیم مستقبل کی نوید دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ میرے مقابلے میں عوام کی یہ جنگ تم زیادہ

بہتر طور پر لڑ سکو گی۔ تمہاری تقاریر، میری تقاریر کے مقابلہ میں زیادہ فصیح و بلیغ ہوں گی۔

عوام کے ساتھ تمہاری وابستگی مساوی طور پر مکمل ہو گی۔ تمہاری جدوجہد میں زیادہ توانائی اور جوانی کا جوش ہو گا۔ تمہارے اقدامات زیادہ جرات مندانہ ہوں گے۔ میں اس انتہائی مقدس مشن کی برکتیں (یعنی قیادت) تمہیں منتقل کرتا ہوں۔ صرف یہی تحفہ میں تمہاری پیدائش کی سالگرہ پر دے سکتا ہوں۔ شہید بھٹو اپنی زندگی میں اپنی بیٹی کو اپنی قیادت سونپ رہے ہیں۔ ان کی دوربین نگاہ اس وقت اپنی بیٹی کی قیادت کا پرتو دیکھ رہی تھی۔ ابھی ان کی بیٹی عملی طور پر سیاست میں پوری طرح سرگرم بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسی کو پیغمبرانہ نگاہ کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بنی نوع انسان پر اور اس کے مشن پر یقین رکھیں۔ اللہ خالق اور مالک ہے اور قادر مطلق ہے۔

فوجی ڈکٹیٹر کی شیخی

فوجی ڈکٹیٹر شیخی بگھار رہا ہے کہ وہ کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔ وہ فضول شیخی ہے۔ اس کو اس دنیا میں ہی اپنا حساب چکانا ہوگا۔ اللہ اللہ شہید بھٹو نے کتنا سچ کہا تھا۔ اس فوجی ڈکٹیٹر کا دنیا میں ہی حساب ہوا تھا۔

مذہب اللہ اور انسان

شہید بھٹو مذہب کی انتہائی سادہ اور خوبصورت دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب اللہ اور بندے کے درمیان ایک کڑی ہے۔ اسی طرح مذہب انسانوں کے درمیان بھی ایک رابطہ اور کڑی ہے۔ سیاسی نظریہ بھی انسان اور انسان کے درمیان ایک کڑی اور رابطہ ہے۔ اسی سبب سے ہندومت، بودھ مت، یہودیت، نصرانیت اور اسلام جیسے دنیا کے بڑے مذاہب سیاسی نظریات کے مقابلے میں زیادہ دیرپا ثابت ہوئے ہیں۔ اگر کوئی کم علم جاہل مہم جو سیاسی اقتدار کی خواہش کے تحت اور اپنے اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کی غرض سے مذہب کو اس آفاقی سطح سے گرا کر مادی یا دنیاوی سطح پر لے آتا ہے اور اسے ایک تنگ نظر سیاسی نظریہ میں تبدیل کر دیتا ہے تو وہ مہم جو جو اللہ اور بندوں کے درمیان کی کڑی یا تعلق کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ بندہ سب سے زیادہ خدا اور مذہب اور انسان کو نقصان پہنچاتا ہے بہت خوب۔ مذہب کی اس سے بڑھ کر تشریح ہو ہی نہیں سکتی۔ اور نہ ہی ضیاء الحق کو مذہب کے معاملے

www.bhutto.org

میں اس قدر ننگا کیا جا سکتا ہے جس طرح شہید نے چند الفاظ میں کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں جہاں تک اسلام کی تعلیم کا تعلق ہے وہ تو جذبات میں تموج پیدا کرنے والی ہے۔

مجھے سامراجیت سے سخت نفرت ہے

وہ اپنی کتاب کے صفحہ 125 پر تحریر کرتے ہیں۔ میں جوانی کے زمانے سے ہی برطانوی سامراجیت کے خلاف جنگ کرتا رہا ہوں۔ لیکن جب میں ان آج کے تذلیل کن دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے اندر کوئی تلخی نہیں رہ جاتی۔ ہم ماضی کی جدوجہد کی یاد میں زندگی نہیں گزار سکتے۔ جبکہ ہم مکمل طور پر حال کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ انگریز سامراج کی اذیت میں ہم فخر محسوس کرتے تھے کہ ہم اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ مگر ان فوجی بالشتیوں کی اذیت کو کیا نام دیا جائے جن کی اذیت کو ہم اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔ یہ ہمارے لئے زیادہ شرمناک اذیت ہے۔

اکبر بگٹی اور خیر بخش مری کو میرا اسلام پہنچے

میں سیاسی انتقام کے ہمیشہ خلاف رہا ہوں۔ 1963ء میں جب میں وزیر خارجہ تھا۔ ان دنوں ایوب خان کی حکومت نے اکبر بگٹی اور خیر بخش مری پر غداری کا مقدمہ چلا رکھا تھا۔ ان دنوں میرا ایک اپریشن ہوا تھا۔ وہ اپریشن بھی ڈاکٹر جنرل شوکت نے ہی کیا تھا۔ جو آج بھی میرے ڈاکٹر ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان دونوں بلوچ لیڈروں کو سزائے موت دی جائے۔ اس اپریشن کے دنوں میں ان کا مقدمہ میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب مجھے کلوروفارم کے اثر سے مغلوب کیا گیا تو میں بیہوشی میں کہتا رہا کہ میں ان کو سزا نہیں ہونے دوں گا۔ ستم نصیبی ملاحظہ ہو کہ 1973ء میں جب میں صدر پاکستان تھا تو ان بلوچ لیڈروں کے ساتھ فوج نے میری محاذ آرائی کرا دی تھی اور میری حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد فوجی جنتا نے سب سے پہلے بلوچ لیڈروں کو رہا کر دیا تھا، ان پر بغاوت کے تمام مقدمات ختم کر دیئے تھے۔ جو میری حکومت کے درمیان بنائے گئے تھے۔ اگر کہیں اتفاق سے تمہاری ملاقات ان لیڈروں کے ساتھ ہو جائے تو ان کو کہنا مجھے اس بات پر یقین ہے کہ ایک بلوچ ایک بہادر باپ کا بیٹا اور ایک ایسی ماں کا بیٹا ہوتا ہے جس کو اپنے

اور فخر ہوتا ہے۔ بہادری اور فخر دونوں ہی بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں اور مجھے یہ ان کا وصف بہت پسند ہے۔

نوٹ: شہید کے ذہن میں تھا کہ بلوچ لیڈران سے ناراض تھے۔ وہ ان کی ناراضی دور کرنے کے لئے ان کو خاص طور پر سلام پہنچانے کا کہہ رہے ہیں۔ شہید کیا خوب انسان تھے۔

خدا رحمت کنند ایں عاشقانِ پاک طینت را

لاڑکانہ کے طوطے کی کہانی

شہید بھٹو اپنی بیٹی کو 1957ء کا واقعہ یاد دلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تم چار سال کی بچی تھی۔ المرتضٰی میں موسم سرما کی خوشگوار صبح کو میرے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ میں نے چبوترے پر بیٹھے بغیر سوچے سمجھے ایک طوطا مار گرایا تھا۔ تم نے طوطے کے غم میں چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیا تھا اور اس کو اپنے سامنے دفن کرایا تھا۔ یہاں تک کہ تم نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں ایک طوطے کے غم نے لاڑکانہ میں ایک چھوٹی سی لڑکی کو رلا دیا تھا۔ میں آج فخر کرتا ہوں کہ وہ چھوٹی سی لڑکی آج ایک نوجوان لڑکی بن چکی ہے۔ جس کے عصاب فولادی ہیں اور آج وہ ظلم کی طویل ترین تاریک رات کی دہشت کا بہادری سے مقابلہ کر رہی ہے۔ حقیقتاً بلاشبہ تم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمہاری رگوں میں بہادر سپاہیوں کا خون موجزن ہے۔

ران پر کاغذ کو رکھ کر لکھنا

شہید اس خط میں پہلی مرتبہ اپنی مجبوری اور بے بسی کا اظہار صرف ان معنوں میں کرتے ہیں کہ میں یہ خط بغیر کتابوں کی یا حوالوں کی امداد میسر نہ آنے کی شکل میں تحریر کر رہا ہوں۔ یہ ایک قسم کا انتہائی عالمانہ نوعیت کا اظہار ہے۔ فرماتے ہیں میں بارہ مہینے سے قیدِ تنہائی میں ہوں اور پچھلے تین ماہ سے موت کی کال کوٹھڑی میں ہوں اور تمام سہولتوں سے محروم ہوں۔ میں نے اس خط کا کافی حصہ ناقابلِ برداشت گرمی میں اپنی ران پر کاغذ کو رکھ کر لکھا ہے۔ میرے پاس حوالے دینے کا کوئی مواد یا لائبریری نہیں تھی۔ میں نے کئی ماہ سے نیلا آسمان بھی شاذ و نادر ہی دیکھا ہے۔ حوالہ جات ان چند کتابوں سے لئے گئے ہیں جن کو پڑھنے کی مجھے اجازت تھی یا ان رسائل سے لئے گئے ہیں

www.bhutto.org

جو تمہاری والدہ یا تم ہفتہ میں ایک بار ملاقات کے وقت اس دم گھٹنے والی کوٹھڑی میں لے کر آتی ہو۔ شہید تحریر کرتے ہیں ''میں اپنی خامیوں کے لئے بہانے نہیں تراش رہا ہوں'' سبحان اللہ کیا عالم انسان تھے شہید بھٹو۔ شہید کے اس جملے کی وضاحت کر دوں کہ دنیا کے تمام عالم انسان اپنی بات ہمیشہ تاریخ کے حوالوں سے کہنے اور کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہاں شہید اپنی اس ذاتی عالمانہ روش کی مجبوری کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لیکن اس قسم کے جسمانی اور ذہنی حالات میں گرتی ہوئی یادداشت پر بھروسہ کرنا بہت مشکل ہوا کرتا ہے۔ مگر مجھے مجبوراً اس پر بھروسہ کرنا پڑ رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی تحریر و تقریر کے معاملے میں کس قدر حساس انسان تھے۔

وصیت نما پیغام

شہید ذوالفقار علی بھٹو اپنے خط کے آخر میں اپنی بیٹی کو اپنا وصیت نما پیغام دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں آج پچاس سال کا ہوں۔ تمہاری عمر میری عمر سے نصف ہے جس وقت تم میری عمر کو پہنچو گی۔ تمہیں عوام کے لئے اس سے دوگنی کامیابیاں حاصل کرنی چاہئیں۔ جس قدر کہ میں نے عوام کے لئے حاصل کی ہیں۔

باخدا شہید کس قدر انسان دوست اور عوام پرست تھے۔ (ان کو زندان میں بھی بلکہ پھانسی کوٹھڑی میں بھی اپنی عوام پرستی کا کس قدر خیال اور احساس تھا) وہ وصیت کے انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ میر مرتضیٰ جو میرا بیٹا اور وارث ہے وہ میرے ساتھ نہیں ہے، اور نہ ہی شاہنواز اور صنم میرے ساتھ ہیں۔ میرے ورثہ کے حصہ کے طور پر اس پیغام میں ان کو بھی شریک کیا جائے۔

وصیت کی انتہائی قابلِ غور بات

پاکستان کے عوام اور پاکستان کے دانش وروں کے لئے ان کو اس خط کی روح کو سمجھنا چاہئے۔ خاص طور پر اوپر کی گئی ان کی وصیت کی روح کے معنی سمجھنے چاہئیں۔ شہید بھٹو موت کی کال کوٹھڑی میں محبوس ہیں ان کو کسی وقت بھی تختہ دار پر لٹکایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اس خط کے تحریر کرنے کے کچھ دن بعد ان کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا تھا۔ وہ ایک طرح سے مختصر ترین الفاظ میں اپنی وصیت اپنی بیٹی کو سونپ رہے ہیں۔ دنیا بھر کے قاعدے اور دستور اور روایت کے مطابق ایک باپ اپنی

وصیت میں اپنی اولاد کو ہمیشہ جائیداد کی تقسیم کی بات کیا کرتا ہے۔ شہید بھٹو جائیداد کے معاملے میں ایک وسیع جائیداد کے مالک تھے۔ وہ ایک بہت بڑی جاگیر کے مالک تھے۔ ان کی شہری جائیداد بھی کافی تھی۔ دولت کی بھی ان کو کوئی کمی نہیں تھی۔ مگر ہم ان کے خط میں ان کے تحریر کردہ لفظ وصیت میں دولت جائیداد کا کوئی ذکر تک نہیں پاتے۔ گویا یہ چیزیں ان کے لئے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی تھیں۔ ان کے لئے اپنی بیٹی اور اپنی اولاد کے لئے سب سے بڑی چیز عوام کی قیادت ہے جس کا وہ بار بار ذکر کر رہے ہیں اور اپنی وصیت میں آخری بات یہ کہتے ہیں کہ تمہیں مجھ سے بڑھ کر قیادت کے معاملے میں دوگنی کامیابی حاصل کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ ان کو اپنی وصیت میں اولاد کو کچھ اور چیز دینے کا خیال تک نہیں آتا۔ اس سے صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ عوام کی محبت کو ہی دنیا کی سب سے بڑی دولت اور عزت خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک دولت جائیداد اور جاگیر کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ وراثت میں ان کا فیصلہ ملاحظہ کریں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میر مرتضیٰ بھٹو شاہنواز بھٹو اور میری بیٹی صنم بھٹو کو بھی میرے ورثہ کے حصے کے طور پر اس پیغام میں ان کو بھی شریک کیا جائے۔ وہ اپنی وراثت کی بات کو اسی پیغام کے ساتھ ختم کر دیتے ہیں۔ واللہ شہید بھٹو جیسے انسان اب اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہیں۔ لیکن وہ نئی نسل کی قیادت کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے اپنی بیٹی کو ایک اشارہ دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

میر سائیں

وہ فرماتے ہیں کہ میر سائیں کینڈی کے بیٹے کے قریبی دوست ہیں پہلے تو اپنے بیٹے کو میر سائیں تحریر کرنا ایک باپ کی محبت اور شفقت کی انتہا ہے۔ دوسرا ان کے ان دو لفظوں میں ان کی سندھ کی تہذیب کا سمندر موجود ہے اور ان کی محبت کی روایات کا طلاطم موجزن ہے۔ وہ اپنے بیٹے کا نام کس عزت اور کس وقار کے ساتھ لے رہے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کا نام اس انداز میں لیتے ہیں جیسے وہ کسی بڑے انسان کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ بلاشبہ میر مرتضیٰ بھٹو ایک بڑا انسان تھا جو باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے باپ کے قاتلوں کے ہاتھوں ہی شہید ہو گیا تھا۔ وہ اپنے خط میں کینڈی کے بیٹے کا ذکر کر کے اپنی اولاد کو ایک اشارہ دے رہے ہیں۔ وہ اشارہ تھا کہ میر صاحب امریکہ کے بااثر سیاسی خاندانوں کے ساتھ رابطہ کریں تاکہ مستقبل کی سیاست

سے آگاہ ہوسکیں۔ چونکہ پاکستان کی سیاست پر امریکہ کا مکمل اثر ورسوخ اور اختیار ہوتا ہے۔ تاکہ ان کے لئے مستقبل کی سیاست میں آسانی پیدا ہوسکے۔ اس لئے کہ پاکستان کے اقتدار کا ہر مسئلہ امریکہ کی ہی ثواب دید پر طے پاتا ہے۔

نئی نسل کی قیادت مسئلہ

شہید بھٹو کو اس بات کا مکمل یقین ہو چکا ہے کہ ان کی قیادت کا باب بند ہونے والا ہے۔ وہ اپنی بیٹی اور اپنے بیٹے کو نئی نسل کی قیادت تصور کرتے ہوئے۔ ان کو نئی نسل کی قیادت کا ادراک رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

نئی نسل کی قیادت کا مسئلہ نئی نسل کا اپنا مرکزی مسئلہ ہوا کرتا ہے

آج نئی نسل کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آیا جنگ کو ختم کرنا ہے یا نسلی ناانصافی کو مٹانا ہے۔ یا انسانوں کی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ نئی نسل کے سامنے آج یہ چیلنجز سر اٹھائے ہوئے ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کے نوجوانوں یا نوجوان نسل کو انفرادی انسان کے وقار کی فکر ہے۔ وہ ضرورت سے زائد اختیار اور طاقت کی حد بندی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ ایسی حکومت چاہتے ہیں جو اپنے شہریوں سے براہِ راست اور دیانتداری کے ساتھ بات کرے۔ نئی نسل انسانیت کی عزتِ نفس کے بارے میں بہت حساس ہے۔ وہ انسان کو باوقار دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نئی نسل کی قیادت اور ان کے احساسات اور خیالات پر فخر کرتا ہوں اور اس کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ وہ بڑی گہرائی میں بات کرتے ہوئے اپنے وجدان سے آنے والے وقت کا ادراک کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

داؤ پر بہت کچھ لگا ہوا ہے

نئی نسل کی قیادت کی کامیابی کے امکانات تو بہت زیادہ ہیں۔ مگر داؤ پر بہت کچھ لگا ہوا ہے
"داؤ پر لگنے کی مثال وہ خود ہیں۔"
بلاشبہ شہید بابا کی پھانسی سے پاکستان کا سب کچھ داؤ پر لگا دیا گیا تھا اور اس داؤ میں جو کچھ

پاکستان کا اور پاکستان کے عوام کا لٹ گیا اس کا ازالہ ہونا ناممکن ہو چکا ہے۔

پیغمبرانہ پیغام

شہید بھٹو آنے والی نسل کے لئے انگریزی کے شاعر ''ٹینی سن'' کی ایک ضرب المثل کہاوت کے حوالے سے بڑی انتہائی دانش وفکر کی بات کہتے ہیں۔ جو اپنے معنوں اور اپنے مفہوم میں ایک الٹی میٹ بات تصور کی جاتی ہے۔ ایک مکمل اور آخری بات کہی جا سکتی ہے یا کہی جاتی ہے۔

وہ نہایت شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں۔ میں آخر میں نئی نسل کے لئے شاعر ٹینی سن کا مایوس کن لیکن ایک طرح سے پیغمبرانہ پیغام چھوڑتا ہوں یا چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ٹینی سن نے کہا تھا کہ ''آج جبکہ پچیس سال کی عمر میں میں اس دنیا کو اس قدر تلخ اور رنج آمیز پاتا ہوں، اور اگر قدرت نے مجھے زندہ رکھا تو پچاس سال کی عمر میں میں کیسا ہو جاؤں گا۔ میرا کیا حال ہوگا۔'' یہ ٹینی سن کے حوالے سے ان کی پاکستان کے بارے میں اپنی ذات کے آشوب کے حوالے سے پیش گوئی تھی۔ آج پاکستان ان کی شہادت کے بعد جن حالات کا شکار ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ انہوں نے جب یہ بات کہی تھی اس وقت میر مرتضیٰ بھٹو اور محترمہ بےنظیر بھٹو اور شاہنواز بھٹو تینوں زندہ تھے۔ آج تینوں اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ تینوں بہن اور بھائیوں کو غیر فطری موت مارا گیا ہے۔ پاکستان فوجی حکمرانوں کی مسلسل دہشت گردی کے اقتدار سے جس طرح عالمی اور مقامی دہشت گردی کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ اس کی سزا پاکستان کی نئی نسل کو مل رہی ہے اور اس کی سزا پاکستان کی نوجوان نسل کی قیادت شہید بی بی بےنظیر بھٹو کو جو ملی ہے۔ وہ پوری دنیا کے لئے عبرت کا مقام ہے۔ یہی وہ اندیشہ اور خوف تھا جس کی طرف شہید بھٹو نے اشارہ کیا تھا کہ داؤ پر بہت کچھ لگا ہوا ہے۔

شہید بابا آپ نے صحیح فرمایا تھا کہ داؤ پر بہت کچھ لگا ہوا ہے۔ آج ہم اپنا سب کچھ ہار چکے ہیں۔ آج ہم اپنی خودمختاری سے لے کر اپنی ثقافت، اپنا قومی وقار، اپنا طرز زندگی، اپنی تہذیب و تمدن، اپنا تشخص، اپنی سیاست، اپنا اقتدار سب کچھ فنا کر چکے ہیں سب کچھ ہار چکے ہیں۔

حزب اختلاف کے لیڈروں کے بیانات

15 اکتوبر 1978ء کو پارٹی کے کارکن منور حسین نے وزیراعظم بھٹو کی پھانسی کی سزا کے

خلاف احتجاج کرتے ہوئے خود کو نذرِ آتش کر کے اپنے عظیم قائد پر اپنی زندگی قربان کر دی۔

اس سے پیشتر یعقوب مسیح کھوکھر، میر عبدالرشید عاجز، عبدالوحید قریشی، محمد ارشد ناگی، محمد ذوالفقار پروانہ، عبدالعزیز آف سکھر، وزیر اعظم بھٹو کی سزائے موت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے شمع قائد عوام پر پروانہ جل کر عوام اور قائد عوام پر قربان ہو گئے تھے۔

مصنف اسلم گورداسپوری اور رائے حفیظ اللہ طارق پیپلز پارٹی پنجاب کی صوبائی مجلس عاملہ سے خطاب کر رہے ہیں

www.bhutto.org

جنرل ضیاء الحق کی بربریت کے کوڑوں کا ایک منظر

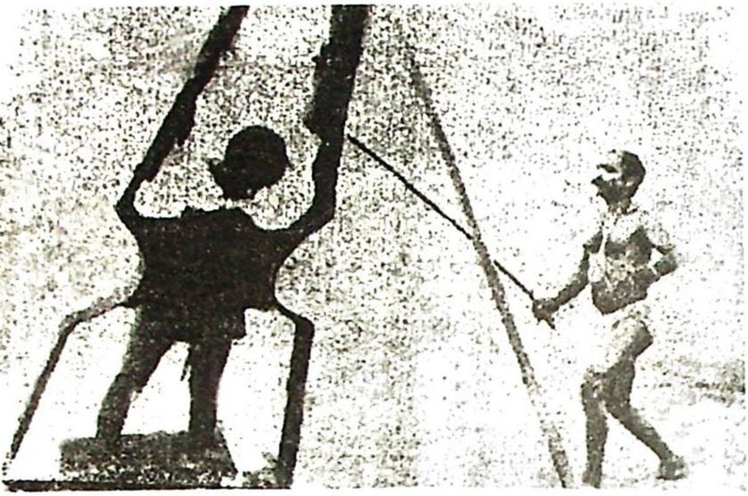

وزیراعظم بھٹو عدالت میں آئے تو حاضرین احتراماً کھڑے ہو گئے

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو 16 دسمبر 1978ء کو سپریم کورٹ میں پیش کیا گیا۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو گہرے نیلے رنگ کی شلوار قمیص اور سفید ڈبل بریسٹ کا کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ یہ سوٹ ان کے صحت مند دنوں کا سِلا ہوا تھا۔ ایک طویل عرصہ انتہائی اذیت ناک قیدِ تنہائی میں رہنے کی وجہ سے ان کا جسم بے حد لاغر اور کمزور ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کا پہنا ہوا شلوار کرتا ان کے جسم پر کھلا کھلا اور ڈھلکتا ہوا دیکھائی دیتا تھا۔ سپریم کورٹ کا فل بنچ جو چیف جسٹس انوار الحق کی صدارت میں مقدمہ کی سماعت کر رہا تھا۔ یہ سپریم کورٹ بھی مولوی مشتاق ہی کے کٹہرے کا ایک تسلسل تھا۔ اس کورٹ میں اور مولوی مشتاق کی عدالت میں صرف اتنا فرق تھا۔ مولوی ایک غنڈے کی طرح وزیراعظم بھٹو سے مخاطب ہوتا تھا۔ چیف جسٹس انوار الحق اپنے چہرے پر عیاری اور منافقت کی چھاپ لگائے ہوئے تھا۔ وہ بظاہر وزیراعظم بھٹو سے اخلاق سے بات کرتا تھا۔ مگر اندر سے اپنے قاتلانہ عزائم چھپائے ہوئے تھا۔ وہ احمد رضا قصوری کو بھٹو صاحب کے آنے سے پیشتر ہی عدالت میں سب سے آگے بٹھائے ہوئے تھا۔

وزیراعظم بھٹو نے 9 بج کر دس منٹ پر سپریم کورٹ سے اپنا خطاب شروع کیا۔ انہوں نے انتہائی شاعرانہ انداز میں اپنے خطاب کی ابتدا خواجہ غلام فرید کی کافی کے پہلے مصرع سے

www.bhutto.org

کی۔ جو مصرع تھا۔

''درداں ماری جندڑی علیل اے''

غیرت مند وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے خواجہ غلام فرید کی اس کافی کا دوسرا مصرعہ پڑھنا گوارا ہی نہ کیا۔ دوسرا مصرعہ تھا ''سوہنا ئیں سُندا دکھاں دی اپیل اے''۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو سپریم کورٹ میں ایک درویش اور فقیر کی طرح گویا ہوئے تھے۔

بندی خانے کی عبادت اور ریاضت سے ان کا قلب جاری ہو چکا تھا۔ خواجہ غلام فرید کا یہ مصرع انہوں نے عدالت کے ججوں کو نہیں سنایا تھا۔ عدالت کے جج ان کے سامنے موجود ضرور تھے مگر ان کا یہ خطاب اور یہ شعر اپنے خدا کی عدالت کے لئے تھا۔ اگر وہ انوار الحق کی عدالت کو یہ شعر سنانا چاہتے ہوتے تو اس شعر کو پورا اور مکمل پڑھتے مگر انہوں نے اس دنیاوی عدالت کے سامنے صرف پہلا مصرع ہی پڑھا۔ جس سے ان کا اس دنیاوی منافق عدالت کے منافق ججوں کو اپنی صورت حال ہی سمجھانا مقصود تھا۔ دوسرا مصرع انہوں نے اپنے خدا کے تصور میں اپنے دل میں ہی پڑھا تھا۔ ایک انسان جو اپنے عہد کے تمام بڑے سے بڑے انسانوں سے بڑا اور عظیم انسان تھا۔ جو ہر لحاظ سے ان سے بہتر تھا۔ جو علم اخلاق دولت خاندان کرسی اور عظمت میں اپنے عہد کے تمام لوگوں سے بلند و بالا تھا۔ اس کو عدالتوں کے کٹہروں میں کھڑا کیا گیا۔ عدالت میں ان کو پنجرہ نما جنگلے میں بٹھایا گیا۔ جیل میں ان کے ساتھ قاتلوں سے بدتر سلوک کیا گیا۔ قدم قدم پر ان کی تضحیک اور توہین کی گئی۔ مگر وہ غیرت مند اور خوددار انسان انتہائی نامساعد حالات میں بھی اپنی عزتِ نفس پر قابو پائے ہوئے تھا۔ اس فانی دنیا کو چھوڑ کر وہ اپنے رب سے لو لگائے ہوئے تھا۔ وزیر اعظم بھٹو جانتے تھے کہ ان کے قاتل حکمران یہ تمام عدالتی کارروائی دنیا کو دیکھاوے کے طور پر کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود وہ نظم و ضبط کے انسان عدالت کا مکمل احترام کئے ہوئے تھے۔ وہ عدالت کو اپنے لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ سپریم کورٹ میں جانے کا ان کو جتنا بھی وقت ہاتھ آیا انہوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ وہ اس بات سے بے نیاز تھے کہ عدالتیں ان کے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی ہیں۔ وہ ان باتوں سے مکمل طور پر بے نیاز تھے۔

انہوں نے پہلے دن ہی سپریم کورٹ میں واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ میں پھانسی بھی چڑھ جاؤں تو کوئی پرواہ نہیں۔ انہوں نے سپریم کورٹ میں فوجی حکمرانوں کے ججوں اور عدالتوں اور

www.bhutto.org

جیلوں اور پھانسی کوٹھڑی میں ان کی کی گئی توہین کے ہی زمرے میں انہوں نے سپریم کورٹ کے ججوں سے مخاطب ہوکر سندھی زبان میں کہا تھا۔

ماں رانو ہاں رانو راندو

میں رانا ہوں یعنی راجہ ہوں۔ راجہ ہی رہوں گا۔ رانا ہی رہوں گا۔ ان کا یہ ایک مختصر پانچ الفاظ کا جملہ اپنے اندر معنی کا سمندر لئے ہوئے تھا۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جس کو خدا نے بڑے انسان کے روپ میں پیدا کیا ہو۔ اس کی عظمت کو کم ظرف لوگ کم اور گھٹا نہیں سکتے۔ ظالم لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے ظلم سے کسی انسان کو کمتر اور چھوٹا بنا دیں گے۔ کسی انسان کو قتل کر کے اس کی عظمت کو مٹا دیں گے۔ مگر بنی نوع انسان کی تاریخ میں آج تک ایسا نہیں ہوسکا۔ حسینؓ حسینؓ ہی رہتا ہے اور یزید یزید ہی رہتا ہے۔ وہ سپریم کورٹ جو وزیراعظم بھٹو کی موت پر آخری مہر تصدیق ثبت کرنے والا تھا۔ ان کے گلے میں پھانسی کے پھندے کی آخری گرہ دینے کے احکامات جاری کرنے والا تھا۔ اس سپریم کورٹ کو وزیراعظم بھٹو مرزا غالب کا شعر سنا رہے ہیں۔ وہ اپنی پھانسی کی آخری عدالت میں بھی اپنے ذوق کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ان کا اپنے قاتلوں کو ایک طریقے سے غالب کی ہی زبان میں یہ کہنا مقصود تھا۔

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس کے سوا اور سہی

واضح رہے کہ سپریم کورٹ میں ان کی پیشی کے دوران تینوں روز ہی ان کو 102 اور 103 بخار تھا۔ جسمانی کمزوری اور ضعف کی بنا پر ان کا جسم لرزتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اور 22 دسمبر 1978ء کا دن ان کا پھانسی کوٹھڑی کے تاریک ماحول سے باہر عدالت کی ایک طرح کی کھلی ہوا میں آخری دن تھا۔ اس طرح 3 اپریل 1979ء کا دن ان کی زندگی کا اس دنیا میں آخری دن تھا۔ ہرچند وہ دن بھی ان کے لئے انتہائی تلخ اور اذیت ناک تھا۔

اس کو ناقدری انسان کا صلہ کہتے ہیں
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

سقراط کی بات

وزیراعظم بھٹو نے سپریم کورٹ میں نہ تو اپنی کسی ذہنی اور جسمانی تکلیف کی شکایت کی اور نہ ہی پھانسی کوٹھڑی کی اذیت کے بارے میں کچھ کہا سپریم کورٹ میں ان کا بیان سقراط کے بیان کی طرح تھا۔ سقراط کو جب عدالت میں زندگی کی بھیک مانگنے کا کہا گیا۔ اس نے کہا تھا۔

"میری دانائی مجھے میری رسوائی کی اجازت نہیں دیتی۔ میں نے عظیم انسانوں کو دیکھا ہے کہ جب ان کو معتوب کیا گیا تو وہ بڑی مردانگی سے پیش آئے تھے۔ بلاشبہ وزیراعظم بھٹو کا وہی رویہ تھا جس مردانگی کے رویے کی سقراط نے بات کی تھی۔"

20 دسمبر اور 22 دسمبر 1978ء روزنامہ مساوات لاہور کی اہم سرخیاں

☆ مجھے نام کا مسلمان قرار دینا عدالت کے اختیار میں نہیں تھا یہ میری نہیں عوام کی توہین ہے۔
☆ اب پھانسی بھی چڑھ جاؤں تو پروا نہیں۔
☆ میرے کردار اور رویّے کا فیصلہ کرنا عدالت کا نہیں عوام کا کام ہے۔
☆ میرے آٹھ کارکنوں نے خود کو زندہ جلا لیا ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں۔
☆ چیئرمین بھٹو کمرۂ عدالت میں آئے تو حاضرین احتراماً کھڑے ہو گئے۔
☆ جو کچھ ہو رہا ہے عوام دیکھ رہے ہیں۔
☆ عدالت ایک منتخب اور جائز حکومت کا بغاوت کے ذریعے تختہ اُلٹ دینے کا عدالتی نوٹس لے۔
☆ جتنی جلدی ممکن ہو عوام کو کاروبارِ حکومت میں شریک کیا جائے۔
☆ مارشل لاء نے عوام کو بددل کر دیا ہے یہ مسائل حل کرنے کا حل نہیں۔
☆ کٹہرے میں میرے دونوں جانب منکر نکیر بٹھائے گئے تھے۔
☆ یہ مقدمہ نہ سیدھی ٹانگ پر ہے نہ ٹیڑھی پر، یہ لُولا لنگڑا مقدمہ ہے۔

وزیراعظم بھٹو کو سپریم کورٹ میں پیش کیا جانا

16 دسمبر 1978ء کو وزیراعظم بھٹو کو سپریم کورٹ میں پیش کیا گیا۔ سپریم کورٹ میں ان کے بیان کا سلسلہ 21 دسمبر 1978ء تک چلتا رہا۔ ان چار ایام میں وزیراعظم بھٹو نے اپنا تاریخ ساز موقف عدالت عالیہ میں پیش کیا۔ ان کے اس سپریم کورٹ کے بیان کے باب کا عنوان میں نے ''درداں دی ماری جندڑی علیل اے'' رکھا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے بیان کا آغاز ہی خواجہ غلام فرید کی کافی کے اس مصرعے سے کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ 1969ء میں یہی کافی ملک غلام مصطفےٰ کھر کے گھر ملتان میں بھٹو صاحب نے خود فرمائش کر کے پٹھانہ خان سے سنی تھی۔ اس وقت میرے علاوہ میر رسول بخش تالپور بھی درمیان موجود تھے۔ بھٹو صاحب عدالت میں دوسرا مصرع نہیں پڑھا تھا۔ جوان کی عالی ظرفی کا ثبوت تھا۔ دوسرا مصرع تھا ''سوہنا نئیں سندا دکھاں دی اپیل اے۔''

درداں دی ماری جندڑی علیل اے

بھٹو صاحب کا سپریم کورٹ کا مکمل بیان (16 تا 22 دسمبر 1978ء)

موت بری بات نہیں ہے، ہر مسلمان کی باری آنی ہے، اس موقع پر فاضل چیف جسٹس نے کہا کہ آپ نے کل بھی کہا تھا کہ ججوں کی باری بھی آئے گی۔ لیکن ہم نے آپ کے خلاف کوئی شکایت درج نہیں کرائی۔ چیئرمین نے کہا کہ جناب میں نے کہا تھا کہ اگر چوتھا مارشل لاء لگا تو جج بھی نہیں رہیں گے۔

چیئرمین بھٹو نے اپنا بیان بارہ بج کر بیس منٹ پر مکمل کر لیا۔ اس کے بعد دیگر ملزموں میاں عباس، صوفی غلام مصطفےٰ، ارشد اقبال اور رانا افتخار نے بھی اپنا بیان دیا۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے آخری روز اپنے بیان میں کہا میں پوری غیر جانبداری سے کہتا ہوں کہ آج ملک کی صورتحال انتہائی نازک اور سنگین ہے۔ انہوں نے متنبہ کیا کہ اگر وقت ہاتھ سے نکل گیا تو موجودہ سیاسی بحران کا کوئی حل کارآمد نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا جتنی جلدی ممکن ہو سکے عوام کو کاروبار حکومت میں شریک کیا جائے اور ان کا تعاون حاصل کیا جائے اتنا ہی بہتر

ہے، ورنہ ایک وقت آ جائے گا کہ جب سب اچھے حل بے کار ہو کر رہ جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اگر انتخابات وقت پر نہ ہوئے تو بے فائدہ ثابت ہونگے اور جتنی دیر ہوتی چلی جائے گی، سیاسی بحران کو حل کرنے کے لئے قابل قبول حل اتنا ہی دور ہوتا چلا جائے گا۔ چیئرمین نے کہا کہ وقت کے حساب سے مسائل کا صحیح حل تلاش کیا جاتا ہے ورنہ وقت گذرنے کے بعد یہ سب کچھ بے کار ہو کر رہ جائے گا۔ انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ جنرل یحیٰی نے پاکستان کے ٹوٹنے کے بعد آئین دیا۔ اس طرح سے وقت گذرنے کے بعد کوئی بھی حل قابل عمل نہیں رہتا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے شبہ ہے کہ پنڈت نہرو نے اپنی کتاب Discovery of India میں ''پاکستان اپنے قیام کے بعد بیس پچیس سال میں ختم ہو جائے گا'' کا جو حوالہ دیا ہے کہیں وہ صحیح ثابت نہ ہو جائے۔ انہوں نے کہا مارشل لاء نے قوم سے جنگ کرنے کی صلاحیت چھین لی ہے، قوم کو بدل کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ مارشل لاء عوام کے مسائل حل کرنے کے لئے حل نہیں ہے بلکہ ایک خلیج میں تبدیل ہو چکا ہے انہوں نے کہا کہ کوئی ہزاروں سال نہیں رہا کسی نے لاکھوں سال حکومت نہیں کی عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں سیزر آیا نپولین آیا اور چلا گیا۔ ہٹلر ایک ہزار سال اپنے اقتدار کی بات کرتا تھا مگر وہ دس سال میں ہی صفحہ ہستی سے مٹ گیا اس لئے جتنی جلدی ہو سکے بحران کا حل تلاش کیا جائے اس پر فاضل چیف جسٹس نے کہا کہ اس وقت ہم اس معاملہ پر کوئی بات نہیں کر سکتے یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کوئی اس طرح کا کیس سپریم کورٹ میں آ جائے جناب بھٹو نے فوراً کہا کہ جناب والا یہ لوگ اسی سازش کے بیج بو رہے ہیں۔ انہوں نے سپریم کورٹ کے سامنے اپنے دلائل دینے کے بعد سماجی حقائق کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا میرے بارے میں اور موجودہ حکومت کے بارے میں دو معیار رکھے گئے ہیں انہوں نے کہا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اگر میرے پاس بندوق ہوتی تو میں اس سے بہتر کر سکتا تھا انہوں نے کہا کہ مجھ پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ میں نے آئین میں یک طرفہ ترامیم کی تھیں جبکہ میں نے یہ ترامیم پارلیمنٹ کی منظوری سے جمہوری طور پر کی تھیں انہوں نے سوال کیا کہ آج کس قسم کی ترامیم کی جا رہی ہیں آج قوم کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تو آئین کے مطابق ترامیم کی تھیں۔ آج آئین کہاں ہے آج جداگانہ طریقہ انتخاب کا سلسلہ شروع کر کے آئین کو پامال کیا گیا ہے انہوں نے کہا یہ ساری باتیں عارضی ہیں صدر یحیٰی کو میں نے کہا تھا کہ آپ کا تیار کردہ لیگل فریم ورک

آرڈر اسمبلی آنے پر ختم ہو جائے گا کیونکہ اسمبلی خود مختار ہے جو چاہے گی پاس کرے گی انہوں نے کہا جو بھی احکامات آج پاس کئے جا رہے ہیں وہ آنے والی اسمبلی ختم کر دے گی اور نئی اسمبلی پہلا کام یہ کرے گی کہ وہ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دے گی اور جو کچھ بھی آج کیا جا رہا ہے وہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا ٹربیونل بنائے جا رہے ہیں فوجی ٹربیونل اور نا اہلی کے ٹربیونل قائم ہو رہے ہیں اس مرحلہ پر فاضل چیف جسٹس نے کہا کہ آپ وہ باتیں نہ کریں جو ہماری دلچسپی کی نہیں ہیں جناب بھٹو نے کہا کہ جناب والا میں بھی خود کو روک رہا ہوں سیاست دانوں کو نا اہل قرار دینے کے لئے نا اہلی کے لئے ٹربیونل بنائے جا رہے ہیں، چیف جسٹس نے کہا کہ جن کو نا اہل قرار دیا گیا ہے وہ اپنی نا اہلی کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل کر سکتے ہیں جناب بھٹو نے کہا کہ سابقہ حکومتوں نے اس قسم کا کام پہلے بھی کیا تھا کبھی پروڈا لگایا گیا کبھی ایبڈو کیا گیا اب نا اہل کیا جا رہا ہے جنہوں نے دوسروں کو پروڈا کیا تھا ان کو پروڈا ہونے والوں نے پروڈا کر دیا۔ جنہوں نے دوسروں پر ایبڈو لگایا ان کو ایبڈو ہونے والوں نے ایبڈو کر دیا چیئرمین نے نرم آواز میں کہا کہ انشاءاللہ وہ دن بھی آئے گا جب ان نا اہل کرنے والوں کو نا اہل ہونے والے نا اہل کر کے رکھ دیں گے انہوں نے کہا بدنیتی ثابت ہونے کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ ایک جائز حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے انہوں نے عدالت سے درخواست کی کہ وہ ایک منتخب اور جائز حکومت کا بغاوت کے ذریعے تختہ الٹ دینے کے اقدام کا عدالتی نوٹس لیں انہوں نے کہا یہ آپ کا کام ہے کہ آپ اس بات کا عدالتی نوٹس لیں یا نہ لیں کم از کم میری گزارشات پر ضرور غور کریں انہوں نے کہا کہ اضافی آئینی اقدامات کا جائز حکومت کے خلاف استعمال کیا جائے تو یہ بدنیتی کی بنیاد بن جاتی ہے انہوں نے عدالت سے کہا اگر آپ برا نہ مانیں تو میں عدالت کے نوٹس میں اخبارات کے تراشے لانا چاہتا ہوں جو اس مقدمہ کے بارے میں مختلف لوگوں ملکی اور غیر ملکی پریس کو انٹرویو دیتے ہوئے کہے ہیں جن پر فاضل چیف جسٹس نے کہا کہ ہم ہر ممکن انسانی صلاحیت کے اعتبار سے اس کیس کا فیصلہ اپنی مرضی سے کریں گے۔ اس پر کسی بھی شخص کے ملک کے اندر یا باہر دیئے جانے والے ریمارکس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ آپ کے وکلاء نے تمام مقدمہ بڑی محنت اور قابلیت سے پیش کیا ہے۔ ہم نے دونوں طرف کے وکلاء کے دلائل سن لئے ہیں اور ہم وکلاء کی امداد کرنے پر ان کے ممنون ہیں جناب بھٹو نے کہا جناب والا میں آپ کی مہربانی کا ممنون ہوں۔ میں اخلاقی طور پر مطمئن ہو گیا

www.bhutto.org

ہوں میں ایک بے گناہ شخص ہوں اور اب مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ یہ مقدمہ نہ سیدھی ٹانگ پر کھڑا ہے نہ ٹیڑھی ٹانگ پر۔ یہ ایک لنگڑا لولا مقدمہ ہے۔ چیئرمین نے عدالت کو اس طرف متوجہ کیا کہ انصاف کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا انصاف قطعی ہوتا ہے۔ سیاست میں سودا بازی ہو جاتی ہے لیکن انصاف میں نہیں ہو سکتی ایک شخص یا تو معصوم ہے اور یا گناہ گار یا تو کیس ثابت ہوتا ہے یا نہیں سوائے اس کے کہ کوئی ایسا بیرونی عنصر بیچ میں آ جائے۔ جس کی وجہ سے ملکی مفاد کو ترجیح دینا مقصود ہو، انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ایک مقدمہ میں یورپی ملک میں کہا گیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد فیصلہ سنایا جائے گا انہوں نے کہا میں پوری ذمہ داری سے درخواست کرتا ہوں کہ عدالت قانون کی حکمرانی کو سربلند رکھنے کا کام کرے اور مارشل لاء کی دایہ نہ بنے جہاں تک بدنیتی کا تعلق ہے ایک فاضل جج نے کہا ہے کہ اگر یہ مقدمہ دلائل کی بنیاد پر تباہ کر دیا جائے تو اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں انہوں نے کہا میں اب یہ محسوس کرتا ہوں کہ دلائل کے اعتبار سے یہ مقدمہ مکمل طور پر تباہ و برباد ہو گیا ہے اور اس کے جھوٹے دلائل کی دھجیاں بکھیری جا چکی ہیں انہوں نے کہا کہ اس لئے میں ان باتوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

جناب بھٹو نے کہا کہ میں نے لاہور ہائی کورٹ میں کوئی پریس کانفرنس نہیں کی تھی۔ اس میں میرا قصور نہ تھا۔ یہ ایس پی کا قصور تھا کیونکہ مجھے جہاں بٹھایا جاتا تھا میں وہیں بیٹھا رہتا جہاں مجھے کھڑا ہونے کو کہا جاتا میں کھڑا رہتا یہ کوئی پریس کانفرنس نہیں تھی۔ بی بی سی کا نامہ نگار 15 نومبر کو قائم مقام چیف جسٹس سے مل کر آ رہا تھا۔ راستے میں وہ مل گیا۔ اس طرح غیر ملکی نامہ نگار بھی موجود تھے۔ انہوں نے غیر رسمی طور پر مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ کیا محسوس کرتے ہیں آپ کی صحت وغیرہ کیسی ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ پریس کے لوگ ہیں اگر کوئی یہاں آ کر مجھ سے میرا حال پوچھے تو کہا یہ پریس کانفرنس ہو گئی جناب بھٹو نے کہا چیف جسٹس میرے خلاف تھا وہ میرا دشمن تھا وہ مجھ سے تعصب رکھتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یحیٰی بختیار میری کابینہ میں تھے یا میں ان کی کابینہ میں تھا۔ میں ان کا وزیراعظم تھا یا وہ میرے وزیراعظم تھے وہ میری کابینہ میں اٹارنی جنرل تھے انہوں نے کہا کہ لاہور ہائی کورٹ میں مولوی مشتاق حسین کو چیف جسٹس مقرر نہ کرنے کا بنیادی فیصلہ میں نے کسی کے کہنے پر نہیں کیا تھا۔

میں کسی کے ہاتھ میں کھیلنے والا نہیں ہوں میں انہیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں ان کا بڑا احترام کرتا

ہوں اس میں میری عزت سیاسی کردار زندگی اور مستقبل کا سوال ہے میں اپنے فیصلے خود کرنا چاہتا ہوں اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ یحییٰ بختیار اس کے ذمہ دار تھے میں نے ایسی باتیں نہیں کہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے، جناب بھٹو نے کہا کہ مولوی مشتاق کہتے ہیں کہ انہوں نے 1968ء میں ایوب خان کے دورِ حکومت میں میرا مقدمہ سنا تھا اور مجھے بری کروایا تھا جناب بھٹو نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ 1968ء میں ایوب خان نے مجھے گرفتار کیا اور میرے خلاف کیمپ جیل لاہور میں مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی میاں محمود علی قصوری میرے وکیل تھے کسی بات پر میرا مولوی مشتاق حسین سے جھگڑا ہو گیا تھا میں اس وقت جوان تھا اور کچھ باتیں اور بھی تھیں جن کی وجہ سے میں سماعت کا بائیکاٹ کر کے کمرہ سے باہر چلا آیا تھا جس پر قصوری نے مجھے سمجھایا اس طرح میری رہائی کی وجہ ان کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ یہ عوام کا دباؤ تھا اس وقت نظر بندوں کو رہا کیا جا رہا تھا حتیٰ کہ اگرتلا سازش کیس کے ملزم شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی رہا کر دیا گیا۔ جناب بھٹو نے کہا پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹیو کمیٹی نے اپنے 13 اگست کے اجلاس میں یہ قرارداد منظور کی تھی کہ پارٹی کو چیف الیکشن کمشنر کی حیثیت سے مولوی مشتاق کی تقرری منظور نہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کیس شروع ہی نہیں ہوا تھا اور ہم نے کہا تھا کہ ہمیں جانبدار چیف الیکشن کمشنر نہیں چاہئے جناب بھٹو نے کہا کہ میں نے 15 نومبر کو درخواست دی جو چیف جسٹس کی پریس کانفرنس کے بارے میں تھی جس میں چیف جسٹس نے کہا تھا کہ مقدمہ کی کھلی سماعت ہوگی اور ملک کے مروجہ قوانین کے مطابق ہو گی۔ میں نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ چیف جسٹس کو اس طرح کے زیرِ سماعت مقدمات پر تبصرہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن ہماری درخواست پر کہا گیا کہ یہ غیر ضروری ہے جناب بھٹو نے کہا خفیہ سماعت کے احکامات سے پہلے میں تین ماہ تک خاموش رہا جبکہ مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے رہے لیکن جب خفیہ سماعت کے احکامات دیئے گئے تو آپ جان سکتے ہیں کہ ایسے معاملات میں کیا جذباتی حالت ہو سکتی ہے۔

جناب بھٹو نے کہا قانونی اختیارات کو جابرانہ طریقہ سے استعمال نہیں کرنا چاہئے میں ہائی کورٹ کو اپنی پبلسٹی کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتا تھا عدالت نے سماعت کو خفیہ رکھ کے خود بہت بڑا سکینڈل بنا دیا ہے۔ جناب بھٹو نے چیف جسٹس کے رویہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ 16 دسمبر کو میری اہلیہ قذافی سٹیڈیم میں پولیس کے لاٹھی چارج سے زخمی ہو گئیں اور سترہ تاریخ کو میں نے ان

کی لہولہان حالت میں تصویر اخبارات میں دیکھی سترہ تاریخ کو میں بہت ڈسٹرب تھا اس کے باوجود چیف جسٹس نے کہا کہ ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ آپ پریشان ہیں۔ اور میرے لئے یہ کہا گیا کہ اس شخص کو باہر لے جاؤ جب تک اس کے اوسان بحال نہ ہو جائیں اس طرح وہ شخص جس نے چھ ماہ پہلے ملک کے سربراہ کا چارج چھوڑا تھا اسے پاگل قرار دے دیا گیا یہ عدالت کے تعصب کی انتہا تھی اس موقع پر وکیل سرکار ایم اے رحمان نے کھڑے ہو کر کہا کہ مسٹر بھٹو غلط کہہ رہے ہیں جبکہ جسٹس مولوی مشتاق حسین نے نہایت شفقت کے انداز میں یہ باتیں کہی تھیں جناب بھٹو نے کہا نہیں! نہیں! اس پر جناب غلام علی میمن نے چیف جسٹس کا متعلقہ حکم پڑھ کر سنایا اور بتایا کہ چیف جسٹس نے یہ مشفقانہ باتیں کہی تھیں۔ جس کے بعد جناب یحیٰی بختیار نے مسٹر رحمان سے کہا کہ اگر آپ اس بات پر اصرار کرتے ہیں تو آپ بطور گواہ آئیں میں آپ پر جرح کرنے کو تیار ہوں جناب بھٹو نے عدالت کے تعصب کا ذکر کرتے ہوئے کہا عدالت خود تحقیقاتی ایجنسی بن گئی تھی۔ جب ایک گواہ نے منصورہ میں بموں کے دھماکوں کے لئے کسی جگہ کی نشاندہی کی تو عدالت نے حکم دیا کہ موقع واردات کا معائنہ کیا جائے جبکہ اس مقصد کے لئے ایف آئی آر پہلے درج کرائی جا سکتی تھی لیکن عدالت خود تحقیقاتی ایجنسی بن گئی۔ جناب بھٹو نے کہا کہ چیف جسٹس خود شکایت کنندہ بن گئے جب عدالت میں جسٹس رضوی کا ذکر آیا تو چیف جسٹس نے اسے خود پر لے لیا۔ اور کہا کہ ابھی تک چیف جسٹس کی باری نہیں آئی وہ اس پر پہلی بار مسکرائے تھے اور میں نے پہلی مرتبہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی جس پر میں نے کہا آپ کی بھی آئے گی۔ میں نے یہ بات کسی بُری نیت سے نہیں کہی تھی بلکہ سارے مسلمانوں کی باری آتی ہے آپ کی بھی آئے گی چونکہ وہ متعصب تھا اس لئے اس نے میرے خلاف ایس پی ظفر اللہ کو شکایت درج کروائی۔ جناب بھٹو نے اپنی بیماری کے معاملات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ 3 نومبر کا واقعہ ہے میں دیہاتی آدمی ہوں مچھر کاٹنے کی وجہ سے میرا منہ سوج گیا اور مجھ پر ملیریا اور انفلوئنزا کے دو حملے ہوئے پھر مجھے قولنج کی بھی تکلیف ہو گئی تھی مجھے ایک سو تین درجہ کا بخار تھا میں نے درخواست دی کہ گواہوں پر جرح کی کارروائی دو روز تک ملتوی کر دی جائے لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ میری عدم موجودگی میں 15 تاریخ کو اصغر خان ہلاکو اور وکیل خان جیسے اہم گواہوں پر جرح کی گئی اس طرح میں وکلاء کو ہدایات نہ دے سکا۔ بیماری کے ان دنوں میں سوائے جیل ڈاکٹر کے اور کسی نے میرا علاج نہیں

کیا۔ 16 تاریخ کو چیف جسٹس نے مسٹر اعوان سے پوچھا کہ آپ کا مؤکل کیسا ہے تو اس نے کہا کہ وہ کچھ بہتر ہیں اس پر چیف جسٹس نے میڈیکل بورڈ تشکیل دے دیا اور اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو بلایا کہ کھوکھر کہاں ہے کیا اسے بھی انفلوئنزا ہو گیا ہے۔ چیف جسٹس کی اس بات سے تعصب کی واضح مثال نہیں ملتی ہے اس سے اگلے دن جب میں عدالت میں آیا تو ہمیں احکامات دیئے گئے کہ آئندہ عدالتی کارروائی صبح نو بجے سے شام ساڑھے چار بجے تک ہوا کرے گی جناب بھٹو نے کہا کہ عدالت اور کوٹ لکھپت جیل کا درمیانی فاصلہ خاصا ہے اور آنے جانے میں ایک ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا تھا پھر سیکورٹی کے انتظامات میں بھی دیر ہو جاتی تھی میں دوپہر کا کھانا بھی نہ کھا سکتا تھا اس لئے میں وکیلوں کو ہدایات نہ دے سکا۔ میں نے درخواست دی کہ عدالتی کارروائی کے اوقات میں کمی کی جائے میرے وکیل نے کیا جرم کیا تھا کہ چیف جسٹس نے ان کی درخواست رسمی طور پر مسترد کرنے کے بجائے ان کے منہ پر دے ماری۔ انہوں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ رفیق شاہ کو ہدایت کی کہ وہ میرے ساتھ کوٹ لکھپت سے آیا کرے جبکہ دوسری طرف میری بیوی اور میری بیٹی مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ ان کو بتایا گیا کہ یہ میرے دائرہ اختیار میں نہیں ہے جب جسٹس شفیع الرحمان رپورٹ پر بحث ہو رہی تھی اور میں ڈی ایم اعوان سے بات کرنا چاہتا تھا تو ہمیں کہا گیا کہ کوریڈور میں بات کریں دو منٹ بعد جب ہم واپس آئے تو چیف جسٹس نے طنزیہ انداز میں کہا کہ کوئی اور درخواست نہ دے دینا۔ جناب بھٹو نے کہا کوری ڈور میں سیکورٹی والے کھڑے تھے اس لئے مسٹر اعوان سے مشورہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چیئر مین بھٹو نے کہا کہ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے میز پر مکہ مار کر عدالت کی توہین کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسا شخص نہیں ہوں جو عدالت کی توہین کرے مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس سے توہین عدالت ہوتی ہے ہر شخص کا اپنا معیار ہوتا ہے میں اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا انہوں نے کہا کہ کیا یہ بھی ضابطہ فوجداری کا حصہ ہے کہ جب ایک شخص کو موت کی سزا دی جائے تو اس کی بے عزتی بھی کی جائے۔ انہوں نے کہا میں ایسا شخص نہیں ہوں کہ جس کی جڑیں عوام میں نہ ہوں لوگوں کو میرا خیال ہوتا ہے جب مجھے تکلیف ہوتی ہے تو انہیں پریشانی ہوتی ہے ان میں اضطراب پیدا ہوتا ہے لوگوں میں میری حالت کی وجہ سے شدید ناراضگی ہے میں اپنی خراب حالت کا ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ لوگوں کو اس سے تکلیف ہوتی ہے جب لاہور میں قذافی سٹڈیم میں میری بیوی زخمی

ہوئی تو لوگ اس زخمی کی چادر شہباز قلندر کے مزار پر پڑ گئے اور کہا شہباز قلندر یہ دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ چیئرمین نے کہا مسز گاندھی گرفتار ہوئیں تو مظاہرے شروع ہو گئے پانچ آدمی مر گئے اگر آج مارشل لاء اٹھ جائے تو پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ مظاہرے شروع ہو جائیں گے جو اس وقت مارشل لاء کی وجہ سے نہیں ہو رہے آج ''کوڑا'' قانون ہے۔ ملک میں کوئی قانون نہیں ہے جب عام صورت حال بحال ہو گی تو آپ دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے یاد نہیں۔

راگ صرف گواہ ہی نہیں بلکہ ہائی کورٹ کے فیصلہ میں بھی جگہ جگہ الاپا گیا ہے انہوں نے کہا میں نے اس جولائی میں سابق صدر نکسن کی خود نوشت سوانح حیات پڑھی ہے اس میں نکسن نے لکھا ہے کہ واٹر گیٹ کے معاملے میں میں نے کہا کہ سمگلر وغیرہ یہ کہہ دیں کہ انہیں واقعات یاد نہیں اس پر نکسن کے قانونی مشیروں نے انہیں کہا کہ انہیں یاد نہیں اگر وہ یہ بات کہیں کہ انہیں یاد نہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں چیئرمین نے کہا کہ میں نے 18 دسمبر کو عدالت کے تعصب کے بارے میں ایک درخواست لکھی مگر 19 دسمبر کو سماعت اچانک ملتوی کر دی گئی اور کہا گیا کہ چیف جسٹس اچانک راولپنڈی چلے گئے ہیں پھر سردیوں کی چھٹیاں کر دی گئیں 5 جنوری کو جب عدالت دوبارہ لگی تو مجھے چیمبر میں بلایا گیا میں حیران رہ گیا کہ مجھے چیمبر میں کیوں بلایا جا رہا ہے میں چیمبر میں گیا تو وہاں پر تمام جج بیٹھے ہوئے تھے میں نے عدالت کے ججوں کو کبھی چیمبر میں نہیں دیکھا تھا جب میں چیمبر میں داخل ہوا تو میرے ساتھ ایس پی تھا۔

چیف جسٹس نے اسے کہا کہ آپ بیٹھیے۔ وہاں پر اور بھی کرسی خالی تھی میں بھی بیٹھ گیا مگر چیف جسٹس نے فوراً کہا کہ ملزم ہو تم نہیں بیٹھ سکتے تم کھڑے ہو جاؤ میں نے کہا ٹھیک ہے اور میں کھڑا ہو گیا۔ چیف جسٹس نے کہا کہ یہ تمہاری درخواست ہے میں نے کہا ہاں۔ چیف جسٹس نے کہا کہ اس پر دلائل دو میں نے کچھ دلائل دیئے اور ساتھ ہی کہا کہ میں اپنے وکلاء سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ پھر میں نے اعوان کو بلایا۔ انہوں نے بھی چند منٹ دلائل دیئے پھر چیف جسٹس کہنے لگے تم عجیب آدمی ہو کبھی کہتے ہو کہ خود بولو گے کبھی کہتے ہو وکیل سے مشورہ کرو گے، وہاں نہ وکیل تھے نہ پریس تھا۔ پھر چیف جسٹس نے کہا یہ موچی گیٹ نہیں ہے سیاسی تقریر نہ کرو چیئرمین نے کہا میری خواہش ہے کہ کاش موچی گیٹ ہوتا جناب بھٹو نے کہا لیکن یہ عدالت کا چیمبر تھا اور یہاں قانون کی بات ہو رہی تھی سیاسی تقریر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

www.bhutto.org

جناب بھٹو نے کہا مجھے 5 جولائی کو گرفتار کیا گیا جس کے بعد مجھے قید تنہائی میں رکھا گیا پھر رہا کیا گیا اور چند دن بعد دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیس جلدی شروع ہو جاتا مگر بعض خاص باتیں تھیں مسٹر غلام علی میمن نے ہائی کورٹ میں دو درخواستیں دیں جن میں ایک درخواست اہم آئینی مداخلت کے بارے میں تھی جس میں بعض اہم نکات اٹھائے گئے تھے میں نے عدالت سے درخواست کی کہ مجھے بھی دلائل کی اجازت دی جائے جس پر مجھے کہا گیا کہ مجھے مکمل اجازت دی جائے گی اور گھنٹوں بولنے کا موقع دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ کوئی خفیہ سماعت کی عدالت نہ تھی بلکہ کھلی عدالت تھی 18 اکتوبر کو جب میمن کے دلائل ختم ہوئے تو میں بولنے کے لئے کھڑا ہو گیا تو فوراً کہا گیا کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ زبانی کہنے کی بجائے تحریری شکل میں پیش کیا جائے اور اگر کسی سٹینوگرافی کی ضرورت ہے تو وہ مل جائے گا۔ میں نے انتہائی نرمی سے عدالت کو یاد دلایا کہ پہلے آپ دو مرتبہ مجھے بولنے کی اجازت دے چکے ہیں اس لئے مجھے بولنے کا موقع دیا جائے یہ بڑے اہم آئینی نکات ہیں جن پر میں دلائل دینا چاہتا ہوں جس پر عدالت نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ جناب بھٹو نے کہا عدالت کے دو متضاد احکامات تھے جس میں ایک میں اجازت دی گئی اور دوسرے میں اجازت نہیں دی گئی۔ 19 اکتوبر کو یہ درخواست خارج کر دی گئی اور 11 اکتوبر کو اس کیس کی سماعت کا آغاز ہوا۔

جناب بھٹو نے عدالت میں کٹہرا بنائے جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کٹہرا جسٹس نیگو کے دور میں بھی نہیں بنایا گیا تھا۔ عدالت نے بتایا کہ کٹہرے میں عام طور پر بنچ رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ کو کرسی اس لئے دی گئی ہے کہ آپ کو جسمانی طور پر تکلیف نہ ہو جس پر میں نے کہا میں شکر گزار ہوں کہ مجھے کرسی دی گئی ہے کٹہرے میں میرے بائیں جانب ایس۔ پی زمان اور ایس۔ پی ظفر اللہ بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دائیں جانب سپیشل برانچ اور انٹیلی جنس بیورو (او۔ آئی۔ بی) کے لوگ ہوتے تھے اگر میں کسی کو سلام علیکم یا گڈ مارننگ بھی کہتا تو وہ کان لگا لیتے اور میری ایک ایک بات سنتے اس طرح میرے دونوں جانب ''منکر نکیر'' بٹھائے گئے۔ اس طرح میں اپنے وکلاء تک سے بات نہ کر سکتا تھا۔ 17 دسمبر 1977ء کو لاہور کے قذافی سٹیڈیم میں پولیس کے لاٹھی چارج سے میری اہلیہ زخمی ہو گئی تھی۔ میں طلعت یعقوب سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ سمجھ نہیں رہی تھیں ڈیم۔ ایم اعوان دور بیٹھے تھے وہ بھی میری بات نہیں سمجھ رہے تھے جس پر میں نے DAMN IT کے الفاظ کہے کہ میں تم سے بات کر رہا ہوں اور تم میری بات سمجھ نہیں پا رہے ہو جناب بھٹو نے کہا میں نے ذہنی طور پر

غیر مطمئن ہونے کی وجہ سے DAMN IT کہا تھا اس موقع پر فاضل چیف جسٹس نے میرے ساتھ انتہائی بدکلامی کی تھی۔ اس نے غصے میں مجھے کہا کہ ابھی تک تمہارا دماغ درست نہیں ہوا۔ تمہارا دماغ درست ہو جائے گا۔ یہ کھلی دھمکی تھی جو عدالت میں چیف جج مجھے دے رہا تھا۔ کیا ایسا جج میرا مقدمہ سننے کا اہل ہو سکتا تھا۔ فرمایئے آپ کا قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ مجھے کہا گیا کہ احمد رضا قصوری کی جرح کے دوران آپ کو وکلاء سے مشورہ کرنے کا موقع دیا گیا جس پر جناب بھٹو نے کہا کہ مجھے غیر ضروری طور پر مصیبت اٹھانا پڑی جو نہ کسی روایت کے مطابق اور نہ ہی قانون کے مطابق ہے اس کا آپ صرف اندازہ لگا سکتے ہیں۔ صحیح صورت حال معلوم نہیں کر سکتے۔ میں نے اپنے وکلاء کو ہدایت دینے کے لئے بات کی تھی اور جو کچھ ذہن میں ہوتا ہے وہ خیال ہوتا ہے آپ اپنے ذہن کے سارے خیالات دوسرے تک نہیں پہنچا سکتے اور بہت سی باتوں پر دوسروں کو ہدایات نہیں دے سکتے۔ اس پر وکیل سرکار ایم اے رحمان نے کہا کہ ان کے وکیلوں نے لاہور ہائی کورٹ میں بہت دن تک جرح کی ہے۔ انہیں پورا موقع ملا ہے مسٹر رحمان نے کہا جہاں تک کٹہرے کی بات کی گئی ہے تو یہ صرف لکڑی کی باڑ بنائی گئی تھی۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ مسٹر بھٹو کو علیحدہ بٹھایا جا سکے اور مسٹر بھٹو جہاں بیٹھے ہوئے تھے وہ اپنے وکلاء کے سامنے تھے۔ وہ اپنے وکلاء سے آسانی سے بات کر سکتے تھے جس پر چیف جسٹس نے کہا کہ مسٹر بٹالوی نے ایسی کوئی وضاحت پیش نہیں کی تھی۔ ہم ساری تفصیل میں جا چکے ہیں یہ انگریزی زبان کا مسئلہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں فلاں شخص کٹہرے میں ہے تو اس کا مطلب اور ہوتا ہے۔ جس کے بعد ایک فاضل جج نے کہا کہ مسٹر بھٹو ڈاکس (کٹہرا) کا ذکر کر رہے ہیں لوہے کے کسی صندوق کا نہیں۔

ایف ایس ایف کے سابق انسپکٹر غلام مصطفیٰ نے عدالت کو اردو میں بتایا کہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے اعلیٰ افسروں کا حکم مانتے ہوئے اپنا فرض پورا کیا۔ اور اس طرح وہ اپنے اعلیٰ افسران کے ہاتھوں استعمال ہوئے ہیں۔ ایک اور اقبالی ملزم ارشد اقبال ایف ایس ایف کے سابق سب انسپکٹر نے سپریم کورٹ کو بتایا کہ ایف ایس ایف کے افسروں کو غیر قانونی اقدامات کے لئے مجبور کیا جاتا تھا۔ خود مجھ پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ ہوا کیونکہ میں محمد احمد خاں قتل کیس میں ملوث تھا۔ ایک قاتلانہ حملہ میں میرا بھائی مارا گیا۔ ایف ایس ایف کے سابق اسسٹنٹ سب انسپکٹر رانا افتخار احمد نے کہا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ذاتی طور پر نواب محمد احمد خان کے قتل کے ذمہ دار ہیں۔ میں

www.bhutto.org

جرم میں اس لئے ملوث ہوا کہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

چیئرمین نے جیل میں اپنے ساتھ ناروا سلوک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ شیکسپیئر نے Twelveth Night میں محبت کے زمرے میں کہا تھا۔

If music be the food of love then play on.

اگر محبت کے لئے موسیقی غذا ہے تو اسے جاری رکھیں۔

چیئرمین نے کہا کہ مجھے تکلیف دیکر بھی ان کا پیٹ نہیں بھرتا تھا اور میرے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا۔ جس سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے شیواجی کو اورنگ زیب کے کیمپ میں لے آئے ہیں۔

ایک اور موقع پر چیئرمین نے کہا کہ بار بار ''جیل مینویل'' کا نام لیا گیا ہے میں پوچھتا ہوں کہ کیا جیل مینویل ملک کے آئین سے بالاتر ہے اور جیل مینویل میں کیا جیل حکام کو خصوصی اختیارات نہیں دیئے گئے ہیں۔ اگر یہ اختیارات ایک ایسے شخص کے لئے استعمال میں نہیں آسکتے جو ملک کا منتخب صدر اور وزیراعظم رہا ہو تو پھر یہ کس کے کام آئیں گے۔

چیئرمین بھٹو نے اپنے بیان کے دوران عدالت کو بتایا کہ میں بعض سماجی حقائق کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور میں نے ان پراثر انداز ہونے والے بیانات اور پریس کانفرنسوں کی فہرست بھی تیار کی ہے جو میں عدالت کو پیش کرنا چاہتا ہوں تا کہ فاضل جج صاحبان اس کا مطالعہ کریں جس پر چیف جسٹس نے کہا کہ ہم ایسے بیانات کو زیرغور نہیں لائیں گے جو خواہ ملک کے اندر دیئے گئے ہوں یا تہران یا انقرہ میں دیئے گئے ہوں اس پر چیئرمین نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ واقعی ان بیانات کا معیار بہت گھٹیا ہے آپ نے ٹھیک کہا ہے اور یہ اچھی بات ہے کہ آپ اس کا مطالعہ نہیں کریں گے۔

چیئرمین ایک موقع پر لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کا ذکر کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ میں نے ان کو صرف یہ کہا تھا کہ آپ کی بھی باری آئے گی جس پر وہ بڑے سیخ پا ہو گئے اور میرے خلاف شکایت کنندہ بن گئے۔ اس پر سپریم کورٹ کے فاضل چیف جسٹس نے مسکرا کر کہا کہ آپ نے کل ہمیں بھی کچھ کہا تھا۔ لیکن ہم نے تو کوئی شکایت درج نہیں کرائی چیئرمین نے کہا ''جی ہاں میں نے یہ کہا تھا کہ اگر چوتھا مارشل لاء لگا تو جج صاحبان بھی نہیں رہیں گے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔''

آپ کو اگر میرے یہ ریمارکس ناگوار گذرے ہیں تو میں معذرت چاہتا ہوں، لیکن سی ایم

ایل اے کو بھی یہ بات معلوم ہے اسی لیئے وہ کہتے ہیں کہ اب چوتھا مارشل لا نہیں لگنا چاہیئے۔

چیئر مین بھٹو آج سُرمئی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھے اور انہوں نے کلیجی رنگ کی ٹائی لگائی تھی اور اسی رنگ کا رومال ان کی کوٹ کی جیب میں نظر آ رہا تھا۔ چیئر مین پورے نو بجے کمرہ عدالت میں داخل ہوئے تو انہیں دیکھ کر حاضرین احتراماً کھڑے ہو گئے اور سب نے بیک آواز کہا ''بھٹو صاحب اسلام علیکم'' اسی دوران ایک آواز بلند ہوئی ''مائی لیڈر'' چیئر مین نے ہاتھ ہلا کر لوگوں کے والہانہ خیر مقدم کا جواب دیا۔

چیئر مین آج بھی حسب معمول بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ وہ نہایت پُر اعتماد اور پُر عزم نظر آ رہے تھے، جب وہ اپنا بیان ختم کر کے جانے لگے تو لوگوں نے انہیں خدا حافظ کہا اور سلام کیا۔ کمرہ عدالت میں لوگوں کا بڑا ہجوم تھا۔ چیئر مین کو سننے کے لیئے مختلف صوبوں سے کافی تعداد میں لوگ آئے ہوئے تھے ان میں سندھ سے بیگم اشرف عباسی، مخدوم رفیق، سید قائم علی شاہ، خادم علی شاہ، ظہور عالم رند، عبدالرزاق سومرو، صوبہ سرحد سے نثار محمد خان، محمد حنیف خان، شیر محمد، پنجاب سے قیوم بٹ، نذر کیانی، احمد وحید اختر، طلعت یعقوب، کرنل حبیب، اصغر علی چوہدری، آزاد کشمیر سے ممتاز راٹھور، اس کے علاوہ کافی تعداد میں پارٹی کے لیڈر اور خواتین موجود تھیں۔

مقدمہ میں لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ ایک سیاسی فیصلہ ہے اور اس میں علامتی طور پر بہت سی باتیں موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں اس سلسلہ میں اتنی بات کہتا ہوں کل میں نے تارا سنگھ کی طرح کرپان نکالنے کا جو ذکر کیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگ لاڑکانہ میں میرے پاس آئے تھے اور اس کے خلاف جلوس نکالنے کو کہا تھا مگر میں نے یہ نہیں کیا انہوں نے کوٹ لکھپت جیل اور ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں اپنے ساتھ کیئے جانے والے سلوک کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہا میں یہ نہیں کہتا کہ میں قانون سے بالا ہوں مگر میرا قانونی حق تو دیا جائے مجھے انصاف کی سرزمین سے بھی نیچے رکھا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہائی کورٹ میں مقدمہ کے فیصلہ سے ایک دن قبل کوٹ لکھپت جیل کا سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اس وقت تک حکومت کے بعض اقدامات کی روشنی میں فیصلہ کا اندازہ ہو چکا تھا کیونکہ بعض گرفتاریاں کی گئی تھیں جیل کے اندر بعض ایسے شواہد ملے تھے جن سے مقدمہ کے فیصلہ کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس کے مطابق کوٹ لکھپت جیل میں باتھ روم جانے کے لیئے جو چھوٹی سی دیوار تھی وہ بھی بند کر دی گئی۔ انہوں نے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے آ کر کہا کہ جو کچھ

بھی ہے اللہ پر رکھیں ۔ چیئرمین نے کہا قدرتی بات ہے اللہ پر ہی رکھیں گے اور کس پر رکھیں گے ۔ اس نے کہا خدانخواستہ توبہ توبہ کریں ۔ اگر سزائے موت کا بھی فیصلہ ہو گیا تو یہ طے ہو چکا ہے کہ آپ کو اسی جگہ رکھا جائے گا اور پھانسی کی کوٹھڑی میں نہیں لے جایا جائے گا ۔ چیئرمین نے کہا میں مسکرایا اور سوچا کہ تم تو عدالت میں گئے نہیں تم کو عدالت کا فیصلہ کیسے معلوم ہو گیا ۔

تاہم میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اس نے کہا کہ میں نے پہلے سے یہ بات طے کروائی ہے اور جنرل سوار خان نے اس کی منظوری دی ہے ۔ آئی جی جیل خانہ جات نے بھی اس کی منظوری دے دی ہے کہ آپ کو پھانسی کی کوٹھڑی میں نہیں لے جایا جائے گا ۔ اس نے خود ہی یہ دلیل بھی دی کہ پھانسی کی کوٹھڑی میں لے جانے کا مقصد قیدی کو دوسرے قیدیوں سے الگ کرنا ہوتا ہے اور ہم نے پہلے ہی آپ کو الگ کیا ہوا ہے ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آخر آپ سابق وزیراعظم ہیں اس لئے آپ کو پھانسی کی کوٹھڑی میں نہیں لے جایا جائے گا ۔ جناب بھٹو نے کہا کہ پاکستان کے صوبہ پنجاب میں اور غیر منقسم ہندوستان میں بھی بہت سے اعلیٰ طبقے کے لوگ ہیں جن کو موت کی سزا ہوئی مگر پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل نہیں کیا گیا انہوں نے کہا جھنگ کا ایک بڑا زمیندار سر فضل حسین کا رشتہ دار تھا ۔ اس کو قتل کی سزا ہوئی مگر اسے پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل نہیں کیا گیا ۔ میں اس کی شکایت نہیں کر رہا کہ مجھے پھانسی کی کوٹھڑی میں کیوں گھسیٹا گیا بلکہ میں جسٹس مشتاق حسین کے اپنے ساتھ ذاتی تعصب کی بات کر رہا ہوں ۔ جناب بھٹو نے انکشاف کیا کہ جب مجھے سزائے موت کا فیصلہ سنایا گیا تو میں جیل میں واپس آ کر اپنے مشقتی کے ساتھ دو گھنٹے تک بیڈمنٹن کھیلتا رہا اور پھر اس کے بعد سو گیا میں ابھی لیٹا ہی تھا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل لٹکا ہوا چہرہ لے کر آ گیا آخر ان لوگوں کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے اس نے مجھے کہا کہ میں ایک ناخوشگوار کام کر رہا ہوں آپ پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل ہو جائیں میں نے کہا ٹھیک ہے مگر میں چائے تو پی لوں پھر چلے چلتے ہیں اس نے کہا چائے بھی نہ پئیں چائے نہ میں پی سکتا ہوں اور نہ ہی آپ پی سکتے ہیں، کیونکہ مجھے ابھی ابھی حکم آیا ہے کہ فیصلہ سنایا جا چکا ہے اور ابھی تک بھٹو کو کیوں پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل نہیں کیا گیا اس مقصد کے لئے ایڈیشنل آئی جی جیل خانہ جات یہاں آئے ہوئے ہیں تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ بھٹو کو پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل کیا گیا ہے یا نہیں ۔ اس لئے ایک منٹ کی تاخیر کی بھی اجازت نہیں چیئرمین نے کہا میں اسے اپنی بے عزتی نہیں سمجھتا انہوں نے بتایا کہ ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں

www.bhutto.org

میرے باتھ روم کا دروازہ نہیں تھا میں کس طرح باتھ روم استعمال کر سکتا تھا جبکہ سیکورٹی گارڈ ادھر اُدھر آ جا رہے ہوں۔ یہ میری بے عزتی تھی میں اپنی بے عزتی نہیں کروا سکتا تھا انہوں نے فاضل ججوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ پھر آپ میری مدد کو آئے اور میرے کمرہ کے باہر چک لگائی گئی۔ میں کمرہ سے باہر نکل کر چند منٹ بیٹھتا تھا تو فوراً جیل کا عملہ آ جاتا اور کہتا کہ آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے آپ اندر چلے جائیں چیئر مین بھٹو نے بلند آواز سے کہا میری عزت ان باتوں سے زیادہ اہم ہے اس لئے میں نے اپنی کوٹھڑی سے باہر نکلنا ہی بند کر دیا۔ انہوں نے کہا فاضل ججوں کے کہنے پر میرے کمرہ میں سوئچ لگایا گیا کمرہ کے باہر چک لگائی گئی۔ میرے کمرہ کے بالکل ساتھ ٹیلی فون لگایا گیا تھا جو کہ ہر وقت تیار رہتا تھا چیئر مین نے سوال کیا کہ جیل مینویل میں یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ کمرہ کے ساتھ ٹیلی فون رکھا جائے۔ میرے کمرہ کو تالا لگا تھا اس کے باہر کورٹ یارڈ کو بھی تالا لگا تھا اس کے باہر بھی ایک دروازہ تھا جس کو تالا لگا رہتا تھا انہوں نے بتایا کہ اس کے بجائے دیگر اقبالی ملزمان کو ساری سہولتیں میسر تھیں ان کے گھر والے آتے جاتے رہتے تھے ان کو کوئی نہیں روکتا تھا موسیقی کی آواز آتی رہتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ جب میاں عباس اپنے اقبالی بیان سے دوسری بار منحرف ہوا تو میں نے اپنے وکلاء سے کہا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کسی بات کی تیاری کی جا رہی ہے ایک اور اقبالی ملزم نے کہا کہ اس کو راولپنڈی کا موسم راس نہیں آتا تو اسے فوراً لاہور بھجوا دیا گیا۔ انہوں نے کہا میں اس سے کوئی کہانی نہیں سنانا چاہتا۔ بات یہ ہے کہ اگر میرے افراد خانہ چند منٹ تک دیر سے بیٹھ جائیں تو کہا جاتا ہے کہ وقت ہو گیا اٹھ جائیں جب کہ دوسرے ملزمان کے بال بچے جب چاہیں آ سکتے ہیں۔

حزبِ اختلاف کے چند بڑے لیڈروں کے بیانات خودسوزی کے خلاف

17 اکتوبر 1978ء مفتی محمود روزنامہ مشرق، نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو ملک و قوم سے ہمدردی ہے تو وہ دونوں ماں اور بیٹی خود کو جلانے کے لئے پیش کریں۔

19 اکتوبر 1978ء میاں طفیل محمد روزنامہ مشرق، پیپلز پارٹی کے شرپسندوں نے پارٹی پر پابندی کا جواز فراہم کر دیا ہے۔ خودسوزیاں کرنے والے کسی نرمی کے مستحق نہیں۔ ان کا سدِ باب کرنا ہوگا۔

www.bhutto.org

10 اکتوبر 1978ء نواب زادہ نصراللہ خان روزنامہ مشرق، پیپلز پارٹی ملک میں انتشار اور بدامنی پھیلانا چاہتی ہے۔

10 دسمبر 1978ء پیر پگارا روزنامہ مشرق، بھٹو کو پھانسی دینے سے آسمان زمین پر نہیں گر پڑے گا۔

پیپلز پارٹی کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس اور رحم کی درخواست اور میاں یٰسین وٹو کا سیکرٹری جنرل بن جانا

31 مارچ 1979ء کے اخبار نوائے وقت کے پہلے صفحے پر سرخی لگائی گئی۔ پیپلز پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی طرف سے بھٹو کی سزائے موت معاف کردینے کی اپیل رحم کی عرضداشت صدر مملکت کو پیش کردی گئی۔ اس خبر میں میرے لئے سب سے حیران کن بات میاں یٰسین وٹو کا سیکرٹری جنرل بن جانا تھا۔ اس سے پہلے ان کو پیپلز پارٹی پنجاب کا قائم مقام صدر بنایا گیا تھا۔ حکومت نے ان کو راوی کے پل سے گرفتار کرکے ان کو ان کے گھر پابند کردیا تھا، اور کچھ دن کے بعد وہ آزاد ہوگئے تھے۔ ان کی گھر میں پابندی کے بعد ملک سعید حسن کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل بنادیا گیا تھا۔ یہ بات انتہائی حیران کن تھی کہ ملک سعید حسن کے قائم مقام سیکرٹری جنرل موجود ہوتے ہوئے اسلام آباد میں یٰسین وٹو کو کس کی اجازت کے ساتھ قائم مقام سیکرٹری جنرل بنایا گیا تھا۔ اس کا کسی کو بتایا نہیں گیا تھا۔

میاں یٰسین وٹو کی ضیاء الحق سے ملاقات کی درخواست

31 مارچ سے بھی زیادہ حیران کن بات یکم اپریل کو نوائے وقت اخبار میں پڑھنے کو ملی کہ میاں یٰسین وٹو نے ممتاز علی بھٹو کی موجودگی میں صدرِ پاکستان سے ملاقات کی درخواست ایک ہنگامی قسم کی پریس کانفرنس کرتے ہوئے کہا کہ مجلسِ عاملہ نے غلام مصطفےٰ جتوئی کو اور مجھے یعنی یٰسین وٹو کو اس بات کا اختیار دیا ہے کہ ہم دونوں جنرل ضیاء الحق سے رابطہ کریں۔ ان سے ملاقات کریں اور ان کو معافی کی درخواست پیش کریں۔ واضح رہے کہ وزیراعظم بھٹو شہید نے اپنے خاندان اور پارٹی کے رہنماؤں کو سختی سے منع کیا تھا کہ ان کے لئے سزائے موت کے خلاف کسی قسم کی رحم کی اپیل نہ کی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی طرف سے رحم کی اپیل نہیں

www.bhutto.org

کی گئی تھی اور نہ ہی ان کے بیٹوں کی طرف سے اس قسم کی کوئی اپیل کی گئی تھی۔

میاں یٰسین وٹو کی طرف سے رحم کی اپیل میں وہ مخصوص ٹولا شامل تھا جو بظاہر تو وزیراعظم بھٹو کے لئے مگرمچھ کے آنسو بہا رہا تھا۔ مگر اندر سے ضیاء الحق کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کی پھانسی کے بعد اس مخصوص ٹولے کے تمام کردار کھل کر شہید کی بیگم اور بیٹی کے خلاف سیاست میں ننگے ہو گئے تھے۔ جس کا سرغنہ غلام مصطفیٰ جتوئی کو بنایا گیا تھا۔ اس موقعے پر شاعر اسلم گورداسپوری نے خوب شعر کہا تھا۔

کیوں اتارا ہے مجھے اتنی بھی عجلت کیا تھی
اور کچھ دیر مجھے دار پہ رہنے دیتے

حفیظ پیرزادہ کی اپیل

31 مارچ کو مجلس عاملہ کی رحم کی اپیل کے ساتھ ہی عبدالحفیظ پیرزادہ کی خبر شائع کی گئی۔ حفیظ پیرزادہ نے صدر سے بھٹو کے لئے رحم کی درخواست کر دی۔

افسوس کہ وزیراعظم بھٹو کے یہ تمام دوسری صف کے لیڈر پہلے تو ان کی رہائی کی تحریک سے بھی لاتعلق رہے اور جونہی ان کو سزا سنائی گئی۔ یہ رحم کی درخواستیں کرنے لگ گئے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ فوجی حکمرانوں نے وزیراعظم بھٹو کو مکمل طور پر تنہا کر دیا تھا۔ بقول شاعر۔

مرے تھے جن کے لئے
وہ رہے وضو کرتے

وزیراعظم بھٹو کی سوتیلی بہن نے جان بخشی کی اپیل کر دی

یکم اپریل 1979ء کو روزنامہ نوائے وقت نے خبر شائع کی کہ بیگم شہر بانو امتیاز جو بھٹو صاحب کی سوتیلی بڑی بہن ہیں انہوں نے بڑی بہن ہوتے ہوئے کہا کہ مجھ پر بھٹو کا حکم نہیں چل سکتا۔ انہوں نے کہا کہ ہر چند میرے بھائی نے جیل میں ملاقات کے دوران مجھے اور بھٹو خاندان کو رحم کی اپیل کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ مگر میں اپنے بھائی کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ نوائے وقت اخبار نے یہ خبر بی بی سی کے حوالے سے شائع کی تھی۔ جس کی بعد میں صداقت کی کوئی تصدیق

نہیں ہو سکی تھی۔ یہ تمام کام جنرل ضیاء الحق کی خفیہ ایجنسیاں ایک تواتر کے ساتھ کر رہی تھیں تا کہ لوگوں کو کنفیوز کیا جائے۔ ان کو اصل صورت حال سے بے خبر رکھا جائے۔

بھٹو فرش پر سوتے ہیں

ہم دیکھتے ہیں کہ یکم اپریل کو ہی اسی اخبار نوائے وقت میں محترمہ شہر بانو کی خبر کے ساتھ ہی ایڈووکیٹ جنرل پنجاب کی طرف سے یہ خبر شائع کی جاتی ہے کہ مسٹر بھٹو اپنی مرضی سے فرش پر سوتے ہیں۔ وہ پلنگ پر نہیں سوتے۔ اس کے علاوہ مسٹر بھٹو کو اپنے کپڑے استعمال کرنے اور گھر سے کھانا منگوانے کی سہولت حاصل ہے۔ جبکہ اس کے اہلِ خانہ بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو جیل میں تھیں۔ ان کا کونسا گھر تھا جہاں سے ان کو کھانا آ سکتا تھا۔ یہ تمام باتیں ڈس انفارمیشن پھیلانے کے لئے کی جارہی تھیں۔

بھٹو یا ان کے کسی عزیز کی طرف سے کوئی اپیل داخل نہیں کی گئی، رحم کی اپیل دائر کرنے کا وقت ختم ہو گیا۔ روزنامہ نوائے وقت

روزنامہ نوائے وقت میں 31 مارچ 1979ء کو خبر شائع کی گئی کہ آج رات 12 بجے تک حکومت کو کوئی رحم کی درخواست موصول نہیں ہوئی۔ لہٰذا رحم کی درخواست دائر کرنے کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد کوئی رحم کی درخواست نہیں دی جا سکتی۔ مگر یکم اپریل کو یہی اخبار نوائے وقت کئی ایک لوگوں کی طرف سے جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے رحم کی درخواستیں کرنے کی بڑی بڑی سرخیاں لگاتا پایا گیا ہے۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کے لئے رحم کی تمام اپیلیں مسترد کر دیں روزنامہ نوائے وقت

3 اپریل 1979ء کو نوائے وقت کی سب سے بڑی سرخی تھی کہ صدر ضیاء الحق نے بھٹو کے

www.bhutto.org

لئے کی جانے والی رحم کی تمام اپیلیں مسترد کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے وزیراعظم ڈیسائی کے بیان کی سرخی لگائی گئی۔

''بھارت کی حکومت بھٹو کی جان بخشی کی اپیل نہیں کرے گی'' وزیراعظم ڈیسائی۔

شرمناک بات

سب سے زیادہ افسوس ناک اور شرمناک بات یہ تھی کہ جنرل ضیاء الحق نے جس قلم سے وزیراعظم بھٹو کی پھانسی کی اپیلوں کو مسترد کیا تھا۔ اس قلم کو بطور سووینیر چوہدری ظہور الٰہی نے ضیاء الحق سے حاصل کیا تھا۔ جس کی خبر بھی اخبار میں شائع کی گئی تھی۔

خدا کی آواز

ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کی ذات وزیراعظم بھٹو کو ہر انداز سے ایک عظیم محب وطن پاکستانی رہنما ثابت کر رہی ہے ایک طرف جنرل ضیاء الحق ان کی نقلی اور جعلی قسم کی رحم کی اپیلیں مسترد کرنے کا اعلان کر رہا ہے۔ دوسری جانب بھارت کا وزیراعظم ان کی جان بخشی کی اپیل نہ کرنے کا اعلان کر رہا ہے۔ گویا ہندوستان اور جنرل ضیاء الحق بھٹو دشمنی میں ایک تھے۔

قیامت خیز دن

کریں گے کوہ کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہء نیروئے تن کی آزمائش ہے

قارئین حضرات یہ 3 اپریل کا دن کس قدر قیامت خیز دن تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ضیاء الحق جیسے لعنتی انسان کی وزیراعظم بھٹو کو سزائے موت کی سزا سنا کر بھی اس کے خبثِ باطن کی تسلی نہیں ہوتی۔ اس کے سفاک اور سیاہ دل کی حسرت پوری نہیں ہوتی۔ عین اسی دن ہی جس دن روزنامہ نوائے وقت ضیاء الحق کی طرف سے رحم کی درخواستیں مسترد کرنے کی سب سے بڑی خبر شائع کرتا ہے اسی دن یہی اخبار پہلے صفحے کی دوسری بڑی سرخی لگاتا ہے۔

www.bhutto.org

بھٹو کی اقامت گاہوں سے خفیہ دستاویزات برآمد کر لی گئیں

شاید ہی دنیا میں کسی دوسرے انسان کو جنرل ضیاء الحق کی طرح کا بدطینت، مقروح اور بدباطن دشمن ملا ہو جیسا کہ وزیراعظم بھٹو کو ضیاء الحق کی شکل میں ملا تھا۔

12 اپریل کو لاڑکانہ، نوڈیرو اور کراچی میں وزیراعظم بھٹو کے گھروں پر فوجی دستوں کے ساتھ چھاپہ مارا جاتا ہے۔ ان تینوں گھروں کی تلاشی لی جاتی ہے، اور اخبار میں بیان کیا جاتا ہے کہ ملکی سلامتی اور دفاع اور امورِ خارجہ سے متعلق اہم دستاویزات پکڑی گئی ہیں جن کو ملک سے باہر سمگل کرنے کی کوشش کی جانے والی تھی۔

ان تمام مظالم کی شرمناک داستان سے پتہ چلتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی بربریت وزیراعظم بھٹو کے خلاف کس قدر اپنی انتہا پر تھی۔ وہ نہ صرف ان کی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہے بلکہ ان کے گھروں کی حرمت کو بھی پامال کر رہا ہے جن گھروں میں کوئی اہلِ خانہ موجود نہیں تھا۔ وہ سفاک انسان بھٹو کے خالی گھر بھی برداشت نہیں کر رہا تھا۔

قدرت کا انتقام

وزیراعظم بھٹو کی شہادت کے بعد جنرل ضیاء الحق کا جہاز ہوا میں جل کر خاک سیاہ ہونا قدرت کا سب سے بڑا انتقام تھا۔ جس کو پوری دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

قاتلوں کا ترجمان اخبار نوائے وقت

قارئین میں نے وزیراعظم بھٹو کی زندگی کے آخری ایام رقم کرنے کے لئے باقی تمام اخبارات کو چھوڑ کر صرف نوائے وقت کی اشاعت کو کتاب میں ثبوت کے طور پر منتخب کیا ہے تاکہ اس وقت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ وزیراعظم بھٹو شہید کے قاتل کس قدر کم ظرف اور رذیل تھے جن قاتلوں کی ترجمانی کا کام نوائے وقت اخبار نے بخوبی سرانجام دیا تھا۔

www.bhutto.org

اس سے پہلے صفحے پر آپ نے نوائے وقت اخبار کی سرخی ملاحظہ کی ہے جس میں وزیراعظم بھٹو کے نوڈیرو، لاڑکانہ اور کراچی کے گھروں کی نہ صرف تلاشی لی گئی بلکہ وہاں سے ان کی تمام نادر اور تاریخی اشیاء کو لوٹا گیا، اور بہت سا قیمتی سامان جس میں ان کے خاندان کا لائسنسی اسلحہ بھی تھا وہ لوٹ لیا گیا تھا۔ وزیراعظم بھٹو کے گھروں کی حرمت کی پامالی کا یہ نقشہ بالکل ہو بہو یزید کے لشکریوں کا سا تھا۔ جنہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے احباب کی شہادتوں کے بعد خیموں کی تلاشی لی تھی اور ہر قیمتی چیز کو لوٹ لیا تھا۔ یہاں تک کہ پاکدامن بیبیوں کے زیورات تک اتار لئے تھے۔

3 اپریل 1979ء روزنامہ نوائے وقت کی سرخیاں

☆ صدر ضیاء الحق نے بھٹو کے لئے رحم کی تمام اپلیں مسترد کر دیں۔
☆ پھانسی کسی بھی وقت دی جا سکتی ہے۔
☆ نصرت اور بے نظیر کو بھٹو سے آخری ملاقات کے لئے پولیس کار میں جیل لے جایا گیا۔
☆ بھٹو نے وصیت تحریر کر دی، بیٹے بیٹیوں کے بارے میں زبانی ہدایات بھی دیں۔
☆ طویل ترین ملاقات اور اہم خط۔
☆ بھارت کی حکومت بھٹو کی جان بخشی کی اپیل نہیں کرے گی۔ ڈیسائی
☆ نواب محمد احمد قتل کیس کے دیگر چار مجرموں کی اپلیں بھی مسترد ہو گئیں۔
☆ لاڑکانہ، نوڈیرو اور کراچی میں بھٹو کی اقامت گاہوں سے اہم خفیہ دستاویزات برآمد۔
☆ روسی وزیراعظم کو سیجن کو صدر ضیاء الحق کا پیغام پہنچا دیا گیا۔

میں اپنے خدا کے پاس خوبصورت ہو کر جانا چاہتا ہوں

وزیراعظم بھٹو 3 اپریل کی شام اپنی پھانسی کوٹھڑی کے اردگرد غیر معمولی قسم کی جیل کے عملے کی حرکات وسکنات دیکھ کر جیل سپرنٹنڈنٹ سے دریافت کرتے ہیں۔ کیا بات ہے ہماری موت کا پروانہ آ گیا ہے کیا۔ سپرنٹنڈنٹ تصدیق کرتا ہے کہ آج دوپہر آپ کی بیگم صاحبہ اور بے نظیر کے ساتھ آخری ملاقات کرا دی گئی ہے۔ آپ کا ڈیتھ وارنٹ آ گیا ہے۔

وزیراعظم مسکرا کر سپرنٹنڈنٹ سے کہتے ہیں او کے پھر چلنے کی تیاری کرتے ہیں۔ میں سب

سے پہلے شیو بنانا چاہتا ہوں۔ میں اپنے خدا کے پاس خوبصورت بن کر جانا چاہتا ہوں۔ وزیراعظم بھٹو نہایت تسلی کے ساتھ اپنی شیو بناتے ہیں۔ اپنے چہرے پر خوشبو لگاتے ہیں۔ اپنی قمیص پر خوشبو چھڑکتے ہیں۔ شام کے سائے ڈھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ دوبارہ آ کر کہتا ہے کہ آپ اپنی وصیت لکھنا چاہیں تو لکھ سکتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ کے مطابق بقول نوائے وقت اخبار بھٹو صاحب اس وقت کچھ کاغذ پر لکھ رہے تھے۔ مگر جب سپرنٹنڈنٹ نے وصیت لکھنے کا کہا تو انہوں نے وہ کاغذ پھاڑ دیا جو ان کے ہاتھ میں تھا اور سپرنٹنڈنٹ سے کہا تم لوگوں کو میری وجہ سے بڑی پریشانی کا سامنا تھا۔ آج رات آپ لوگوں کی تمام پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔

وصیت

بھٹو نے کہا میری وصیت میرے عوام ہیں۔ انہوں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا میری وجہ سے تم لوگوں کو بڑی پریشانی کا سامنا تھا۔ آج رات آپ لوگوں کی تمام پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔

زندگی اتنی غنیمت تو نہیں جس کے لئے
عہدِ کم ظرف کی ہر بات گوارہ کر لیں

جیل حکام نے کھانے کا پوچھا

3 اپریل کی شام کو جیل والوں نے وزیراعظم بھٹو سے کھانے کے بارے میں کہا۔ انہوں نے کہا کہ میں بہت کھا چکا ہوں۔ اب میری طرف سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔ اب میں یہاں سے اڑنے والا ہوں۔

کوسیجن کو صدر کا پیغام پہنچا دیا گیا

3 اپریل کے نوائے وقت میں اخبار پہلے صفحے پر دیگر بیان کی گئی سرخیوں کے ساتھ ایک سرخی شائع کرتا ہے کہ روسی وزیراعظم کوسیجن کو صدر ضیاء الحق کا خصوصی پیغام بذریعہ پاکستان کے سفیر صاحبزادہ یعقوب علی خان پہنچا دیا گیا۔ اس خصوصی بیان کے جواب کی ہی صورت میں 4 اپریل کے اخبار نوائے وقت کے پہلے صفحے پر روس کے بارے میں سرخی لگائی گئی۔

4اپریل 1979ء روزنامہ نوائے وقت کی سرخیاں

☆ محمد احمد خاں کے مقدمہ قتل کے بڑے مجرم کو ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں صبح 2 بجے تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

☆ پھانسی کی اطلاع ملنے پر بھٹو بے ہوش ہو گئے۔

☆ جیل میں حفاظتی انتظامات سخت کر دیئے گئے تھے۔

☆ بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔

☆ تارا مسیح نے پھانسی دی، نعش کو غسل دیا گیا، جیل والوں سے معذرت خواہ ہوں۔

☆ بھٹو کا انجام آمرِ مطلق بننے کے آرزومند حکمرانوں کے لئے باعثِ عبرت ہے۔ چوہدری ظہور الٰہی۔

☆ بھٹو کو پھانسی دینے پر کسی قسم کا ردِ عمل نہیں ہوا۔

☆ نواب محمد احمد خاں کی میت کی تصویر شائع کی گئی۔

تاس نے بھٹو کی پھانسی کی خبر پر کوئی تبصرہ نہیں کیا

نوائے وقت اخبار 4 اپریل کی دوسری خبروں کے ساتھ پہلے صفحے پر خبر شائع کرتا ہے کہ سوویت روس کی قومی خبر رساں ایجنسی تاس نے آج راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں پاکستان کے سابق وزیراعظم بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کی خبر کسی تبصرے کے بغیر دی۔ گویا سوویت روس کا یہ بہت بڑا انسان دوست کارنامہ تھا۔ جس کی روزنامہ نوائے وقت تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

روزنامہ نوائے وقت اخبار کی 4 اپریل کے ہی اخبار کے پہلے صفحے پر ایک اور سرخی ملاحظہ ہو۔

آخر کار انصاف کی جیت ہوئی اور مجرم کو سزا ملی۔ ملائشیا کا سابق وزیراعظم تنکو عبدالرحمٰن

واضح رہے کہ یہ تنکو عبدالرحمٰن بھی ضیاء الحق کی طرح کا ہی ملائشیا میں امریکن سی۔ آئی۔ اے

کا ایجنٹ تھا۔

ان تمام سرخیوں سے اخبار نوائے وقت کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ ان سرخیوں کے درمیان چھوٹی سرخی اخبار لگاتا ہے۔

بھٹو کا جسم 35 منٹ تک تختہء دار پر لٹکتا رہا

روز نامہ نوائے وقت اور اس کے تمام تارا مسیح حواریوں اور بھٹو دشمنوں کے لئے عرض ہے کہ اہلِ حق تختہء دار پر ہی لٹکا کرتے ہیں۔ بقول سعدائے سرمد۔

عمریست کہ افسانہء منصور کہن شد
من ازسرِنو تازہ کنم دار و رسن را

ترجمہ: مدت ہوئی کہ افسانہ منصور الحق پرانا ہو چکا ہے یعنی بھلا دیا گیا ہے۔
میں اس نعرہ انا الحق کو پھر سے نئے سرے سے زندہ کر رہا ہوں۔
اس طرح کا مرتبہ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ بقول شاعر ؎

یہ رتبہء بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اخبار نوائے وقت کی ایک اور دل خراش سرخی ملاحظہ ہو۔

پھانسی کی اجرت دس روپے

اخبار نوائے وقت لکھتا ہے کہ جلاّد تارا مسیح جس کا تمام خاندان پھانسی دینے کا ماہر ہے آج اپنی فیس یعنی 10 روپے اور آمد و رفت کا خرچ لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ اخبار لکھتا ہے کہ بھٹو کو پھانسی دینے کے لئے جلاّد تارا مسیح کو ذہنی طور پر تیار کیا گیا تھا۔

اس مقام پر مرزا غالب کا شعر خوب یاد آیا ہے ؎

یہ نعشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

جیل والوں سے معذرت خواہ ہوں ۔ نوائے وقت

اخبار نوائے وقت کے مطابق وزیر اعظم بھٹو کو جب تختۂ دار کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو اس وقت انہوں نے جیل کے موجود عملے کے لوگوں سے معذرت کے انداز میں کہا کہ میں نے اپنی جیل کے ایام کے دوران آپ لوگوں کو بڑی تکلیف دی جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

بلاشبہ ایک بڑا انسان ہی اتنا خلیق اور اتنا شفیق ہوسکتا ہے کہ وہ جیل کے اس عملے سے بھی معذرت کر رہا ہے جس عملے نے ضیاء الحق کے احکامات کے مطابق وزیر اعظم بھٹو کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا تھا۔ جس ناروا سلوک کے بارے میں انہوں نے سپریم کورٹ میں کہا تھا کہ جیل کا عملہ ہر قدم پر میری تضحیک کا سامان پیدا کرتا تھا۔

وزیر اعظم بھٹو شہید کا یہ کردار بالکل اس ضرب المثل کی طرح ہے۔

بخش دو گر خطا کرے کوئی

ہیلی کاپٹر نبی بخش بھٹو کی حویلی کے سامنے اترا

نعش کفن میں لپٹی ہوئی تھی

ماں اور بیٹی نے رو رو کر برا حال کر لیا

پھانسی کی اجرت دس روپے

4 اپریل 1979ء روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت کے تراشے

www.bhutto.org

نوائے وقت لاہور

محمد احمد خاں کے مقدمۂ قتل کے بڑے مجرم کو ڈسٹرکٹ جیل

راولپنڈی میں صبح ۲ بجے تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا

پھانسی کی اطلاع ملنے پر بھٹو بے ہوش ہو گئے

جیل میں حفاظتی انتظامات سخت کر دیئے گئے تھے

...پر ان کی دونوں بیویوں بیٹی اور قریبی

...ان سے آخری ملاقات کرا دی گئی تھی

بھٹو کا جسم ۵ منٹ تک

تختۂ دار پر لٹکتا رہا

میں نے آپ کو بہت تنگ کیا ہے

باقی مجرم کہاں ہیں؟

بھٹو کو پھانسی دے دی گئی

...لے گئی تھی اور پھانسی کے ساڑھے آٹھ گھنٹے بعد گڑھی خدا بخش میں سپرد خاک کر دیا گیا • نماز جنازہ میں بھٹو کے چچا نبی بخش بھٹو، سردار پیر بخش بھٹو، پہلی بیوی شیریں امیر بیگم اور دوست احباب شریک ہوئے

4اپریل 1979ء روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت کے تراشے

www.bhutto.org

بابِ شہادت

3 اپریل 1979ء کا دن وزیر اعظم بھٹو سے محبت کرنے والی پاکستان کے عوام کے لئے اور انسانیت کے لئے ایک حشر کا دہاڑا تھا اور 3 اپریل کی رات ایک قیامتِ صغرا کی طرح کی تھی۔ 3 اپریل کو دن بھر تو وزیر اعظم بھٹو کے قاتل ان کی ہر ایک رہائش گاہ کی تلاشی لیتے رہے۔ بھٹو خاندان کے غریب ملازموں کو دیواروں کے ساتھ منہ کر کے کھڑا کرتے رہے۔ اور دن ڈھلتے ہی شام کو وزیر اعظم بھٹو کو پھانسی دینے کی تیاری کرنے لگ گئے۔

انسانیت سوز شرمناک انتقام

وزیر اعظم بھٹو کے قاتل انتہائی رذیل شقی القلب اور یزیدی انتقام کے لوگ تھے۔ ان کے دلوں میں شرم وحیا قانون نام کی کوئی شے نہیں تھی۔

وزیر اعظم بھٹو کی پھانسی جیسی سنگین سزا پا کر مرنے سے بھی ان کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں پڑتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ اپنی بدذاتی اور وحشت کی انتہا کئے ہوئے تھے۔

وزیر اعظم بھٹو کے سیاہ رواور سیاہ فام دل کے قاتل ان کو ان کی موت سے پہلے انتہائی اذیت میں مبتلا رکھنا چاہتے تھے۔ پھانسی والی رات ان کی تضحیک کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایک بے بس اور لاچار انسان پر اپنی درندگی کی انتہا کرنا چاہتے تھے۔ بقول شاعر اسلم گورداسپوری ؎

ان کو کیا خاک سزا دیں گے زمانے والے
جن کو احساس نے سولی پہ چڑھا رکھا ہے

ایک کرنل کا جیل میں جانا

3 اپریل کی شام 9 بجے کے قریب ایک فوجی کرنل جو جنرل ضیاء الحق کا بے حد چہیتا کرنل تھا۔ وہ وزیر اعظم بھٹو کے پھانسی کے کمرے میں اپنی سٹک جیل کی کال کوٹھڑی کی سلاخوں پر مارتا ہوا انتہائی بدتمیزی اور رعونت کے انداز میں وزیر اعظم بھٹو کی پھانسی کوٹھڑی کا دروازہ کھلوا کر ان کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ فوجی کمانڈو نما سپاہی جو ڈشکروں کی شکل میں تھے

وزیراعظم بھٹو کے چاروں طرف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کرنل بھٹو صاحب سے مخاطب ہوتا ہے۔ ان سے پوچھتا ہے کہ فلاں کاغذات کہاں ہیں۔ وزیراعظم بھٹو کرنل کی اس بدتمیزی پر کہتے ہیں کہ میں پھانسی کا مجرم ہوں۔ آج رات جیل سپرنٹنڈنٹ کی اطلاع کے مطابق مجھے پھانسی دے دی جائے گی۔ میرے مقدمے کی تفتیش و تحقیق تمام ہو چکی ہے۔ اب میرا مسئلہ تمہاری دنیا سے متعلق نہیں رہ گیا۔ اب میرا مسئلہ میرے خدا کا اور میرا بن گیا ہے۔ اب تم مجھ سے نہ کوئی سوال کر سکتے ہو اور نہ ہی میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند ہوں۔ اب تو تمہاری میری بات ختم ہو چکی ہے۔ تم کس قانون کے تحت میری پھانسی کوٹھڑی میں آئے ہو۔ اب کسی قسم کے سوال جواب کا قانون اجازت نہیں دیتا۔

تم نے مجھے زندگی میں تو سکون نہیں دیا اب چین سے مرنے تو دو

کرنل: ہم تمہیں چین سے مرنے نہیں دیں گے۔ مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے وہ کاغذات کہاں ہیں۔

وزیراعظم بھٹو: میں کسی کاغذات کے بارے میں نہیں جانتا۔

کرنل: کرنل گرج کر کچھ کاغذات وزیراعظم بھٹو کے آگے کرتا ہے۔ ان کاغذات پر دستخط کرو۔

وزیراعظم بھٹو: میں کسی کاغذ پر دستخط نہیں کرتا۔ تم میری کوٹھڑی سے باہر نکل جاؤ۔

انگریزی میں کہتے ہیں۔ "You get out from here."

وزیراعظم بھٹو کے اس فقرے سے کرنل مشتعل ہو جاتا ہے۔ دراصل کرنل ضیاءالحق کے کہنے پر بھٹو صاحب پر تشدد کرنا چاہتا تھا۔ وہ کن کاغذات پر دستخط چاہتا تھا۔ وہ کاغذات اور وہ باتیں آج تک صیغہ راز میں ہیں۔

کرنل وزیراعظم بھٹو کو اپنی سٹک سے مارنا شروع کر دیتا ہے۔ وزیراعظم بھٹو کی پشت پر کھڑے کمانڈو نے اپنی رائفل کا بٹ وزیراعظم بھٹو کے کندھوں پر دے مارا۔ کرنل نے بھٹو صاحب کی پسلیوں پر اپنے فوجی بوٹ کا ٹھڈا مارا۔

وزیراعظم بھٹو جو پہلے ہی جیل اور پھانسی کوٹھڑی کی اذیت سے انتہائی نحیف و کمزور اور لاغر

ہو چکے تھے۔ وہ ضیاء الحق کے درندہ صفت کرنل اور کمانڈو کے تشدد سے زمین پر جا گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے فوری طور پر جیل کے ڈاکٹر کو بلایا۔ جس ڈاکٹر کو 3 اپریل کے دن سے ہی جیل میں رہنے کا حکم تھا۔ ڈاکٹر نے بھٹو صاحب کی نبض دیکھ کر ان کو ایک انجکشن دیا۔ اس انجکشن کے لگنے کے بعد بھٹو صاحب کی صرف آنکھیں وا ہوئیں۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھے۔

سپرنٹنڈنٹ اور ڈاکٹر وزیراعظم بھٹو کو کھڑا کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ تشدد کی وجہ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ اس طرح وزیراعظم بھٹو رات 11-12 بجے سے لے کر ایک بجے تک نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑے رہے۔ اس کے بعد اخبار انتہائی مضحکہ خیز بات تحریر کرتا ہے کہ بھٹو کو غسل کرنے کو کہا گیا۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

نوائے وقت اخبار کے مالک مجید نظامی کے لئے ہی شاید غالب نے یہ شعر کہا تھا۔

جانِ غالب تابہ گفتارے گماں داری ہنوز

سخت بے دردی زے می پرسی زے ما احوالِ ما

ترجمہ: جان غالب میں اب نہیں بات کرنا گماں ہے کہ میں بات کر سکتا ہوں۔ کس قدر ظالم ہو کہ مجھ سے میرا حال پوچھ رہے ہو۔

یعنی نیم بے ہوش بھٹو کو غسل کرنے کا کہہ رہے ہو۔ جب کہ بھٹو صاحب شام کو شیو بنا کر غسل کر چکے تھے۔

پھانسی دینے کا قانونی وقت

پاکستان کے قانون کے مطابق پھانسی دینے کا وقت اذانوں کے بعد کا ہوتا ہے۔ یہ وقت صبح 5 بجے تک کا ہوتا ہے۔ مگر وزیراعظم بھٹو کو قانون کو پامال کرتے ہوئے تقریباً رات کے دو بجے پھانسی دی گئی۔ جس کی پاکستان کی تاریخ میں پہلے کوئی مثال موجود نہیں تھی۔

اخبار نوائے وقت کے مطابق پھانسی کا منظر

4 اپریل کے پہلے صفحے پر اخبار تیسرے کالم میں ایک چھوٹی سرخی لگاتا ہے۔ جس کا عنوان ہے "پھانسی کی طرف جانے سے انکار۔"

پھانسی کی طرف جانے سے انکار

حضرات میں نے وزیراعظم بھٹو کی زندگی کے آخری لمحات کی داستان کو بیان کرنے کے لئے نوائے وقت اخبار کو اس لئے منتخب کیا ہے کہ یہ اخبار وزیراعظم بھٹو کے قاتلوں کا ترجمان اخبار تھا۔ اور وزیراعظم بھٹو کی پھانسی کی رات صرف اس اخبار کو ہی پھانسی کا آنکھوں دیکھا حال اور پھانسی کی تمام کارروائی تک رسائی حاصل تھی۔

اخبار اپنے "باوثوق ذرائع" کے مطابق تحریر کرتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو جب رات ایک بج کر پچپن منٹ پر پھانسی کی کوٹھڑی سے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جایا جانے لگا تو انہوں نے مزاحمت کی۔ وارڈن نے ان سے باہر آنے کا کہا۔ مگر انہوں نے انکار کردیا۔ اس پر انہیں بازوؤں سے پکڑ کر باہر لایا گیا۔ تو وہ پھر مزاحم ہوئے۔ اس پر ان کو اسٹریچر پر ڈالا گیا۔ انہوں نے اسٹریچر سے اترنے کی کوشش کی۔ مگر وہ نیچے نہ اتر سکے۔ پھانسی گھاٹ ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔

لہٰذا اخبار نوائے وقت کے مطابق تمام عالمِ اسلام کے منتخب چیئرمین پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس کے خالق فخرِ ایشیا قائدِ عوام وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو جیل کا عملہ اسٹریچر پر ڈال کر اس طرح پھانسی گھاٹ کی طرف لے کر ایک فرلانگ تک بھاگتا رہا۔ جس طرح ریلوے اسٹیشن پر قلی مسافروں کا سامان اپنی ریڑیوں پر ڈال کر بھاگا کرتے ہیں۔ جیل کے عملے نے اسٹریچر کو چبوترے کے قریب پہنچ کر پھانسی گھاٹ کے ساتھ رکھ دیا اور جیل کے عملے نے ان کو سہارا دے کر تختۂ دار تک پہنچا دیا۔ یعنی پھانسی کے تختے پر کھڑا کردیا۔ اخبار لکھتا ہے کہ انہوں نے اردگرد دیکھ کر پوچھا کہ باقی مجرم کہاں ہیں۔ ان کی یہ بات مکمل اس بات کا ثبوت ہے کہ بھٹو صاحب باقاعدہ ہوش و حواس میں تھے۔ انہوں نے اپنی پھانسی کی تصدیق کے لئے ان مجرموں کا پوچھا تھا۔ جس کا جیل

www.bhutto.org

کے سپرنٹنڈنٹ کی طرف سے اخبار کے مطابق ان کو کوئی جواب نہ مل سکا۔

وزیراعظم بھٹو کے ہاتھوں کو ان کی پشت کی طرف کھینچ کر سختی سے پیچھے باندھا گیا۔ تو انہوں نے کہا کہ میرے ہاتھ ڈھیلے کرو۔ اب تو میں تختہء دار پر کھڑا ہوں۔ اب اس تشدد کی کیا ضرورت ہے۔

بھٹو نے اپنی گردن کو اور بلند کر دیا

وزیراعظم بھٹو کی گردن میں یعنی گلے میں جب جلاّد تارا مسیح نے پھندا ڈالا تو وزیراعظم بھٹو نے اپنی گردن کو اور بلند کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ ''اے خدا میں بے قصور ہوں''۔ جلاّد تارا مسیح نے اخبار کے مطابق ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھندے کو اپنی جلاّدی مہارت کی آخری گانٹھ دے کر پھندے کو خوب کسا۔ سپرنٹنڈنٹ کے اشارے پر پھانسی کے تختے کے ساتھ لگے ہوئے لیور کو کھینچ دیا گیا اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے پاؤں کے نیچے سے تختے نکل گئے اور ان کا جسم ایک جھٹکے کے ساتھ پھندے کی رسّی کے ساتھ لٹک گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی روح اپنے خالقِ حقیقی کی طرف پرواز کر گئی اور شہید ذوالفقار علی بھٹو اس دنیا میں اپنے انتہائی کمینے اور رذیل دشمنوں سے آزاد ہو گئے۔ اناللہ وانا علیہ راجعون۔

شاعر فیض احمد فیض نے شہید بھٹو کی طرح کے ہی انسانوں کے لئے کہا تھا۔

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی کوئی بات نہیں

شہید ذوالفقار علی بھٹو کا سفرِ آخرت

شہید بابا کو جیل میں ہی غسل دیا گیا۔ غسل کے لئے ایک غسال مولوی کو شام سے ہی جیل میں مقید رکھا گیا تھا۔ غسل کے بعد ان کو کفن پہنا دیا گیا۔ اور ان کی میت کو جیل کے عقب کی طرف سے ٹرک کے ذریعے باہر لے جایا گیا۔ اور ان کی میت کو ایک فوجی جہاز میں سوار کرا دیا گیا۔

خدا کی قدرت کہ وہ فوجی جہاز جو C-1-30 ہی ہوگا۔ اس میں اڑان کے بعد کچھ خرابی واقع

www.bhutto.org

ہوگئی۔اس بارے میں یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ فوجی جہاز کے پائلٹ کی وزیراعظم بھٹو کی اس دل خراش موت کی وجہ سے طبیعت خراب ہوگئی تھی۔وہ شدتِ غم سے جہاز اڑانے کے قابل نہیں رہا تھا اس نے اپنی طبیعت کی خرابی کا کہہ کر جہاز کو واپس اتار دیا تھا۔اس کے بعد فوجی حکمرانوں نے ایک دوسرے جہاز میں شہید بھٹو کی میت کو سوار کرا کر نوڈیرو پہنچایا تھا۔

قبر کشائی کی داستان

وزیراعظم بھٹو کے آبائی قبرستان گڑھی خدا بخش کو فوج کے جوانوں نے آدھی رات کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔اور قبرستان میں ایک خالی جگہ پر صبح پانچ بجے کے قریب قبر کھودنے کا کام شروع کروادیا۔

اس طریقے کے ساتھ صبح آٹھ بجے تک قبر کو تیار کردیا گیا۔وزیراعظم بھٹو کے آبائی گاؤں جو ان کے آباؤ اجداد کی رہائش گاہ نوڈیرو تھی اس کو مکمل طور پر فوج اور پولیس نے اپنی تحویل میں رات ہی سے لے رکھا تھا۔جس کی وجہ سے نوڈیرو کے علاقے میں کرفیو کا سماں تھا۔

گڑھی خدا بخش نوڈیرو سے تقریباً 10 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔یہ 10 کلومیٹر کا راستہ مکمل طور پر فوجی پلٹون کی حراست میں تھا۔یہ راستہ 3 اپریل کی رات کو ہی بند کردیا گیا تھا۔گڑھی خدا بخش اب جو ایک قصبہ نما شہر ہے۔اس کی تمام آبادی کو ایک طرح سے گھروں میں ہی قید کردیا گیا تھا۔کسی شخص کو اپنے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔

نبی بخش بھٹو کی حویلی

فوجی حکمرانوں نے شہید وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے چچا سردار نبی بخش بھٹو اور سردار پیر بخش بھٹو کو 3 اپریل کو اطلاع کی کہ وزیراعظم بھٹو کی میت کو صبح سویرے آپ کی حویلی کے سامنے ہیلی کاپٹر کے ذریعے لایا جائے گا۔آپ شہید بھٹو کی بیوہ شیریں امیر بیگم کو اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو اپنی حویلی میں رات کو ہی بلالیں۔اس طرح سردار نبی بخش بھٹو کی حویلی میں محترمہ شیریں امیر بیگم اور بھٹو خاندان کے مرد اور خواتین اور اس خاندان کے ملازمین رات بھر شہید بھٹو کی میت کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔

www.bhutto.org

میت کی آمد

شہید وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی میت مرزا غالب کے شعر کی عملی تصویر تھی۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

4 اپریل 1979ء کے روزنامہ نوائے وقت کے پہلے صفحے پر چھٹے کالم میں ایک چھوٹی سرخی تھی۔

ہیلی کاپٹر نبی بخش بھٹو کی حویلی کے سامنے اُترا

راولپنڈی میں پھانسی دیئے جانے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی میت ہیلی کاپٹر کے ذریعے آج صبح آٹھ بج کر پانچ منٹ پر نواب نبی بخش کی حویلی کے سامنے لائی گئی۔ نعش سفید کفن میں ملبوس تھی۔ اسے حویلی کے اندر لے جایا گیا۔ جہاں رشتے دار اور گاؤں کی خواتین آخری جھلک دیکھنے کے لئے پہلے سے موجود تھیں۔ ان میں ان کی پہلی بیوی شیریں امیر بیگم بھی موجود تھیں۔

سردار پیر بخش بھٹو کا بیان

سردار پیر بخش بھٹو کا کہنا تھا کہ جب نعش حویلی کے اندر لائی گئی تو ان کا کفن چہرے سے لے کر سینے تک کھلا ہوا تھا۔ شاید استاد ظہیر کاشمیری نے اسی موقعے کے لئے یہ شعر کہا تھا۔

آنکھوں میں اَبروئے جنوں کی حکایتیں
سینہ مثالِ گنجِ شہیداں کھلا ہوا

ان کے چچا نواب نبی بخش بھٹو نے ان کے کفن کی گرہ کو ان کے چہرے کو دیکھنے کے لئے تھوڑا سا کفن سرکا دیا۔ حویلی سے باہر فوجی حکمرانوں کے کارندوں نے میت کو باہر لانے کا بار بار مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے ان کے چہرے کو دوبارہ کفن سے ڈھانپ دیا گیا تو شہید وزیر اعظم بھٹو کا کفن فیض احمد فیض کے شعر کی مثال بن گیا۔

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

www.bhutto.org

فوجی حکام کے حکم کے مطابق دس بج کر 5 منٹ پر جنازہ حویلی سے باہر لایا گیا اور جنازے کو گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں پہنچا دیا گیا۔

4 اپریل کے نوائے وقت میں وزارتِ داخلہ کا بیان

فوجی حکومت کی وزارتِ داخلہ نے اعلان کیا کہ آج صبح دو بجے راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی دینے کے بعد ان کی نعش بذریعہ طیارہ لاڑکانہ بھیج دی گئی۔ جہاں صبح دس بجے ان کو ان کے آبائی قبرستان گڑھی خدا بخش میں نمازِ جنازہ ادا کرنے کے بعد سپردِ خاک کر دیا گیا۔

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

شہید وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی نمازِ جنازہ

4 اپریل 1979ء صبح ساڑھے دس بجے فوج کے کڑے پہرے میں شہید بھٹو کی میت کو گڑھی خدا بخش لایا گیا۔ ان کی قبر حکام پہلے ہی تیار کر چکے تھے۔ قبرستان مکمل طور پر فوج کی تحویل میں تھا۔ شہید وزیراعظم بھٹو کی میت کے ساتھ صرف چند لوگوں کو ہی قبرستان میں آنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ان میں نواب نبی بخش بھٹو، سردار پیر بخش بھٹو اور چند ان کے خاندان کے دوسرے لوگ قبرستان لائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ شہید بھٹو کی بیگم شیریں امیر بیگم بھی قبرستان میں موجود تھیں اور کچھ دوسری خواتین تھیں اور ان کے ملازم تھے۔

لہٰذا ان گنتی کے چند لوگوں کی صف آرائی میں نوڈیرو کی مسجد کے امام مولوی محمود نے شہید وزیراعظم فخرِ ایشیا اور چیئرمین عالمِ اسلام کا جنازہ پڑھایا اور فوجی حکام کے اہل کاروں نے ان کی میت کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر قبر میں اتار دیا۔ اور شہید بابا کی قبر پر نوڈیرو کی پاک مٹی ڈال دی گئی۔ اور ان کا جسدِ خاکی اپنی سندھ کی مٹی جس کے ساتھ ان کا والہانہ عشق تھا۔ اس عشق کی مٹی میں جذب ہو گیا۔ بقول بلھے شاہ

بلھے شاہ اسی مرنا ناہیں
قبر پیا کوئی ہور

www.bhutto.org

خواتین وحضرات نوائے وقت کی آخری سرخی بھی ملاحظہ کریں۔

وزیراعظم شہید بھٹو کے قاتلوں کے ترجمان اخبار نوائے وقت کی 4 اپریل کی پہلے صفحے کی ہی آخری سرخی بھی آپ ملاحظہ کرتے جائیں۔ اخبار اپنے نمائندہ خصوصی کے حوالے سے سرخی لگاتا ہے "ماں اور بیٹی نے رورو کر براحال کرلیا۔" کوئی اس اخبار سے پوچھے کہ وہ بے وارث، لاچار، بے بس، بے آسرا ماں بیٹی اس کے سوا کر ہی کیا سکتی تھیں۔

ہنگامِ نزع گریا یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے ہو کون سا موقعہ ہنسی کا تھا

ماں اور بیٹی نے رورو کر بُرا حال کرلیا

نمائندہ خصوصی نوائے وقت۔ بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو کو آج جب پھانسی کی اطلاع ملی تو وہ منہ نوچنے لگیں۔ اور رورو کر اپنا بُرا حال کرلیا۔ انہوں نے جیل حکام سے کہا کہ انہیں نعش کے ساتھ کیوں نہیں بھیجا گیا۔ ہماری فوری روانگی کا بندوبست کیا جائے۔ بے نظیر۔ ہائے پاپا۔ ہائے پاپا کہہ کر بین کرتی رہیں۔ سہالہ ریسٹ ہاؤس میں جہاں ماں بیٹی نظر بند تھیں۔ گذشتہ روز سے ان کے تین ملازموں پر بھی باہر جانے پر پابندی لگادی گئی تھی۔ ماں بیٹی پر مسلح فوج کا پہرہ تھا۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کے گلے مل کر بین کرتی رہیں۔

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گذر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

شاعر اسلم گورداسپوری نے اس موقعے پر کہا تھا۔

ستونِ دار پہ جو لوگ بھی چڑھائے گئے
وہ اپنے عہد میں سب سے عظیم پائے گئے

خاندانِ شہداء

شہید وزیراعظم بھٹو کے خاندان کو خاندانِ شہداء کہنا نہایت واجب اور مستحسن ہے۔ بھٹو خاندان کی قیادت شہادت سے شروع ہو کر شہادت پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ شہید بابا وزیراعظم

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت کے بعد ان کی بیٹی وزیراعظم محترمہ بےنظیر بھٹو کی قیادت کا آغاز ہوا۔ ان کی قیادت کے درمیان پہلے ان کا چھوٹا بھائی شاہنواز بھٹو دیارِ غیر میں زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا بھائی میر مرتضٰے بھٹو اپنے شہید باپ کی معروف رہائش گاہ اور اپنی رہائش گاہ 70 کلفٹن کے سامنے پولیس کے ہاتھوں شہید کرا دیا گیا۔ بھائی کی شہادت کے بعد ان کی بہن اور شہید بابا کی بیٹی کو پہلے لاکھوں انسانوں کے جلوس میں کارساز کراچی کے مقام پر خفیہ طاقتوں نے ان کو بم دھماکے میں شہید کرنا چاہا۔ مگر وہ اپنے جیالے اور پروانے فدائی ورکروں کے حصار کی وجہ سے صرف اور صرف ڈیڑھ ماہ کے لئے زندہ بچ گئی تھیں اور پیپلز پارٹی کے تقریباً 200 کارکن اپنی قائد کی زندگی کو بچاتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اگر ان جانثار کارکنوں کا کارساز کے مقام پر حصار نہ ہوتا تو محترمہ بےنظیر بھٹو 18 اکتوبر 2008ء کو ہی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتیں۔ حیرت کا مقام یہ ہے کہ بھٹو خاندان کے سفاک قاتلوں کو نہ تو 200 غریب انسانوں کی ہلاکت سے خوف آیا۔ اور نہ ہی پوری دنیا کی لعنت ملامت کا کچھ اثر ہوا۔ ان نادیدہ خفیہ قاتلوں نے راولپنڈی لیاقت باغ کی جلسہ گاہ کو اپنی آخری شکارگاہ بنایا۔ جو شکارگاہ ان کی برسوں پرانی آزمائی ہوئی تھی۔ جہاں برسوں پہلے پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو جلسہء عام میں گولی کا نشانہ بنا کر شہید کیا گیا تھا۔ اسی طرح ہنستی بولتی سابق وزیراعظم محترمہ بےنظیر بھٹو کو اپنے تاریخ ساز لیاقت باغ کے جلسہء عام سے خطاب کے بعد جب وہ لیاقت باغ سے اپنی گاڑی میں سوار ہو کر باہر روانہ ہوئیں اور انہوں نے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر گاڑی میں کھڑے ہو کر لوگوں کے نعروں کے جواب میں ہاتھ ہلا کر ان کو خوش آمدید کہنا چاہا، قائدانہ محبت اور شفقت سے لوگوں کو سلام کرنا چاہا تو ان کے سر کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ ان کو ان کے شہید باپ اور بھائیوں کی ہی طرح عشقِ عوام کے جرم میں شہید کر دیا گیا۔

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتل شہر میں
یہ مزار اہلِ وفا کے ہیں یہ ہیں اہلِ صدق کی تربتیں

قیادت کی قیمت

بھٹو خاندان نے پاکستان میں قیادت کی قیمت شہادت بنا دی ہے اب کسی ایرے غیرے

کے لئے پاکستان کے عوام کی قیادت کرنا ممکن نہیں رہا۔اب تو پاکستان کی قوم کا وہی انسان قائد بن سکتا ہے جو ان ہی کی طرح سر باز اور سرفروش ہو۔ شاعر اسلم گورداسپوری نے گڑھی خدا بخش کی شہید گاہ پر کھڑے ہو کر پیغامِ شہید بی بی کے حوالے سے یہ شعر پڑھا تھا۔

وہ آئے جس کو بھی دعویٰ ہے سرفروشی کا
شہادتوں کا تو میلہ لگا دیا گیا ہے

شہید بی بی کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے بلاول بھٹو کو پاکستان پیپلز پارٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا ہے۔ بلاول بھٹو ابھی بہت کم سن ہے اور میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ بقول مرزا غالب ۔

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

بابِ تحسین

پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کا یہ فرضِ اوّلین ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنی جدوجہد اور پارٹی کی جدوجہد کی بے مثال تاریخی قربانیوں کی تاریخ نویسی کا ایک باقاعدہ شعبہ قائم کرتی۔ جو شعبہ قیادت کا اور کارکنوں کی جدوجہد اور قربانیوں کا ریکارڈ مرتب کر کے پاکستان پیپلز پارٹی کی تاریخ نویسی کا کام سرانجام دیتا۔ افسوس کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو اس قدر اقتدار زدہ کر دیا گیا ہے کہ پارٹی کے تین مرتبہ اقتدار میں آنے کے باوجود اس اہم کام کی طرف دھیان ہی نہیں دیا گیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کی یہ غفلت خود ان کی قومی جدوجہد کے لئے اور پارٹی کے کارکنوں کی قومی جدوجہد کے لئے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بے حد نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔

اس وقت جبکہ میں پارٹی کی تاریخ نویسی کا کام اپنی شہید بھٹو کی داستانِ حیات کی شکل میں مکمل کر چکا ہوں۔ آج تک پارٹی کی جانب سے کسی ایک لیڈر اور عہدہ دار نے میرے ساتھ کبھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔ میں اپنے محدود قسم کے وسائل کے مطابق پارٹی کی قیادت اور پارٹی کے کارکنوں کی تاریخ کے حوالے سے جو کچھ بھی تحریر کر رہا ہوں وہ میری ذاتی کوشش اور میری یادداشت کا نتیجہ ہے اس میں پارٹی کی جانب سے کسی قسم کی کوئی مدد شامل نہیں ہے۔

اس سلسلے میں پارٹی کے کوڑے کھانے والے مخلص کارکن میاں منیر احمد کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھے پھانسیاں پانے والے کوڑے کھانے والے اور شاہی قلعے میں جانے والے اور

جیلوں میں جانے والے خواتین وحضرات کے ناموں کی فہرست فراہم کی جس فہرست کو میں اپنی اس کتاب کے آخر میں شائع کر کے ان کارکنوں اوران کے خاندانوں کوخراجِ تحسین پیش کر کے ایک طرح کا ثواب حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے پروانوں شہیدوں اور جیالوں کوخراجِ عقیدت اور خراجِ تحسین

انسانی جدوجہد کی آزادی کی تحریک میں سوویت روس اور سوشلسٹ جمہوریہ چین کے انقلاب دنیا کے سب سے بڑے انقلاب تھے۔ان انقلابات کے بعد شہید بھٹو کی شہادت سے لے کر شہید بی بی کی شہادت کی طویل ترین جنگ اور جدوجہد ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت اوراس کے کارکنوں کی قربانیاں اور جدوجہد بالکل ویسی ہی قربانیاں اور جدوجہد ہے جس سے سوویت روس میں اور چین میں انقلاب برپا ہو گیا تھا۔مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہماری تمام جدوجہد کا کمال بالآخر ایک اندھا کانا انتخاب بنا دیا جاتا ہے اور ایک لولی لنگڑی حکومت ہمیں دے کر ہماری تمام جدوجہد پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔اس کے بعد چند الزامات لگا کر ہماری حکومت ختم کر دی جاتی ہے۔اس طریقے سے پاکستان پیپلز پارٹی کی جدوجہد اوراس کی حکمرانی کو سانپ سیڑھی کا کھیل بنا دیا گیا ہے۔ہم کو ہر بار اپنی جدوجہد کے سفر کو نئے سرے سے شروع کرنا پڑتا ہے۔

اقتدار کی بھول بھلیوں سے ہماری جدوجہد کا تسلسل توڑ دیا جاتا ہے۔ہمارے اقتدار میں ہر بار نئے لوگ ہمارے اقتدار میں شریک ہو جاتے ہیں۔ایسے لوگ جن کو ہماری جدوجہد کی تاریخ کا کچھ شعور نہیں ہوتا۔اس طرح ہماری قیادت کی اور کارکنوں کی تمام جدوجہد کا نتیجہ کچھ لوگوں کی وزارت اور کچھ لوگوں کی امارت کی شکل میں دیکھنے میں آتا ہے۔جبکہ قیادت اور کارکن ٹھیک پیچھے اسی مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے وہ چلے ہوتے ہیں۔

میں چونکہ تاریخ کا طالب علم ہوں میرے لئے یہ بات انتہائی اندوہ گیں ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت اوراس کے کارکنوں کی تاریخ ساز جدوجہد اور قربانیوں کا کوئی ریکارڈ ہی مرتب نہیں کیا گیا۔پارٹی کی جدوجہد کی تاریخ نویسی ہی نہیں کرائی گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی

جدوجہد پر ایسی کوئی کتاب تحریر نہیں کرائی گئی جس میں قیادت کی شہادتوں سے لے کر کارکنوں کی شہادتوں اوران کی جیلوں کی داستانیں رقم کی گئی ہوں۔ میں چونکہ خود ایک کارکن ہوں میں ان کارکنوں کی داستان کو فراموش نہیں کرسکتا جو پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان کی جمہوری آزادیوں کی تاریخ کا ایک اَن مٹ حصہ ہیں۔ میں ان کارکنوں کو خراجِ عقیدت اور خراجِ تحسین پیش کئے بغیر اپنی جدوجہد کی کتاب کو مکمل تصور نہیں کرسکتا۔

اس سلسلے میں میں نے سب سے پہلے ان کشتگان عشق کے ناموں کو ترتیب دیا جو ملک وقوم پر قربان ہوکر اس دنیا سے چلے گئے۔

کشتگانِ عشق

خودسوزی کرنے والے پروانوں کے نام

سب سے پہلے میں شمع جمہوریت فخرِ ایشیا وزیراعظم پاکستان چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو شہید کے عشق میں خود کو آگ لگا کر جل مرنے والے پروانوں کو نذرانہءعقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے نام تحریر کرتا ہوں۔

(1) یعقوب مسیح کھوکھر، (2) مہر عبدالرشید عاجز، (3) عبدالوحید قریشی، (4) محمد ارشد ناگی، (5) منور حسن، (6) محمد ذوالفقار پروانہ (جو واقعی پروانہ ثابت ہوا)، (7) عبدالعزیز آف سکھر۔

آمریت کی قتل گاہ میں پھانسیاں پانے والے شہیدوں کو خراجِ عقیدت اور ان کے نام

(1) عبدالرزاق جھرنا، (2) عثمان غنی، (3) ادریس طوطی، (4) ادریس بیگ، (5) ایاز سموں، (6) ناصر بلوچ، (7) نذیر عباسی، (8) لالہ اسد، (9) لالہ اسلم خان۔

کوڑے کھانے والے بہادر کارکنوں کو خراجِ تحسین اوران کے نام

کوڑے کھانے والے جیالوں میں میں سب سے پہلے چار صحافی دوستوں کا نام دوں گا جن

www.bhutto.org

کوکوڑوں کی سزائیں سنائی گئی تھیں اور کوڑے مارے گئے تھے۔

(1) خاور نعیم ہاشمی، (2) مسعود اللہ خان، (3) ناصر زیدی، (4) اقبال جعفری۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے کوڑے کھانے والے جیالوں کے نام

(1) میاں منیر احمد، (2) جہانگیر بدر، (3) پیر سید ناظم حسین شاہ، (4) قیوم نظامی، (5) حاجی محمد طارق، (6) محمد جاوید، (7) حافظ غلام محی الدین، (8) احسان بٹ، (9) چاچا غلام رسول، (10) آغا مسعود قزلباش، (11) مسعود کونسلر، (12) محمد امین بھٹی لیبر لیڈر، (13) روشن علی (رکشہ ڈرائیور)۔

شاہی قلعہ لاہور جانے والے لیڈروں اور کارکنوں کے نام

(1) جہانگیر بدر، (2) سلمان تاثیر، (3) نسیم کاشمیری ایڈووکیٹ، (4) میاں جہانگیر ایڈووکیٹ، (5) راجہ ذوالقرنین ایڈووکیٹ، (6) چوہدری محمد اسلم گل، (7) میاں منیر احمد، (8) رانا عیش بہادر ایڈووکیٹ، (9) چوہدری محمد اشرف مناواں، (10) ملک محمد منظور ایڈووکیٹ، (11) چوہدری نثار احمد چنوں (مرحوم)، (12) چوہدری اسحاق گجر، (13) پیر سید ناظم حسین شاہ، (14) جاوید اختر، (15) قیوم نظامی، (16) پرویز صالح، (17) سردار مظہر علی خان، (18) سرور بٹ، (19) اعجاز ملک، (20) زاہد ملک (بم کیس)، (21) میاں محمد بشیر ایڈووکیٹ، (22) خالد چوہدری، (23) چوہدری غلام قادر مرحوم، (24) چوہدری محمد علی، (25) میاں محمد یعقوب شاکر، (26) آغا مبین، (27) آغا نوید، (28) میاں محمد فاروق کاشف، (29) محمد یوسف مرشد، (30) محمد شریف ایڈووکیٹ، (31) ضمیر احمد گیلانی ایڈووکیٹ، (32) جاوید اقبال معظم، (33) میاں غلام نبی، (34) محمد منشا رانا، (35) زوار حسن ملک، (36) محمد جہانگیر، (37) شاہنواز بھٹی، (38) میجر محمد صادق، (39) طارق خورشید، (40) چوہدری خالد محمود صحافی، (41) شیخ نثار علی، (42) ڈاکٹر ضیاء اللہ بنگش، (43) سیٹھ محمد بشیر، (44) محمد عارف خان، (45) نواز ربانی، (46) باؤ محمد یٰسین، (47) محمد یوسف خٹک، (48) محمد یعقوب چینہ، (49) محمد صابر، (50) رفیق بابر، (51) محمد اشرف ناز، (52) خالد مسعود، (53) مولوی سکندر ہاشمی، (54) نواب پہلوان مرحوم، (55) راجہ محمد ریاض، (56) شیخ سہیل، (57) محمد زمان بٹ، (58) مجید ملک،

www.bhutto.org

(59) سید باقر علی شاہ، (60) کمال دین کمالا پہلوان، (61) ملک ریاض شاہد، (62) جاوید اقبال انقلابی، (63) ملک عظیم محمود آف سانده، (64) میاں صابر نوناریاں، (65) فیصل صالح حیات، (66) نسیم اقبال۔

شاہی قلعے جانے والی بہادر خواتین کارکنوں کے نام

(1) فرخندہ بخاری، (2) بیگم عابدہ ملک مرحومہ، (3) شاہدہ جبین، (4) ناہید سعید، (5) بیگم عارف اقبال بھٹی، (6) مسز ناصرہ شوکت، (7) طاہرہ شمیم۔

ملٹری کورٹ سے ایک سال قید بامشقت کی سزا پانے والی بہادر خواتین کے نام

(1) سرور بیگم ان کی بیٹی (2) فردوس بیگم لاہور، (3) شاہدہ جبین لاہور، (4) حشمت بی بی راولپنڈی، (5) حاجرہ بی بی فیصل آباد، (6) نسیم کوثر فیصل آباد، (7) نواب بی بی فیصل آباد، (8) سرداراں بی بی فیصل آباد، (9) حیات بشیر بھٹی لاہور، (10) اماں پٹھانی لاہور، (11) ثریا گوجرانوالہ۔

نوٹ: یہ وہ بہادر خواتین تھیں جنہوں نے شہید بھٹو کو لاہور ہائی کورٹ سے سزائے موت سنائے جانے کے بعد مارشل لاء کے ضابطے توڑتے ہوئے سرِ عام مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی گرفتاریاں پیش کی تھیں۔ ان میں میری بڑی ہمشیرہ سرور بیگم اور ان کی بڑی بیٹی فردوس بھی شامل تھیں۔ ہمشیرہ سرور بیگم کے ساتھ میری ہمشیرہ ہونے کی وجہ سے جیل میں بڑی سختیاں اور زیادتیاں کی گئی تھیں۔ ان کی ایک سال قید میں تین مرتبہ ایک ایک ماہ کا اضافہ کیا گیا تھا۔ جیل میں ان پر الزام تھا کہ قیدی خواتین کو فوج کے خلاف نعرے لگانے پر اکساتی ہیں اور جیل کے عملے کے ساتھ تعاون نہیں کرتیں۔ اس طرح ہمشیرہ صاحبہ کو 15 ماہ کی قید بامشقت کاٹنے کے بعد جیل سے رہا کیا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر 55 سال تھی۔

بحالیٔ جمہوریت کی تحریک کی روحِ رواں خواتین اور ان کے نام

(1) نادرا خاکوانی، (2) بیگم عابدہ ملک، (3) بیگم بیلم حسین، (4) عزیزہ بیگم، (5) شمیم

نیازی، (6) ریحانہ سرور، (7) طلعت یعقوب، (8) نسرین بیگم (سابق ایم۔این۔اے)، (9) صغیرہ اسلام، (10) بیگم قیوم نظامی، (11) بیگم اشتیاق بخاری، (12) نرگس اعوان، (13) ساجدہ میر، (14) نسیم پٹھانی (مرحومہ)، (15) ناصرہ ملک (مرحومہ)، (16) نرگس خان، (17) عزرا شجاع، (18) نرگس چوہدری، (19) شمیم رئیسہ، (20) پروین حیات، (21) رقیہ نجمی، (22) سلمیٰ نواز (مرحومہ)، (23) نسرین گیلانی، (24) شاہینہ ظفر، (25) عشرت چوہدری، (26) زینت چوہدری، (27) طاہرہ شمیم، (28) زرقا بٹ، (29) عفت بٹ، (30) شاہدہ اقبال، (31) بھنڈرا، (32) محمودہ بیگم (مرحومہ)، (33) فرحت ستار، (34) اماں شمشاد، (35) امجد فردوس، (36) ثریا بھٹی، (37) عذرا بتول (مرحومہ)، (38) عالیہ عزیز، (39) عطیہ زیدی (صحافی)، (40) آمنہ زیدی، (41) زاہدہ افتخار، (42) زاہدہ شاہین، (43) خوشنود چوہدری، (44) بیگم ملک منظور (مرحومہ)، (45) عشرت چوہدری، (46) تسنیم چوہدری، (47) صدف بیگم، (48) عائشہ بٹ، (49) ثریا فاطمہ، (50) امت بیگم (مرحومہ)، (51) انور بیگم (مرحومہ)، (52) سکینہ بادامی باغ، (53) مائی جھنڈے والی، (54) بیگم یوسف خان۔

جیلوں میں جانے والے لیڈروں اور کارکنوں کے نام

(1) جہانگیر بدر، (2) حاجی آصف ایڈووکیٹ، (3) سید اشتیاق بخاری، (4) میاں منظور احمد، (5) میاں منیر احمد، (6) میاں شمس، (7) میاں ریاض احمد، (8) رانا عیش بہادر ایڈووکیٹ، (9) چوہدری محمد اسلم گل، (10) چوہدری خوشی محمد گل (مرحوم)، (11) چوہدری اکرم گل، (12) خالد چوہدری، (13) چوہدری اشرف اعجاز گل، (14) جاوید حفیظ پپی، (15) چوہدری پرویز حفیظ، (16) چوہدری شاہد حفیظ، (17) شیخ رشید، (18) محمد اشرف مناواں، (19) شیخ محمد فیاض (مرحوم)، (20) ملک ظفر اقبال، (21) سردار ظفر اقبال، (22) چوہدری رحمت وٹو، (23) دلاور بٹ، (24) محمد اکرم بھٹی، (25) حکیم عمر دین، (26) سید لقا علی بخاری، (27) ڈاکٹر غلام حسین زاہی، (28) محمد لطیف ایاز ایڈووکیٹ، (29) منصور ملک ایڈووکیٹ، (30) ملک ظفر علی (مرحوم)، (31) مجید ملک، (32) سید مظفر اقبال شاہ، (33) ملک شاہ محمد محسن (مرحوم)، (34) ملک شوکت علی، (35) شاہد محمود ندیم، (36) شیخ محمد آصف، (37) محمد طفیل، (38) ولی

www.bhutto.org

الرحمٰن، (39) سید عنایت شاہ، (40) آغا شاہد، (41) ڈاکٹر ایس۔ایم۔یعقوب، (42) محمد الطاف کیڑی، (43) ظہیر احمد باجوہ، (44) شاہد افتخار ایڈووکیٹ، (45) شیخ تاج دین (مرحوم)، (46) خواجہ ناہید قمر، (47) ڈاکٹر محمد امین، (48) چوہدری نذیر احمد (مرحوم)، (49) مرزا محمد اکرم بیگ، (50) سائیں حرا، (51) شیر محمد بھٹی (مرحوم)، (52) طارق وحید بٹ، (53) محمد سلیم بھولی، (54) ملک کرامت علی ایڈووکیٹ، (55) جسٹس (ر) سعید حسن ملک، (56) ایس۔ایم۔مسعود، (57) چاچا شریف چاول والا، (58) شیخ عبدالغفور، (59) چوہدری محمد یونس، (60) میاں ارشد (مرحوم)، (61) شاہنواز (اداکار مرحوم)، (62) میاں خالد لطیف کاردار، (63) ڈاکٹر اسرار شاہ، (64) علاؤالدین بیگ، (65) ملک محمد اسلم (مرحوم)، (66) حفیظ بدر (مرحوم)، (67) محمد اکرم بھٹی (مزنگ)، (68) حکیم محمد سعید، (69) منظور احمد، (70) جیو بھٹو، (71) چوہدری محمد اسلم، (72) (او۔ایس۔ڈی) ایڈووکیٹ، (73) رفیق احمد شیخ، (74) شیخ عتیق رفیق، (75) چوہدری اصغر خادم ایڈووکیٹ، (76) میاں بشیر ظفر ایڈووکیٹ، (77) بھاؤ محمد یٰسین، (78) عبیداللہ بٹ (مرحوم)، (79) پروفیسر استقلال خان، (80) بھاؤ حامد منیر، (81) کاظم حسین شاہ، (82) نواز مرزا (ریلوے)، (83) کامریڈ مجید، (84) اقبال چیمہ ایڈووکیٹ، (85) محمد اسلم گورداسپوری۔

پارٹی کارکنوں کی مالی اور اخلاقی مدد کرنے والے کارکنوں کے نام

(1) میاں حبیب اللہ خان، (2) میاں علی احمد (دوبئی پی پی کے کنوینیر)، (3) چوہدری جعفر حسین، (4) ڈاکٹر فخرالدین چوہدری، (5) اشرف محمود بٹ، (6) میاں خالد سعید، (7) فرخ بٹ، (8) سید آصف ہاشمی، (9) چوہدری غلام حسین فیروز یانوالے، (10) عرفان شیخ، (11) معراج دین، (12) چوہدری غلام رسول، (13) محمد اظہر صدیقی، (14) وحید ملک، (15) رانا خالد، (16) سید حسن رضا، (17) ڈاکٹر پروفیسر مرتضیٰ جعفری، (18) میاں محمد دلاور، (19) ملک سیف الملوک (کسان ونگ)، (20) صوفی محمد تسنیم، (21) چوہدری محمد یعقوب نمایاں، (22) واجد علی شاہ، (23) میاں محمد آصف، (24) اللہ نواز سیال، (25) شبیر احمد، (26) سید راشد علی شاہ، (27) رحمت وٹو (مرحوم)، (28) سید واصف علی شاہ، (29) تنویر بٹ، (30) حاجی نذیر احمد، (31) مولوی ہدایت اللہ، (32) محمد ادریس خان، (33) چوہدری صادق،

www.bhutto.org

(34) تایا کرم دین، (35) جاوید اقبال خان، (36) حاجی ملک لیاقت علی، (37) اکبر خان، (38) زبیر شاہ، (39) میاں اکبر، (40) ملک عبدالقادر، (41) شیخ اخلاق حسین، (42) ملک علی محمد، (43) محمد یوسف خان، (44) محمد یامین خان آزاد، (45) میاں عبدالستار نجم ایڈووکیٹ، (46) اورنگ زیب برکی، (47) حفیظ الرحمٰن ملک، (48) الطاف قریشی، (49) سہیل منان، (50) عزیز الرحمٰن چن، (51) مظہر مرغوب، (52) سید امیر علی شاہ، (53) چوہدری محمد سلیم، (54) عارف نسیم کشمیری، (55) ظفر مسعود بھٹی، (56) چوہدری وحید، (57) آغا شوکت، (58) میاں حامد منیر، (59) یوسف خان، (60) فاروق شیخ، (61) احمد مکی، (62) سلیم کھوکھر، (63) عادل بٹ، (64) فیاض بٹ، (65) سیٹھ شوکت علی، (66) غلام محمد بٹ، (67) جاوید اقبال راجہ ایڈووکیٹ، (68) ملک کرامت علی کھوکھر، (69) خرم رفیق، (70) لیاقت رضا، (71) لیاقت علی شاہ، (72) افضال صدیقی، (73) خالد بٹ، (74) مطاہر احمد، (75) حاجی عبدالستان، (76) خواجہ محفوظ عالم، (77) چوہدری منور انجم، (78) مظفر بٹ، (79) محمد منشا پرنس، (80) محمد رفیق بھٹہ، (81) محمد ضمیر کھوکھر، (82) چوہدری صلاح الدین (مرحوم)، (83) محمد سعید بٹ، (84) شاہد استقلال خان، (85) ڈاکٹر عزیز کاش، (86) سید سکندر شاہ، (87) محمد ضیاء تاگرہ، (88) ذوالفقار ملک، (89) ضیاء بخت بٹ (مرحوم)، (90) دلاور محمود بٹ، (91) ڈاکٹر ضرار یوسف، (92) سید خالد بخاری، (93) ڈاکٹر زاہد اکرم نت، (94) طفیل بٹ، (95) سمیع اللہ خان، (96) راحت سعید خان، (97) ملک لطیف، (98) ملک حفیظ، (99) ملک یٰسین، 100) شیخ عاشق۔

کارکنوں کی قانونی مدد کرنے والے وکلاء کے نام

ملک محمد قاسم مرحوم صدر رہائی کمیٹی، چوہدری لیاقت حسین وڑائچ مرحوم سیکرٹری جنرل پرزنر رہائی کمیٹی، ملک سعید حسن ایڈووکیٹ، محمد اصغر چوہدری ایڈووکیٹ، میاں عبدالستار نجم ایڈووکیٹ، ایس۔ایم۔مسعود ایڈووکیٹ، میاں سلیم جہانگیر مرحوم ایڈووکیٹ، میاں بشیر ظفر مرحوم ایڈووکیٹ، کاظم خان ایڈووکیٹ، محمد اشرف خان ایڈووکیٹ، چوہدری محمد اشرف ایڈووکیٹ، راجہ ذوالقرنین ایڈووکیٹ، محمد نواز گوندل ایڈووکیٹ، رانا ذوالقرنین ایڈووکیٹ، عبدالرشید قریشی ایڈووکیٹ،

www.bhutto.org

نسیم کاشمیری ایڈووکیٹ، ملک غلام رسول ایڈووکیٹ، میاں محمد اقبال ایڈووکیٹ، احسان وائیں ایڈووکیٹ، منظور گیلانی ایڈووکیٹ، سردار شوکت علی ایڈووکیٹ، شریف حسین بخاری ایڈووکیٹ، میاں جہانگیر ایڈووکیٹ، عاقل مرزا ایڈووکیٹ، ملک منصور ایڈووکیٹ، ملک منظور ایڈووکیٹ، تنویر ہاشمی ایڈووکیٹ۔

www.bhutto.org